سب رنگ ڈائجسٹ کا مقبول ترین سلسلہ
بازی گر
دوسرا حصہ
PDFBOOKSFREE.PK

بیماری ۔ کی کسی کو خبر نہیں تھی۔ ہم وہاں ایک ایک پہنچے تو اڈے
میں کھلبلی مچ گئی۔ شرلی نے مجھے کندھوں پہ اٹھا لیا۔ نصیب میاں نے
میری بلائیں لے لیں۔ "اے واہ میاں! ماشاء اللہ ایسی بھی کیا ستم گری ہے۔ نہ
پیام نہ کلام نہ سلام۔ قسم خدا کی، بیگم کی۔ استاد نواب کو کسی پہلو چین نہیں
تھا۔ آہیں بھرتے تھے۔" نصیب میاں نے میرے ہاتھوں کو بوسہ دیتے
ہوئے کہا۔

اڈا اجڑا اجڑا معلوم ہوا لیکن تھوڑی ہی دیر میں آدمیوں سے بھر
گیا۔ ہر شخص بڑھ کے گلے مل رہا تھا اور میری عدم موجودگی میں تجمل کی کیفیت
بیان کر رہا تھا۔ کالے نے بمبئی میں مجھے سچ بتایا تھا۔ جلد ہی مجھے بھی
اندازہ ہو گیا کہ اڈے کا وہ حال نہیں ہے جو پہلے تھا۔ کئی آدمی پیسہ دینا
بند کر چکے تھے۔ سونا گاچھی کے علاقے پہ استاد تبو خاں نے پوری طرح
قبضہ جما لیا تھا۔ اُدھر گھوشی پہلے ہی محلے کے اڈے پہ قابض تھا۔ دور دراز
کے بھولے ہوئے اڈے بھی پیسہ دیتے ہوئے آنا کانی کرنے لگے تھے اور
کہتے تھے کہ جب استاد تجمل اس طرف کی خبر ہی نہیں لیتا تو وہ کیوں اُسے
علاقے کی آمدنی میں شریک کریں۔ تجمل کے سامنے شکایتوں کا دفتر کھل گیا۔
اُسے بتایا گیا کہ علاقوں میں گشت کرنے والے آدمی بھی حساب میں صاف
نہیں ہیں۔ پیسہ درمیان ہی میں اُڑا جاتے ہیں۔ تجمل کے بمبئی جانے کے
بعد حالات اور خراب ہو گئے تھے۔ گھوشی کی تعداد میں کا ذکر سب کے ہونٹوں
پر تھا۔ تجمل کے اڈے کے کئی پرانے آدمی گھوشی سے مل گئے تھے۔

دوسرے دن شہر میں دور دور تک یہ خبر پھیل گئی کہ تجمل لاڈلے کے
ساتھ واپس آچکا ہے۔ شام کو استاد تبو خاں تمام رقم لے کے خود حاضر ہو گیا۔
اُس نے تجمل سے معذرت طلب کی اور رقم کی ادائی میں تاخیر کے مختلف
عذر تراشے۔ تجمل نے کچھ نہیں کہا۔ رقم نصیب میاں کو دے دی گئی۔ رات
تک لوگوں کا تانتا بندھا رہا۔ دو ہی دنوں میں رکی ہوئی اچھی خاصی بڑی
رقم جمع ہو گئی اور اڈے کی پرانی رونق رفتہ رفتہ بحال ہونے لگی۔ کالے
بمبئی سے آنے کے بعد اب تک الگ تھلگ رہا تھا۔ وہ بھی کچھ سرگرم ہو گیا۔
اُس نے تجمل سے ایک ہزار روپے لے کے جوالین کے نام بمبئی روانہ کر دیے اور
منی آرڈر پہ سختی کے ساتھ یہ تاکید کر دی کہ یہ روپے صرف جوالین خرچ کرے
گی۔ وہ جوالین کے سلوائے ہوئے کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ کپڑے میلے ہو گئے
تھے لیکن بدلتے انہیں آتا نہیں تھا۔ جانو شفیق آباد جانے پر مصر تھا۔ تجمل
نے اُسے نہیں جانے دیا۔ اڈے کے دوسرے لوگ اُس کی خاطر تواضع میں مصروف
تھے۔ تبو خاں اُسے اپنے ساتھ سونا گاچھی لے گیا تھا۔ شرلی، رامو، لیلا
لالہ وغیرہ سب میرے گرد جمع رہتے تھے۔ نصیب میاں ادھر سے اُدھر
تحرک رہتے تھے۔ جب بھی کوئی شخص پیسے لے کے آتا وہ چلاتے۔ "استاد
برکت ہی برکت ہے۔ ساری برکت چشم بددور لاڈلے میاں کی ہے۔ ماشاء اللہ
نواب! ذرا ایک بکرا تو منگوا لو۔"

دو دن تک یہی ہنگامہ رہا۔ تجمل زیادہ تر لوگوں کی باتیں سنتا اور
اُن سے ملتا رہا۔ وہ خود کم کم تھا گویا خاموشی میں رہتا۔ تیسرے دن صبح ہی صبح تجمل

تیرے ساتھ اُس مدرسے میں گیا جہاں مولوی محمد شفیق بیٹھے اور کوہ کرتے گئے تھے۔ صدر مدرس تجمل سے خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آئے اور مولوی محمد شفیق کا سامان دکھانے پر آمادہ ہو گئے۔ وہ سامان ایک الماری میں ابھی تک بند تھا۔ وہاں کوئی نئی بات معلوم نہیں ہوئی۔ مولوی شفیق کے سامان سے ایک کاپی نکلی۔ کاپی میں تعویذ لکھے ہوئے تھے اور کلکتے کی مختلف دکانوں کے پتے بھی درج تھے۔ تجمل نے صدر مدرس سے وہ کاپی عاریتاً طلب کی۔ انھوں نے بڑی مل دقت کے بعد آ کے کاپی دے دی۔ میں کرتے کے سائے کپڑے لے جانا چاہتا تھا مگر مدرس نے کاپی ہی بڑی مشکل سے دی تھی۔ وہ کپڑے اصل میں فیروزے کے تھے مگر کرانے بھی انھیں پہنا تھا۔ ان ہی کپڑوں کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ میں نے سوچ لیا کہ کسی دن رات کو یہاں آ کے انھیں چوری کر لوں گا۔ تالا بہت معمولی تھا۔ ایک جھٹکے میں کھل سکتا تھا اور مدرسے میں کوئی خاص پہرا بھی نہیں رہتا تھا۔ وہ پہر تک تجمل مولوی صاحب کی کاپی کے چیں بہ جانے کے آگے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا مگر کسی کو بھی مولوی صاحب کا پتہ معلوم نہیں تھا۔ سب یہی کہتے تھے کہ انھوں نے ایک مرتبہ سے اس کی شکل نہیں دیکھی ہے، نہ ان کے متعلق کچھ معلومات رکھتے ہیں۔

اُس دن رات کو تجمل نے خلاف توقع اپنے تمام اڈوں کا نگراں استاد جامو کو بنا دیا۔ تجمل کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ اُس کی عدم موجودگی میں جامو اور جامو کی عدم موجودگی میں کالے اور لالا اڈے کا کام سنبھالیں گے۔ کالے کی طرح لالا کا ہاتھ بھی چاقو میں بہت رواں تھا۔ سب نے یہ اعلان حیرت سے سنا کیونکہ بہت سے لوگوں کو امید تھی کہ تجمل جامو کے بجائے لالا ڈلے کو متعین کرے گا۔ کالے نے مجھے بتایا کہ جامو بے حد اصرار کے بعد کلکتے میں رکنے پر تیار ہوا ہے اور اُس نے لکھنؤ کے کلن خاں کو اطلاع دے دی ہے کہ وہ فیض آباد میں اُس کے چھوٹے بھائی مجو کی دیکھ بھال کرتا رہے۔ فیض آباد کا اڈا یوں بھی محفوظ تھا وہاں کلکتے اور بمبئی کی طرح آپس میں اختلافات پیدا ہونے کا بہت امکان نہیں تھا۔ شہر بھی چھوٹا تھا اور جامو کی گرفت سخت تھی۔

صرف چار دن میں اڈے کے معمولات مکمل طور پر اپنی ڈگر پر آ گئے۔ نصیب میاں کو روزنامچے میں اندراج کرنے کے کام سے سر اٹھانے کی فرصت نہیں ملتی تھی۔ تقریباً اڈے سے کترانے والے بھی لوگ واپس آ چکے تھے مگر گھوشی نہیں آیا تھا اور آنے والے لوگ گھوشی کے بارے میں عجیب عجیب باتیں بیان کرتے تھے۔ میرا خیال تھا کہ تجمل یا جامو اُسے خود ڈھونڈنے نکلیں گے اور کہیں گے کہ یا تو وہ اڈا چھوڑ دے ورنہ نتائج بھگتنے کے لیے تیار ہو جائے۔ ہو جائے کہ کا اڈا یا تو تجمل کے اڈوں میں شامل نہ ہوتا اور شامل ہو گیا تھا تو اُسے واپس نہیں جانا چاہیے تھا۔ ادھر تجمل تیزی سے اپنے

کام منشار ہا تھا اور اپنے معتبر آدمیوں کو کام کے مختلف ہدایتیں دے رہا تھا۔ تجمل نے خاص خاص لوگوں کے سوا شاید کسی کو نہیں بتایا تھا کہ وہ میرے ساتھ واپس جا رہا ہے۔ بس شمول یا سارسے کو ساتھ لے کے روز صبح سویرے اڈے سے نکل جاتا تھا اور دوپہر کو واپس آتا تھا۔ شمول رات کو مجھے سارا پچھلا سناتا تھا۔ اُس کی آواز پہلے سے کہیں زیادہ مختصر ہو گئی تھی۔ یہاں بھی بیکاری اور کام نہیں تھا۔ دن بھر گلی گلی پھرتا اور شام کو اڈے واپس آ کے ادھر اُدھر کی باتیں سنتا رہتا۔ ایک دن مجھے جیلر صاحب نظر آ گئے۔ وہی جیلر صاحب جو مجھ پر بہت مہربان تھے اور جن کی لڑکی سونیا کو میں نے جیل میں پڑھایا تھا۔ اتفاق سے جیلر صاحب کی نظر مجھ پر نہیں پڑی۔ میں نے راستہ بدل دیا۔ اُس دن رات کو کئی آدمیوں نے لب لباب یہ بتایا کہ تجمل کو آمادہ کرنا چاہا کہ وہ گھوشی کے سلسلے میں کوئی قدم اٹھائے۔ اس سے اڈے کی بدنامی ہو رہی ہے۔ تجمل نے ہوں ہاں کر کے ٹال دیا۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ تجمل کے لیت و لعل کی وجہ کیا ہے۔ اگر وہ خود گھوشی کا سامنا کرنے سے گریزاں تھا کہ گھوشی پر چاقو اٹھا تا اُس کے لیے سبکی کی بات ہے تو وہ کسی کو بھی بھیج سکتا تھا۔

پانچویں دن صبح صبح سب جاگ گئے تھے۔ تجمل نہا رہا تھا اور نصیب میاں روزنامچے پر پنسل سے لکیریں کھینچ رہا تھا۔ باقی لوگ بھی اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ میں پچھلے دروازے سے نکل گیا۔ گلی میں آتے ہی مجھے ایک ٹیکسی مل گئی۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر میں مونچوار کے علاقے میں تھا۔ میں نے ٹیکسی اڈے کی عمارت کے دروازے پر کوائی۔ دروازے پر جو لوگ موجود تھے انھوں نے مجھے دیکھا تو چپاند کی طرف دوڑے اور دو دو کر میری جانب لپکے۔ وہ سب مجھے جانتے تھے۔ "گھوشی کہاں ہے؟" میں نے اُن میں سے ایک سے دریافت کیا۔

"اندر ہے۔" سنتے آگے آ کے سینہ پھلاتے ہوئے کہا۔

"اُس سے کہو کہ لالا ملنے آیا ہے۔"

سنتے اپنے شانے سکوڑ لیے اور میری آنکھوں میں جھانکنے لگا پھر اُس نے اپنے قریب کھڑے ہوئے آدمی کو اشارہ کیا۔ وہ فوراً اندر کی طرف چلا گیا مگر وہ ابھی دہلیز ہی میں تھا کہ گھوشی کو آتا ہوا دیکھ کے پلٹ پڑا۔ گھوشی کے پیچھے کئی آدمی تھے۔ میں اپنی جگہ کھڑا رہا۔ "لالا ڈلے!" گھوشی نے دور ہی سے مجھے پکارا اور میرے سامنے آ کے کھڑا ہو گیا۔ "کہا ہے لالا ڈلے؟"

وہ نخوت سے بولا۔

"گھوشی! میں تجھ سے ملنے آیا ہوں۔ شاید تُو نے سُنا نہیں کہ ہم لوگ واپس آ گئے ہیں؟" میں نے بلند آواز میں کہا۔

"میں نے سن لیا تھا۔" وہ منہ بنا کے بولا۔

"اس وقت میں تجھ سے یہ کہنے آیا ہوں کہ سیدھے سبھاؤ اڈا واپس

کر دے۔ میں زیادہ بات نہیں کروں گا۔ تُو نے اڈا زبردستی نہیں لیا ہے، تُو نے تجمل بھائی کے ساتھ فریب کیا ہے۔ تُو نے استاد تجمل کی خاموشی غلط سمجھی اور یہ بھی غلط سمجھا کہ میں مر گیا ہوں۔ میں تیرے سامنے زندہ موجود ہوں۔ اچھی طرح اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔"

"استاد تجمل اڈا سنبھالنے کے کام کا نہیں رہا۔ وہ بوڑھا ہو گیا ہے۔" گھوشی نے غصے کے کہا۔ "اور یہ اڈا مرحوم استاد تجمل نے نہیں لیا تھا، تُو نے لیا تھا۔ تُو چلا گیا تو اڈے پر تجمل کا کوئی حق نہیں تھا۔ مونچوار کے تم میں یہ اڈا میں چلاتا تھا۔ میں اپنے گرو کا اڈا اس طرح برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ اُدھر تجمل بیٹھا حقہ گڑگڑ کرتا ہے اور ادھر آدمی ہاتھ سے نکل رہے ہیں۔ اُدھر تجمل منہ پھلائے گردن ڈالے بیٹھا ہے اور ادھر سالا کوئی جالا بُنتا ہے۔ اڈے کو زنگ لگ گیا تھا لالا ڈلے! میں نے استاد سے بار بار کہا پر استاد نے دھیان نہیں دیا۔ میں نے اڈا لے لیا۔ اب بھی استاد منہ پر تالا ڈالے بیٹھا ہے۔"

"زبان سنبھال کے بات کر گھوشی! اب استاد تجمل کے لیے تُو نے ایک لفظ بھی آئیں منہ سے نکالا تو تیری زبان کاٹ لوں گا۔ بے کار کے بولنے مت کر۔ یہ اڈا میں نے استاد تجمل کو دیا تھا اور اس سے چاقو کے بل پر ہی واپس لے سکتا تھا۔ تُو نے شہ دارن کیا تو اچھا لگا ہے گھوشی! تجمل نے تیرے ساتھ کیا زیادتی کی تھی؟ وہ تجھے اپنا سب سے قریب کا آدمی سمجھتا تھا۔ تیری آنکھ میں سؤر کا بال ہے۔ تُو بیمار ہو جائے یا بوڑھا ہو جائے تو کیا تیرے ساتھی تیری زندہ لاش نوچنے لگیں۔ تُو استاد تجمل کو بوڑھا کہتا ہے۔ چل میرے ساتھ چل۔ میں تجھے اُس کا بڑھاپا دکھاؤں گا۔ تجمل کے اور تمام اڈے بھی تیرے ہو جائیں گے لیکن تجھے تیری ماں کی قسم ہے تُو جا کے بات۔ تجمل پر چاقو اٹھا ایم ہیں سے کوئی نہیں بولے گا۔ چل۔" میں نے اُسے دھکیلتے ہوئے کہا۔

"تُو ان بات کی اڑی کر رہا ہے۔" وہ پیچھا کرتے ہوئے بولا۔ "میں کیوں جاؤں؟ تجمل کو آنا ہوتا آ کر خود آتا۔ تُو اُس کے حق میں نہیں بولے گا تو اور کون بولے گا۔ یہ میری بات سن لالا ڈلے! جھگڑا مت کر۔ میری جگہ تُو ہوتا تو تُو بھی یہی کرتا۔ تجمل کا تم جا چکا ہے۔"

"تجمل کا تم جا چکا ہے اور تُو نے یہ بھی جاننے کی کوشش نہیں کی کہ تیرے ساتھ احسان کرنے والے کا تم کیوں جا رہا ہے۔ تُو گدھ کی طرح اُس کے قریب منڈلاتا رہا کہ کب استاد گردن ڈالتا ہے۔ گھوشی! جو کچھ نہیں ہوا تا تُو نے وہ کیا ہے۔ اب تیرا کیا خیال ہے؟ اڈا واپس کرتا ہے تجمل کو یا مجھے؟ اور سن لے اب وہ جامو بھی آ گیا ہے جو اڈوں کی تنخی پر جا تا ہے تو اسے دو کرتے۔ میں کوئی اور بات سننا نہیں چاہتا۔ تُو نے بُرا کیا ہے۔ جو اپنی غلطی مان لے وہ بڑا آدمی ہوتا ہے۔ اب بھی کچھ نہیں گیا۔ اڈا واپس کر دے۔ تجمل کو یہاں آنے کی

تکلیف نہ دے۔ تُو خوار ہو گا۔ پانی بھی نہیں دے گا گھوشی! اب ہم میں سے کوئی تجھ پر چاقو نہیں اٹھائے گا۔ استاد تجمل ہی تجھ سے نمٹے گا۔"

"تُو کہنا کیا چاہتا ہے؟" وہ تندی سے بولا۔

"تُو سمجھنا نہیں چاہتا ورنہ میری بات بالکل صاف ہے۔ میں تیرے پاس آیا ہوں۔ تجھے سمجھ جانا چاہیے۔ چل میرے ساتھ چل اور استاد سے معافی مانگ لے۔ وہ تجھے معاف نہیں کرے گا لیکن میں اُس سے کہوں گا تو وہ میری بات ٹالے گا بھی نہیں۔ جلدی سے فیصلہ کر لے۔"

کچھ دیر بعد ہم اڈے پہنچ گئے۔ میری تلاش میں کئی آدمی دوڑ چکے تھے۔ میں نے گھوشی کو تجمل کے سامنے کھڑا کر دیا۔ تجمل نے منہ پھیر لیا۔ "اسے معاف کر دو تجمل بھائی!" میں نے عاجزی سے کہا۔ "میں اسے اسی لیے لایا ہوں۔ میری خاطر معاف کر دو۔"

"لالا ڈلے!" تجمل چلانے لگا۔ "تُو اِس کمینے کے پاس کیوں گیا تھا؟"

"گھوشی سے غلطی ہو گئی تجمل بھائی! غلطی کسی سے بھی ہو سکتی ہے۔ ہم سب اپنی زندگی میں ایسی غلطیوں سے دوچار ہوتے ہیں۔ تم تو کہتے تھے کہ جو واپس آ جائے اس کے لیے دل کھلا رکھنا چاہیے۔ گھوشی نے میری بات کا پاس کیا اور میرے ساتھ چلا آیا ہے۔"

"اگر تُو نے اسے بخش دیا ہے تو پھر مجھ سے کیوں پوچھتا ہے۔" وہ کرب سے بولا۔ "پر تُو ایسی باتیں مت کیا کر۔"

گھوشی نے تیزی سے بڑھ کے تجمل کے پیر پکڑ لیے۔ تجمل بگڑا رہا۔ گھوشی بلکنے لگا۔ تجمل نے اُس کے گال پر ایک طمانچہ رسید کیا۔ گھوشی اُس کی حماقت سے پٹ گیا۔ "قسمت کا اچھا ہے گھوشی کہ لالا ڈلے تیرے پاس پہنچ گیا۔ میں جامو کو تیرے پاس بھیجنے ہی والا تھا۔ ذرا شہر والوں کو بھی پتہ چل جاتا کہ استاد جامو کون ہے۔ جا تو اب اسے تُو ہی سنبھال۔" تجمل نے اُسے ایک ہاتھ سے دھکا دیا۔ دوسری طرف سے جامو نے گھوشی کو پکڑ کے گلے سے لگا لیا۔

دوپہر کو ڈاکیے نے ایک خط تجمل کے سپرد کیا۔ تجمل نے اُسے میرے حوالے کر دیا۔ وہ زرّیں کا خط تھا۔ زرّیں نے تجمل کو آداب و تسلیمات کے بعد اُس کی خیریت پوچھی تھی اور لکھا تھا کہ "میری عزت ظہیر کے نام بمبئی سے ایک خط آیا ہے۔ میں نے خط کھول کے نہیں دیکھا ہے لیکن اُسے کسی ذریعے کے بغیر آپ کے پاس بھیج رہی ہوں۔ یہ خط کسی بمبئی والے نے لکھا ہے۔ یقیناً ظہیر بمبئی میں رہتے ہوں گے۔ آپ چاہیں تو اسے کھول لیں۔ شاید ظہیر اس طرف آنے ہی والے ہیں۔ انھوں نے اپنی طرف سے میرا پتہ دیا ہو گا۔ ممکن ہے وہ کلکتے میں آپ کے پاس پہنچ گئے

جہانگیر کی پیشانی سے خون پھوٹ رہا تھا اور اس کی آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔ مجھے اپنی طرف بڑھتا ہوا دیکھ کے لڑکا چیخا۔ وہ درمیان میں تجمل و جیٹھے کی تلقین کر رہا تھا لیکن اس کی بات پوری ہونے سے پیشتر ہی میں نے اس کے کولہے پر ٹھوکر مار دی تھی۔ میں جہانگیر کو اگر کھینچ کر اس سے علیحدہ کرتا تو لڑکا اس دوران میں اسے دو چار ضربیں اور لگا دیتا۔ جہانگیر مزید ضربوں کا متحمل معلوم نہیں ہوتا تھا اس لیے میں نے جاتے ہی اسے جہانگیر سے دور کرنے کی کوشش کی۔ وہ دونوں ایک ساتھ زمین پر گر گئے۔ جہانگیر بھی اس کی ٹھوکر سے زمین پر آ گیا تھا کیونکہ اس نے ابھی تک لڑکے کے بال نہیں چھوڑے تھے۔ میں نے اس کی گردن پکڑ کے کھینچا تو اسے بال چھوڑنے پڑے۔ میں اسے لے کے جلد سے جلد بھیڑ سے دور ہو جانا چاہتا تھا مگر لڑکے نے ایک لمحے میں پھرتی سے اٹھ کے میری کمر پر پوری طاقت سے سر مار دیا۔ اگر سامنے ہجوم نہ ہوتا تو میں اوندھے منہ سڑک پر جا گرتا۔ لوگوں نے مجھے سنبھال لیا۔ ہر شخص اپنی بولی بول رہا تھا۔ بس کرو بس کر جانے دو، توبہ ہے! ایک طرف سے کسی بڈھے کی چیختی ہوئی آواز گونجی۔

لڑکے کا نام مولا تھا۔ ہجوم میں بہت سے لوگ اسے جانتے تھے۔ وہ بار بار اس کا نام لے کے اسے بچانے بجھانے کے لیے آوازیں لگا رہے تھے مگر کسی نے اس کا ہاتھ نہیں پکڑا۔ مولا نہیں مانا۔ مجھے ڈر تھا کہ جہانگیر نظروں سے اوجھل نہ ہو جائے یا معاملہ بڑھتا ہوا دیکھ کے فرار ہونے کی کوشش نہ کرے۔ میں نے بہت احتیاط کی تھی۔ یہ شارع عام تھی اور علاقہ بھی بالا خانوں کا تھا۔ مولا کے کچھ اور ساتھی بھی وہاں موجود ہو سکتے تھے لیکن مولا کے لیے میری ضرب ناکافی ثابت ہوئی۔ جہانگیر کی پیشانی سے خون ابل رہا تھا۔ میری آنکھیں جلتی جا رہی تھیں۔ مجھے سامنے کی چیزیں صاف نظر نہیں آ رہی تھیں۔ مولا دوبارہ دوڑتا ہوا میرے پیچھے لپکا اور اس نے پشت سے میری واسکٹ پکڑ لی۔ میں نے جہانگیر پر اپنی گرفت قائم رکھی تھی۔ وہ مسلسل مجھ سے خود کو چھڑانے کی تگ و دو کر رہا تھا۔ اس کا ہاتھ تھامے تھامے میں نے مولا سے نمٹنے کا فیصلہ کیا۔ اس اثنا میں تجمل بھی ہجوم چیر کے آگے آ چکا تھا اور خاموش کھڑا تھا۔ میں نے جہانگیر کو اس کی طرف دھکیل دیا پھر پلٹ کے قدم بڑھانے کو تھا کہ مولا کو کمر سے پکڑ کے زمین پر پٹخ دوں مگر تجمل میرے اور اس کے درمیان آ گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے میرا بازو جکڑ لیا۔ مولا نے دیوانہ وار تجمل کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا اور کچھ دیکھے بغیر وحشت زدہ انداز میں اس کی ٹھوڑی پر سر کا وار کیا۔ وہ بری طرح گالیاں بک رہا تھا۔ تجمل نے حرکت نہیں کی۔ وہ مجھے اور جہانگیر کو اپنی آڑ میں لیے ہوئے چپ کھڑا رہا۔ مولا نے تجمل کے سینے پر پے در پے گھونسے مارے۔ "اسے چھوڑ دے

چاچا!" اس نے چلا کے کہا۔ "اس رنڈی کے جنے کو چھوڑ دے۔" میرے کانوں میں آگ بھڑک اٹھی۔ میں تجمل کے ہاتھ سے اپنا بازو چھڑا کے اس کی طرف جھپٹا مگر تجمل نے ٹانگ مار کے مجھے زمین پر گرا دیا اور دوبارہ پکڑ کے کھڑا کر لیا۔ مولا خود ہی اچانک رک گیا۔ وہ تجمل کو چند ہی گھونسے مار سکا۔ اسے شاید تجمل کا چہرہ دیکھنے کا موقع مل گیا تھا۔ وہ پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے پیچھے ہٹتے ہی ہجوم میں سے بہت سے لوگ ہماری جانب بڑھے۔ بعض نے جہانگیر کی پیشانی صاف کرنی چاہی مگر تجمل نے انہیں روک دیا اور جہانگیر کا ماتھا اپنے دامن سے خشک کیا۔ تجمل جہانگیر کی طرف متوجہ تھا۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد ہی میں نے مولا کی تلاش شروع کر دی۔ مجھے ذرا سی دیر ہو گئی۔ مولا فرار ہو چکا تھا۔

اوپر بالا خانوں پر کھڑی ہوئی عورتوں میں سے کسی نے کپڑا پھینک دیا تھا۔ تجمل نے اپنے ہاتھ سے جہانگیر کے پٹی باندھی۔ آگے کچھ دور چوک پر ایک انگریزی شفا خانہ تھا۔ ہمارے ساتھ کئی آدمی چلے۔ پھر ابھی کمپونڈر جہانگیر کی مرہم پٹی کر رہا تھا کہ ایک برقع پوش عورت بے تابی سے مطب میں داخل ہوئی اور نقاب الٹ کے جہانگیر سے لپٹ گئی۔ "یہ کیا ہو گیا رے رجو!" وہ ہذیانی انداز میں بولی۔

وہ اکیلی نہیں تھی۔ ڈاکٹر کے اشارے پر اس کے ساتھ آنے والے دونوں آدمیوں نے اسے جہانگیر سے جدا کیا۔ دونوں آدمیوں کی وضع قطع سے ان کے پیشے کا صاف پتہ چلتا تھا۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ میں نے غور سے عورت کو دیکھا مگر وہ فریحہ، فریال یا نادرہ میں سے کوئی نہیں تھی۔ وہ ادھیڑ عمر کی ایک گوری چٹی عورت تھی۔ اس کا ناک نقشہ ترشا ہوا تھا۔ میں نے ذہن پر بہت زور دیا مگر خاندان کی کوئی ایسی عورت میرے ذہن میں محفوظ نہیں تھی۔ وہ جہانگیر کو رجو کے نام سے مخاطب کر رہی تھی۔ یک بارگی خیال آیا کہ کہیں مجھے دھوکا تو نہیں ہوا ہے مگر اتنا بڑا دھوکا میری آنکھیں نہیں کھا سکتی تھیں۔ وہ یقیناً جہانگیر تھا۔ میرا چھوٹا بھائی۔ جب میں گھر سے نکلا تھا تو اس کی عمر آٹھ نو سال سے زیادہ نہیں تھی۔ یہ اسی کا چہرہ تھا۔ اب وہ بڑا ہو گیا تھا۔ سولہ سترہ سال کا دبلا پتلا لمبا سا لڑکا۔ اس کا قد میری طرح اٹھ رہا تھا لیکن اس کی آنکھیں ابھی تک پچکی ہوئی تھیں۔ وہ بے نیاز نظروں سے ہم دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ عورت اس کے برابر تپائی پر بیٹھی ہوئی اس کے کپڑوں سے گرد جھاڑ رہی تھی اور شکایت کر رہی تھی کہ وہ اسے اطلاع دیے بغیر گھر سے کیوں نکلا۔ "میں مولا اور اس کے حمایتیوں کو دیکھ لوں گی۔ دیکھ لینا وہ پھر کبھی اس گلی میں نظر نہیں آئیں گے۔" وہ بلند آواز سے کہہ رہی تھی۔ "تو مجھے نہیں جانتا ہے رجو! میں نواب بادشاہ سے کہہ دوں تو عمر بھر جیل میں سڑتا رہے۔ تم... تم نے اس بدمعاش کی بات پر کان ہی کیوں دھرے تھے۔ تم راستہ بدل لیتے یا سر جھکا کے چلے آتے۔"

"وہ خود ہی میرے سامنے آ گیا۔" جہانگیر نے شکستہ آواز میں کہا۔

"خیر اب کے وہ بچ کے نہیں جائے گا۔" عورت غصے سے بولی۔

میرا سر گھوم رہا تھا۔ جہانگیر کے ماتھے پر پتھر کا کونا لگ گیا تھا اور زخم کی پٹی بن گئی تھی۔ کمپونڈر مرہم پٹی سے فارغ ہو گیا تو عورت نے ریشمی رومال میں بندھے ہوئے پیسے نکالے مگر تجمل ڈاکٹر کو پہلے ہی فیس ادا کر چکا تھا۔ عورت کی آنکھیں ممنونیت سے چھلکنے لگیں۔ جہانگیر نے سرگوشی میں اسے بتا دیا تھا کہ ہمی دونوں نے درمیان میں پڑ کے معاملہ رفع دفع کرایا ہے۔ عورت نے لمبے لمبے لفظوں میں ہمارا شکریہ ادا کیا۔ جب وہ جہانگیر کو اپنے ساتھ لے جانے لگی تو میں نے تجمل کی طرف دیکھا۔ تجمل نے آنکھیں میچ لیں۔ چلتے وقت جہانگیر نے ہم دونوں کو سلام کرنے کے لیے ہاتھ اٹھایا۔ میں اسے گھورتا رہا۔ مطب کے اندر کئی مریض موجود تھے اور باہر ابھی تک گلی کے چند لڑکے کھڑے تھے۔ گلی میں آتے ہی عورت نے نقاب ڈال لیا اور اپنے دونوں آدمیوں کے ساتھ ایک طرف چل دی۔ جب وہ کچھ آگے بڑھ گئی تو ہم بھی کچھ فاصلے سے اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ میرے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ گلی میں خاصی چہل پہل تھی۔ تجمل ساتھ نہ ہوتا تو میں جہانگیر کو عورت کے ہاتھ سے ضرور چھین لیتا۔ کچھ دور جا کے جہانگیر نے پیچھے مڑ کے دیکھا اور عورت کو کوئی اشارہ کیا۔ عورت نے تیزی سے گردن گھمائی۔ پیچھے ہم آہستہ تھے۔ اس کی چال میں ذرا سی لرزش پیدا ہوئی مگر وہ جلد ہی سنبھل کے نپے تلے قدموں سے آگے بڑھتی رہی۔ اس کے بعد ان میں سے کسی نے منہ پھیر کے ہمیں دیکھنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ "کیا یہ وہی ہے؟" تجمل نے آہستگی سے پوچھا۔

"ہاں وہی۔" میں نے بے چینی سے کہا۔ "وہ جہانگیر ہے مگر اس کے ساتھ جو عورت ہے اسے میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔"

وہ چپ ہو گیا۔ عورت دوسری گلی میں مڑ گئی۔ ہم نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ اس علاقے میں چھوٹے بڑے نئے پرانے دو دو تین تین منزلہ مکانات تھے۔ جس گلی میں عورت داخل ہوئی تھی وہ زیادہ بڑی نہیں تھی۔ ہمارا اور اس کا فاصلہ بھی کم ہو گیا تھا۔ کوئی دو سو قدم چلنے کے بعد وہ ایک حویلی نما مکان کے پاس جا کے ٹھیر گئی۔ مکان کا رنگ روغن تازہ تھا۔ اوپر کی دونوں منزلوں پر شہ نشینیں بنی ہوئی تھیں۔ مکان کے آس پاس بھی کئی مکانات تھے جو تقریباً ایک ہی طرز کے تھے مگر گلی میں اس سے نمایاں کوئی اور مکان نہیں تھا۔ ہم دور ہی سے دروازہ دیکھ کے دوسری طرف نکل گئے۔ تجمل نے میری آستینوں میں اپنی انگلیاں پھنسا رکھی تھیں۔ میرے ہاتھ سر پر پڑے ہوئے تھے۔ تجمل مڑ کے پھر چوڑی گلی میں آ گیا اور جدھر جہانگیر کو ہم نے پہلی بار مولا سے دست بگریباں دیکھا تھا اس جگہ سے نزدیک ایک تنگ ہوٹل میں آ بیٹھا۔

ہوٹل ایک دکان میں واقع تھا۔ بیٹھنے کے لیے ادھر ادھر چٹائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ دیواریں کالی تھیں۔ دیگچوں کے پاس بیٹھے ہوئے ہوٹل کے آدمی نے ہمیں پہچان لیا اور مسکراہٹ کے ساتھ ہمارا استقبال کرتے ہوئے بیرے کو میز صاف کرنے کا حکم دیا۔ ہماری آمد پر ہوٹل میں بیٹھے ہوئے کئی لوگوں کی نگاہیں ہماری جانب اٹھنے لگیں۔ ممکن ہے ان میں سے بعض نے ہمیں کچھ دیر پہلے دیکھا ہو۔ "تم یہاں کیوں آ گئے؟" میں نے وحشت سے پوچھا۔

"ذرا دیر ٹھیرو۔" وہ درشتی سے بولا۔

"کہیں وہ پھر نہ نکل جائے۔"

"نہیں۔" تجمل اپنی انگلیاں چٹخاتے ہوئے بولا۔ "اتنی جلدی نہیں۔"

"تم نے اس عورت سے بات کیوں نہیں کی؟" میں نے مضطرب لہجے میں کہا۔

"لاڈلے آ وہ تنک کے بولا۔ "چین سے بیٹھا رہ۔"

شاید تجمل کو میرے یقین پر شبہ تھا۔ آٹھ سال سے زیادہ ہو گئے تھے لیکن گھر کے ایک ایک آدمی کا چہرہ میری آنکھوں میں نقش تھا۔ جیسے تو مجھ میں ہی بہت بڑی تبدیلی ہو گئی ہو گی اسی لیے جہانگیر مجھے نہیں پہچانا۔ اہر کش کا جتنا زمانہ میں نے اسے دیکھتے گزارا تھا، اتنا وقت اسے نہیں ملا تھا۔ وہ مجھے بھول سکتا تھا مگر میں اسے کیسے بھول جاتا۔ یہ وہی جہانگیر تھا جس کے کپڑے گندے ہو جاتے تھے تو میں انہیں بدل دیتا تھا۔ میں اکثر اسے اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلاتا تھا۔ وہ روز مجھے اپنا سبق سناتا تھا۔ جب بھی گلی میں نکل جاتا تو میں اس کے کان پکڑ کے اسے گھر واپس لاتا۔ وہ مجھ سے روٹھ جاتا تھا۔ امی سے وہ روز میری سختیوں کی شکایت کرتا تھا۔ جب کوئی گھر میں آئی تھی تو وہ بہت خوش تھا۔ ہر وقت اس کے گرد منڈلاتا رہتا تھا۔ مجھے یاد آیا، امی نے کہا تھا کہ وہ ہمیشہ کے لیے کوڑا کر اپنے گھر میں روک لے۔ اس نے کوا گوڑا بابا کی کا لقب دیا تھا۔ کبھی کبھی وہ اتنی ذہانت کی باتیں کرتا تھا کہ امی اور ابا جان دنگ رہ جاتے تھے۔ اسے یہاں اس بازار میں دیکھ کے میرے ذہن میں ہر لمحے ایک نیا وسوسہ اٹھ رہا تھا۔ تجمل کو علم نہیں تھا کہ مجھے ایک ایک پل کاٹنا دوبھر ہو رہا ہے۔ بیرا بالائی سے بھری ہوئی چائے کی پیالیاں میز پر رکھ گیا۔ میرا جی چاہا کہ میں پیالی تجمل کے منہ پر مار دوں۔ اسے اس وقت چائے کی طلب ہو رہی تھی۔

تجمل نے مجھ سے چائے پینے کے لیے اصرار نہیں کیا۔ میری چائے رکھے رکھے ٹھنڈی ہو گئی۔ تجمل نے دو تین گھونٹوں میں پیالی حلق میں انڈیل لی تھی۔ ابھی ہمیں بیٹھے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ سامنے کی تپائی سے ایک شخص سرکتا، جھجکتا ہمارے پاس آیا۔ "کیا پردیسی ہو حضرت؟" اس نے لفظ چباتے ہوئے کہا۔ تجمل نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اُن نے پہلے ہی جان لیا تھا کہ ہم پردیسی سیاں ہیں۔" وہ تیزی سے بولا: "لڑکا بابو کو۔ کیا یا حضرت! مولا بے ہوش کر کے دم لیا۔ اِدھر کسی میں اتنا زور نہیں تھا کہ بیپے شاہ کے مرغے پہ ہاتھ ڈالتا۔ زیور کی قسمت اچھی تھی کہ آپ لوگ وقت پر پہنچ گئے۔ ایک بات بولیں؟" وہ اپنا چہرہ ہمارے قریب کرتے ہوئے سرگوشی میں بولا: "آزو بازو سے ہوشیار رہنا۔ مولا نے کبیرے شاہ سے جا کے بولا ہوگا۔ بھروسا نہیں کہ کبیرا کلدار سمجھ کے جیب میں ڈالتا ہے۔"

"کلدار کا کیا مطلب ہے؟" عقیل نے بھاری آواز میں کہا۔

"کام کی بات کرتا ہوں سرکار! اِچھر میں اِدھر آ کے پھنس گیا ہوں۔ بیس سال اِدھر مغز مارتے ہوئے ہو گیا۔ یہ زبان سسرا یاروں سے چپک گیا ہے۔ مطلب صاف ہے۔ اِس طرف ٹک پوری سانپ کبیرے شاہ کا سکہ چلتا ہے۔ دال بھی نہیں چلتا۔ کلدار بھی نہیں چلتا۔" وہ اِدھر اُدھر دیکھ کے ہنس کر بولا۔ حیدرآباد میں ریاستی سکوں کو حالی اور انگریزی چھاپ کے سکوں کو کلدار کہتے تھے۔ دونوں سکے ایک ساتھ رائج تھے۔ ہمیں کلدار کہنے سے اُس کی مراد تھی کہ ہم ریاست سے باہر کے لوگ ہیں۔

"اور یہ لڑکا کون تھا؟" عقیل نے نرمی سے پوچھا۔

"یہ دیکھو تھا حضور نواب زادہ شرلی خانم کا بیٹا۔"

"شرلی خانم! نواب زادہ؟" عقیل اُلجھے ہوئے لہجے میں بولا۔

"ہاں شرلی خانم!" وہ اشتیاق سے بولا: "خانم کا نام اب شرلی خانم ہی پڑ گیا ہے۔ وہ کوئل کی طرح کوکتی ہے۔ نواب خانم اب بہادر نے اُسے شرلی خانم کا خطاب دیا تو یہی نام پڑ گیا۔ اب بس قسمت والوں ہی کو شرلی کے گلے کا جادو دیکھنے کو ملتا ہے۔"

"کیوں؟ کیا وہ محفل نہیں سجاتی؟"

"ہے ہے۔" وہ سینے پہ ہاتھ رکھ کے سرد آہ بھرتے ہوئے بولا: "تب سے اُس نے گانا بند کیا ہے اُدھر بازار اُجاڑ گیا ہے۔ اب وہ صرف دربار سرکار میں جا کے گاتی ہے۔ ہیں کیا بولوں ایک زمانہ تھا کہ دُور دُور سے لوگ اُس کا جلوہ دیکھنے اور اُس کی آواز کی شراب پینے آتے تھے۔ خانم نے کئی سال ہوئے اپنی دکان بند کر لی ہے۔ ایسی چلمن ڈال دی ہے کہ لوگ دیدار تک کو ترس جاتے ہیں۔ اب تو صرف نخرا اٹاری ہی رہ گیا ہے۔ خیر اب بھی لوگ ہیں۔" وہ کسمسا کے بولا: "بازار کبھی بند نہیں ہوتا۔ اِس پنجرے میں روز نیا نیا پنچھی آتا ہے۔ ابھی بولو حضرت! کہیں چلنا ہے؟" وہ زیرِ لب مسکراہٹ سے بولا: "آج کل تو بازار میں رونق آئی ہوئی ہے۔ کل ہی بنارس سے ایک نئی مینا آئی ہے۔"

"کیا یہ لڑکا واقعی خانم کا بیٹا ہے؟"

عقیل کے استفسار پر اُس نے منہ بنایا: "لوگ ایسا ہی بولتے ہیں۔ شرلی خانم بھی اُسے بیٹا ہی کہتی ہے۔ ابھی کوئی ڈیڑھ سال ہوئے بازار کے لوگوں نے اس لڑکے کو خانم کے ساتھ دیکھا تھا۔ ہوگا کسی نواب بکا کے نطفے سے۔ شرلی نواب سے کم کسی کو دن کو گھاس نہیں ڈالتی۔۔۔ صورت شکل سے بھی یہ تو نواب زادہ لگتا ہے۔ بچے کی ناک میں ہی رہتی ہے۔ کسی سے ملنا جلنا نہیں۔ زیادہ تر گھر میں پڑا رہتا ہے۔ خانم نے اُسے پڑھانے لکھانے کا بھی گھر ہی پہ انتظام کیا ہے۔ صبح ایک مولوی اور شام کو پتلون کوٹ پہنے ہوئے ایک عیسائی ماسٹر آتا ہے۔ عرصے سے خانم مہینوں مہینوں کے لیے بڑے بڑے راجوں مہاراجوں نوابوں کے بلاوے پر گانے کے لیے جاتی رہی ہے۔ وہیں کسی نواب سے آشنائی ہو گئی ہوگی۔ لوگ بولتے ہیں کہ شرلی نے اُسے اپنی ماں کے پاس بھوپال میں رکھا ہوا تھا۔ ماں مر گئی تو لڑکے کو پھر اِدھر اپنے پاس لے آئی۔ پہلے چھپاتی تھی اب اُسے چھپانے کی ضرورت نہیں۔ نواب بہادر کے ہاں سے اُسے اتنا مال جاتا ہے کہ کئی پشتیں چلا سکتی ہے۔ کچھ جڑی مار یہ بھی بولتے ہیں کہ خانم کی ہاتی جوانی نے انگڑائی لی ہے۔ لڑکے کو تیار کر رہی ہے۔ اندر کا حال نیلی چھتری والا جانتا ہے۔ لڑکے کی اٹھان۔۔۔"

"بس کرو۔" عقیل نے ترشی سے اُس کی بات کاٹ دی۔

"کیا حضرت!" وہ ناگواری سے بولا: "آپ ہی کی بات کا جواب بول رہا تھا۔"

"کیا خانم اکیلی رہتی ہے؟" میں نے اضطراب سے پوچھا۔

لیکن عقیل اُس کا جواب سننے سے پہلے ہی اُٹھ گیا تھا۔ اُس نے کرتے کے اندر بنڈی کی جیب سے دس روپے کا نوٹ نکال کے اُس شخص کی ہتھیلی پر رکھ دیا اور مٹھی بند کر دی۔ وہ آناً فاناً تیزی سے جھکیں بجانے لگا۔ اُس نے جھک کے دو مرتبہ ہمیں سلام کیا۔ ہم ہوٹل سے باہر آ گئے تو وہ بھی تیزی کے ساتھ ہمارے ساتھ ہو لیا۔ "کہیں چلیے گا نہیں؟" وہ مذبذب سے بولا۔

"نہیں۔" عقیل نے سر جھٹک کے انکار کر دیا۔

"پھر رات کو آئیے گا؟" وہ جھجکتے ہوئے بولا۔

"ہاں شاید آ جائیں۔"

"میں اسی ہوٹل کے آس پاس ملوں گا۔" اُس نے گردن خم کرتے ہوئے مدھم آواز میں کہا: "نہیں نظر آؤں تو خلیفہ جی کا پوچھ لیجیے گا۔ یہاں سب اسی نام سے پکارتے ہیں۔ شان میں حاضر ہو جاؤں گا۔ لطف نہ آ جائے تو گردن کٹا دیجیے گا۔ دیر تک یاد رکھیے گا کہ کسی نام خلیفہ جی سے ملاقات ہوئی تھی۔" وہ اسی طرح کی باتیں کرتا ہوا ہمارے ساتھ چلتا رہا اور ہم سے ہوٹل کا پتہ پوچھنے لگا۔ عقیل نے کچھ نہیں بتایا اور جب بڑی بے زاری کا اظہار کیا تو وہ واپس ہو گیا۔

ہم جب کی منڈی کے علاقے سے نکل آئے، اندھیرا چھا گیا تھا۔ بس اسٹینڈ پہ آتے آتے کھمبوں کی روشنیاں جل گئیں۔ عقیل کے کرتے کے دامن پہ جہاں گیر کے خون کے دھبے پڑے ہوئے تھے۔ اُس نے

کپڑے بدل لیے اور آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ میں اُس کی صورت دیکھتا اور اپنی بوٹیاں نوچتا رہا۔ لیٹتے وقت اُس نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ مجھے اب اپنے آپ سے ڈر لگ رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے میرا سارا جسم کچوکوں سے بنا ہوا ہے اور گھڑیاں چٹک رہی ہیں۔ خانم کے ہاں جانے میں عقیل کے پس و پیش کی وجہ اب کچھ کچھ میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ شاید عقیل میرا لحاظ کر رہا تھا کہ وہاں جانے کے بعد مجھے اور نہ جانے کیا کیا دیکھنا اور سننا پڑے۔ کچھ وقت گزر جائے گا تو سب کچھ دیکھنے اور سننے کے لیے میری آمادگی بڑھ جائے گی لیکن عقیل کو یقین نہیں رہا تھا کہ میرا سینہ بہت کشادہ ہے وہ سمجھے گا نہیں۔ ننھی کو بھری محفل میں سارنگیوں کے بیچ بیٹھے دیکھ کے بھی میری آنکھوں نے بینائی نہیں کھوئی تھی۔

کمرے میں عقیل کی گہری سانسوں کے سوا کوئی آواز نہیں تھی۔ ہمیں آئے ہوئے خاصی دیر ہو گئی تھی۔ جہاں گیر کا چہرہ بار بار میری آنکھوں کے سامنے آ جاتا تھا۔ وہ مجھ سے چند ہی پل دُور تھا۔ اتنے لمبے سفر کے بعد کہیں اُس کی صورت نظر آئی تھی جب پیروں میں گھٹے پڑ گئے تھے اور اُمید کے چراغ کی لَو دن بہ دن کم ہوتی جا رہی تھی۔ اب بھی مجھے اُس کی صرف ایک جھلک نصیب ہوئی تھی۔ میں اُسے اچھی طرح دیکھ بھی نہیں سکا تھا۔ عقیل وہاں سے واپس چلا آیا تھا اور اب دوبارہ جانا بھی ابھی نہیں معلوم ہوتا تھا۔ وہ پاؤں پھیلائے پلنگ پہ لیٹا ہوا تھا لیکن سو نہیں رہا تھا۔ بہت دیر بعد اُس نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور مجھے کرسی پہ بے حس و حرکت بیٹھا ہوا دیکھ کے کروٹ بدلنے لگا: "تو بھی کچھ کمر سیدھی کر لے۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ میں نے ہنکاری بھری۔ وہ تھکے ہوئے لہجے میں کہنے لگا: "کیا سوچ رہا ہے رے!"

"کیا سوچ سکتا ہوں؟" میں نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا: "کیا تمھیں اب بھی شبہ ہے کہ وہ جہاں گیر نہیں ہے؟"

"مجھے پہلے بھی شبہ نہیں تھا۔"

"تو پھر کیا ہے۔ تم وہاں سے واپس کیوں چلے آئے؟"

"اندھیرا ہو گیا تھا۔ اندھیرے میں وہاں جانا ٹھیک نہیں تھا۔"

"کیوں؟ کیا کوئی ہمیں روک لیتا؟"

"تیری تو مت ماری گئی ہے لاڈلے!" وہ اُٹھ کے بیٹھ گیا۔ "جہاں گیر ایک گھر میں رہتا ہے سڑک پہ نہیں۔ ہو سکتا ہے اس وقت خانم ملنے سے انکار کر دیتی اور اُسے معلوم ہوتا کہ ہم وہی لوگ ہیں جنھیں اُس نے تھوڑی دیر پہلے دیکھا تھا تو وہ شبہ کرتی۔"

"تو کیا ہوتا؟"

"کچھ نہ ہوتا یا بہت کچھ ہو بھی سکتا تھا۔"

"کیا ہو سکتا تھا؟ ہم بتا سکتے تھے کہ ہم جہاں گیر سے ملنے آئے ہیں۔"

"لاڈلے! تو اب بڑا ہو گیا ہے کیسی ننھی ننھی باتیں کرتا ہے۔" وہ جھنجھلا کے بولا: "ابھی ہمیں صرف اتنا پتہ چلا ہے کہ جہاں گیر خانم کے ہاں رہتا ہے اور تو نے خلیفے کی زبان سے سُن ہی لیا ہے کہ خانم اُس کا کتنا خیال رکھتی ہے۔ ہر آدمی زمین پہ اپنی جگہ گھیرتا ہے لاڈلے! کوئی بڑی کوئی چھوٹی۔ آدمی پیڑوں کی طرح ہوتے ہیں۔ بہتیروں کی جڑیں بہت پھیلی ہوتی ہیں کسی کی اوپر ہی اوپر ہوتی ہیں۔ پیڑ اکھاڑتے سمے پہلے اُس کی جڑوں کا دھیان رکھنا پڑتا ہے۔ ہمیں وہاں طریقے سے جانا چاہیے۔ پھر دوپہر میں ہمیں سوچ سمجھ کے کیا یہ ٹھیک ہوتا کہ ہم ایک دو گھنٹے بعد ہی وہاں چلے جاتے۔ خانم بازار میں بیٹھتی ہے۔ بازار کی عورت کی آنکھیں چار ہوتی ہیں۔ فرض کر خانم اُس وقت ملنے سے انکار کر دیتی تو کیا ہم چاقو نکال لیتے؟ پستول چلاتے؟ تماشا کرتے؟ کیا اس طرح جہاں گیر پہ اچھا اثر پڑتا؟ جو باتیں سامنے کی ہیں انھیں کیوں پوچھتا ہے۔ خانم کو شبے میں ڈالنے سے بات خراب ہو سکتی تھی۔ زبردستی ایک ایسی عورت کی۔ بازی نہیں ہونی چاہیے جس نے جہاں گیر کو پناہ دی ہے اور اُسے اپنے بیٹے کی طرح رکھتی ہے۔"

"کیا معلوم وہ کس طرح اُس کے پاس ہے۔"

"یہی بات تو میں تجھ سے کہنا چاہتا ہوں۔ ہمیں کچھ پتہ نہیں۔ پہلے ہمیں کچھ پتہ ہونا چاہیے۔ میں جہاں گیر سے ملنا چاہتا ہوں لیکن ہم وہاں جہاں گیر کے باہر نکلنے کی آس میں کھڑے نہیں رہ سکتے تھے۔ وہ جگہ دوسری ہے اور ہمارا مطلب کچھ اور ہے۔ اندھیرے میں اندھا ہی جا سکتا ہے۔ ابھی ہمیں نہ جانے اور کہاں کہاں جانا پڑے۔ وقت جیب میں رکھا ہوا نہیں ہوتا پیارے۔ جیب میں رکھے ہوئے پیسے سے زیادہ سنبھال سنبھال کے خرچ کرنا پڑتا ہے۔ مجھے پتہ ہے لاڈلے! تیرے دل پہ آری چل رہی ہے پر جانی! یہ آری تو جیتے جی چلتی ہے۔ ساری زندگی ایسا ہی ہوتا ہے۔ سکھ پل بھر سے زیادہ نہیں ہوتا اور زندگی بس پل پل بھر ہوتی ہے۔ کچھ سمجھ آئی تیرے دماغ کی انگیٹھی میں؟"

میں چپ رہا۔ کچھ ایسی ہی باتیں میرے ذہن میں بھی آئی تھیں لیکن میرا دل نہیں مانتا تھا۔ ہو سکتا ہے خانم نے جہاں گیر کو بہت کچھ بتایا ہو۔ مجھے اتی یاد آ رہی تھیں۔ اتی کی زندگی بہت بے کل ہوگی۔

"لیکن خانم کے دروازے پہ جانے کے بعد کل بھی یہی صورت پیش آئی تو؟۔۔۔" میں نے متفکر لہجے میں کہا۔

"شاید ایسا نہ ہو۔"

"فرض کرو ایسا ہی ہوا؟"

"تو پھر کچھ اور سوچیں گے۔"

"جو کل سوچنا ہے وہ ابھی کیوں نہیں سوچ لیتے؟"

"لاڈلے! کیا یہ کافی نہیں ہے کہ ہم نے جہاں گیر کو کھوج لیا ہے

اور بھی سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ اب ذرا سی مہلت دیں۔ جا کچھ آرام کر لے۔ کیا نہیں کھائے گا؟ مجھے تو بہت بھوک لگ رہی ہے۔"

"تم کھا لو۔" میں نے بیزاری سے کہا۔

"چھوڑو، پھر میں بھی نہیں کھاتا۔"

"میرا جی بالکل نہیں چاہ رہا۔"

❦

اُس نے چادر تان لی۔ رات آہستہ آہستہ گزرتی رہی۔ بہت دیر ہو گئی۔ اُس نے کروٹ نہیں بدلی۔ میں نے دروازہ کھول کے بیرے کو آواز دی اور اُس سے کھانا لانے کے لیے کہا۔ کھانا آگیا۔ میں نے اُسے اُٹھایا۔ وہ جاگ ہی رہا تھا۔ میں اُس کے ساتھ بیٹھ کے روٹی اپنے منہ میں ٹھونستا رہا۔ اُس نے نہاری کی پلیٹ میرے آگے کر دی۔ میں نے چند لقمے اُسے بھی حلق سے اُتار لیے۔ میری طرح وہ بھی ساری رات بستر پر کسمساتا رہا لیکن صبح کے قریب اُس کی آنکھ لگ گئی۔ تجمل نے میرے سوال کا صحیح جواب نہیں دیا تھا۔ یقیناً اُس کے ذہن میں کچھ اور اندیشے بھی پل رہے تھے۔ صبح ہوئی تو اس نے اُٹھنے میں دیر لگا دی حالانکہ روز وہ سویرے سویرے اُٹھ جاتا تھا۔ ہوٹل سے نکلتے نکلتے دھوپ چڑھ آئی۔ بس میں جانے کے بجائے اُس نے نامپلی سے محبوب کی مہندی کا طویل راستہ پیدل ہی طے کیا۔ ہم بازار میں داخل ہوئے تو دوپہر ہو چکی تھی۔ تجمل کا رخ خانم کے مکان کی جانب تھا۔ اس کی گلی میں پہنچتے ہی میرے پیروں میں لرزش ہونے لگی۔ سارا جسم پسینے میں نہا گیا۔ رگوں میں سنسنی سی بجلی سی دوڑنے لگی۔ تجمل کے اشارے پر میں نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے دروازے پر دستک دی اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ ممکن ہے اندر سے جہاں گیر برآمد ہو جائے لیکن وہ نہیں آیا۔ جس شخص نے دروازہ کھولا تھا وہ انھی میں سے ایک تھا جو کل خانم کے ساتھ دوا خانے آئے تھے۔ ہمیں دیکھ کے اُس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں پھیل گئیں۔ اُس نے متجسس انداز میں ہمیں سلام کیا۔ "خانم ہیں؟" تجمل نے بھاری آواز میں پوچھا۔

"خانم اپنے کمرے میں آرام کر رہی ہیں۔"

"اُن سے بولو کہ دو پردیسی ملنے آئے ہیں۔ کچھ کام ہے۔"

"لیکن خانم نے ملنا جلنا بند کر دیا ہے۔" اُس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"تم خانم کو جا کے بولو۔ ہم کو تمھیں سے جواب مت دو۔"

"آپ وہی لوگ ہیں نا جنھوں نے کل رجو میاں کی مدد کی تھی؟" اُس نے کسی قدر گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "آپ کو خانم سے کیا کام ہے جی؟"

"اُن سے بولو کہ ایک ضروری کام ہے۔ یہ اتفاق ہے کہ رجو میاں خانم کے بیٹے نکلے۔ اب وہ کیسے ہیں؟"

"اچھے ہیں۔ ہلکا سا بخار ہے۔"

"پھر ہم انھیں بھی دیکھ لیں گے۔ جاؤ، تم کھڑے کیوں ہو؟" تجمل نے ترشی سے کہا۔ "ہمیں اُمید ہے کہ تم جا کے بولو گے تو خانم ہم سے ضرور ملیں گی۔"

"مگر... مگر میں اُوپر جا کے کیا بتاؤں۔ خانم ناراض ہوتی ہیں۔ آپ کام بتا دیں۔ میں اُن سے جا کے بول دوں گا۔"

"کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے۔ ہم نے خانم کا بہت ذکر سنا ہے۔ کیا وہ پردیسیوں سے ملنے سے انکار کر دیں گی؟ ہم خانم کا زیادہ وقت نہیں لیں گے اور نہ ہم خانم سے کل رجو میاں کی مدد کرنے کی اُجرت لینے آئے ہیں۔ اس بات سے بے فکر رہو۔"

"اب خانم کہیں آتی جاتی نہیں ہیں۔ اگر ایسا کوئی کام ہے تو میں یہیں سے جواب دے دیتا ہوں۔ خانم صرف چند خاص جگہوں پر جاتی ہیں۔"

"ہم کو یہ جان کاری ہو گئی ہے۔ ہم خانم کو کہیں چلنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ تم بحث مت کرو۔ اُن سے جا کے بولو کہ ہم حیدرآباد آئے ہیں تو اُن سے ملے بغیر نہیں جائیں گے۔"

اُس کے ہونٹ پھڑک گئے۔ اُس نے کھڑے کھڑے کئی پہلو بدلے اور دروازہ بند کر کے اندر چلا گیا۔ ہم باہر انتظار کرتے رہے۔ میں نے تجمل کا بازو پکڑ لیا۔ مجھے چکر سا آ رہا تھا۔ تجمل میری کمر تھپکنے لگا۔ واپس آنے میں اُسے کئی منٹ لگ گئے۔ اُس نے اندر آنے کے لیے راستہ چھوڑ دیا اور ہمیں ڈیوڑھی سے ملحق ایک بڑے کمرے میں بٹھا دیا۔ مونڈھے پر بیٹھ کے میری سانس پھولنے لگی۔ یہ ایک بڑا کمرہ تھا۔ خانم کے آدمی نے روشن دان کھول دیے۔ کمرہ روشن ہو گیا۔ چھت اور دیواروں پر پچی کاری کی گئی تھی اور ان میں لگے ہوئے چھوٹے چھوٹے شیشے کے ٹکڑے روشنی میں چمکنے لگے تھے۔ سامنے ایک تخت پر قالین بچھا ہوا تھا اور گاؤ تکیے رکھے ہوئے تھے۔ باقی تین اطراف مونڈھے اور آرام کرسیاں تھیں۔ تخت کے اُوپر دیوار میں گھڑی نصب تھی۔ وہ ٹک ٹک کر رہی تھی۔ تجمل میرے برابر ہی بیٹھا تھا۔ "او لڑکے! چاہو تو باز آ۔" وہ سرگوشی میں بولا۔ "زبان اپنے منہ ہی میں رکھنا۔"

کوئی پندرہ منٹ بعد قریب ہی کہیں سے چوڑیاں بجنے کی آواز آئی۔ میں سنبھل کے بیٹھ گیا۔ چند لمحوں بعد تخت کے قریب کے دروازے سے خانم نمودار ہوئی۔ اُس کے پیچھے وہ آدمی بھی تھا۔ خانم نے گردن خم کر کے اور ہاتھ اٹھا کے آداب کیا۔ آج وہ کل سے بالکل بدلی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ سفید غرارہ اور نیلا قمیص پہنے ہوئے وہ کوئی ملکہ معلوم ہو رہی تھی۔ اُس کا سر ہرے دوپٹے سے ڈھکا ہوا تھا۔ کلائی چوڑیوں سے بھری ہوئی تھی۔ کانوں میں آویزے جھلک رہے تھے۔ وہ پاؤں لٹکا کے تخت پر بیٹھ گئی۔ اُس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اُس نے کئی بار ہم دونوں کو غور سے دیکھا اور اُس کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم پھیل گیا۔ "معاف کیجیے آپ کو زحمت ہوئی۔ کل میں رجو میاں کو دیکھ کے بہت پریشان ہو گئی تھی۔ آپ کا شکریہ بھی ٹھیک طرح ادا نہیں کر سکی۔ اگر آپ وقت پر نہ پہنچ جاتے تو اُس

کم بخت نے کسر کون سی چھوڑ دی تھی۔" وہ متانت سے بولی۔ اُس کی آواز بہت اچھی تھی۔

"ہم رجو میاں کا شکریہ وصول کرنے نہیں آئے۔" تجمل نے ٹھیری ہوئی آواز میں کہا۔ "اُس وقت رجو میاں کی جگہ کوئی اور ہوتا تب بھی شاید ہم یہی کرتے۔"

"اس محلے میں کوئی اور ایسا نہیں کرتا۔" خانم افسردگی سے بولی۔ "سالار جو سے خدا کی مار ہے۔ پہلے وہ یہیں میرے پاس ملازم تھا۔ بچپن ہی سے اُس نے عادتیں بگاڑ لیں۔ روز تنگ کرتا تھا۔ رجو میاں ہر وقت اُس کی شکایت کرنے کے میرے پاس آتے تھے۔ میں نے اُسے نکال دیا۔ اُس وقت سے وہ اور شیر ہو گیا۔ میں کبھی رجو میاں کو تنہا باہر نہیں بھیجتی تھی حالانکہ وہ اس بات سے بہت گھبراتے ہیں۔ کہتا ہے، آپا! میں بچہ تو نہیں ہوں۔ مجھے اکیلا جانے دیجیے۔ مگر یہ ماحول تو آپ جانتے ہی ہیں۔ میں بھی نہ جانے کس مجبوری میں یہاں ٹکی ہوئی ہوں۔ جلد ہی یہاں سے نکل جاؤں گی۔ لوگ چین نہیں لینے دیتے۔ مولا کو اس علاقے کے ایک بدمعاش شاہ کبیرا نے اپنے پاس رکھ لیا ہے۔ شاہ کبیرا بہت سنگ دل آدمی ہے۔ پہلے بھی وہ ایک بار مولا رجو کو پریشان کر چکا ہے۔ اس بار تو حد ہو گئی۔ اب میں آپ کو کیا بتاؤں۔ میں نے اپنے آپ کو اس چار دیواری میں بند کر لیا ہے۔ وہ ایک ہی جگہ آتا جاتا ہوتا ہے۔ شاہ کبیرا مجھ سے اس بات پر بدظن ہے کہ میں اس کے بلانے پر اُس کے گھر کیوں نہیں جاتی۔ میں نے کئی بار عاجزی سے کہا کہ مجھے اب معاف کرو لیکن یہاں اس علاقے میں شاہ کبیرا کا حکم چلتا ہے۔ وہ تو کچھ نواب بہادر کی بات ہے اور کچھ میں بھی ان لوگوں کا خیال رکھتی ہوں۔ بہت مشکل سے زندگی بسر ہو رہی ہے۔" وہ جھرجھری لے کے بولی۔ "معاف کیجیے میں نے ایک ساتھ اتنی باتیں کر لیں اور آپ سے کچھ پوچھا ہی نہیں۔ بس دل بھرا ہوا تھا۔ زبان نہیں رکی۔ ارے شجاعت میاں!" اُس نے اپنے ساتھ آنے والے آدمی کو مخاطب کیا۔ "کھڑے کھڑے کیا دیکھ رہے ہو۔ مہمانوں کے لیے کچھ چائے وغیرہ کا انتظام کرو۔ یہ تو کھانے کا وقت ہے۔ آپ لوگوں نے ابھی کھانا تو نہیں کھایا ہوگا؟"

"نہیں نہیں۔ کھانے وانے کا تکلف مت کرو، شریف خانم! ہاں چائے میں کوئی حرج نہیں ہے۔" تجمل نے نرمی سے کہا۔

شجاعت اُٹھنے لگا تو خانم کی آواز نے اُسے پھر روک لیا۔ "پان بھی لیتے آئیو اور ذرا ادھر شبنم سے کہہ دو کہ وہ رجو میاں کو دوا دے دے۔ وقت ہو گیا ہے۔"

شجاعت کو حکم دینے کے بعد وہ ہماری طرف متوجہ ہوئی لیکن اُس کے کچھ کہنے سے پہلے تجمل نے کہا۔ "کیا رجو میاں کی طبیعت زیادہ خراب ہے؟"

"نہیں خدا نخواستہ ایسی تو کوئی بات نہیں ہے مگر احتیاط بہتر ہے۔ اچھا ہے وہ تین خوراکیں پی لیں۔ یہ انگریزی دوا اثر بھی تیز کرتی ہے۔ کل تک اللہ نے چاہا تو بھلا چنگا ہو جائے گا۔"

"تم رجو میاں سے بہت پیار کرتی ہو۔"

"رجو میاں میری زندگی ہے۔" وہ خوابیدہ لہجے میں بولی۔ "اُن کے لیے میں نے اپنے آپ کو محدود کر لیا ہے۔ نواب بہادر کے بڑے احسانات ہیں اس لیے میں اُن کا کہنا نہیں ٹال سکتی۔ رجو میاں کے بعد مجھے کوئی شے عزیز ہے تو صرف موسیقی۔ میں اب بھی ریاض کرتی رہتی ہوں لیکن میں نے نواب بہادر سے کہہ دیا ہے کہ میری جائداد کا انتظام کر دیجیے۔ اب میں رجو میاں کو لے کے زیادہ دنوں تک اس ماحول میں نہیں رہ سکتی۔ وہ ٹال رہے ہیں۔ ایک دن ضرور آمادہ ہو جائیں گے۔ پھر مجھے کچھ سکون مل جائے گا۔"

"رجو میاں اچھا ہے.... تمھارا ہے....." تجمل نے جھجک کے کہا۔

"وہ میرا بیٹا ہے۔" خانم نے تیزی سے اُس کی بات مکمل کر دی۔ "مجھے آپا کہتا ہے۔ بہت اچھا لڑکا ہے۔ یوں تو اپنے بچوں کی سبھی تعریف کرتے ہیں۔"

"وہ بہت اچھا ہے اور بہادر بھی ہے۔ مولا اُس سے ڈیڑھ گنا ہے پر رجو خوب زور کر رہا تھا۔"

"جی کیا پوچھیے، بس جی ہی جی ہے۔ دھان پان ہے اور روز بروز بانس ہوتا جا رہا ہے۔ میں کہتی ہوں تم ذرا اپنی جان بناؤ۔ تب یہ داڑھی بھی اچھی لگے گی۔ مسکرا کے خاموش ہو جاتا ہے۔ کھانا تو بہت ہی کم کھاتا ہے۔ ہر وقت کچھ سوچتا رہتا ہے۔"

"کیا سوچتا رہتا ہے؟" تجمل نے تجسس سے پوچھا۔

"معلوم نہیں کن خیالوں میں گم رہتا ہے۔ میں ایک بار شملے گئی ہوں۔ سوچتی ہوں کچھ دنوں کے لیے اُسے وہیں لے جاؤں گی لیکن یہاں سے تو جان چھوٹے۔" وہ کچھ کھوئی کھوئی پھر چونک کر بولی۔ "اے میرا دماغ بھی ٹھکانے نہیں ہے۔ میں نے آپ سے پوچھا ہی نہیں کہ آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟"

"ہم کلکتے سے آئے ہیں۔" تجمل نے آہستگی سے جواب دیا۔

"کلکتے سے؟" اُس نے دہرایا۔ "کیسے کیسے زحمت کی؟"

"بس خانم تم سے ملنے چلے آئے۔" تجمل نے لمبی سانس کھینچتے ہوئے کہا۔ "تمھارا بہت چرچا سنا تھا۔"

"میرا کیا چرچا۔ رسوائی کا ذکر سنا ہوگا۔"

"رسوائی کیسی؟ ہم ان باتوں کو نہیں مانتے۔ جو جہاں ہے ضروری نہیں وہ وہاں کیوں ہے۔ خانم! تم بہت سمجھدار عورت ہو۔ تمھارے ذہن کی طرح تمھارا دل بھی صاف ہے۔ تمھیں دیکھ کے اور مل کے اچھا لگا۔"

"آپ کا حسن نظر ہے۔" خانم کی نظریں جھک گئیں۔ "مرے اس کا

وہ پٹا ڈھلک گیا تھا وہ اس نے فوراً درست کر لیا۔ "آپ لوگوں کا مشغلہ؟ یہاں کہاں قیام ہے؟ حیدرآباد کب آنا ہوا؟ مجھے بھی اتنی دیر بعد یہ باتیں سوجھ رہی ہیں۔"

"یہاں آئے ہوئے کئی دن ہو گئے۔ ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں اور رہا کام ۔۔۔ تو خانم کام نہ پوچھو تو بہتر ہے۔"

"کیوں؟ بھلا آپ ایسا کون سا کام کرتے ہیں؟"

"ابھی تو گلی گلی گھومنا ہی کام ہے۔"

"دنیا کی سیر کر رہے ہیں، سب سے خوب صورت کام ہے۔"

"ہاں دُنیا دیکھ رہے ہیں۔"

"یوں آپ کا مستقل مشغلہ؟ اگر بتانا مناسب سمجھیں؟"

"کیا بولیں۔ نہ پوچھو تو اچھا ہے۔ کبوتر اڑاتے ہیں۔ بازیاں کھیلتے ہیں زور آزمائی اپنا کام ہے۔ جہاں زبان کام نہیں کرتی وہاں ہتھیار چلاتے ہیں۔ بس یوں ہی اچھل کود کرتے کچھ کھیل کرتے رہتے ہیں۔"

"خوب، ضرور کوئی جاگیردار ہوں گے۔ آپ بہت بذلہ سنج ہیں۔ سب کچھ بتا کے بھی کچھ نہیں بتایا اور یہ آپ کے ساتھ کون صاحب ہیں؟"

"یہ میرا رجو ہے۔" جمّل نے میری کمر پر دھپ مارتے ہوئے کہا۔

"اچھا!" وہ کسی قدر تعجب سے بولی۔ "یعنی یہ آپ ۔۔۔۔ یہ آپ کے ۔۔۔"

"تم اسے یہاں میرے ساتھ دیکھ کے حیران ہو گی پر جو لوگ آگے پیچھے اور ایک راستے سے چھپ کے کہیں آتے ہیں، وہ ساتھ آتے ہیں تو

کیا بُرا ہے میرا اس کا معاملہ کچھ دوسرا ہے خانم!"

"جی -؟" خانم کی آنکھیں جلنے بجھنے لگیں۔

"اسے اچھی طرح دیکھو خانم! میں اسے تمہارے سپرد کرنے آیا ہوں۔"

"میرے سپرد کرنے؟"

"ہاں خانم! اسے بھی رجو میاں کی طرح سمجھو۔ ساری بات سمجھنے ہی کی ہوتی ہے۔ اس کی بہت سی عادتیں رجو میاں سے ملتی جلتی ہیں۔ یہ بھی الجھا الجھا رہتا ہے۔ ہر وقت سوچتا رہتا ہے۔ تم نے غور نہیں کیا کہ اس کی پیشانی اور آنکھیں رجو میاں سے کتنی ملتی ہیں۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" خانم نے مضطرب لہجے میں کہا۔

"میں کوئی بہت عجیب بات نہیں کہہ رہا ہوں۔ میں تمہارے رجو کے لیے ایک تحفہ لایا ہوں۔ وہ اسے دیکھ کر خوش ہو گا۔ یہ بھی رجو کے لیے کل سے مچل رہا تھا۔ یہ بھی اچھا لڑکا ہے۔ ذرا ضدی اور نٹ کھٹ ہے۔ غصہ جلدی آ جاتا ہے۔ یہ دونوں مل جائیں گے تو شاید ان کی تنہائی دور ہو جائے گی۔"

"بھلا میری سمجھ میں نہیں آیا کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"ان حالات میں، میں یہی بول سکتا ہوں خانم! میں نے اس پر بہت سوچا اور یہی فیصلہ ہوا کہ میں اپنے لاڈلے کو تمہارے سپرد کر دوں۔ جو ایک سے دو ہو جائیں گے۔ تمہارے دو جوان بیٹے۔ کیا یہ بات اچھی نہیں ہو گی؟ خانم! مجھے پتہ ہے کہ تم رجو کے لیے کیا کیا سوچتی ہو گی۔ اس کی خوشی کے لیے تم بڑے سے بڑا کام کر سکتی ہو۔ رجو میاں کو بھی بلاؤ اور پوچھ کر دیکھو کیا اسے یہ دوسرا بھائی پسند ہے؟ میرا خیال ہے وہ انکار نہیں کرے گا۔"

خانم کا چہرہ لال ہو گیا۔ "خدا کے لیے آپ صاف صاف بات کیجیے۔" وہ لرزیدہ آواز میں بولی۔ وہ کبھی مجھے تکتی تھی کبھی جمّل کو۔

"میں بہت صاف بات کر رہا ہوں خانم! اس میں کوئی لاگ لپیٹ چھل فریب نہیں ہے۔ میری بات پر یقین کرو۔ میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ میں اپنے اوسان میں ہوں۔ میں تم سے یہ نہیں بول رہا ہوں کہ تم رجو میاں کو میرے حوالے کر دو۔"

اتنے میں شجاعت رنگین خوان پوش سے ڈھکی ہوئی تھالی ہاتھوں میں اٹھائے ہوئے اندر آیا۔ اس نے تھالی خانم کے آگے رکھ دی۔ وہ ابھی کرسی پر بیٹھ بھی نہیں پایا تھا کہ خانم نے اُسے کمرے سے باہر جانے کا حکم دے دیا۔ شجاعت چلا گیا تو وہ سراسیمہ آواز میں بولی۔ "بے شک آپ یہ نہیں کہہ رہے ہیں مگر کوئی اس طرح کیسے کہہ سکتا اور کر سکتا ہے۔"

"جس طرح میں کہہ رہا ہوں اور کر رہا ہوں۔"

"معاف کیجیے۔" وہ ترشی سے بولی۔ "یہ دل آزاری ہے۔"

"نہیں خانم! ایسا مت بولو ایسا نہیں ہے۔ ہم کل رات بھی تمہارے پاس آ سکتے تھے پر نہیں آئے۔ مجھ کو ڈر تھا کہ اس وقت تم شاید نہ طوا ادھر الجھ کے کوئی ایسا قدم نہ اٹھا لو جو رجو میاں کے لیے ادھر اپنے لاڈلے کے لیے اور خود تمہارے لیے اور پریشانیاں کھڑی کر دے۔ ان معاملوں میں ایسی الجھنیں ہو جاتی ہیں۔ پھر اور میری کیا کوشش ہونی چاہیے تھی کہ مجھے تم سے بات کرنے اور تم کو سمجھانے کا موقع مل جائے۔ خانم! تم رجو میاں کو ہمیشہ دیواروں پردوں اور پنجرے میں بند نہیں رکھ سکتیں۔ تمہیں اپنے اوپر بھروسا ہونا چاہیے کہ تم نے رجو میاں سے جھوٹ نہیں بولا ہے۔ اس کو سچ ہی سچ دیا ہے۔ اب ایک اچھی صورت سامنے آئی ہے۔ ذرا سوچو، رجو میاں کتنے خوش ہوں گے اور اسے دیکھو، یہ اپنی ماں کا لال کتنا بے تاب ہے۔ رجو میاں شریف زادے ہیں۔ وہ اس عورت کو کیسے بھول سکتے ہیں جس نے اُن کے سکھ کے لیے اپنے سکھ چھوڑ دیے ۔۔۔۔ خانم! بھلا اس میں جھجکنے اور گھبرانے کی کیا بات ہے؟"

خانم کی آنکھیں ساکت ہو گئیں۔ اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔

"رجو میاں کو بلاؤ خانم! بلاؤ خانم! اُسے آواز دو۔" خانم نے اپنا چہرہ چھپا لیا اور سسکنے لگی۔

"میں تم سے رجو میاں کو لینے نہیں آیا ہوں۔" جمّل نے کہا۔ "میں نے پہلے بول دیا ہے۔ تمہیں پتہ نہیں ہم کہاں کہاں سے گھومتے ہوئے آئے ہیں کچھ میرے لاڈلے کا بھی خیال کرو۔ رجو میاں کی خاطر، اس کی خاطر تمہارے لیے یہ برات سے بڑی ہے۔"

"کیا ۔۔۔ کیا یہ رجو میاں کے؟ ۔۔۔" خانم گھٹی ہوئی آواز میں بولی۔

"ہاں خانم!"

"مگر ۔۔۔ مگر رجو میاں نے مجھے کبھی نہیں بتایا؟"

"یہ بھی کسی کو کچھ نہیں بتاتا تھا۔"

خانم کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ چند لمحوں تک خاموشی طاری رہی۔ خانم پتھر کی طرح گنگ ہو گئی تھی۔ جمّل کی آواز پر وہ جیسے سوتے سوتے چونک پڑی۔ "کیا سوچنے لگیں خانم؟"

"کچھ نہیں۔" وہ نڈھال انداز میں بولی۔

"کیا مجھے کچھ اور بولنے کی ضرورت ہے؟"

"نہیں نہیں۔" خانم نے روتے روتے کہا اور ایک دم تخت سے اٹھ گئی۔ اس نے دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھے اور بوجھل قدموں سے اندر چلی گئی۔ میری سانس سینے میں اٹکنے لگی اور آنکھوں کے سامنے دھند سی چھانے لگی۔ جمّل نے میرا سر پکڑ کے جھنجھوڑ دیا۔ خانم فوراً ہی واپس آگئی۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ جہاں گیر اس کے ساتھ نہیں تھا۔

"چائے بناؤ خانم!" جمّل نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

خانم نے بڑبڑا کے کسی معمول کی طرح تھالی سے سرپوش ہٹا لیا۔ اُس کی انگلیاں لرز رہی تھیں۔ اس نے پھلوں، خشک میووں اور نمکین چیزوں کی پلیٹیں ہمارے سامنے رکھ دیں اور چائے بنانے لگی۔ خانم شکر گھول رہی تھی۔ اندر سے دفعتاً کھٹ پٹ کی آواز آئی۔ میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ وہ جہاں گیر ہی تھا۔ وہ تیزی سے آ رہا تھا مگر ہمیں دیکھ کے ٹھٹک گیا۔ پھر اُس نے ہم دونوں کو سلام کیا اور خانم کے برابر تخت پر بیٹھ گیا۔ "کیوں آپی!" اُس نے تیز لہجے میں پوچھا۔ "آپ نے مجھے بلایا تھا؟"

"ہاں!" خانم نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "یہ صاحب تم سے بات کرنا چاہتے تھے۔" خانم نے نگاہیں اٹھا کے ہماری جانب اشارہ کیا۔

"اچھا!" وہ کچھ مضطرب سا ہو گیا۔ "مگر آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ آپ کچھ پریشان پریشان ہیں۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔" خانم نے مرتعش ہونٹوں سے مسکرانے کی کوشش کی۔ "تم مہمانوں سے بات کرو۔ دیکھو، یہ کہتے ہیں یہ تمہارے لیے ایک اچھی خبر لائے ہیں۔"

"کیسی خبر؟" وہ مچل کے بولا۔ "ضرور دلا کی بات ہو گی مگر آپی! میں اُس سے خود نمٹوں گا ورنہ ۔۔۔۔ ورنہ مجھے۔" وہ ہمیں دیکھ کے کچھ کہتے کہتے چپ ہو گیا اور چند ثانیے ٹھہر کے بولا۔ "مگر آپ کیا خبر لائے ہیں؟"

"خبر کیا، ہم تو تمہیں دیکھنے آئے تھے رجو میاں!" جمّل نے کہا۔ "اس سے ملو یہ لاڈلا ہے۔ میں تمہیں اس سے ملانے لایا تھا۔ کل جب سے اس نے تمہیں دیکھا ہے یہ تمہارا حال پوچھنے اور تمہیں دیکھنے کو کڑھ رہا تھا۔"

"اچھا!" وہ پٹ پٹاتی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگا۔ "میرا جی تو بھی ان سے ملنے کو چاہ رہا تھا۔ میری وجہ سے انہیں بہت تکلیف ہوئی۔ دلا نے ان کی کمر میں کئی بار زور سے مارا تھا اور اس نے آپ پر بھی ہاتھ اٹھایا تھا۔ میں نے آپی سے رات ہی کہا تھا۔ آپی افسوس کرتی رہیں۔ آپ کو کہیں چوٹ تو نہیں آئی؟"

"نہیں رجو! ایسے اپنے سالے گریبان رفو کیے ہوتے ہیں۔"

"ہاں۔" وہ حیرت سے بولا۔ "پھر آپ ہمیشہ اس طرح درمیان میں آ جاتے ہوں گے۔ کیا پہلے بھی آپ کو مولا جیسے لوگوں سے واسطہ پڑا ہے؟" جمّل آہستہ آہستہ سر ہلانے لگا۔ جہاں گیر جوشیلے لہجے میں بولا۔ "مگر مولا ذلیل ہے۔ وہ بدمعاش ہو گیا ہے۔ کسی دن میں اسے ۔۔۔ میں اسے ۔۔۔۔"

"جانے دو اس ذکر کو رجو میاں! اتنا غصہ نہیں ہوتے۔ اسے معاف کرو۔" جمّل کی آواز اس پر غالب آ گئی۔ "یہ بتاؤ کہ تمہارا پورا نام کیا ہے؟"

"پورا نام؟" وہ سٹ پٹا کے بولا۔ "ظفر علی۔"

مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا مگر جہاں گیر نے اپنا نام ظفر علی ہی بتایا تھا۔ میں نے بے چینی سے جمّل کو دیکھا۔ وہ پُر سکون تھا۔

"اور ابا کا نام؟" جمّل نے مسکرا کے پوچھا۔

"کیوں ۔۔۔؟" وہ تندی سے بولا۔ "یہ آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"یوں ہی۔ ممکن ہے وہ ہمارے کوئی جاننے والے ہوں۔"

"یہ آپ کیسے کہہ رہے ہیں؟"

"کیا تمہارے ابا سے ہماری جان پہچان نہیں ہو سکتی؟ ذرا بتاؤ تو۔"

"معظم علی۔" اُس نے تیزی سے کہا۔ میرا سر چکرانے لگا۔

"کیا کہا؟ مقصود علی؟" جمّل نے پوچھا۔

"جی ۔۔۔۔ جی نہیں۔" وہ حواس باختہ سا ہو گیا اور لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے بولا۔ "معظم علی۔ میں نے معظم علی کہا ہے۔"

"میں نے سن لیا ہے۔ کوئی بات نہیں۔" جمّل نے ہنس کے کہا اور میرا شانہ پکڑ کے بولا۔ "چلو بابر زماں خاں! یہ جہاں گیر نہیں ہیں۔ تو ظفر میاں ہیں۔"

جہاں گیر اچھل کے تخت سے کھڑا ہو گیا۔ "کیا یہ ۔۔۔۔ یہ بابر زماں خاں ہیں؟" اس کی آواز بھرا رہی تھی۔ وہ کسی [illegible] کی طرح مجھ پر جھپٹا اور میرے قریب آ کے مجھے گھورنے لگا۔ اُس کی

آنکھیں اُلٹ گئی تھیں، وہ بے چارا کٹ کے گرا ہی چاہتا تھا کہ میں نے بڑھ کے اُسے سنبھال لیا اور اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا۔ میرا سینہ گرجنے لگا۔ میں نے اپنے ہونٹ کاٹ لیے لیکن مجھے خود پہ اختیار نہیں رہا۔

پتہ نہیں کتنی دیر بعد خانم نے ہم دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کیا۔ جہاں گیر کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ وہ بُری طرح رو رہا تھا۔ کبھی میرے ہاتھ چومتا تھا کبھی انھیں آنکھوں سے لگاتا تھا۔ میں اُسے [illegible] رہا تھا۔ خانم ہماری کمر پہ ہاتھ رکھے ہوئے ہمیں تخت پہ لے آئی۔ اس نے اپنے دوپٹے سے میرا اور جہاں گیر کا چہرہ خشک کیا۔ جہاں گیر نے اس کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور زار و قطار رونے لگا۔ خانم اُسے سمجھانے لگی۔ اس نے ہم دونوں کو پانی پلایا اور ہمارے سرہانے بیٹھ کے خود بھی سسکنے لگی۔

تجمل اور خانم کی موجودگی میں جہاں گیر نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا اور نہ خود کچھ بتایا۔ وہ تو بار بار میری صورت دیکھتا اور سکتے میں رہ جاتا تھا۔ اُسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ میں ہوں۔ اس کی تصدیق کے لیے اچانک وہ میرے ہاتھ زور سے پکڑ لیتا اور میرے سینے سے چمٹ جاتا۔ جو اُس کا حال آج تھا وہ میرا کل سے تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں میں آنسو کب سے بند کر رکھے تھے۔ تمام رات بستر پہ کروٹیں بدلتا رہا تھا۔ تمام رات میں نے اُس کی آہٹیں محسوس کی تھیں۔ خانم ہمیں اوپری منزل کے ایک آراستہ کمرے میں لے آئی۔ اس نے شجاعت کو حکم دیا کہ وہ ہمارا سامان ہوٹل سے لے آئے۔ تجمل نے منع نہیں کیا۔ نہ جانے کس وقت خانم نے ڈھیر ساری مٹھائی منگوائی تھی۔ نیاز کے بعد اس نے ہم سب کا منہ میٹھا کرایا۔

خانم اور تجمل کمرے سے چلے گئے تو جہاں گیر میری صورت دیکھ کے پھر بلکنے لگا۔ میں نے اس کا سر اپنی گود میں چھپا لیا۔ اُسے چپ کرانے کی میں نے بہت کوشش کی مگر اس کے آنسو تھمتے ہی نہ تھے۔ "چپ ہو جاؤ بھیا! میں اب آ گیا ہوں۔" میں اُسے جتنا سمجھانے کی کوشش کرتا، اُس کی آنکھیں اتنی ہی اُمڈ آتی تھیں۔ اتنا تو مجھے پہلے ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ خانم کے ساتھ گھر میں اکیلا ہے۔ میرے ذہن میں اور بے شمار باتیں بھی منڈلا رہی تھیں مگر میں نے جہاں گیر سے کچھ پوچھنے کی جلدی نہیں کی کہ جوابات سے مجھے ڈر لگتا تھا۔ مجھے ڈر تھا اگر میں نے اُسے کریدا تو سب سے پہلے وہ مجھ سے پوچھے گا کہ میں ان سب کو چھوڑ کے گھر سے کیوں چلا گیا تھا۔ میں اُسے کیا بتاتا کہ وہ جو ایک خوف زدہ سی لڑکی اس رات گھر میں آ گری تھی وہ مجھے لے گئی تھی۔ وہ دور ڈھ کے کہیں بھی گئی تھی مجھے اکیلا چھوڑ گئی تھی۔ میں کسی کو کیا بتاتا کہ میں کہاں رہا۔ میں نے اتنے بہت سے دن کہاں گزارے۔ جہاں کسی کو [illegible] کے گھر سے نکلتا تو میری بات اس کی سمجھ میں نہ آتی۔

میرے کان بج گئے جب جہاں گیر نے ہچکیوں کے دوران میں خود ہی مجھے بتانا شروع کیا کہ اُس کے ساتھ کیا کچھ پیش آیا۔ وہ کوئی تین سال پہلے گھر والوں سے بچھڑ گیا تھا۔ ایک سال وہ شہروں شہروں گلی گلی انھیں ڈھونڈتا رہا۔ پھر اُس کے پیروں نے جواب دے دیا اور وہ بھوپال کے ایک نواب کے ہاں ملازم ہو گیا۔ نواب اُس کا خیال رکھتا تھا۔ وہیں خانم سے اس کی ملاقات ہوئی اور خانم نے اُسے نواب سے مانگ لیا۔ اس کے بعد وہ خانم کے ساتھ یہاں آ گیا۔ اس دوران میں بھی وہ مسلسل ابا جان کی تلاش میں لگا رہا مگر وہ اُسے کہیں نظر نہیں آئے۔ ابا جان نے اس کے گھر واپس آنے کا انتظار بھی نہیں کیا۔ وہ میرٹھ میں تھے کہ ایک دن جب وہ گھر کے کسی کام سے باہر نکلا تو شہر میں بلوہ ہو گیا۔ ہندو مسلم فساد ہو گیا۔ جہاں گیر کو گھر جانے کا راستہ نہیں ملا۔ پولیس نے تمام راستے بند کر دیے تھے۔ شہر میں گولیاں چل رہی تھیں اور چاقو گھونپے جا رہے تھے۔ جہاں گیر پولیس اور بلوائیوں سے بچتے بچاتے شہری حدود سے باہر آ گیا۔ وہاں سے اُسے ایک متعصب بلوائی پکڑ کر اپنے گھر لے گیا۔ اس نے جہاں گیر کو سخت اذیتیں پہنچائیں۔ اُسے تین دن تک بھوکا رکھا اور ننگا کر کے بید سے مارا۔ وہ اُسے مذہب بدلنے پر مجبور کرتا تھا مگر ایک دن جب اُس بلوائی کو پولیس پکڑ کے لے گئی تو جہاں گیر کو وہاں سے بھاگنے کا موقع مل گیا۔ اس اثنا میں ابا جان گھر چھوڑ کے جا چکے تھے۔ وہ محلے میں ہر ایک سے ان کا پتہ پوچھتا پھرا لیکن ابا جان محلے میں کسی سے ملتے ہی نہیں تھے۔ وہ انھیں پتہ بتا کے بھی نہیں گئے۔ انھوں نے سمجھ لیا ہوگا کہ جہاں گیر فسادات میں مارا گیا۔ ممکن ہے انھوں نے اُسے تلاش کیا ہو مگر جب اُس کا کوئی پتہ نہ چلا ہو تو مایوس ہو گئے ہوں۔ وہ کسی ایک جگہ نہیں ٹھہرتے تھے۔ تین مہینے اس شہر میں چار مہینے کسی اور شہر میں۔ میرٹھ میں آئے ہوئے انھیں دو مہینے سے زیادہ نہیں ہوئے تھے۔ جمن میں مولوی اکرم نے جو باتیں ابا جان کے متعلق بتائی تھیں جہاں گیر بھی وہی دہرا رہا تھا۔ ابا جان ایک کمرے میں بند ہو جاتے تھے اور دن بھر اخبارات پڑھتے یا کچھ لکھتے رہتے تھے۔ ان کے ارد گرد موٹی موٹی کتابیں پھیلی ہوئی تھیں۔ کھانے پینے کا انھیں کوئی ہوش نہیں تھا۔ گھر کا کوئی فرد اُن سے شکایت کرتا تو وہ ہمیشہ یہی کہتے کہ بس چند دنوں کی بات اور ہے پھر سارے دکھ دور ہو جائیں گے۔ ہم ایک محل بنائیں گے۔ [illegible] کی فتح ہوگی۔ ایک دن آئے گا کہ ہمیں دنیا میں کسی چیز کی کمی نہیں ہوگی۔ ابا جان رات گئے دیر سے کمرے سے نکلتے اور پلنگ پہ آ کے بھی بار بار گم سم رہتے یا بڑبڑاتے رہتے۔

جہاں گیر نے نیچی نظروں اور دبے دبے لہجے میں مجھے امّی کے گھر سے غائب ہو جانے کا واقعہ بھی بتایا۔ ابا جان اس کے بعد بہت چڑچڑے ہو گئے تھے۔ ہمیشہ فرخ، نرگس اور ندا کو جھڑکتے رہتے تھے۔ اکبر ان کے سامنے جاتے ہوئے ڈرتا تھا۔ انھوں نے اسکول کی کتابیں گھر میں لا کے رکھ دی تھیں اور کہا تھا کہ وہ خود پڑھایا کریں گے مگر انھیں کبھی فرصت نہیں ملی۔

پہلے تمی سب بہن بھائیوں کو پڑھاتی تھی۔ وہ چلی گئی تو یہ سلسلہ بھی بند ہو گیا۔ ابا جان کبھی کبھی گھر سے نکلتے تھے۔ واپس آتے تو اُن کے ساتھ کتابوں کا ڈھیر ہوتا۔ وہ کتابیں گھر میں اُن کے سوا کوئی نہیں پڑھ سکتا تھا۔ کبھی واپس آتے تو اُن کی جیب میں ایک بڑی رقم ہوتی۔ فرخ اور غزال [illegible] اُن سے کہتیں کہ پیسے ختم ہو گئے ہیں تو وہ کان دھرتے اور ایک پہر کے لیے گھر سے نکل جاتے۔ اُن کا خرچ بڑھ جاتا تھا [illegible] ہو جاتے تھے انھیں خبر ہی نہیں ہوتی تھی۔ گھر میں سب کو ہدایت تھی کہ گھر میں رہیں، پڑوسیوں سے میل جول نہ رکھا جائے۔ کوئی ملنے آئے تو اُسے دروازے ہی سے ٹال دیا جائے۔ انھوں نے فرخ، غزال اور ندا پہ کڑی پابندیاں عاید کر دی تھیں۔ جس محلے میں وہ رہتے، لوگ انھیں شک کی نظروں سے دیکھتے۔ کئی مرتبہ [illegible] کہ اب کے ابا جان باہر جائیں گے تو وہ [illegible] بچوں کا قضیہ ہو گئے نہ ابا جان ان میں سر کھپائیں گے مگر ابا جان کے خوف کی وجہ سے کوئی ایسا نہیں کر سکا۔ انھوں نے بہت دعائیں مانگیں۔ فرخ ہر نماز کے بعد دعا مانگتی تھی۔ اُس نے بہت سی منتیں بھی مان رکھی تھیں۔ ابا جان میں کوئی تبدیلی نہیں آئی بلکہ وہ روز بروز اور زیادہ مستغرق رہنے لگے۔ بار بار گھر اور شہر بدلنے کے سبب ان کے پاس سامان بھی بہت کم رہ گیا تھا۔ ابا جان کی رازداری کے خیال سے جہاں گیر نے خانم کو اپنا صحیح نام نہیں بتایا تھا۔ ابا جان کا نام بھی غلط بتایا تھا اور اپنے گھر سے بچھڑنے کی ایک فرضی داستان سنا دی تھی۔

جہاں گیر کہہ رہا تھا کہ وہ ان تین برسوں میں کبھی پوری نیند نہیں سویا۔ اُسے بُرے بُرے خواب آتے ہیں۔ راتوں کو وہ ہڑبڑا کے اٹھ جاتا ہے اور بلکنے لگتا ہے۔ اُسے معلوم تھا کہ شرفل خانم ایک طوائف ہے اور گانا سنانے کے لیے نواب صاحب کے ہاں مہمان ہے لیکن ایک خانم ہی تھی جس نے اس پر سب سے زیادہ توجہ دی۔ اس نے اس کے کپڑے بنوائے، ڈاکٹر سے علاج کرایا۔ وہ ہر وقت اس کا خیال رکھتی تھی اسی لیے وہ خانم کے ساتھ چلا آیا۔ اس کے کپڑے پھٹ گئے تھے اور جیب میں ایک کوڑی نہیں تھی۔ نواب صاحب کے ہاں سے اُسے کھانا مل جاتا تھا اور چار آنے روز۔ ان چار آنوں میں نہ تو وہ کہیں جا سکتا تھا، نہ [illegible] سکتا تھا اور نہ پڑھ سکتا تھا۔ اس نے پیسے جوڑ جوڑ کے رکھے۔ نواب صاحب کے بچے اُسے مارتے تھے۔ یہ سب خانم نے دیکھا تھا۔ جب خانم نے اُسے بلا کے اس کے بارے میں پوچھا تو وہ رونے لگا۔ خانم نے اُسے بہت پیار کیا اور اسی وقت کہا "اب تم میرے ساتھ چلو گے۔" جہاں گیر خانم کی باتیں کرتے نہیں تھکتا تھا جیسے میں اُسے ٹوکوں گا کہ وہ ایک طوائف کے ساتھ کیوں چلا آیا۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ تمی اُس کی بہن بھی ایک ناچنے گانے والی تھی اور اُس کا بڑا بھائی سات سال جیل میں گزار کے آیا تھا۔ اس نے کئی قتل کیے تھے۔ اُس نے کلکتے کے ایک بہت بڑے بدمعاش سرجمار کو ٹھکانے لگا دیا تھا اور کئی شہر کے کئی یاروں کا استاد رہ چکا ہے۔ اُس کی جیب میں ہمیشہ ایک چاقو ہوتا ہے۔ جہاں گیر والہانہ انداز میں خانم کا ذکر کر رہا تھا۔ شاید وہ غیر شعوری طور پر مجھے یہ جتانا چاہتا تھا کہ میری زبان سے خانم کے بارے میں کوئی ایسی ویسی بات نہ نکل جائے جس سے اس کی دل آزاری ہو۔ کوئی بات ایسی نہ ہو کہ خانم کے سامنے اُسے سر اٹھانے میں جھجک ہو۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اس نے کئی دفعہ یہاں سے بھاگنے کا ارادہ کیا مگر آپی کے خیال سے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔ نہ جانے آپی کیا سمجھیں۔ وہ بہت [illegible] کھانا پینا بند کر دیں گی۔ وہ آپی کی نظروں سے ذرا بھی دور ہو جائے تو وہ پریشان ہو جاتی ہیں۔ اگر وہ کہیں چلا گیا تو آپی زندہ نہیں رہیں گی۔ اُس نے آپی سے بہت سے وعدے کیے تھے اور آپی نے اس سے۔

جہاں گیر کہتا تھا کہ گھر میں کوئی دن بھی ایسا نہ آتا تھا جب میرا تذکرہ نہ ہوتا ہو۔ ابا جان نے تو میرے جانے کے چند دن بعد ہی بیزاری کا اظہار کر دیا تھا۔ کچھ دن اور گزر گئے اور میں گھر واپس نہیں پہنچا تو انھوں نے اعلان کر دیا کہ میں مر چکا ہوں، زندہ ہوتا تو ضرور واپس آ جاتا۔ ابا جان کا خیال تھا کہ میں جس لڑکی کے ساتھ گھر سے نکلا ہوں اُس کے اعزہ نے پکڑ لیے ہوں گے اور اس کے ڈھونڈنے والوں نے مجھے مار ڈالا ہوگا۔ وہ بتا رہا تھا کہ میرے جانے سے امی کا بُرا حال تھا۔ وہ ابا سے جھگڑتی رہتی تھیں۔ پھر ابا کتابوں میں گم ہو گئے اور انھوں نے گھر میں دلچسپی لینا کم کر دیا۔ امی ہر وقت اُن سے کہتی تھیں کہ وہ گھر کی [illegible] دیں اور میری تلاش کے لیے دوڑ دھوپ کریں مگر ابا جان کچھ دن تک تو مجھے ادھر ادھر ڈھونڈتے رہے پھر گھر میں بند ہو گئے۔ انھوں نے رشتے داروں سے ملنا بھی منقطع کر دیا۔ امی کی صحت گرتی گئی۔ وہ بہت دُبلی ہو گئی تھیں۔ ہر وقت مجھے یاد کرتی رہتی تھیں اور آسمان کی طرف تکتی رہتی تھیں۔ ساری ساری رات وظیفے پڑھتی تھیں۔ انھیں یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن میں ضرور واپس آ جاؤں گا۔ پھر وہ ایسی بیمار پڑیں کہ پلنگ سے نہیں اٹھیں۔ آخری وقت بھی اُن کی زبان پہ میرا ہی نام تھا۔ کہتی تھیں کہ وہ آئے تو کہنا تیری ماں نے بہت انتظار کیا۔ امی کی موت کے چند روز کے اندر اندر ابا جان نے زمینیں بیچ دیں، چپ چاپ گھر کا سامان لیا۔

میں نے جہاں گیر کو روکا نہیں تاکہ جتنے طعنے دینے ہوں وہ ایک ہی بار دے لے۔ میں نے درمیان میں ایک بات بھی نہیں پوچھی۔ وہ خود ہی سب کچھ کہتا اور سینہ خالی کرتا رہا۔ امی کے ذکر پہ اُس کی آواز حلق میں پھنس گئی۔ کہنے لگا۔ "مجھے خوب یاد ہے امی نے آخری وقت میرا ہاتھ تھام کے کہا تھا کہ جب تک تیرا بڑا بھائی واپس نہیں آتا تُو اپنے آپ کو اس گھر کا بڑا سمجھنا۔ میں یہ سارا گھر تجھ پہ چھوڑے جا رہی ہوں۔ امی نے سب کو تاکید کی تھی کہ اپنے باپ کا خیال رکھیں اور بھائی کو تلاش کرتے رہیں۔ ایک نہ ایک دن وہ ضرور مل جائے گا۔ وہ نہ آئے تو اُسے اپنی امی کا واسطہ دینا وہ گھر

ہی روٹھا ہوا ہو، واپس آ جائے گا اور اس کے ساتھ وہ لڑکی ہو تو اُسے عزت سے گھر لانا۔ امی نے تم سے بھی کہا تھا کہ وہ اب اس گھر کی مالک ہیں سب کچھ ہے۔ نہ تم نے امی کی بات پوری کر سکی نہ میں۔" جہاں گیر کہہ رہا تھا۔ "پتہ نہیں اب وہ سب کہاں اور کس حال میں ہوں۔ اگر وہ ہوتے چھوٹا، اپنے گھر کو سیدھا کون لاتا ہوگا؟"

معلوم نہیں جہاں گیر نے اور کیا کیا کہا اور کتنے طمانچے مارے۔ میرے اعصاب شل ہو گئے تھے۔ شاید اس کی آواز میں بھی دم نہیں رہا تھا۔ وہ چپ ہو گیا اور میری صورت دیکھنے لگا۔ میری آنکھیں چھلک رہی تھیں اور جسم تھرتھرا رہا تھا۔ "بھائی جان! آپ کہاں چلے گئے تھے؟" وہ سسکتے ہوئے بولا۔ میں نے اُسے جواب نہیں دیا۔ وہ مجھے جھنجوڑنے لگا۔ "آپ کہیں روٹھ گئے تھے؟"

"مت پوچھ منے!" میں نے اس سے فریاد کی۔ "کچھ نہ پوچھ" کہ کہاں رہتے ہیں میں گیا تھا۔ میں دوبارہ زندہ ہوا ہوں۔"

جہاں گیر خاموش ہو گیا لیکن چند ہی لمحوں بعد سے ہونٹ ہلے میں بولا "ایک بات بتائیے۔ وہ کہاں ہیں؟"

"وہ نہیں ہے۔" میں نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ "وہ کھو گئی۔"

"کھو گئیں؟ کہاں؟"

"مجھے کچھ نہیں معلوم منے! چپ ہو جا۔"

اس نے پھر مجھے تنگ نہیں کیا۔ اپنی زبان سی لی۔ کمرے میں اندھیرا چھا گیا تھا۔ ہم دونوں دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ جہاں گیر نے اپنا سر میرے شانے پر ٹکا دیا تھا۔ خانم نے کمرے میں آ کے روشنی کی لو ہمیں اُٹھا کے کمرے سے باہر لے گئی۔

3

باہر کے کسی مکان سے گانے کی آواز آ رہی تھی۔ ڈھولک نغمے گھنگرو بجنے لگے تھے اور طبلے کی تھاپ تیز ہو جاتی تھی۔ خانم کو اس کا احساس ہوا تو اس نے کھڑکی بند کر دی۔ ہم سب اوپری منزل کے صحن میں بیٹھے تھے۔ وہاں کئی گملے رکھے ہوئے تھے۔ ایک چھوٹا سا باغیچہ سا تھا۔ سائبان کے کھمبوں پر بیلیں چڑھی ہوئی تھیں اور رات کی رانی کی خوشبو سے فضا مہکی ہوئی تھی۔ ایک بوڑھی اور ایک نوجوان خادمہ سامنے چوکی پر بیٹھی ہوئی دستر خوان پر کھانا لگا رہی تھیں۔ طرح طرح کے کھانے۔ جہاں گیر کا چہرہ آنسوؤں سے دھل سا گیا تھا جیسے کئی دنوں کی بارش کے بعد دھوپ نکلے۔ خانم نے لباس تبدیل کر لیا تھا۔ وہ نارنجی ساڑھی میں ملبوس تھی اور خوش خوش نظر آ رہی تھی۔ خادماؤں کو ہدایت دینے کے کام سے فارغ ہو کے وہ میرے پاس آ بیٹھی اور بچے جہاں گیر کی باتیں کرنے لگی۔ وہ مجھے بتا رہی تھی کہ اب جہاں گیر کی صحت بہت ٹھیک ہے۔ پہلے تو اس کی ہڈیاں ہی ہڈیاں نظر آتی تھیں۔ اس نے اُسے شہر کے سب سے بڑے ڈاکٹر، ڈاکٹر برہان کو دکھایا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ اگر وہ کچھ اور دیر سے آتی تو جہاں گیر کے دق ہونے کا اندیشہ تھا۔

مجھ سے اس کا شکریہ ادا نہیں کیا جا سکا۔ میری زبان سے ایک لفظ بھی نہیں پھوٹا تھا۔ جب ہم کھانا کھانے کے لیے چوکی پر آئے تو وہ سمجھی کہ میں تکلف کر رہا ہوں۔ اس نے خلوص سے میری شکایت کی۔ "ہاتھ کیوں روک لیے؟" وہ بڑی بی سے بولا۔

"ہاں! بھائی جان!" جہاں گیر چہک کے بولا "میٹھے چاول کھائیے۔ آپ کو میٹھے چاول بہت پسند ہیں نا!"

اُسے اب تک یاد تھا۔ امی میرے لیے بطور خاص میٹھے چاول پکاتی تھیں۔ ممکن ہے خانم نے اُسے بتایا ہو۔ خانم نے چاولوں کی تھال میرے آگے کر دی۔ میرے حلق میں لقمے اٹک رہے تھے اور مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے امی آج ہی مری ہیں اور یہ اُن کی موت کا کھانا ہے۔

کھانے کے بعد خانم نے ہمیں تھوڑا بہلایا اور رات گئے تک وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی۔ شہر میں اچھے گھریلو ملازموں کا قحط۔ ملازموں کے سلسلے میں اپنے تجربے۔ اُسے شکایت تھی کہ وفاداری اٹھ گئی ہے اور لوگ بہت مطلبی ہو گئے ہیں۔ اس نے میرا پلنگ بھی جہاں گیر کے کمرے میں بچھوایا تھا لیکن جہاں گیر میرے پلنگ پر آ کے اور مجھ سے چمٹ کے لیٹ گیا۔ خانم شاید روزانہ اس کی پیشانی پر بوسہ دے کے رخصت ہوتی تھی۔ شب بخیر کہتے وقت اس نے جہاں گیر کے ساتھ میری پیشانی پر بھی اپنے ہونٹ ثبت کیے اور مسکراتی ہوئی اوجھل ہو گئی۔ آدھی رات تک جہاں گیر نرالے لہجے میں مجھے گھر کی باتیں سناتا رہا۔ پھر میرے بازو پر سر رکھ کے سو گیا۔ میں اس کے بال سنوارتا اور اس کا چہرہ تکتا رہا۔ وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ بالکل آٹھ سال پہلے کے منے کی طرح۔ میں نے اس کے بہت سے پیار لیے۔ مجھے یاد تھا کہ وہ سوتے میں ٹانگیں بہت مارتا تھا۔ جب وہ ایسا کرتا تو میں غصے سے اُسے اٹھا کے امی کی چارپائی پر ڈال دیا کرتا۔ اب بھی وہ ٹانگیں چلا رہا تھا۔ میں نے اپنا رُخ بدل لیا۔ اس کی ٹھوکریں میرے منہ پر بھی لگنی چاہیے تھیں۔

ابھی میری گہری اندھیری ہی طاری تھی کہ مجھے دروازے پر دستک کا احساس ہوا۔ میں یوں ہی آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔ پہلے تو میں سوچتا رہا کہ اس وقت کون ہو سکتا ہے۔ جب تیسری بار بھی دستک ہوئی میں نے اٹھ کے دروازہ کھول دیا۔ وہاں خانم موجود تھی۔ "کیا وہ جاگ گیا ہے؟" اس نے آہستگی سے پوچھا۔

"نہیں وہ سو رہا ہے۔" میں نے تذبذب سے جواب دیا۔

وہ سیدھی کمرے میں چلی آئی اور جہاں گیر کے سرہانے بیٹھ کے اس کے گال تھپ تھپانے لگی۔ جہاں گیر فوراً ہی اٹھ گیا۔ "آپی! آج تو نیند آ رہی ہے۔" اس نے خانم کے گلے میں بانہیں ڈال کے کسمساتے ہوئے کہا۔

"نہیں! بالکل نہیں۔ شجاعت اٹھ چکا ہے۔ بستر چھوڑو گے تو نیند بھاگ جائے گی۔ بس جلدی سے تیار ہو جاؤ۔" خانم نے اس کے بازو ہلاتے ہوئے

اُسے بستر سے اُٹھنے پر مجبور کر دیا۔ وہ پوری طرح بیدار ہو گیا تو خانم چلی گئی۔ جہاں گیر نے مجھے جاگتا دیکھ کے سو جانے کا مشورہ دیا اور کہا کہ وہ ایک دو گھنٹے بعد واپس آ جائے گا۔ اس نے بتایا کہ وہ روز صبح کسی ملازم کے ساتھ چہل قدمی کے لیے جاتا ہے۔ جب وہ منہ دھو کے باہر آیا تو میں بھی تیار ہو گیا تھا۔ میں نے شجاعت کو منع کر دیا اور اُسے اپنے ساتھ لے کے گھر سے نکل گیا۔ ہم پیدل چلتے جامع مسجد تک آ گئے۔ اس کے پہلو بہ پہلو چلتے ہوئے مجھے اپنا قد بڑا اور وزن زیادہ محسوس ہو رہا تھا جیسے میں ایک دن ہی میں بہت بڑا ہو گیا ہوں۔ راستے میں جہاں گیر مجھے عمارتوں اور راستوں کے بارے میں بتاتا جا رہا تھا۔ "یہ خلوت مبارک ہے۔ یہ پختہ مسجد ہے۔ وہ سامنے چوک کمان ہے اور شفا خانہ ذکریا ہے۔" میں ان راستوں سے پہلے بھی گزر چکا تھا لیکن میں نے اس کے سامنے اپنی معلومات کا اظہار نہیں کیا۔ جیل سے چھوٹنے کے کچھ دنوں بعد ہی میں مولوی محمد شفیق کی تلاش میں یہاں آیا تھا اور میں نے کوئی گلی نہیں چھوڑی تھی۔ اخبار میں اشتہار بھی چھپوایا تھا۔ اس وقت بھی جہاں گیر یہیں ہوگا۔ کاش وہ مجھے اس وقت نظر آ جاتا۔ مگر میں ہر گھر میں گھس کے تو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ایسے ہی کسی گھر میں کہ امی چھپی ہوئی ہوں گی۔ باہر سے کسی کو کیا خبر ہو سکتی ہے کہ اندر کون ہو سکتا ہے۔ میں نے جتنی چند کی تمام بستیوں میں انہیں پوچھ لیا تھا۔ ممکن ہے امی جان کی طرح اور مولوی صاحب نے بھی اپنا نام تبدیل کر لیا ہو اور وہ خود بھی نہ چاہتے ہوں کہ کوئی تلاش کرتا ہوا اُن تک پہنچ جائے۔ ممکن ہے آپا جان کی طرح مولوی صاحب نے بھی مجھے مرا ہوا سمجھ لیا ہو اور کسی کو بھی یہ باور کرا دیا ہو مگر پھر کیا وہ زندہ رہی ہوں گی۔ جس طرح امی جان مر گئیں وہ بھی...... وہ بھی، "نہیں نہیں۔" میں نے اپنا منہ کھسوٹ لیا۔ مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ جہاں گیر بھی میرے ساتھ ہے اور میں سڑک پر چل رہا ہوں۔ وہ پریشان ہو گیا اور حیرانی سے پوچھنے لگا کہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔

میری حالت اُسے مطمئن نہیں کر سکی۔ وہ زیادہ مضطرب ہو گیا اور گھر واپس چلنے پر اصرار کرنے لگا۔ اس نے خانم کو شبہ کیا کہ اب وہ اپنی صبح کی ریاضت سے فارغ ہو گئی ہو گی اور ہماری راہ تک رہی ہو گی۔ لیکن ابھی اندھیرا چھٹ گیا تھا اور ہمیں واپس ہو جانا چاہیے تھا۔ محبوب کی مہندی کے علاقے میں پہنچتے پہنچتے اکا دکا دکانیں کھل گئی تھیں۔ خانم ناشتے پر ہمارا انتظار کر رہی تھی اور بیٹھک میں فضل گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے اس طرح تخت پر بیٹھا تھا جیسے اُسے یہاں آئے ہوئے بہت دن گزر گئے ہیں۔ مجھے حیرت ہوئی۔ خانم نے فضل کے لیے ناشتے کا اہتمام بھی کر رکھا تھا۔ یقیناً فضل وہاں پہلے سے موجود ہوگا۔ گھر کا کوئی ملازم شوق کرتا ہوگا۔ معلوم ہوا کہ خانم نے ہماری خوشی میں دو بکرے ذبح کرائے ہیں۔ دھوپ چڑھی اور اتر گئی۔ فضل دن بھر گھر ہی میں پڑا رہا۔ شام کو کہیں وہ باہر نکلا۔ اس نے جہاں گیر کو بھی ساتھ لے لیا۔ میرا خیال تھا کہ گھر سے باہر آنے میں اس کا کوئی مقصد ہوگا مگر وہ جہاں گیر کا ہاتھ تھامے شہر کے خوب صورت علاقے عابد شاپ روڈ، باغ عامہ کا ایک طویل چکر کاٹ کے لوٹ آئے۔ ایک مدراسی ہندو کی دکان سے چاٹ مسالا لے کے گھر آیا۔

خانم کے ہاں خیر سے مجھے کئی ہفتے گزر گئے۔ اس دوران میں ایک رات نواب عالم جاہ نے اُسے اپنے محل طلب کیا۔ خانم نے معذرت کر لی کہ اس کے ہاں مہمان آئے ہوئے ہیں۔ شجاعت کا کہنا تھا کہ خانم نے نواب صاحب کے ہاں جانے سے پہلو تہی کیا ہے۔ صبح جب ہم گلیوں سے گزرتے تھے تو چھجوں، کھڑکیوں اور نشستوں پہ بیٹھی ہوئی عورتیں ایک دوسرے کو اشارے کرتی تھیں۔ ان سے کئی عورتوں کی خانم کے ہاں آمد و رفت تھی اور جہاں گیر بھی ان سے خوب واقف تھا۔ وہ آتے جاتے ہوئے انھیں سلام کرتا تو وہ مسکرا کے جواب دیتیں۔ کچھ دعائیں دیتیں اور کچھ اس سے اپنے گھروں میں آنے کے لیے اصرار کرتیں۔ بازار کے بہت سے لوگ بھی جہاں گیر کو پہچانتے تھے اور اس کے سلام کا جواب نہایت گرم جوشی سے دیتے تھے۔ رات گلیوں میں دن کا سا ہو جاتا تھا۔ گلیاں پھولوں سے مہک جاتی تھیں۔ طرح طرح کے رنگ برنگے کپڑے بدل لیتی تھیں۔ اُن کے کپڑوں میں مہکتے ہوئے عطر میں مہکتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے رنگینی آنگن کے جنوں سے چھوٹ رہی ہو۔ اُن کے لبوں پر اور آنکھوں میں مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ رات کو ہم باہر نکلنے سے پرہیز کرنے لگے۔ میں نے شجاعت سے نہیں پوچھا کہ اب اس کا ارادہ کیا ہے۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ اس سلسلے میں خود بھی سوچ رہا ہوگا مگر اس کا کچھ پتہ ہی نہیں چلتا تھا۔ میں جہاں گیر کو جلد سے جلد یہاں سے لے جانا چاہتا تھا مگر خانم کے خیال سے میری زبان نہیں کھلتی تھی۔ یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اُسے لے کے کہاں جاؤں گا۔

ایک دن تمام گھر والوں کے وقت فضل نے ہمارا راستہ روک لیا۔ اس نے جہاں گیر کے سامنے اونچی آواز میں باتیں شروع کر دیں۔ "کیوں حضرت! آپ نے تو بالا ہی بالا کام کر لیا؟" اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا اور آنکھ مار کے بولا۔ "کیسا منتر پھونکا تھا یار؟ گر بتلاؤ نا! ادھر ہم بے کار کی ٹکریں مار کے بھاگ گئے ہیں۔" فضل نے جب تک اس کی تسلی نہ ہو گئی، چپ نہیں ہوا۔ اس کی زبان کو تالا نہیں لگتا تھا۔ بڑی اس کے ساتھ کھل کھلاتے رہے اور اس کی معنی خیز نظروں سے وہ دیر تک ہمارا تعاقب کرتا رہا۔ اُسے زیادہ باتیں کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس کی ان اشتیاق بھری باتوں سے ظاہر تھا کہ بازار میں خانم کے اجنبی مہمان کے متعلق حیرانی ہے۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ اب میں صبح کے سوا باہر نہیں نکلا کروں گا۔ صبح بازار میں بہت سکون ہوتا تھا۔ گلیاں تو زیادہ سنسان پڑی رہتی تھیں مگر فضل نے آنا جانا بند نہیں کیا۔ وہ جہاں گیر کو لے کے کسی وقت بھی گھر سے نکل پڑتا تھا۔ مجبوراً مجھے بھی اس کے ساتھ جانا پڑتا۔ گھر سے باہر نکلنے

کے لیے ان گلیوں کے سوا کوئی اور راستہ بھی نہیں تھا۔

وہاں میں خانم کے ہاں کئی لڑکیاں آتی تھیں۔ جہاں گیر نے مجھے بتایا تھا کہ خانم ان لڑکیوں کو گانے کا ریاض کراتی ہے۔ جب سے ہم آئے تھے خانم نے یہ سلسلہ بھی بند کر دیا تھا۔ لڑکیاں اب بھی آتی تھیں مگر وہ دن بھر گھر کے کاموں میں لگی رہتیں یا ایک کمرے میں بند ہو کے خود ہی مشق کیا کرتیں۔ ایک لڑکی کا نام نیساں تھا۔ وہ دن بھر ہماری خاطروں میں لگی رہتی۔ اُس کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ رنگ کھلتا تھا۔ چھوٹے چھوٹے دانت تھے۔ وہ ہر لمحے اس طرح شرماتے اور بدن چراتے ہوئے لٹکراتی تھی جیسے اس کی کوئی چوری پکڑی گئی ہو یا جیسے کسی نے اُسے گدگدی کر دی ہو یا کسی نے اُس کے کان میں کوئی بے حجاب بات کر دی ہو۔ چھوٹے بالوں کی چوٹیاں اُس کے شانوں پہ لہراتی رہتی تھیں۔ اُس کا قد بڑا تھا نہ چھوٹا۔ وہ بہت شائستہ تھی۔ جب وہ گھر آتی تو سب سے پہلے جھجل کو تسلیمات کرتی، پھر خانم کو، پھر مجھے، پھر جہاں گیر کو۔ شام کو وہ اپنے گھر چلی جاتی۔ اس کے جانے کے بعد گھر میں ایک کمی سی محسوس ہوتی تھی۔ کئی بار میرے جی میں آئی کہ نیساں سے بات کروں۔ کیا وہ بھی کچھ اور بڑی ہو کے اپنے پیروں میں گھنگرو باندھے گی؟ ابھی تو وہ اس قدر شرماتی ہے، پھر اتنے مردوں میں کیسے بیٹھے گی۔ اُس کے حلق سے تو آواز بھی نہیں نکلے گی لیکن ننھی بھی تو نیساں کی طرح تھی۔

ہمیں یہاں آئے ہوئے دس دن سے اوپر ہو چکے تھے۔ راستے میں کئی بار مولا سے آمنا سامنا ہوا تھا۔ ہم دونوں کو ساتھ دیکھ کے اُس کی نگاہوں میں چمک آ جاتی تھی لیکن وہ چپ رہا۔ اس لیے میں نے بھی ہاتھ اٹھانا مناسب نہیں سمجھا حالانکہ میرے ذہن سے وہ گالی نہیں نکلی تھی جو اُس نے جہاں گیر سے لڑائی کے دوران میں ادا کر دی تھی۔ جھجل بھی کئی مرتبہ اُسے ادھر اُدھر بازار میں بیٹھا ہوا دیکھ چکا تھا اور اُس نے مجھے سختی سے منع کر دیا تھا کہ میں ان گلیوں سے کان بند کیے اور نظریں جھکائے ہوئے گزرا کروں۔ میں نے یہی کوشش کی تھی اور جھجل نہ کہتا تب بھی جہاں گیر کے ساتھ بازار میں گزرتے ہوئے مجھے ایسا ہی کرنا چاہیے تھا لیکن میں نے سوچ لیا تھا کہ چلتے وقت اگر موقع ملا اور بعد میں خانم پر کوئی آنچ آنے کا اندیشہ نہ ہوا تو میں مولا سے ضرور ملوں گا۔ ان دنوں مولا کے متعلق جہاں گیر اور خانم نے اتنی باتیں بتا دی تھیں کہ مجھے خود ہی اُسے راستے میں روک لینا چاہیے تھا۔

میں نے بہت ضبط کیا مگر مولا سے ضبط نہیں ہوا۔ صبح صبح میں جہاں گیر کے ساتھ سیر سے واپس آ رہا تھا۔ وہ تین روز سے مسلسل مجھے ایک گلی میں بیٹھا ہوا نظر آتا۔ اُس دن سویرے مولا نے پہلی بار اپنی زبان کھولی۔ ہم اُس کے قریب سے گزرے تو اُس نے بیڑی پھینک کر ایک گالی دی اور زمین پر تھوک دیا۔ گالی ذومعنی تھی۔ یہاں تک بات ٹھیک تھی۔ میں نے جان بوجھ کے اسے کانوں کا دھوکا سمجھا لیکن پھر اُس نے اونچی آواز میں خانم کے متعلق ایک بھپتا ہوا گندہ فقرہ چست کیا۔ میرے قدم رکنے لگے۔ جہاں گیر کے کان بھی تیز تھے۔ اس نے بھی فقرہ سن لیا ہوگا۔ میں نے صرفِ نظر کیا لیکن دوسری صبح مولا حسبِ معمول پھر اپنی جگہ بیٹھا تھا۔ اگرچہ جہاں گیر نے اس روز گلی کے دوسری طرف سے گھر واپس آنے کو کہا تھا لیکن میں نے راستہ نہیں بدلا۔ میں اُسی گلی سے گھر کی طرف آیا۔ یہ مولا روزانہ ہمارا انتظار کرتا تھا۔ اس نے ہمیں دور سے دیکھتے ہی منہ سے سیٹی بجائی اور جب ہم اُس کے سامنے پہنچے تو اس نے پھر اپنی زبان گندی کی۔ مجھ سے آگے بڑھنا دوبھر ہو گیا۔ مولا چاہتا بھی یہی تھا کہ میرا خون آزمائے۔ تاہم خانم کی رسوائی نے میرے ہاتھ تھامنے لگے۔ ادھر جہاں گیر نے بھی میرا ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ ہم کوئی چھ سات قدم آگے چلے ہوں گے کہ ایک دم جہاں گیر بلبلانے لگا۔ مولا نے پیچھے سے خنجر مارا تھا۔ خنجر جہاں گیر کی گردن پر لگا اور خون پھوٹ پڑا۔ میں نے جہاں گیر کو ایک طرف کیا۔ وہ مجھے روکنے لگا۔ مولا اکیلا نہیں تھا۔ جب اس نے سیٹی بجائی تھی تبھی مجھے شبہ ہو گیا تھا کہ وہ اکیلا نہیں ہے۔ اس کے دو ساتھی اور بھی تھے جو اس سے کچھ دور ادھر اُدھر بیٹھے ہوئے تھے اور مجھے پلٹتا دیکھ کے میری طرف بڑھ رہے تھے۔ میں نے ان کے آنے کا انتظار کیا۔ ”کیا سمجھا، انھیں دکھا رہا ہے؟“ مولا نے اپنا سر جسم سے آگے کر کے ہنستے ہوئے کہا۔

میدان کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ اس کے دونوں ساتھی بھی اس کے آس پاس کھڑے ہو گئے۔ میں نے جواب دینے کے بجائے باری باری ان کی طرف دیکھا۔ جھجل نے جیل میں مجھے بتایا تھا کہ مقابل کی جگہ تبدیل کرانی ہو تو نگاہوں سے کام لینا چاہیے۔ وہ اپنی جگہ سے ضرور حرکت کرے گا اور جب وہ نسبتاً موافق موقع پر آ جائے تو اپنی نگاہ ٹھہرا لینی چاہیے۔ میں نے یہی کیا۔ وہ مجھے گھور رہے تھے۔ دونوں ساتھی مولا کے کچھ اور قریب ہو گئے۔

”کیا چاہتا ہے مولا؟“ میں نے اپنی آواز پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”یہ معشوق اپن کا ہے۔“ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کے بولا۔ اس کا اشارہ جہاں گیر کی طرف تھا۔ میرا خون رگوں میں اُبلنے لگا۔ مجھے اُس سے کوئی بات ہی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ میں نے سوچا، جیب سے چاقو نکال کے اس کی زبان کاٹ لوں۔ ”اُس دن کے دھوکے میں نہ رہنا، ہو! وہ تیرا باپ جھگڑا بیچ میں آ گیا۔“ وہ جھپٹے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”مار بھول گیا؟ گیدڑ! زمین پہ چھوڑ دے تو تو ابھی خود بھی......“

جہاں گیر نے میرا کرتا پکڑ لیا تھا۔ میں نے منع کر کے ایک جگہ کھڑے رہنے کا حکم دیا۔ مولا کی آواز حلق میں رہ گئی۔ میں دونوں ہاتھ سمیٹے ہوئے اس کی گردن کی طرف جھپٹا۔ مجھے یقین تھا کہ اس کے دونوں ساتھی آگے بڑھ کے میرے ہاتھ پکڑنے کی کوشش کریں گے لیکن میرا ارادہ مولا کی گردن پکڑنے کا نہیں تھا۔ میں نے مولا کے قریب پہنچ کے اپنے دونوں ہاتھ پھیلانے کے لیے جھٹکا دیا۔ دونوں ہاتھ اس کے ساتھیوں

کی گردنوں پر ایک ساتھ پڑے۔ دونوں زمین پہ گر گئے۔ ان کی طرف دیکھے بغیر میں نے تیزی سے مولا کے پیٹ میں گھٹنا مارا۔ وہ دائیں بائیں اپنے ساتھیوں کو دیکھنے کی چوک کر بیٹھا تھا اور غضب میں آ کے مجھ سے لپٹ گیا تھا۔ گھٹنا لگتے ہی وہ پیٹ پکڑ کے زمین پر بیٹھ گیا۔ وہ اکڑی ہڈی کا تھا۔ میں اُسے کمر سے پکڑنے کے لیے دوبارہ آگے بڑھا مگر اس کا ایک ساتھی زمین سے اٹھ گیا۔ اُس کی گردن پر ضرب شاید ٹھیک طرح نہیں لگی تھی۔ اس نے بائیں جانب سے بہت زور سے گھونسا مارا۔ یہ دیکھ کے مولا کی ہمت بھی بڑھی۔ اُس کے اُٹھنے سے پیشتر ہی جہاں گیر اس کا گریبان پکڑ کے اس سے الجھ گیا تھا۔ جہاں گیر کو اس سے علیحدہ کرنے میں چند لمحوں کے لیے میری توجہ بٹ گئی اور مولا کا ساتھی مجھے دو تین ضربیں لگانے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ مجھ سے لپٹ گیا تھا اور مجھے گرانے کے لیے زور لگا رہا تھا۔ میں نے اس کی خواہش پوری کی اور اُسے ساتھ لے کے زمین پر آ پڑا۔ ایسے موقع پر سب سے پہلے نیچے پڑے ہوئے آدمی کے گھٹنے اور سر کو زور سے کسے قابو میں رکھنا ہوتا ہے۔ اُس نے ایک ہاتھ سے میری ٹھوڑی پر ہتھیلی سے دباؤ ڈالا اور دوسرا ہاتھ گلے تک لانے کے لیے آزاد رکھا۔ اُس نے اپنا جسم زیادہ اوپر نہیں اٹھایا تھا۔ اٹھاتا تو میرے دونوں کھلے ہوئے ہاتھ زیادہ آسانی سے کام کرتے۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اُسے خوب نزدیک کر لیا اور اس کی کمر بازوؤں سے جکڑ لی۔ اب اس کی میری حالت ایک جیسی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ میں نیچے تھا اور وہ اوپر۔ مجھے جلدی تھی۔ جہاں گیر اور مولا میری نظروں سے اوجھل تھے۔ مولا کے ساتھی کے لیے زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میری ٹھوڑی پر رکھا ہوا اس کا ہاتھ ہم دونوں کے سینے کے درمیان پھنس گیا تھا۔ اس نے ٹھوڑی چھوڑ دی تھی اور اپنے کھلے ہوئے ہاتھ سے میرے کان پر گھونسے مار رہا تھا۔ میں نے پوری طاقت سے اپنے دائیں شانے پر زور دیا۔ وہ سمجھا کہ میں اس جانب سے پلٹنا چاہتا ہوں چنانچہ اس نے بھی اپنا سارا زور اسی طرف صرف کر دیا لیکن مجھے بائیں شانے سے پلٹنا تھا۔ ہم دونوں جھونک میں ایک دوسرے سے گتھے ہوئے تین چار لڑھکنیاں کھا گئے۔ اُس کا وزن کم تھا۔ جہاں جھونک کم ہوئی میں نے وہیں اپنے آپ کو ٹھیرا لیا۔ نیچے آنے سے وہ اپنے حواس برقرار نہیں رکھ سکا۔ اس نے اُچھل کود شروع کر دی۔ اس سے یہی توقع تھی۔ میں نے دوبارہ اُسے اپنے جسم سے نہیں چپکایا بلکہ اس کے پہلوؤں میں پنجہ ڈال کے اس کے پیٹ پر جم کے بیٹھ گیا۔ میں کچھ اوپر اُٹھا تو اس نے یہ جانا کہ میں کھڑا ہو رہا ہوں لیکن جسم ڈھیلا چھوڑنے میں دوبارہ کہیں اوپر سے گرنے کے انداز میں پیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔ پھر سارا وزن پیٹ پر ہی ہوا۔ میں نے یہ عمل کئی بار دہرایا۔ وہ چیخنے چلانے لگا۔ اُس کی آنتڑیاں پچک گئی ہوں گی۔ اس کی آنکھیں اُبلنے لگیں تو میں نے اُسے چھوڑ دیا۔

چند ثانیوں کی تاخیر ہو گئی۔ اُدھر مولا نے جہاں گیر کا دانت توڑ دیا تھا۔ جہاں گیر کی توجہ میری ہی طرف ہو گی ورنہ وہ اتنی جلدی مار کھانے والا نہیں تھا۔ کوشش میں اسے اپنے بارے میں پہلے بتا دیتا۔ میں نے مولا کو پیچھے سے پکڑ کے پہلے جہاں گیر کو اس سے دور ہونے کی ہدایت کی۔ جہاں گیر دور ہو گیا تو میں نے مولا کی کمر سے ہاتھ ہٹا لیے۔ وہ جیسے ہی میری طرف پلٹا، میں جھک گیا اور اُسے لیے ہوئے اوپر اٹھا۔ پھر میں نے اسے زمین پر لوٹنے میں دیر نہیں کی۔ اس نے کھڑے ہونے کی ہمت کی، میری ٹھوکروں نے اس کا توازن بگاڑ دیا۔ میں نے اس کے منہ پر اتنے طمانچے مارے کہ خون کی دھار بہ نکلی۔ میں اُسے وہیں ختم کر دیتا اگر جہاں گیر درمیان میں نہ آ جاتا۔ مولا کے ساتھی بھاگ گئے تھے۔ اردگرد تماشا دیکھتے ہوئے راہ گیروں نے ہمیں گھیرے میں لے لیا تھا حالانکہ مولا تڑپ رہا تھا مگر اُس کی طرف کسی نے توجہ نہیں دی۔

جہاں گیر نے راہ گیروں میں سے کوئی آدمی جھجل کو بلانے کے لیے گھر کی طرف دوڑا دیا تھا۔ جھجل نہیں آیا مگر جب ہم گھر والی گلی میں داخل ہوئے تو خانم تمام احتیاط کے ساتھ تیزی سے آتی ہوئی دکھائی دی۔ زمین پر پڑے رہنے کی وجہ سے میرے تمام کپڑے گندے ہو گئے تھے۔ جہاں گیر کے منہ سے خون جاری تھا لیکن اس کے پیر ٹک رہے تھے۔ وہ میرے بازو سے چمٹا جا رہا تھا۔ خانم نے گلی ہی میں واویلا شروع کر دیا۔ جہاں گیر اُسے گھر میں لے گیا۔ بیٹھک میں جھجل حقہ پی رہا تھا۔ ”میں نے کہا تھا خانم! مت جاؤ۔“ وہ بلند آواز سے بولا۔ ”وہ آتے ہی ہوں گے۔ سب ٹھیک ہے نا؟“ اس نے مجھ سے مخاطب ہو کے پوچھا۔ ”نہیں مانے حرام کے بچے۔“

”نہیں۔“ میں نے مختصر جواب دیا۔

”چل کپڑے بدل لے۔ ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔“

”وہ تین تھے آپا!“ جہاں گیر حیرت بھری آواز میں بولا اور خانم کو ساری داستان سنانے لگا۔ خانم نے آنکھیں بند کر کے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔

”اب میں ایک دن بھی یہاں نہیں ٹھیروں گی۔“ وہ وحشت سے بولی۔ ”پتا ہے اس گھر کا انتظام ہو یا نہ ہو۔ میں اسے اونے پونے بیچ دوں گی۔ مجھے پہلے ہی اس کا اندیشہ تھا۔“

”خانم!“ جھجل کی آواز گونجی۔ ”جلدی مت کرو، اطمینان سے چلیں گے۔“

”کیسا اطمینان!“ وہ خوابی انداز میں بولی۔ ”آپ نے دیکھا نہیں کہ کس طرح واپس آئے ہیں۔ میں اب یہاں نہیں رہ سکتی۔“

”انھیں کیا ہوا ہے۔“ جھجل نے غنودہ آواز میں کہا۔

”اور کیا کسر رہ گئی تھی۔ معاف کیجیے آپ تو یہیں بیٹھے رہے۔ اگر انھیں کچھ ہو جاتا! آپ ان لوگوں کو نہیں جانتے۔ میں ایک عرصے

ہیں رہتی ہوں۔"

"خانم! اتنا نہیں گھبراتے۔" تجمل دھیمے لہجے میں بولا۔ "یہ کیسے نگینوں سوچ رہی ہیں تم؟ کل کچھ ہو سکتے ہیں پرسوں دن۔ بازار میں کوئی ان کے منہ نہیں لگتا۔ سب کو معلوم ہے کہ اس کا نتیجہ اچھا نہیں ہوگا۔"

"جیسے تمہاری مرضی خانم! ہم تو کب سے جانے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔" تجمل نے تندی سے کہا۔ "تم جیسا چاہو کرو، پر جلدی میں نقصان ہو سکتا ہے۔ میں تم سے اتنا ہی بول سکتا ہوں۔"

"آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔" خانم نے لجاجت سے کہا۔

"جو میں بولتا ہوں وہ تم بھی سمجھا کرو۔"

خانم نے تجمل کی طرف سراسیمگی سے نگاہ اٹھائی، اس کے ہونٹ کچھ کہنے کے لیے کھلے مگر لرز کے رہ گئے۔ وہ تجمل کی بات سے مطمئن نہیں تھی۔ ان کے درمیان ہونے والی باتیں میرے لیے نئی تھیں۔ انھیں سن کے مجھے بے کلی ہونے لگی۔ صاف ظاہر تھا کہ تجمل کے اتنے دنوں کے ٹال مٹول کے پیچھے کوئی سبب ہوگا۔ اسی لیے میں نے اسے پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا جب بھی میں اس سلسلے میں سوچتا تھا میرا دماغ بند ہونے لگتا تھا۔ مجھے احساس تھا کہ تجمل کا بھی یہی حال ہوگا۔ میرا کوئی ٹھکانا ہوتا اور جہاں گیر سے ملنے کے بعد گھر تک پہنچنے کی کوئی صورت ہوتی تو میں یقیناً خانم سے درخواست کرتا کہ وہ ہمارے ساتھ رہ لے چونکہ وہ پہلی ملاقات میں بازار کی زندگی ترک کرنے کا اظہار کر چکی تھی اور اس نے اپنے گھر کے دروازے تماشائیوں کے لیے بند کر دیے تھے۔ خانم کہیں جانے کی بات کر رہی تھی لیکن کہاں؟ اتنے کے بعد کچھ دیر کے لیے مجھے اور تجمل کو تنہائی کا موقع ملا۔ میں اس سے پوچھ سکتا تھا مگر اب تک میں نے اس بارے میں کچھ نہیں پوچھا تھا تو اب بھی کیا ضرورت تھی۔ تجمل نے جو کچھ طے کیا ہوگا، سوچ سمجھ کر ہی کیا ہوگا۔

دوسرے دن صبح نیساں بیٹھک میں آئی تو اس کا چہرہ بیماروں جیسا لگ رہا تھا۔ وہ ایک کونے میں کھڑی ہو گئی۔ تجمل نے چونک کے اس کی طرف دیکھا اور مضطرب آواز میں پوچھا۔ "کیا بات ہے نیساں بیٹا! یہ تو نے ہلدی اپنے گالوں پر کیوں مل لی ہے؟"

نیساں سسکنے لگی۔ تجمل ذرا تخت سے اتر کے اس کے پاس گیا اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ کے پوچھنے لگا۔ "کیا کسی نے تجھے کچھ کہہ دیا ہے؟ تو خانم سے لڑائی تو نہیں ہو گئی؟"

وہ سر جھکائے اور شدت سے رونے لگی۔ "کیا بات ہے؟ مجھے نہیں بتائے گی؟ تو تو مجھے پیاری لگتی ہے۔" وہ اسے اپنے بازو میں سمیٹتا ہوا منت بھرے لہجے میں بولا۔ "بتا، شاباش بتا دے!"

نیساں نے بمشکل تمام سر اٹھا کے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں سرخ آنسو بھرے ہوئے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ وہ میرے سامنے تجمل سے بات کرنا نہیں چاہتی۔ مجھے خدشہ ہوا کہ وہ یہاں گھر کی کوئی بات ہوگی۔ میں اٹھنے لگا تو تجمل نے مجھے بٹھا لیا اور نیساں سے بولا۔ "لاڈو! ان کے سامنے ہی بول دے، مت گھبرا۔ میرا اس سے کوئی پردہ نہیں ہے۔ بتا بچا! تو تو جب بولنے پہ آتی ہے تو مینا کی طرح بولتی ہے۔"

"اپی نے اری بائی سے معاملہ طے کر لیا ہے۔" وہ اٹک اٹک کے بولی۔

"اچھا! پھر کیا ہوا؟" تجمل نے تجسس سے پوچھا۔

"ابھی ابھی اری بائی واپس گئی ہے۔" وہ روتے ہوئے بولی۔ "اس نے تمام سامان سمیت مکان کا سودا کر لیا ہے۔ میں نے ان کی باتیں سن لی ہیں۔ تین چار دن میں وہ باقی پیسے دے دے گی پھر اپی چلی جائیں گی۔ میں نے اپی سے کہا کہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلیے۔ انھوں نے مجھے ڈانٹ دیا۔ اپی کے بغیر میرا جی نہیں لگے گا۔ آپ ہی ان سے کچھ کہیے بابا! آپ کی بات وہ بہت مانتی ہیں۔ میں انھیں کبھی تنگ نہیں کروں گی۔ جو وہ کہیں گی کروں گی۔ میں نے ان سے بہت کہا لیکن وہ کہتی ہیں کہ یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے۔"

تجمل چپ ہو گیا پھر افسردگی سے بولا۔ "اپی ٹھیک کہتی ہیں نیساں!"

"آپ بھی یہی کہتے ہیں؟"

"ہاں نیساں! تیری ماں ابھی زندہ ہے وہ کس طرح تجھے خانم کے ساتھ بھیج دے گی اور پھر تو کب تک اپنی اپی کے ساتھ رہے گی۔ لڑکیاں پرائے گھر کی ہوتی ہیں۔"

"مگر مجھے معلوم ہے کہ مجھے کسی گھر میں نہیں جانا۔"

تجمل نے جواب نہیں دیا۔ "یہ ممکن نہیں ہے نیساں!" وہ دکھ سے بولا۔

"کیوں ممکن نہیں ہے بابا؟"

"نیساں! تو اب اتنی بچی نہیں ہے۔"

"بابا! میں آپ لوگوں کے ساتھ بالکل ایک لونڈی کی طرح رہوں گی اور کبھی کسی سے کوئی شکایت نہیں کروں گی۔ آپ مجھے ساتھ لے چلیے۔ دیکھیے، منع مت کیجیے گا۔ میں آپ کے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ مجھے یہ سب اچھا نہیں لگتا۔"

"میں تجھ سے کیا بولوں، میرے بس میں کچھ نہیں ہے۔"

"اپی بھی یہی کہتی ہیں مگر آپ چاہیں تو مجھے لے جا سکتے ہیں۔"

"سمجھ کیجیے نیساں!" تجمل نے شکستہ لہجے میں کہا۔

"آپ مجھے خرید لیجیے بابا! میں عمر بھر آپ لوگوں کی خدمت کروں گی۔"

تجمل گم سم ہو گیا۔ "کیا کہہ رہی ہے رنی!"

"ہاں بابا! آپ مجھے خرید سکتے ہیں۔"

"نہیں نہیں۔" تجمل تیزی سے سر ہلانے لگا۔ "ایسے خواب مت دیکھ۔ جو تو سوچ رہی ہے وہ کسی بھی طرح ممکن نہیں، سمجھی؟ ممکن نہیں ہے۔"

"تو آپ کیوں نہیں سوچتے؟ آپ تو میری اتنی تعریفیں کرتے ہیں۔"

"تو بہت اچھی ہے نیساں!" تجمل الجھ کے بولا۔ "پر میں کیا کروں۔ میں خانم سے بات کروں گا پر میں تجھ سے کوئی وعدہ نہیں کر سکتا۔ اب مجھ سے کچھ مت پوچھنا، تجھے خود پتہ چل جائے گا۔"

وہ منتیں کرنے لگی اور اس کے آنسو بہتے رہے۔ تجمل نے ہامی نہیں بھری۔ مجھے گھبراہٹ ہونے لگی۔ "نیساں مت رو۔" میں نہ جانے کیوں بیچ میں بول پڑا۔ میری آواز بھرا گئی تھی۔ تجمل نے تیز نظروں سے مجھے دیکھا اور سر جھکا لیا۔ دروازے پر کسی کی آہٹ ہوئی تو نیساں گھبرا کے اٹھ کھڑی ہوئی اور چھپری سے منہ چھپاتے بیٹھک سے بھاگ گئی۔ جہاں گیر آ گیا تھا۔ اسے تجمل کے پاس چھوڑ کے میں اوپری منزل پر اپنے کمرے میں چلا آیا اور بستر پر گر پڑا۔ میرا جسم اچانک ٹوٹنے لگا تھا اور سینے میں جلن سی ہو رہی تھی۔ بہت دیر ہو گئی تو خانم مجھے پوچھنے کے لیے کمرے میں آئی۔ مجھے اس کی آمد کا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔ اس نے میری کلائی پر ہاتھ رکھا تو میں ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ وہ میرا حال پوچھنے لگی اور کبھی کے تولا سے جھگڑے کے دوران میں مجھے کوئی اندرونی چوٹ آ گئی ہے۔ میں نے اس سے نیساں کے متعلق بات کرنا چاہا مگر لفظ میری سمجھ میں نہیں آئے۔ مجھے خود نہیں معلوم تھا کہ مجھے اس سے کیا کہنا چاہیے اور آخر کس بنیاد پر میں اس سے نیساں کا ذکر چھیڑوں۔ تجمل نے نیساں کو منع کر دیا تھا۔ خانم پہلے ہی جواب دے چکی تھی۔ میرے درمیان میں دخل دینے کا کیا محل تھا۔ ٹھیک ہے نیساں کی قسمت میں جو لکھا ہے اسے کون روک سکتا ہے۔ رنی کی قسمت میں جو لکھا تھا وہ پورا ہوا۔ میں نے قسمت کی بات کبھی نہیں مانی تھی لیکن اب اسے ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ خانم میری طبیعت کی طرف سے مطمئن ہو کے چلی گئی۔ میں وہیں کمرے میں لیٹا رہا۔ میرا گوشت دکھتا تھا اور ایسا لگتا تھا جیسے میرے جسم پر بہت سی مکڑیوں نے جالے بُن لیے ہوں۔ جہاں گیر کے ملنے کے بعد مجھے اور تازہ تراق محسوس ہونے لگی تھی۔ اس کی صورت دیکھتے وقت میرا دل بیٹھنے لگتا تھا اور میں دھواں سا بھر جاتا تھا۔ نیساں نے کمرے میں آکے دوپہر کے کھانے کی اطلاع دی۔ میں نہ جاتا تو خواہ مخواہ کا تماشا بنتا۔ کھانے کی چوکی پر نیساں بھی ہمارے ساتھ بیٹھی تھی۔ بار بار میری نگاہیں اس کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ وہ کوئی دلہن معلوم ہو رہی تھی۔ اس نے اپنی چھپری سر سے آگے کر لی تھی کہ کوئی اس کا چہرہ نہ دیکھ سکے مگر وہ اپنے ہاتھ نہیں چھپا سکی۔ اس کی لانبی لانبی انگلیاں بے قرار تھیں۔ سہ پہر کو تجمل قیلولے کے لیے لیٹ گیا اور جہاں گیر دوسرے کمرے میں ماسٹر سے پڑھنے چلا گیا۔ میں بیٹھک میں مونڈھے پر بیٹھا اپنے ناخن کریدتا رہا۔

پھر مجھ سے بیٹھا نہیں گیا۔ میں نے ایک ارادہ کر لیا تھا۔ جتنا میں سوچتا تھا، اتنا ہی وہ میرے ذہن پر اور ابھرتا جاتا تھا۔ میں نے آہستہ سے اپنا سامان ٹٹولا، کپڑے پہنے اور کسی کو بتائے بغیر باہر آ گیا۔ مجھے زیادہ دور نہیں جانا پڑا۔ جب میں زینہ طے کر کے دوسری منزل پر پہنچا تو ایک بوڑھی عورت نے دروازہ کھولا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں حرکت آرا سے ملنا چاہتا ہوں۔ وہ مجھے دروازے سے ملحق ایک کمرے میں لے گئی۔ فرش پر چاندنی بچھی ہوئی تھی۔ دیواروں کا رنگ گلابی تھا۔ چند منٹ بعد ہی صاف ستھرے لباس میں گندمی رنگ کی ایک ادھیڑ عمر عورت نمودار ہوئی۔ اس نے مجھے تسلیمات کی اور ساڑھی کا پلو شانے پر درست کر کے بولی۔ "فرمائیے کنیز کو کیسے یاد فرمایا ہے؟"

میں نے کہا۔ "میں نیساں کے سلسلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"خدا کرے آپ نیساں کی شکایت لے کے نہ آئے ہوں۔"

"نہیں ایسی بات نہیں۔ میں کچھ اور بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"میں تو ڈر گئی تھی۔" وہ مطمئن ہو کے بولی اور تعجب آمیز نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ "فرمائیے! پھر بھلا نیساں کی کیا بات ہو سکتی ہے؟"

"آپ نیساں خانم کو دے دیجیے۔" میں نے جھجک کے کہا۔

"وہ خانم ہی کی ہے۔" اس نے بے ساختہ جواب دیا۔

"آپ کو معلوم ہے کہ خانم جلد ہی یہاں سے جانے والی ہیں۔ نیساں کی خواہش ہے کہ وہ خانم کے ساتھ ہی چلی جائے۔"

اس نے ایک گہری سانس لی اور پہلو بدلنے لگی۔ "میں آپ کی بات نہیں سمجھ سکی؟" اس کی آواز بھی بوجھل تھی۔

"میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ نیساں کو خانم کے حوالے کر دیں اور اس کی جو قیمت آپ کے ذہن میں ہو مجھے بتا دیں میں ادا کر دوں گا۔"

اس کے لبوں پر ایک مٹھی مٹھی مسکراہٹ ابھری۔ "اچھا! یہ بات ہے کیا خانم نے آپ کو بھیجا ہے؟" وہ مجھے کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"نہیں خانم کو نہیں معلوم کہ میں یہاں آیا ہوں اور شاید خانم آپ سے اس سلسلے میں بات کرنا مناسب سمجھیں۔ میں اپنی مرضی سے آیا ہوں۔"

وہ کچھ سوچنے لگی اور بوجھل آواز میں بولی۔ "میں نے نیساں کے لیے کبھی ایسا نہیں سوچا۔ میں معذرت کرتی ہوں۔"

"لیکن نیساں کے لیے آپ نے ایک بات تو ضرور سوچ رکھی ہے کہ آپ دو ایک سال بعد اسے محفل میں بٹھائیں گی۔"

"ہاں، نیساں خانم سے اسی کی تربیت لے رہی ہے۔ اس کی اٹھان اچھی ہے اور اللہ نے اسے آواز کے حسن سے بھی خوب نوازا ہے۔ خانم نے اس پر بہت محنت کی ہے مگر میں اسے خانم کو کیسے دے سکتی ہوں، خانم تو ایسی دس لڑکیاں حاصل کر سکتی ہے۔"

"آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔ آپ کو پتہ ہوگا کہ خانم نے اپنے آپ کو محدود کر لیا ہے اور اب وہ مستقل طور پر یہ زندگی ترک کر رہی ہیں۔ نیساں کو یہاں سے لے جانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اُسے آپ سے چھین کے خود فائدہ اٹھایا جائے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ نیساں کے ساتھ ایسا نہیں ہوگا۔ نیساں خود بھی یہ نہیں چاہتی۔ نیساں سے آپ کی جو توقعات وابستہ ہیں، وہ میں پیشگی پوری کیے دیتا ہوں۔ کیا آپ یہ پسند نہیں کریں گی کہ نیساں کسی گھر میں رہے؟"

"کہاں! کہاں میاں!" وہ اُداسی سے بولی۔ "اب یہ باتیں پرانی ہو گئی ہیں، بظاہر اب بھی اچھی لگتی ہیں۔"

"آپ جس طرح چاہیں یقین کر لیں۔ سب سے بڑا یقین وہ قیمت ہے جو میں آپ کو ادا کر سکتا ہوں۔ کچھ اور مت سمجھیے۔ مجھ پر اعتبار کیجیے۔"

"میاں! آپ کی عمر ابھی کم ہے۔ آپ نے زمانہ نہیں دیکھا۔ آپ پہلے کچھ اور سوچ لیجیے پھر میرے پاس آئیے گا اور ویسے بھی میں نیساں کو اس طرح کیسے کسی کو دے سکتی ہوں۔ میری تمام آرزوئیں اُس سے بندھی ہوئی ہیں۔ ابھی مجھے اپنے لگائے ہوئے پودے کی بہار تو دیکھ لینے دیجیے۔ مجھے ایسی بات پر مجبور مت کیجیے جو میرے اختیار میں نہ ہو اور جس کا تصور بھی میرے خواب و خیال میں نہ ہو۔ نیساں کو ابھی اپنی تربیت پوری کر لینے دیجیے پھر دیکھیے گا۔ نیساں چار صاحبانِ ذوق کے درمیان بیٹھے گی تو مجھے بھی اُس کی قیمت کا اندازہ ہوگا۔ ابھی نہ میں آپ سے کچھ کہہ سکتی ہوں اور نہ آپ اُس کی قدر و قیمت صحیح طور پر کہہ سکتے ہیں۔ یہ بات یہیں رہنے دیجیے۔ ویسے خانم کے لیے میری جان حاضر ہے۔ آپ اُس کے مہمان ہیں تو میرے بھی سر آنکھوں پر۔"

"میں فیصلہ کر کے آیا ہوں اور مایوس واپس جانے نہیں آیا۔ لیکن ہے آپ کے ذہن میں کوئی اور بات ہو تو وہ نکال دیجیے۔ بہتر ہے آپ نیساں کو نیلام پر نہ چڑھائیں۔ نیلام کی آخری بولی آپ اپنے تصور میں طے کر لیجیے۔ میں مول تول نہیں کروں گا اور دوبارہ آپ سے التجا کروں گا کہ نیساں اگر یہ زندگی پسند نہیں کرتی تو آپ بھی اُس پر رحم کیجیے۔"

"میاں! میرے لیے یہ بات بڑی اچانک ہے۔ مجھے سوچنے کے لیے وقت دیجیے۔ میں اس طرح کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی۔ بھلا اپنے جگر کے ٹکڑوں کو کوئی اس طرح کیسے جدا کر سکتا ہے۔"

"اور جگر کے ٹکڑوں کو اس طرح دکان پر بھی نہیں سجایا جاتا۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں لیکن ہم یہاں بیٹھ کے اور کیا سوچ سکتے ہیں۔ میں آپ کو نہیں جانتی۔ آپ کون ہیں، کس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، کیا کرتے ہیں؟ آپ نے اپنے بارے میں کچھ بتائے بغیر اتنی ڈھیر ساری باتیں کر دیں۔"

"خانم! آپ ٹالنے والی باتیں نہ کریں۔ آپ یہاں تجربے نہیں دیکھتیں، عیب دیکھتی ہیں۔ پھر یہ تمام باتیں پوچھنا بے کار ہے۔ نیساں بازار میں بیٹھے گی۔ بازار میں بکنے والی ہر چیز کی ایک قیمت ہوتی ہے وہ مجھے بتا دیجیے اور ادھر ادھر کی بات مت کیجیے۔ آپ کا ارادہ نیساں کو بازار میں لانے کا نہیں ہوتا تو میں آپ کے پاس نہ آتا۔"

"آپ بہت بہت عجیب نوجوان ہیں۔" وہ ترشی سے بولی۔ "فرض کیجیے میں انکار کر دیتی ہوں کہ میں نیساں کے بارے میں ایسا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔"

"میں جانتا ہوں آپ کا انکار محض حجت ہے۔ جو قیمت آپ کو رفتہ رفتہ ملے وہ ایک ساتھ مل جائے تو یہ سودا برا نہیں ہے۔ فرض کیجیے نیساں ہی انکار کر دے۔"

"اُس کی یہ جرأت نہیں۔" وہ خفا ہو کے بولی۔

"لیکن کسی دوسرے میں یہ جرأت ہو سکتی ہے۔"

"آپ دھمکی دے رہے ہیں؟" اُس کا چہرہ تمتمانے لگا۔

"دھمکی کیسی! میں آپ کو منہ مانگی رقم ادا کرنے کو تیار ہوں۔"

"آپ نے بھلا اس کے لیے کیا سوچا ہے؟" وہ بے رخی سے بولی۔

"یہ بتانا آپ کا کام ہے۔"

"میں نے آپ سے کہہ دیا، میں نے کچھ نہیں سوچا۔"

"تو سوچ لیجیے، میں یہیں بیٹھا ہوں۔"

"نہیں، آپ پھر کسی وقت آئیے۔"

"آپ بتا دیجیے کسی جھجک کے بغیر بتا دیجیے۔"

"میں کیا بتاؤں۔" وہ سر جھٹک کے بولی۔

"کچھ بھی جو آپ مناسب سمجھیں۔ میں آپ سے کسی رعایت کے لیے نہیں کہہ رہا ہوں۔ آپ خانم کا خیال بھی مت کیجیے۔"

"مجھے تنگ نہ کیجیے۔" وہ بیزاری سے بولی۔

"تو مجھے بتائیے؟"

"یہ کیسی زبردستی ہے۔"

"کوئی زبردستی نہیں۔ آپ کچھ کہہ کے تو دیکھیے۔"

"آپ...... آپ پچاس ہزار دے سکتے ہیں؟"

"میں آپ کو ساٹھ ہزار دوں گا۔" میں نے تیزی سے کہا۔ "سودا پکا۔ نیساں اب میری ہے۔ میرے پاس نقد رقم نہیں ہے لیکن میں چیک دے رہا ہوں۔ آپ کل صبح کسی بھی بینک میں یہ چیک داخل کر دیجیے اور بینک والے سے کہہ دیجیے کہ وہ جلد از جلد یہ چیک بمبئی بھیج دے۔ آپ کو بمبئی سے تار سے جواب آسکتا ہے کہ میرا چیک ٹھیک ہے یا نہیں۔ ہم ابھی چار پانچ روز تک یہیں ہیں۔ اُس وقت تک آپ کو رقم مل جائے گی۔ نیساں اب یہاں واپس نہیں آئے گی اور جب تک آپ کو رقم نہیں مل جائے ہم یہاں سے نہیں جائیں گے۔ آپ نیساں سے خانم کے ہاں آ کے مل سکتی ہیں۔" میں نے چیک بک جیب سے نکالی اور چیک بھر کے اُس کے

ہاتھ میں تھما دیا۔ شوکت آرا کے ہاتھوں پہ کپکپی طاری تھی۔ اس کی آنکھیں بجلی کی ساکت ہو گئی تھیں۔ میں چلنے لگا تو وہ حواس باختہ انداز میں اٹھی اور لڑکھڑاتی زبان میں مجھے روکنے لگی۔ میں زینے سے نیچے اتر آیا۔

❁

میں واپس پہنچا تو بیٹھک میں سبھی میرا انتظار کر رہے تھے حالانکہ مجھے آنے جانے میں زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔ جیسے ہی موقع ملا میں نے نیساں سے کہہ دیا کہ وہ آج سے اپنے گھر نہیں جائے۔ اس کی پتلیاں جگمگانے لگیں۔ مجھے شک تھا کہ شوکت آرا خانم سے ملنے نہ آ جائے مگر وہ نہیں آئی۔ اندھیرا ہونے تک نیساں موجود رہی تو خانم نے اُسے ٹوکا۔ نیساں کو جواب دینا مشکل ہو گیا۔ خانم نے اُسے برا بھلا کہا لیکن وہ خاموش بیٹھی رہی۔

"چلی جائے گی آپا۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ "ابھی یہ تین چار روز یہیں رہے تو کیا حرج ہے۔"

"کوئی حرج نہیں لیکن شوکتی نہ جانے کیا سوچے گی۔"

"نیساں نہیں پہنچے گی تو وہاں سے خود کوئی لینے آ جائے گا۔"

"پر تو کہاں گیا تھا رے؟" تجمل نے مجھے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"میں یہیں قریب ہی گیا تھا۔" میں نے سرسری انداز میں جواب دیا۔

ابھی تجمل کچھ اور کہنے والا تھا کہ حجامت ہانپتا ہوا اندر آیا اور خانم کے پاس جا کے کہنے لگا۔ "شاہ کبیرا آیا ہے۔"

"کبیرا!" خانم نے خوف زدہ آواز میں کہا۔ "وہ کیوں آیا ہے؟" وہ ہماری طرف سراسیمگی سے دیکھنے لگی۔

"پتہ نہیں، پوچھتا ہے خانم سے ملنا ہے۔"

"اکیلا ہے؟"

"نہیں وہ تینوں بھی ساتھ ہیں۔"

"کہنا اس وقت خانم باہر گئی ہوئی ہیں۔ تم نے کہہ تو نہیں دیا کہ میں اندر گھر میں موجود ہوں۔"

"نہیں میں نے کہا میں دیکھ کے بتاتا ہوں۔"

"تم اُن سے جا کے یہی کہہ دو کہ میں کہیں گئی ہوئی ہوں۔"

"مل آؤ خانم! پوچھ لو کہ وہ کیا بولنا چاہتا ہے۔" تجمل نے بلند آواز میں کہا۔ "نہیں جاؤ گی تو وہ دوبارہ آئے گا۔"

"میں پہلے ہی ڈر رہی تھی۔" وہ میری طرف دیکھ کے بولی۔ "مرا لے نہ جانے کیا کیا کان بھرے ہوں گے۔ میں اُس کے دوبارہ آنے سے پہلے کچھ رقم بھجوا دوں گی۔ پھر شاید وہ نہیں آئے۔"

"رقم دینے کی کیا ضرورت ہے۔ پہلے اس سے جا کے بات کرو۔ بولو تو میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔" تجمل نے نرمی سے اُسے سمجھایا۔

"میں آپ سے بار بار کیا کہہ رہی ہوں۔ یہ لوگ بہت شر بھرے ہیں۔ ان میں نفرت بھرا ہوا ہے۔ بات بات پہ چاقو نکال لیتے ہیں اور زبان پہ تو انھیں تالو ہی نہیں۔ سب نواب بہادر سے کہہ گئے کہ یہی بات نہیں پڑے گا۔ میں نے دو تین بار اُن کا ہرکارہ واپس کر دیا ہے۔ اب ان کے سامنے جانا مناسب نہیں۔ اپنی عزت اپنے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ اس وقت کسی طور سے یہ بلا ٹل جائے تو بہت ہے۔"

"خانم جتنا ڈرو گی اتنی ہی بات خراب ہوگی۔ مجھے ساتھ لے جاؤ۔ مت لے جاؤ، تم خود جا کے بات کرو۔"

"آفت خدا!" خانم اپنا ماتھا پکڑتے بیٹھ گئیں۔ پھر لرزتی آواز میں بولیں۔ "اگر اس نے باہر میاں کو پوچھا یا جو میاں کو پایا تو آپ مت بیٹھیے۔ میں کہوں گی دونوں گھر پہ نہیں ہیں۔ جب تک میں نہ آ جاؤں آپ سب یہیں رہیے۔"

"نہیں وہ بلائے تو انھیں بلا لینا۔ جو بات ہو وہ ایک ہی بار ختم ہو جائے تو اچھا ہے۔ وہ انھیں کھا نہیں جائے گا۔"

"وہ بہت برا ہے۔"

"تو یہ بھی آدمی کے بچے ہیں۔"

"چند روز تک اب چند روز ہی کی تو بات ہے۔"

"نہیں خانم۔" تجمل نے پہلی بار سختی سے کہا۔

"اچھا آپ یہیں بیٹھے رہیے جیسا کچھ ہوگا میں کسی وقت بلا کے آپ کو بتاؤں گی۔" خانم سٹپٹا کے بولی اور وہ حجامت کے ساتھ بیٹھک سے باہر چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی تجمل نے نیساں سے کہا وہ دیکھ کے آئے کہ خانم نے شاہ کبیرا کو کس جگہ بٹھایا ہے۔

"برابر والی چھوٹی بیٹھک میں ہی وہ اسے بٹھا سکتی ہیں۔" نیساں کی آواز میں لرزش تھی۔ میاں کا رنگ متغیر ہو گیا تھا۔ ایسے میں تجمل نے پوچھا کہ کیا میں خانم کے پاس چلا جاؤں؟ اس نے انکار کر دیا۔

"بیٹھا رہ لاڈلے!" وہ تحکم سے بولا۔

نیساں بیٹھک سے چلی گئی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ حواس باختہ بھاگی ہوئی آئی۔ "وہ کہتے ہیں کہ باہر بھائی کو جا کے سامنے لاؤ۔ آپا منت کر رہی ہیں۔ شاہ کبیرا بہت غصے میں معلوم ہوتا ہے۔ میں نے دروازے کے پاس کھڑے ہو کے اُن کی کچھ باتیں سنی ہیں۔ وہ اونچی آواز میں بول رہا ہے اور خانم کی کوئی بات نہیں سن رہا ہے۔"

تجمل کھڑا ہو گیا۔ اُس نے مجھے اشارہ کیا۔ جہاں گیر بھی ساتھ چلنے لگا۔ تجمل نے اُسے منع کیا لیکن وہ نہیں مانا۔ ہم تینوں ایک ساتھ چھوٹی بیٹھک میں داخل ہوئے۔ خانم تخت پہ بیٹھی ہوئی تھی۔ چار آدمی موجود تھے۔ اُن کے درمیان جو شخص سب سے نمایاں تھا وہ یقیناً کبیرا ہوگا۔ اُس کی بڑی بڑی مونچھیں اوپر اٹھی ہوئی اور آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔ لمبے بال پیچھے کی طرف الٹے ہوئے تھے اور کنگھی کی ہوئی تھی۔ گلے میں سونے کی زنجیر

چاقو کا نشان تو زیادہ بڑا نہیں تھا مگر جسم جھکا ہوا تھا۔ اس نے ملگجی میلا
کرتا اور لٹھے کا پاجامہ پہن رکھا تھا۔ رنگ سُرخی مائل سیاہ، لمبی ناک اور بڑا منہ
ہم پر نظر پڑتے ہی خانم بوکھلا کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ شاہ اور اس کے
ساتھیوں نے گردن موڑ کے ہمیں دیکھا اور اُن کی پیشانیوں پر بل پڑ گئے۔
"کیا بات ہے خانم؟" تجمل نے ہلکی آواز میں پوچھا۔
"کچھ نہیں، یہ شاہ کبیرا ہیں"۔ وہ کانپتے ہوئے لہجے میں بولی۔ "اس
علاقے کے خاص آدمی۔ ملنے کے لیے آئے ہیں اور یہ۔۔۔ یہ میرے مہمان ہیں"۔
"ان میں وہ لڑکا تو نہیں جس نے مولا اور اس کے ساتھیوں پر
ہاتھ اٹھایا تھا؟" شاہ کبیرا کی بھاری آواز کمرے میں گونجی۔
خانم نے کوئی جواب نہیں دیا۔
"کیا تم اس سے ملنا چاہتے تھے شاہ؟" تجمل نے پوچھا۔
"ہاں اس لونڈے کی صورت دیکھنا ہے"۔
"دیکھ لو شاہ، خوب اچھی طرح دیکھ لو، یہی ہے وہ"۔
"آپ لوگ اندر بیٹھیے، میں ابھی آتی ہوں"۔ خانم نے التجا کی۔
"خانم بات بولو، شاہ کبیرا کیا چاہتا ہے"۔ تجمل نے بگڑتے ہوئے
لہجے میں کہا۔ "شاہ کبیرے! خانم نہیں بتائے گی تم بولو"۔
"تُو کون خانم!" شاہ کبیرا نے منہ بنا کے پوچھا۔ "یہ کون لوگ ہیں؟"
"یہ میرے مہمان ہیں، یہ آپ لوگوں کو نہیں جانتے"۔ وہ گھگیا
کے بولی۔ "اسی لیے۔۔۔۔"
"خانم! ہم اپنے آپ کو جنوانے آئے ہیں"۔
"آپ اندر چلیے، میں ان مہمان سے بات کرتی ہوں"۔
"ایسی کیا بات کر رہی ہو؟"
"خدا کے لیے آپ چلے جائیں"۔ خانم عاجزی سے بولی۔
"تم ہی بولو شاہ کبیرے، عورت سے کیا بات کرتے ہو"۔
"بول دے بھئی"۔ شاہ کبیرا نے بے پروائی سے اپنے ایک ساتھی
کو حکم دیا۔ "انھیں بھی بول دے۔ خانم کے مہمانوں کا کچھ تو خیال رکھنا پڑے
گا۔ قصہ ختم کر"۔
شاہ کبیرا نے جس آدمی کو اشارہ کیا تھا وہ معین جتانے لگا۔ "شاہ کبیرے
کے کسی آدمی پر پہلی بار بازار میں ہاتھ اٹھایا گیا ہے"۔ وہ میری طرف دیکھ
کے غصے سے بولا۔ "اسے بازار میں سب کے سامنے شاہ، مولا اور اس کے
ساتھیوں سے معافی مانگنی پڑے گی"۔
"ورنہ کیا ہوگا؟"
"ورنہ اسے اٹھا لیا جائے گا"۔
"اور کوئی بات؟"
"اور خانم مکان کے سودے کا پندرہواں حصہ شاہ کبیرے
کو دے گی۔ یہاں بکنے والے تمام مکانوں کا یہی ہوتا ہے اور جانے سے
پہلے خانم شاہ کبیرے کے ہاں مجرا کرے گی"۔
"اور کچھ؟"
"بس یہی"۔
"نہیں کوئی اور بات ہو تو بولو"۔
"بس یہی"۔
"اور اگر خانم ان سب سے انکار کر دے"۔
شاہ کبیرا ہنسنے لگا۔
"نہیں نہیں، بولو، پھر کیا ہوگا؟"
"پھر برا ہوگا"۔
"کیا برا ہوگا؟"
"پھر خانم کو یہاں سے نکلنا مشکل ہو سکتا ہے۔ اس چھوکرے کا
مکھڑا ابھی داغ دار ہو جائے گا اور بھی بہت کچھ ہو سکتا ہے"۔
"تم لوگ کس برتے پر یہ بات کر رہے ہو؟"
شاہ کبیرا دوبارہ ہنسنے لگا۔ اس کا ساتھی جلدی سے بولا۔ "شاہ کبیرا
یہاں کا بادشاہ ہے۔ بادشاہ کس برتے پر بات کرتا ہے"۔ اس نے چاقو
نکال کے اُچھالا اور اس کی دھار پہ انگلی پھیرنے لگا۔
"میں خانم کی طرف سے تمہاری تمام باتوں سے انکار کرتا ہوں"۔
"نہیں نہیں"۔ خانم ہذیانی انداز میں بولی۔
"تم کون ہوتے ہو خانم کے معاملے میں بولنے والے"۔
"ہم اس علاقے کے لوگ ہیں"۔
"زیادہ بک بک مت کرو"۔ شاہ کبیرے نے اپنے ساتھی کو جھڑک
دیا۔ "میں نے بول دیا ہے کہ ہم کو خانم کے مہمانوں کا خیال کرنا چاہیے"۔
"جاؤ شاہ کبیرے! جو دل چاہے کرو"۔ خانم کی طرف سے میں نے
جواب دے دیا ہے"۔
خانم نے اپنا چہرہ دوپٹے میں چھپا لیا۔
"کیوں خانم کیا یہی تمہارا جواب ہے؟"
"نہیں"۔ خانم چیختی ہوئی آواز میں بولی۔ "مجھے تمہاری سب باتیں
منظور ہیں۔ میں پندرہواں حصہ بھی تمہیں دے دوں گی اور میں یہاں سے جانے
سے پہلے تمہارے ہاں ایک دن مجرا کرنے آؤں گی لیکن۔۔۔۔ میں۔۔۔ تم بابر میاں
کو مت بلاؤ"۔
"نہیں خانم! ان سے ایک یہ رعایت بھی کیوں لے رہی ہو"۔
تجمل نے تنک کے کہا۔ "شاہ کبیرے ہم کو تمہاری تیسری بات بھی منظور
ہے۔ اب ہم کیا بولیں، ہم بھی خانم کے مہمان ہیں۔ کچھ اس کا حق بھی ہم پر
ہے۔ بولو تم کہاں لے جانا چاہتے ہو، کس وقت جانا ہے یہ؟"
شاہ کبیرے کو جواب دینے میں تامل ہوا۔ وہ تیکھی نظروں سے تجمل
کو گھورنے لگا۔ اس کے کچھ کہنے سے پہلے اس کا ساتھی نفرت سے بولا "میرا
کے ہوٹل پر چلیں"۔
"چلو، چلو بھئی لاؤ شے! شاہ کبیرا کی بات مان لے۔ مان لے حاجی"
تم گرم چلتا ہے۔ ہم کو کون سا ادھر رہنا ہے۔ خانم! تم بے فکر رہو، ہم لوگ
شاہ کے ساتھ جاتے ہیں اور ابھی واپس آجاتے ہیں۔ شاہ کا آج شُرہ
لینے دو۔ چلو شاہ!"
"نہیں شاہ"۔ خانم رو پڑی۔
شاہ کبیرا کچھ متذبذب ہوگیا تھا۔ اُس نے اپنے ساتھیوں کی طرف
دیکھا اور ایک جھٹکے سے اٹھ گیا۔ "چلتے! مولا کو میرا کے ہوٹل پہ لے کے آ"۔
اُن دونوں اٹھائی گیروں کو بھی ساتھ پکڑ لانا"۔
خانم نے شاہ کبیرے کا دامن پکڑ لیا۔ "خانم! ایک بات مانگو"۔
تجمل نے چیخ کر کہا۔ "ہم مرنے نہیں جا رہے ہیں۔ شاہ کبیرا زبان کا اتنا
ڈھیلا نہیں ہوگا۔ لاؤ لاؤ! ہاتھ اٹھا کے اور دو لفظ منہ سے بول کے صحیح
سلامت واپس آجائے گا۔ شاہ کبیرا کی بات بری سمجھ میں آتی ہے۔ یہ اس
کی ناک کا سوال ہے۔ شاہوں کی ناک سالا اونچی ہوتی ہے۔ کیوں شاہ!
یہی تمہاری خواہش ہے؟"
شاہ نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔
تجمل دروازے پہ آ گیا تھا۔ شاہ کے تینوں ساتھی بھی کھڑے
ہوگئے تھے۔ میں نے جہاں گیر کو خفگی کے ساتھ وہیں ٹھہرنے کی تاکید
کی۔ ہم سب گھر سے باہر آگئے۔ ہوٹل سے کچھ آگے ایک تنگ چورستہ
تھا۔ کبیرے کا ایک آدمی پچھلی گلی سے مڑ گیا تھا۔ آگے آگے شاہ اس کے
پیچھے اس کے ساتھی اور ان کے پیچھے ہم چل رہے تھے۔ جہاں جہاں سے
شاہ گزرا لوگوں نے راستہ چھوڑ دیا اور نظریں چرانے لگے۔ بہت سوں
نے اُسے سلام کیا۔ جواب میں شاہ نخوت کے انداز میں گردن ہلا رہا تھا۔
بالاخانوں پہ کھڑی ہوئی عورتیں اندر چلی گئیں۔ جو باہر رہیں وہ ایک دوسرے
سے کانا پھوسی کرنے لگیں۔ کسی نے شاہ کو آداب کا اشارہ کیا، کسی نے
نازا لگا کے ایک پھول اس کے چہرے پہ مارا۔ گلی کے تقریباً تمام لوگ ہم
سے واقف ہو گئے تھے۔ صبح مولا سے جھگڑے کی خبر بھی شاید سارے ہی
بازار میں پھیل گئی ہوگی۔ لوگ پہلے شاہ کو دیکھتے تھے پھر ہمیں۔
میرا کے ہوٹل پہ آ کے شاہ کبیرا رک گیا۔ ہوٹل کے ادھیڑ عمر مالک نے
فوراً ایک کرسی گلی میں ڈال دی۔ اس کے باقی دو ساتھی تپائی پر بیٹھ گئے۔ ہم نہیں
بیٹھے اور نہ شاہ کبیرا نے ہمیں اس کا حکم دیا۔ ہوٹل کے آگے ٹاٹ کے سائبان
کے نیچے کھڑے رہے۔ ہوٹل کا ایک بیرا شاہ کے پیر دبانے لگا۔ گلی کے
دونوں اطراف بالاخانے تھے اور یہ جگہ نسبتاً زیادہ آباد تھی۔ نچلی منزلوں
کے دروازوں، کھڑکیوں اور کوٹھوں پہ لوگ تماشا کرنے لگے تھے۔ ہوٹل
میں موجود گاہک بھی اپنی اپنی نشستوں سے اٹھ کے چبوترے پہ کھڑے
ہو گئے تھے۔ ہوٹل کے مالک نے آنکھوں آنکھوں میں شاہ کے ساتھی سے
پوچھنے کی کوشش کی کہ شاہ کی برہمی کا کیا سبب ہے۔ اس پر وہ گویا
ہونے لگا۔ "شاہ کبیرے کا ہر آدمی شاہ کبیرے کی جگہ ہوتا ہے۔ کسی...
کوئی شکایت ہو تو اپنے باپ شاہ کبیرے سے بولو۔ اس سے پہلے
اپنے آپ فیصلہ کرنا شاہ کبیرے کی بے عزتی ہے۔ یہ چھوکرا حرامزادہ ش...
کے آدمی مولا کے آگے آیا ہے"۔
"ٹھیک بولتے ہو کالے دادا! ادھر سالا گلی کا سارا لوگ اس با...
خیال رکھتا ہے۔ ابھی ان نے خود کتنا شاہ کو بولا ہے۔ شاہ نے...
دم بر ہم ان کی بات سنتا"۔ ہوٹل کا مالک خوشامدانہ لہجے میں بولا...
ابھی شاہ چھوڑ دو اس کو معاف کر دو"۔
"جان بچ گیا لاؤ بیٹھ ورنہ سالے کو تارے بھی دکھائی نہیں دیتا..."
شخص جس کا نام ہوٹل والے نے کالا بتایا، تھوک کے بولا۔
ہم نے کچھ نہیں کہا۔ شاہ کے آدمی گندی گندی گالیاں بکتے
جاتے تھے۔ وہ چاروں طرف دیکھتے تھے جیسے سب سے مخاطب...
اُن کی شان ہیں لگا رکھا تھا۔ پہلے تو لوگ بے حد دور دور رہے لیکن جب...
کی جانب سے اُن کے گھر سے بچے ہوئے کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا گ...
رفتہ رفتہ اُن کی تعداد بڑھتی گئی۔ بازار کا وقت شروع ہو رہا تھا۔ بازار...
والے تماش بین بھی اس بھیڑ میں شامل ہو گئے۔ گلی میں شاہ کے...
کے سوا کوئی آواز نہیں تھی۔ ہوٹل کا گراموفون بند کیا جا چکا تھا۔...
پولیس والے بھی آگئے۔ شاہ نے صرف اپنی پتلیوں کو جنبش دی تھی...
گئے۔ اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا اور کسی کسی جگہ روشنیاں جل گئی تھیں...
واپس آگیا۔ اس کے ساتھ مولا اور کئی آدمی تھے۔ ان میں وہ لڑکے...
موجود تھے جو صبح مولا کے ساتھ نظر آئے تھے۔ مولا سے اپنے پیروں...
کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا۔ گردن سے لٹکے ہوئے کپڑے میں اس کا...
جھول رہا تھا۔ دوسرے ساتھی کا بھی برا حال تھا۔ انھیں شاہ کے...
کر دیا گیا۔ شاہ کی پشت پر بھی بہت سے لوگ اکٹھے ہو گئے تھے۔ ایک...
نے مولا کی کمر پہ دھپ مار کے آتے ہی دعا کرتے ہوئے یہ...
گرتے گرتے بچا۔
"یہی تھا وہ؟" کبیرے کے ایک دوسرے آدمی نے میری ط...
انگلی اٹھا کے پوچھا۔ "اسے پہچان لے"۔ مولا نے مردنی سے...
کبیرے کا آدمی مڑ کے مجھ سے مخاطب ہوا۔ "چھوکرے! آگے...
بازار کا مجمع ہو گیا ہے"۔
"شاہ کبیرے! اپنا لاؤ لاؤ بس ماننا"۔ تجمل نے اونچی آواز...
"بولتا ہے اس بے عزتی سے بہتر ہے کہ شاہ سے لڑتے لڑتے...
دے دوں"۔
شاہ کی آنکھیں چڑھ گئیں۔ اس نے تجمل کے کوسے...
جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ اس کا سر چکرانے لگا۔ اس کے سا...

اُس کے ساتھ چند قدم آگے بڑھے۔ "طیفو شاہ!" جھجل نے چیخ کر کہا "یہ ہوتا ہے شاہ، چھوٹا شاہ ہے۔ اس میں دم خم نہیں ہے۔ خالی پیلی ہانگ ہوتا ہے۔ نہ اس سے چاقو چلایا آتا ہے اور نہ علاقہ سنبھالنا۔ اس نے علاقے کے سارے لوگوں کو پریشان کر رکھا ہے۔ ہوتا ہے کہ شاہ کو اس جگہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔" ابھی جھجل نے اپنی بات ختم نہیں کی تھی کہ میں نے چاقو نکال لیا۔ "اس کا کہا مان لو شاہ! یہ تمہیں بھرے بازار میں دھمکی دے رہا ہے۔ اس کی زبان اور ہاتھ پیر کاٹ لو۔ اور یہ کوئی غلط بات نہیں کر رہا۔ تم نے بھی کبھی اسی طرح یہاں کھیل تماشا کیا ہوگا۔ یہ ہوتا ہے کہ شاہ کو مجھ سے معافی منگوانی ہے تو چاقو کے زور پہ منگوالے۔ بات ٹھیک ہی ہوتا ہے۔ ابھی تم اس کو سمجھو، میرے تاؤ میں نہیں ہے لیکن ایک بات سن لو۔ تمہارے جواب دینے سے پہلے تمہارے کسی آدمی نے کوئی بھول کی تو یہاں خون ہی خون ہوگا۔ تم میں سے ایک بھی واپس نہیں جا سکے گا۔" جھجل کا لہجہ اکھڑ گیا تھا: "شاہ بولو! کیا بولتے ہو؟"

شاہ کا چہرہ بگڑ گیا۔ اس کے دو تین آدمی چاقو کھولے ہوئے مجھ پر جھپٹنا چاہتے تھے۔ وہ جھجل کی آواز سن کے ٹھہر گئے۔ "کیوں شاہ؟ اپنے تمام آدمیوں کو حکم دو کہ وہ اس کی بوٹی بوٹی کر دیں تاکہ سب کو اس بات کا یقین ہو جائے کہ شاہ کبیر کس برتے پہ بادشاہت کرتا ہے۔ بے عزتی ہی ہونا ہے تو شاہ پھر اس مانگ کیوں نہ ہو۔ بازار کے لوگ بھی دیکھ لیں گے کہ شاہ نے ایک چھوکرے کو کس طرح مارا۔"

"چپ ہو! اس پہ چاقو اُٹھانا بے عزتی ہے۔" شاہ کبیر گرج کے بولا۔

"تو مجھ پہ اُٹھاؤ، پھر اس کی حسرت دل میں باقی نہ رہے گی۔ بہتر ہے شاہ پہلے اسے ختم کر دو، پھر مجھ کو دیکھنا۔"

"چھوکرے سے بولو، مان جائے۔"

میں نے جیسے ہی شاہ کی طرف چاقو لہرایا، جہان گیر پھر بکواس کرتا ہوا آکے میرے بازو سے لپٹ گیا۔ میں نے اُسے دھکیل دیا۔ "میں اس کی طرف سے تم سے معافی مانگتا ہوں۔" وہ شاہ کے سامنے ہاتھ جوڑ کے کھڑا ہو گیا۔

جھجل نے جہان گیر کو کھینچ لیا اور اس کے گال پر ایک طمانچہ رسید کیا۔ "کیوں شاہ، قبول ہے؟ جلدی بولو یا پھر اسی طرح واپس چلے جاؤ۔ بازار کے لوگ اسے بھی تمہاری بڑائی سمجھیں گے۔"

"میں اس کی حسرت ضرور پوری کروں گا۔" شاہ غرانے لگا۔

"لیکن پہلے اپنے آدمیوں سے وصیت کر جاؤ۔"

"تو اس چھوکرے سے پوچھ لے کہ اس کی کوئی آخری خواہش ہے؟"

شاہ کبیر نے پھر کے کہا: "اسے پانی پلا دو۔"

"یہ لال پانی پینے کا عادی ہے۔"

"نہیں شاہ!" مجمع میں سے ایک لرزتی ہوئی نسوانی آواز آئی۔ وہ خانم تھی۔ خانم ہجوم کے بیچ چل آئی تھی۔ وہ شاہ کے پیروں پر گر گئی۔ شاہ نے اُسے ٹھوکر ماری اور ایک جھرجھری لی جیسے جانور جسم کی دھول جھاڑ رہا ہو۔ میری طرف سینگ مارنے کے انداز میں آیا۔ وہ مجھ سے اتنا قریب ہو گیا کہ میرے اور اس کے درمیان فاصلہ چند ہی انچ رہ گیا ہوگا۔ اُس نے بائیں ہاتھ سے میرا سینہ ٹھونکا۔ میں نے بھی یہی عمل کیا۔ شاہ کبیر ایک جھٹکے میں مجھ سے دور ہو گیا۔ اس نے ایک طرف ہاتھ پھیلایا، کسی نے چاقو اُچھالا جو شاہ نے اس طرح اُچک لیا جیسے شکرا اپنا شکار جھپٹ لیتا ہے۔ وہ چاقو تانے میرا انتظار کرنے لگا۔

اسی لمحے جھجل نے چاروں طرف نظر گھما کے بالا خانوں پہ اور گلی میں کھڑے ہوئے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا: "تم سب آنکھیں کھلی رکھنا اور شاہ کو جتنا دیکھنا ہے دیکھ لو۔ اس کے بعد یہ صورت تمہیں نظر نہیں آئے گی۔ مجھ کو پتہ ہے تم سب اسے دوبارہ دیکھنا چاہتے ہو یا نہیں۔"

شاہ نے جھجل کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی۔ وہ میری طرف متوجہ تھا۔ شاہ نے اپنا چاقو ہتھیلی اور کلائی سے اس طرح چپکا لیا تھا کہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ مجمع میں سوئی بھی گرتی تو آواز آتی۔ میں نے پہل کی اور شاہ کی طرف بڑھا۔ وہ اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔ میں پلٹ کے دوبارہ یہی عمل دہرایا۔ شاہ پھر جھکائی دے گیا۔ میرا مقصد وار کرنا نہیں تھا۔ صرف شاہ کی پھرتی کا اندازہ لگانا تھا۔ اس میں اچھی خاصی پھرتی تھی۔ اس نے بھی پہل کرنے کی جلدی نہیں کی۔ میں نے زیادہ پستی اس لیے نہیں دکھائی تھی کہ شاہ فوراً میرے بارے میں کوئی رائے قائم نہ کر سکے۔ اس کی خواہش یقیناً یہ ہوگی کہ وہ پہلے ہی حملے میں میرے ہاتھ سے چاقو چھین لے مگر جہاں اتنے لوگ موجود ہوں وہاں یہ بے احتیاطی نہیں کی جا سکتی۔ شاہ اپنی خواہش کے باوجود ہر احتیاط کا خیال رکھے گا۔ میری نظریں پوری طرح شاہ اور اُس کی ایک ایک حرکت پر مرکوز تھیں۔

شاہ کے آدمیوں کے لیے شاہ کے خلاف فوراً کوئی فیصلہ ہونا اُن کی برہمی کا سبب بن سکتا تھا۔ مجھے کسی ایسے داؤ کا موقع ملنا چاہیے تھا کہ شاہ کے ساتھی بعد میں کسی قسم کا شکوہ نہ کریں۔ شاہ نے دو تین بار اُچھل کے میرے وار [illegible] آسانی خالی دے لیے تو میں اس سے کچھ دوری پر کھڑا ہو کے اُسے گھورنے لگا۔ پھر میں نے دونوں ہاتھ پھیلا لیے اور شاہ پہ یہ ظاہر کیا کہ میں چاقو مارنے کا دائرہ وسیع کر رہا ہوں اور میرا مُدعا اس کے بچنے کی جگہ تنگ کرنا ہے۔ یہ کوئی چوڑی گلی نہیں تھی۔ لوگوں کے گھیرے کے درمیان جو جگہ چھوڑی تھی وہ کم تھی۔ اس طرح آگے بڑھنے میں شاہ کا رد عمل یہی ہو سکتا تھا کہ وہ میرے بازوؤں کے دائرے میں چلا آئے اور اس سے پہلے کہ میں کچھ کر سکوں، وہ خود ہی جھٹکے

میرے سینے پر چاقو رکھ دے۔ میں نے دو قدم ہٹ کے خود کو اس کے مقابل کیا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ شاہ آگے آنے کا خطرہ مول نہ لے اور کسی دوسری طرف نکلنے میں کامیاب ہو جائے۔ شاہ کو لمحوں میں اپنے آئندہ اقدام کے بارے میں جو بات مجھے سمجھانی تھی، اُس نے اُسے اسی طرح سمجھا جس طرح میں چاہتا تھا۔ اس میں اس کے لیے خطرہ کم میرے لیے زیادہ تھا۔ کوئی بھی ایسی تنگ جگہ پہ ہاتھ کھول کے مقابل کو براہ راست سینے تک آنے کا موقع نہیں دے گا۔ میں نے اُسے اس کا موقع دیا تھا کہ وہ مجھ سے تیز آگے بڑھ سکے اور یقین کرے کہ جب وہ میرے سینے میں چاقو کی نوک پیوست کرے گا تو میں اپنے پھیلے ہوئے ہاتھ سمیٹ کے اس کے گرد بھی چاقو نہیں مار سکوں گا۔ اس وقت میری گرفت کمزور پڑ جائے گی یا میں بوکھلا جاؤں گا۔

وہ میرے اس بچگانہ داؤ کا یقین کر چکا تھا کیونکہ ابھی تک میرے بارے میں اس کی رائے بھی نہیں تھی۔ اُسے میری کوشش فہمی سے فائدہ اُٹھانا چاہیے تھا۔ اُس نے چاقو بائیں ہاتھ میں لے لیا اور اپنا ایک ہاتھ ۴۵ ڈگری کے زاویے سے اُٹھاتے ہوئے مجھ پہ لپکا۔ اس کا رُخ سیدھا میری چھاتی کی طرف تھا لیکن اگر میں اسی داؤ پہ قائم رہتا جس کا تاثر میں نے شاہ کو دیا تھا تو اُسے نشانہ لگانے میں دیر نہ ہوتی۔ اس صورت وہ کسی قدر ترچھا ہو کے اور جسم کو گھما کے چاقو مارتا تاکہ میں جوابی وار کروں تو میرے چاقو بردار بائیں ہاتھ کی رسائی اس کے جسم تک نہ ہو سکے اور میں کوئی پینترا بدل لوں تو وہ آسانی سے دائیں جانب نکل جائے۔ وہ ہر طرح مطمئن ہو کے جست لگا کے آگے آیا۔ ادھر وہ بڑھا، اُدھر میں لیکن وہ جھک کے میرے سینے پہ چاقو گھونپنے ہی کو تھا کہ میں بھی اچانک جھک گیا اور میں نے نیچے سے اُس کا چاقو والا پنجا پکڑ لیا۔ شاہ ایک لمحے کے لیے سکتے میں پڑ گیا، پھر جھکولے لگا۔ اس نے اپنا پنجا چھڑانے کی بہت تگ و دو کی۔ میرا چاقو والا ہاتھ آزاد تھا۔ شاہ نے اُسے معذور کرنے کے لیے میری کلائی پکڑ لی اور میری نس پہ ناخن کا دباؤ ڈال دیا۔ میں نے بھی اس کا پنجا مروڑنا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شاہ نے اپنا ناخن نس سے ہٹا لیا۔ میں پکڑی ہوئی کلائی کے باوجود اس کے شانے پہ نوک ضرور چبھو سکتا تھا مگر میں نے یہ نہیں کیا۔ میرے جی میں آئی کہ اپنا چاقو پھینک دوں لیکن اس طرح اس کی ساری توجہ میری پکڑ سے اپنا پنجا چھڑانے پہ مبذول ہو جاتی اور فیصلہ جلد ہی ہو جاتا۔ شاہ کو مجھ سے اتنی تیزی کی توقع نہیں ہوگی۔ فاصلہ بہت کم تھا، اُس کے سان و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ میں اتنے کم فاصلے پہ زاویہ بدل لوں گا۔ وہ اپنے جسم کی پوری طاقت صرف کر رہا تھا اور گالیاں بھی بک رہا تھا۔ میری ماں اور بہنیں اتنی بیمار زادیاں ہو گئی تھیں کہ کوئی بھی انہیں گالی دے دیتا تھا۔ شاہ اپنا

پنجا نہیں چھڑا سکتا تھا۔ چاقو پر اس کی گرفت مضبوط تھی مگر وہ مجبور تھا۔ تھوڑی دیر میں نے اُسے دھکیلتے ہوئے اس کا پنجا چھوڑ دیا۔

مجھے یقین تھا کہ شاہ کے حملوں میں شدت آ جائے گی اور وہ شور بھی زیادہ مچانے لگا۔ لوگوں کو اس بات پہ حیرت ہوئی ہوگی کہ میں شاہ کے پنجے سے اتنی آسانی سے کیوں دست بردار ہو گیا۔ میں نے جھجل کی طرف نظر کی تھی۔ اس نے اپنی آنکھیں بند نہیں کی تھیں۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ شاہ مجھ پہ پے در پے وار کرنے لگا۔ میں کبھی ادھر کبھی اُدھر، کبھی پیچھے ہٹتے کبھی آگے کے مینے کے جھینگا نثار کی طرح اسے دائرے میں گھما رہا۔ وہ ہواؤں میں ہاتھ مارتا رہا۔ اس کی سانس پھول گئی تھی اور ماتھے سے پسینہ بہنے لگا تھا۔ وہ بار بار چاقو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کرتا اور مجھے فریب دینے کی کوشش کرتا۔ کبھی وہ چیتے کی طرح دہاڑ کے جھپٹتا لیکن اس کی کوئی تدبیر کارگر نہیں ہو رہی تھی۔ بے شک اس نے میری آستین پھاڑ دی تھی لیکن وہ چاقو میری جلد تک نہ پہنچا سکا۔ "بس لاڈلے! آنکھیں تھک گئی ہیں۔" مجھے جھجل کی آواز سنائی دی۔ "جلدی کر، لوگوں کو کام پہ بھی جانا ہے۔"

"کیا کروں؟" میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر پوچھا کیونکہ اس دوران میں صرف ایک شخص دیکھا جا سکتا تھا اور وہ تھا شاہ کبیر۔ مجھے اتنا بھی ہوش نہیں تھا کہ کون کہاں کھڑا ہے؟ جہان گیر اور خانم کو کیا ہوا ہے؟ شاہ کا پنجا پکڑنے کے بعد میں نے ایک ہی لمحے کے لیے جھجل کو دیکھا تھا۔ جہان گیر اور خانم میں سے کوئی نظر نہیں آیا تھا۔

"کاٹ دے۔" جھجل نے پُرسکون آواز میں جواب دیا۔

یہ سن کے میں نے مدافعت ختم کر دی اور اس کے وار سے پہلو بچا کے ایک کونے میں چلا گیا۔ جھجل نے جس بات کی طرف اشارہ کیا تھا، وہ آسان نہیں تھی۔ میرے سامنے کوئی اور شخص نہیں، شاہ کبیر تھا۔ اس علاقے کا سب سے بڑا چاک دست آدمی۔ جھجل کی ہدایت پہ مجھے بہت احتیاط سے عمل کرنا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چمکتی ہوئی دھار کا چاقو تھا اور وہ اچھے خاصے داؤ پیچ بھی جانتا تھا۔ درمیان میں خود ہی داؤ پہ داؤ نکل آتے ہیں لیکن تمام امکانی داؤ نظر انداز کر کے کسی ایک داؤ کا موقع تلاش کرنا مشکل کام ہے۔ اس اثنا میں ذرا بھی کوئی بے بس ہو جائے تو سارا معاملہ اُلٹا ہو سکتا ہے۔ مجھے سب سے پہلے اُس کا چاقو چھیننا تھا۔ اس کی تدبیر ایک تو وہی تھی جو میں نے تیزی کے ساتھ کی تھی کہ اپنا چاقو پھینک کے اس کا دھیان بٹا دوں مگر چاقو ایک بار ہاتھ سے نکلنے کے بعد دوبارہ حاصل کرنے میں دشواری پیش آ سکتی تھی اور مجھے چاقو کی ضرورت تھی۔

شاہ کبیر کچھ سوچ کے سنبھل گیا تھا۔ اب کے میں اس کی طرف گیا۔ کبیر نے مجھے بڑھنے دیا مگر میں درمیان ہی میں رک کے آٹھ قدم

ہوئی وحشت زدہ سی کمرے میں داخل ہوئی۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ جہاں گیر نچلی منزل پر مولوی صاحب سے پڑھنے گیا تھا۔ میں کمرے میں اکیلا ہی تھا۔ خانم آتے ہی خفگی سے کہنے لگی: "یہ تم نے کیا کیا؟ مجھے بھی نہیں بتایا! میں نے لاعلمی ظاہر کی تو اُس کی آواز تیز ہو گئی: "آخر تم نے اتنی بڑی رقم اُسے کیوں دے دی؟"

میں نے آہستگی سے کہا: "آپی! اُس نے یہی طلب کیا تھا۔ میں نے اپنی طرف سے کچھ روپے بڑھا دیے۔"

"ایسا ہی تھا تو تم مجھ سے کہتے اور دیکھتے کہ میں اُسے کیسے تیار کرلیتی۔ تم وہاں اکیلے کیوں چلے گئے؟"

"اب چھوڑیے آپی! آدمی کی قیمت روپوں میں نہیں لگائی جا سکتی۔ نیساں بہت پیاری لڑکی ہے، وہ بہت معصوم ہے اور یہاں رہنا نہیں چاہتی۔ جو شوکت آرا کی قسمت میں لکھا تھا وہ اُسے مل گیا۔ وہ اُس کی ماں بھی تو ہے۔ یہ بھی تو دیکھیے کہ وہ اپنی بیٹی کی جدائی کے لیے تیار ہو گئی ہے۔" میں نے دبے دبے لہجے میں کہا۔

"ماں!" وہ چیخ کے بولی: "کس کی ماں۔ وہ ماں ہوتی تو اپنی بیٹی کے لیے اتنی جلدی یہ فیصلہ کرتی۔ کوئی ماں اپنی بیٹی کو اس طرح جدا نہیں کرتی۔ نیساں کی ماں نہ جانے کہاں ہوگی۔" میں حیرت سے اُس کا چہرہ دیکھنے لگا۔ "میں اُس سے چیک واپس لے رہی ہوں۔" خانم نے برہمی سے کہا۔

"نہیں آپی! میں اُس سے وعدہ کرچکا ہوں۔"

"مگر تم نے مجھ سے ذکر کیوں نہیں کیا؟"

"مجھ سے غلطی ہو گئی۔ مجھے اچھا بھی نہیں لگتا تھا۔" میں نے ہچکچاہٹ سے کہا۔

"میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر آپ نیساں کو ساتھ رکھنے پر تیار نہیں ہوں گی تو میں اُسے کہیں اور چھوڑ آؤں گا۔ آپ جہاں گیر، نجل بھائی اور نیساں کو کچھ مت بتائیے گا۔ نیساں ہمیشہ اپنے آپ کو بوجھ سمجھے گی۔ روپے کا کیا ہے۔ روپے اور آجائیں گے۔ اگر شوکت آرا اپنی مرضی کے مطابق نیساں کو محفل میں بٹھاتی تو کیا وہ اس سے زیادہ حاصل نہیں کرسکتی تھی؟"

"کرسکتی تھی۔" خانم تیزی سے بولی: "مگر بعد میں نیساں کے تمام دکھ بھی تو آپ نے اٹھانے پڑتے۔ وہ مُول پوچھی تو کھل رہتی۔ وہ نیساں پر خرچ بھی تو کرتی اور کچھ دنوں بعد نیساں ہی اُس کے دھن دولت کی ضمانت ہوتی۔ نیساں کی زبان اور دیدے کھلنے تو شوکت کے دل پر آرے بھی تو چلتے۔ محفل میں بیٹھی ہوئی لڑکی پر ہزار نظریں پڑتی ہیں اور کسی وقت بھی کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ وہاں کوئی ایک آدمی نہیں آتا۔ تم نے نہ جانے اُس سے کس طرح بات کی۔ تم اُن لوگوں کو نہیں جانتے۔ تم نے یہ کیا کر دیا؟"

"جانے دیجیے آپی! دیکھیے نیساں آپ سے کتنی محبت کرتی ہے۔ وہ ہمارا کتنا خیال رکھتی ہے۔ میں نے دیکھا ہے جہاں گیر کے کپڑے بھی وہ دھوتی ہے۔ اس دن مرزا سے جھگڑے کے درمیان جہاں گیر کا قمیص پھٹ گئی تھی تو وہی اُسے سی رہی تھی۔"

"لڑکیاں گھر کا کام کرتی ہی ہیں۔"

"اور لڑکیاں گھر ہی کا کام کرتے ہوئے اچھی بھی لگتی ہیں۔"

خانم نے مجھ پر بہت زور دیا کہ میں چیک منسوخ کر دوں، وہ شوکت آرا سے نئے سرے سے بات کرے گی۔ میں نے خانم سے التجا کی کہ اب وہ اس سلسلے میں شوکت آرا سے کوئی بات نہ کرے۔ خانم بہت جزبز ہوئی اور مجھے شکایتی نظروں سے دیکھتی ہوئی چلی گئی۔ میں دیر تک نیساں کا انتظار کرنے لگا۔ بہت دیر ہو گئی۔ نیساں نہیں آئی۔

نجل سہ پہر کو تھکا ہوا سا گھر واپس آیا۔ شاہ کبیر کے واقعے کو ایک دن گزر چکا تھا۔ خانم اور جہاں گیر کے ابھی تک رخسار تمتمائے ہوئے تھے۔ شام کو کالے دلو پٹھانی کے نوکروں سے لا چند گھر میں داخل ہوا۔ خانم بھی وہیں بیٹھی تھی۔ کالے دادا اُس سے معافی مانگنے لگا۔ خانم کے ہونٹوں پر لرزہ طاری ہو گیا۔ کالے دادا نے فوراً اپنا چاقو نکال کے خانم کے پیروں میں رکھ دیا اور لرزا کر خانم اُس کے لیے جو سزا تجویز کرے وہ اُس کے لیے تیار ہے۔ خانم نے اپنے پیر سمیٹ لیے اور سر جھکائے چپ بیٹھی رہی۔ کالے دادا نے اُس سے درخواست کی کہ وہ کچھ دن اور ٹھیر جائے۔ خانم نے لب نہیں کھولے۔ وہ خود ہی کہنے لگا کہ مکان واپس کیا جا سکتا ہے۔ ہم چنگاری باقی کر رہا دیں گے لیکن خانم نے ہامی نہیں بھری۔ اُس نے کالے دادا کی کسی بات کا جواب نہیں دیا۔ کالے دادا مایوس ہو کے نجل کے پیر دابنے لگا۔

اُسی رات خانم نے اپنا ہلکا پھلکا سامان سمیٹنا شروع کر دیا۔ اُس نے اپنے بہت سے کپڑے لوگوں میں بانٹنے کے لیے علیحدہ کر دیے۔ نیساں اُس کی مدد کر رہی تھی۔ اُسے یقین آگیا تھا کہ وہ بھی ہمارے ساتھ چل رہی ہے۔ اُس کے قدم زمین پر نہیں پڑتے تھے۔ وہ پورے گھر میں اس طرح بھاگی بھاگی پھر رہی تھی جیسے بہت دنوں بعد اپنے میکے جا رہی ہو۔ وہ میری طرف دیکھ کے شرمانے لگتی تھی۔ پانی دانی جانے والی ٹلن ٹلن جب بھی اُسے میرے سامنے آنے کا موقع ملتا، وہ یہی کرتی رہتی۔ میں ہر بار اُس سے کچھ نہ کچھ منگوا لیتا تھا۔ کام کر کے اُس کا شہابی رنگ دہکنے لگتا تھا۔ اُس کی سانس ہمیشہ پھولی پھولی رہتی تھی۔ چتری ادھر جاتی

تھی، بال اُدھر بکھرے ہوئے ہوتے تھے۔ اتنی تیزی کو ایسی حالت میں دیکھ کے ہمیشہ ڈرتی تھیں کہتی تھیں "ساری دیوانی! ذرا دوپٹا تو سر سے ٹکا کے رکھا کر۔ اور یہ کیسی اُلٹی سیدھی چلتی ہے۔ اوسان میں رہا کر۔" تیتی بھی ہرنی کی طرح گھر میں چوکڑیاں بھرتی پھرتی تھی۔

دوسرے ہی دن ارجی بائی نے خانم کو مکان کے باقی روپے یک مشت ادا کر دیے۔ اُسے اندازہ ہو گیا تھا کہ دیر ہو جانے سے خانم کا ارادہ بدل سکتا ہے۔ اُس دن نواب بہادر کا ہرکارہ اُن کا ایک پیغام لے کے خانم کے پاس آیا۔ اُس نے نواب بہادر کی طرف سے پہلے خانم کو ایک طشت پیش کیا۔ طشت میں ستاروں سے ٹکا ہوا ریشمی جوڑا، سونے کی چوڑیاں، انگوٹھی سرخ نگینے کی، انگوٹھی گلاب کے تازہ پھول رکھے ہوئے تھے۔ نواب بہادر نے خانم کو بلایا تھا اور یہ وضاحت کر دی تھی کہ وہ گانے کے لیے نہیں بلا رہا ہے بلکہ خانم سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہے۔ خانم نے نواب کے تحائف کا شکریہ ادا کرتے ہوئے طشت ہرکارے کو واپس کر دیا اور بولی: "کنیز پر پہلے ہی نواب بہادر کے بہت احسانات ہیں۔ اب کنیز کو ان چیزوں کی ضرورت نہیں۔ نواب بہادر کو میری تسلیم کہنا اور کہنا کہ میں انھیں کبھی نہیں بھولوں گی لیکن کنیز نے اپنے بارے میں ایک فیصلہ کر لیا ہے۔ خدا نواب بہادر کا اقبال قائم رکھے۔ کہنا کہ اُن کی تمام باتیں بہت دل پر نقش ہیں مگر کنیز اپنی حیثیت سے خوب واقف ہے۔"

مجھے پتہ بھی نہیں چلا کہ کون آیا تھا اور خانم نے اُسے واپس کر دیا۔ میں اُس وقت کمرے میں نجل کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ نیساں پیچھے کمرے میں آگئی اور جیسے ہی رقعہ ملا مجھے باہر آنے کا اشارہ کرنے لگی۔ میں اُدھر چلا آیا۔ نیساں زینے سے ملحق کوٹھری میں میرا انتظار کر رہی تھی۔ اُس نے ہانپتے کانپتے یہ تمام باتیں مجھے بتائیں اور پریشانی سے کہنے لگی: "اگر نواب بہادر نے آپی کو روک لیا تو......! وہ بہت بڑے آدمی ہیں۔"

"ہوا کریں۔" میں نے ترشی سے کہا۔

اندھیرے کی وجہ سے میں نیساں کا چہرہ نہیں دیکھ سکا۔ زینے میں کوئی بھی آسکتا تھا۔ میں اُس کا شانہ تھپتھپا کے نیچے اُتر آیا۔ بیٹھک میں خانم نجل سے اصرار کر رہی تھی کہ اب جتنی جلدی ممکن ہو یہاں سے چلنا چاہیے۔ نجل نے اُسے تحمل کی تلقین کی اور کہا کہ ایک دو دن تک اُس کا یہاں رہنا کچھ ضروری ہے مگر خانم کا اصرار بڑھتا گیا۔ ابھی بینک سے کم از کم ایک دن اور لگنا چاہیے تھا۔ میں نے شوکت آرا سے وعدہ کیا تھا کہ جب تک اُسے بینک سے رقم مل جانے کا یقین نہیں ہو جائے گا، میں نیساں کو ساتھ نہیں لے جاؤں گا لیکن یہ تو میری اور شوکت آرا کی بات تھی۔ نجل یہاں اور ٹھیرنے کو کیوں کہہ رہا تھا؟ یقیناً اُسے یہ کسی گڑبڑ کا اندیشہ تھا۔ خانم کے اچانک اصرار پر نجل کچھ گم گشتہ سا نظر آتا تھا اور خانم پر جیسے ایک ایک لمحہ گراں گزر رہا تھا۔ اس کے لہجے میں لرزش تھی۔ نجل کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس نے شجاعت کے ذریعے کیے داوا کو اوقیے سے بلوا لیا اور اُسے بتایا کہ ہم سب ابھی چپ چاپ لاہور سے جانا چاہتے ہیں۔ کالے کو یقین نہیں آیا۔ وہ ابھی کچھ دن اور ٹھیرنے کے لیے نجل سے ضد کرنے لگا۔ میں نے یقیناً بہ نارا چاہا کہ کیا ایک کے بیچ جانا ملتوی کر دیا جائے۔ کل تک شوکت آرا کے چیک کا جواب بینک سے ضرور آ جائے گا۔ جانے جانے کی خبر دو شخص نہیں رہ سکتی تھی، میرے کانوں میں بھنک پڑ گئی تو وہ نیساں کے آڑے آسکتی ہے۔ ممکن ہے مگر ہم بھی کسی سبب ہی سے گھر سے جلد از جلد نکل جانے پر زور دے رہی تھی۔ شاید نواب کے ہرکارے سے کوئی ایسی بات ہوئی تھی جو نیساں بھی نہیں سُن سکی۔ کالا دیوں کا وقت مقرر ہوتا ہے۔ خانم کو راضی کرنا بھی لا حاصل نہیں تھا۔ میں نے پھر اپنی بات اپنے آپ تک محدود رکھی۔ اب یہی ہو سکتا تھا کہ شوکت آرا دوانے تو میں ایک دن کے لیے رک جاؤں۔ نجل چاہے تو کچھ گھر میں نیساں کے ساتھ اس کے گھر ٹھیر جاؤں گا اور جہاں گیر نجل کے ہمراہ چلے جائیں، ممکن ہے مجھے ایک دن کے بجائے دو دن لگ جائیں۔ ایک دو دن بعد جہاں وہ بتائیں گے میں اُن کے پاس آ جاؤں گا۔ میرا چیک بالکل درست تھا۔ دستخط میں نے ٹھیک کر دیے تھے اور رقم کے اندراج میں پوری احتیاط برتی تھی۔ شوکت آرا نے زیادہ خیال کیا تو مجھے بھی اب رُکنے سے پیش آنے کی ضرورت تھی۔ وہ شاہ کبیر کے واقعے کا حال سُن چکی ہوگی اور مجھ سے زیادہ حسن ظن نہیں کرے گی۔ پھر خود نیساں اُس کے ہاں ٹھیرنے پر کہاں آمادہ تھی۔

خانم نے ارجی بائی کو بلوا کے گھر کی چابیاں اُس کے حوالے کر دیں۔ کالے دادا اور اُس کے ساتھیوں نے ہمارا مختصر سا سامان اپنے ہاتھوں میں اٹھا لیا۔ نیساں اور خانم دونوں نے سیاہ برقعے پہن رکھے تھے۔ کالے برقعے میں نیساں کا چہرہ چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ گلیوں میں اس وقت بہت بھیڑ تھی۔ ہر طرف سے گانے بجانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ہمارا سامان آگے چلا گیا تھا۔ پیچھے پیچھے ہم پیدل ہو لیے اور بازار کے باہر سڑک پر کھڑی ہوئی دو موٹروں میں بیٹھ گئے۔ ان موٹروں کا انتظام کالے دادا ہی نے کیا تھا۔ چلتے وقت خانم کی بوڑھی ملازمہ خانم کے گلے لگ گئی تھی۔ اُس کی بیٹی الفت بھی پھوٹ پھوٹ کے رو رہی تھی۔ خانم کے دونوں ملازم شجاعت اور امّی نور ہمیں اسٹیشن پہنچانے آئے تھے۔ خانم نے انھیں وہیں سے واپس کر دیا حالانکہ وہ اسٹیشن چلنا چاہتے تھے۔ خانم نے ان سب کو معقول رقم دے دی تھی۔ جب موٹریں روانہ ہوئیں تو میرے اوسان بحال ہوئے۔ اب یہ خطرہ نہیں رہا تھا کہ شوکت آرا دریافت

ہیں آجائے گی۔ بس اتنی سی بات تھی کہ گاڑی کے انتظار میں ہمیں اسٹیشن پر ٹھہرنا پڑے۔ اس کا بھی امکان کم تھا۔ تجمل نے کالے دادا کو حکم دیا تھا کہ اس وقت جو بھی گاڑی حیدرآباد سے باہر جاتی ہو، ہم اسی سے روانہ ہو جائیں گے۔ بیٹھک میں کالے دادا اور تجمل کے درمیان ہونے والی گفتگو سے پہلی بار مجھے یہ پتہ چلا تھا کہ تجمل دلّی کی طرف جانا چاہتا ہے۔ دلّی کی گاڑی کا وقت نہیں تھا۔ کاچی گوڑا اسٹیشن سے ہمیں اورنگ آباد کے لیے گاڑی مل سکتی تھی۔ وہاں بمبئی سے آنے والی گاڑی ہمیں دلّی کی طرف لے جاتی۔ ہم کاچی گوڑا اسٹیشن پر اتر گئے لیکن ابھی ہم پلیٹ فارم پر پہنچے بھی نہیں تھے کہ پولیس کی ایک گاڑی تیزی سے آ کے رکی۔ اس کے پیچھے ایک بڑی سی سیاہ موٹر کار تھی۔ لمحوں میں پولیس والے گاڑی سے اتر گئے اور سیدھے ہماری طرف جھپٹنے لگے۔ دفعتہً خانم کی چیخ نکل گئی۔ "نواب بہادر!" اس نے وحشت زدہ لہجے میں کہا۔ "آخر انھیں خبر ہو گئی۔"

"کیسے خبر ہو گئی؟" تجمل نے چونک کے پوچھا۔

"وہ... وہ یہاں آ گئے ہیں۔" خانم نے حواس باختگی سے گاڑی کی طرف اشارہ کیا۔ پولیس ہمارے اطراف آ کے ٹھہر گئی تھی۔ چند ثانیوں بعد موٹر سے سفید شیروانی میں ملبوس ایک دراز قامت شخص برآمد ہوا۔ اس کا جسم بھاری نہیں تھا۔ رنگ کھلتا ہوا گندمی۔ آنکھیں بڑی بڑی۔ سر پہ ترکی ٹوپی۔ چال میں وقار۔ عمر پینتالیس سال سے زیادہ نہیں ہو گی۔ اس کے ساتھ دو شخص اور تھے جو اس کے خاص ملازم معلوم ہوتے تھے۔ نواب بہادر آہستہ آہستہ چلتا ہوا ہمارے پاس آ گیا۔ خانم نے اپنی نقاب اٹھا دی تھی۔ "آپ!" وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے بولی۔ "آپ یہاں کیسے آ گئے؟"

"ہم تمھیں لینے آئے ہیں خانم!" نواب نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

"کہاں؟" خانم سٹپٹا کے بولی۔

"محل میں۔" نواب نے ٹھہرے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

"کیا ہرکارہ آپ کے پاس نہیں پہنچا؟ میں نے آپ کو پیغام بھجوا دیا تھا۔ اور اپنی معذوری ظاہر کر دی تھی۔"

"ہمیں معلوم ہو گیا ہے لیکن ہم تم سے اس سلسلے میں کچھ بات کرنے کے خواہش مند تھے اس لیے خود یہاں چلے آئے۔"

"میں نے پیغام رساں پہ یہ بات واضح کر دی تھی۔" خانم پژمردگی سے بولی۔ "آپ نے کیوں زحمت کی؟"

"ہم تمھارے لیے بہت سی زحمتیں اٹھا سکتے ہیں۔"

"آپ کی نوازشیں مجھ پر بے پناہ ہیں لیکن کنیز نے جو عرض کیا ہے اُسی پہ قائم رہنا چاہتی ہے۔ کنیز اس شہر سے رخصت ہو رہی ہے۔"

"ہم دیکھ رہے ہیں۔" نواب نے ہماری طرف خشمگیں نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "سمجھنے کی کوشش بھی کر رہے ہیں۔ بھلا ہمیں حق نہیں آتا کہ تم اس طرح اچانک ہم سے دُور ہو سکتی ہو۔"

"مجبوری کچھ ایسی ہی ہے۔" خانم نے تھرّائی آواز میں کہا۔

"ہم وہی تو جاننا چاہتے ہیں۔ کیا تم ہمیں نہیں بتاؤ گی؟"

"آپ نہ پوچھیے اور ایسی کوئی خاص بات بھی نہیں ہے۔"

"پھر بھی ہم یہ جاننے کے لیے بے تاب ہیں کہ تم نے ہمیں اطلاع دیے بغیر اتنی عجلت میں یہ فیصلہ کیوں کر لیا۔ جہاں تک بازار ترک کرنے کا تعلق ہے ہم کون سا اسے پسند کرتے تھے۔ ہم نے تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ تم جب چاہو چلی آنا۔ ہمارے دروازے کھلے ملیں گے۔ تم ادھر کیوں نہیں آئیں؟ آخر ہم سے کون سی لغزش ہو گئی ہے؟"

"ہے ہے۔ آپ سے کوئی لغزش کیوں ہوتی۔ اللہ ایسی باتیں مت کیجیے۔ خدا گواہ ہے کہ کنیز کے دل میں آپ کا کیا مرتبہ ہے۔" خانم بے بسی سے بولی۔

"تو پھر تم نے ہم سے یہ بے اعتنائی کیوں برتی خانم! اس کا کوئی سبب تو ضرور ہو گا۔ ہم فردِ جرم سننے آئے ہیں۔ اگر تم ہمیں کچھ بتائے بغیر چلی گئیں تو ہمیں چین نصیب نہیں ہو گا اور تم ہمیں کس کے آسرے چھوڑ کے جا رہی ہو؟ کیا تمھیں یاد نہیں رہا۔ ہم نے اپنے بارے میں تم سے کیا کچھ نہیں کہا تھا۔ ہم تمھاری ہر مجبوری ختم کرنے کی کوشش کریں گے۔ ہمیں بتاؤ۔ ہم تمھارے لیے نہ جانے کیا کیا کر سکنے پہ قادر ہیں۔"

"اس قدر نادم نہ کیجیے کنیز کے شانوں پر پہلے ہی بہت بوجھ ہے۔"

"ہمیں بتاؤ خانم! ہم سے کچھ مت چھپاؤ۔"

"میں آپ کو کیا بتاؤں۔" خانم بے بسی سے بولی۔

"کوئی خوف مت کرو۔ ہم تمھارا خوف ہی تو دُور کرنے کے لیے آئے ہیں۔ ہمیں بتاؤ۔ ہم ہر دیوار ڈھا دیں گے۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ فیصلہ تمھارا نہیں ہو گا۔"

"میرا ہی ہے۔" خانم تیزی سے بولی۔ "کوئی اور اس میں شریک نہیں ہے۔ کوئی دیوار نہیں کچھ بھی نہیں۔"

"نہیں۔" نواب نے افسردگی سے کہا۔ "ہم کس طرح یقین کر لیں؟"

"میں آپ سے کہہ رہی ہوں۔"

"ہمیں شک ہے کہ یہ تم کہہ رہی ہو خانم! ہم بھی کچھ ارادہ ہی کر کے آئے ہیں۔ ہم تمھیں یوں کیسے جانے دیں ورنہ یہ چند لوگ اس شہر میں ہمارا نام لیتے ہیں انھیں ہم کیا منہ دکھائیں گے۔ تمھاری بیزاری اگر ہمارے لیے ہی نہیں تو ہمیں اپنا نام بدل لینا چاہیے۔ خانم! گھبراؤ مت، احتیاطاً ہم اسی لیے پورے انتظام سے آئے ہیں۔ یہ لوگ۔" نواب بہادر نے ہمارے اطراف کھڑے ہوئے پولیس کے لوگوں پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

"یہ لوگ ہمارے اشارے کے منتظر ہیں اور ہم تمھارے اشارے کے۔ تم ہی کر سکتی تھیں۔ کہو تو اس سے زیادہ بھی کر گزرنے کے لیے آمادہ ہیں۔"

"یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟" خانم خوف زدہ لہجے میں بولی۔

"ہم کچھ بھی نہیں کر رہے ہیں۔" نواب نے کہا۔ "صرف اتنی بات کہہ رہے ہیں کہ ابھی ہم اس شہر میں موجود ہیں اور ہم نے زندگی صرف اپنے محل میں مقید ہو کے نہیں گزاری ہے۔ خانم! تم زبان نہیں کھولو گی تو ہمیں مجبوراً بعض ناروا باتوں کے لیے قدم اٹھانا پڑے گا۔ تمھاری زباں بندی کی صورت میں ہم یہی کر سکتے ہیں۔ ہمیں اتنا اختیار حاصل ہے اور ہم زندہ ہیں۔ جن لوگوں نے تمھیں اس اقدام پر مجبور کیا ہے انھیں ہم سے ہمارے تعلق کا پاس رکھنا چاہیے اور اگر انھوں نے نہ رکھا تو ہم بھی نہیں رکھیں گے۔"

"اگر آپ کچھ اور سمجھ رہے ہیں تو غلط ہے۔ میں آپ سے کہہ چکی ہوں کہ یہ سب کچھ میرے ایما پر ہے۔ میں نے اپنے لیے یہی بہتر سمجھا۔"

"لیکن... لیکن ہم اسے تمھارے لیے بہتر نہیں سمجھتے۔ ضروری نہیں ہے کہ ہر شخص اپنے متعلق بہتر ہی سوچا کرے۔ کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ ہم تم سے بے خبر رہے ہیں۔ تم سامنے نہیں ہوتیں تو کیا ہم سے دُور ہو جاتی ہو۔ ہمیں اندازہ ہو گیا ہے کہ تم کن الجھنوں میں الجھ گئی ہو۔ ہمارا بھی کچھ فرض ہے۔ اپنے عزیز لوگوں کے لیے بسا اوقات ناپسندیدہ رویے بھی اختیار کرنے پڑتے ہیں۔"

"جو آپ سوچ رہے ہیں ایسا نہیں ہے میں کہہ رہی ہوں ایسا نہیں ہے۔"

"گاڑی پلیٹ فارم پر لگ چکی ہے۔" دفعتہً تجمل نے ایک قدم آگے بڑھ کے نرم آواز میں خانم سے کہا۔

"گاڑیاں روز جاتی ہیں۔" نواب نے درشتی سے کہا۔ "ہمارے حکم کے بغیر گاڑی حرکت میں نہیں آ سکتی اور ہم اپنے معاملات میں کسی کی دخل اندازی پسند نہیں کرتے۔"

"خانم بھی اپنے معاملات میں کسی کی دخل اندازی پسند نہیں کرتی۔"

"آپ خدا کے لیے نوازش کیجیے۔" خانم تجمل سے عاجزی کے ساتھ بولی۔

"خانم! ان لوگوں کو بتا دو کہ ہم کیسی باتیں سننے کے عادی ہیں اور ہمیں کون سا لہجہ پسند ہے۔" نواب نے برافروختگی سے کہا۔ "ہمیں افسوس ہے کہ جو ہم نہیں چاہتے تھے وہ ہم سے سرزد ہو رہا ہے۔ ہمیں معاف کر دینا۔ اگر ہمیں یہ یقین نہ ہوتا کہ تم بعد میں ہمیں معاف کر دو گی تو ہم الٹے قدموں واپس چلے جاتے۔" نواب نے یہ کہتے ہی گردن خم کر کے پولیس کو اشارہ کیا۔ خانم چیخ پڑی۔ ایک ساتھ کئی پولیس والے ہماری جانب لپکے انھوں نے دیکھتے دیکھتے دونوں اطراف سے کالے دادا اور اس کے تین ساتھیوں کے شانوں کے علاوہ میرے شانے بھی زور سے پکڑ لیے۔ تجمل نے اچانک اپنے کندھے زور سے جھٹکے اور اس سے پہلے کہ پولیس والے دوبارہ قابو میں کرتے نواب کی چھاتی میں تجمل کا چاقو چبھا ہوا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے نواب کا بازو پکڑ رکھا تھا۔ نواب کی آنکھیں پھٹ گئیں اور ان میں انگارے سے دہکنے لگے۔ اس نے پیچھے ہٹنے کی کوشش کی لیکن تجمل کی گرفت سے اپنا بازو نہیں چھڑا سکا۔ ادھر کئی پولیس والوں نے پیچھے سے تجمل کو کھینچنا چاہا۔ تجمل کھنچا مگر نواب بہادر بھی ساتھ کھنچا چلا آیا۔ "ہٹ جاؤ۔" تجمل نے گرج کے کہا۔ "نواب صاحب! انھیں روک لو ورنہ..." پولیس خود پیچھے ہٹ گئی۔ "نواب بہادر! ابھی یہ نہیں چاہتے تھے۔" تجمل نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "اگر ہمیں بعد میں خانم کے معاف کر دینے کا یقین نہ ہوتا تو ہم لوٹ جاتے۔ آپ نے خانم کی بات سمجھنے اور سننے پہ دھیان نہیں دیا۔ آپ عزت دار ہیں۔ عزت والے اس طرح سے پیش آتے اور اپنی بات بھول جاتے ہیں تو اچھا ہے پہلے ان لوگوں سے بولو کہ یہاں سے چلے جائیں پھر ہم سے بات کرو۔ آپ اپنی عزت شان دکھانے آ سکتے ہو تو نواب! اپنے پیچھے بھی دیکھو اور جن کے پاس کم ہوتا ہے انھیں اس کے جانے کی اتنی فکر بھی نہیں ہوتی۔ جتنی پر کسی ہوئی چیز کسی وقت بھی گر سکتی ہے۔ ان کو حکم دو یہاں سے دُور ہو جائیں۔ ان کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے دل میں آپ کے لیے بہت درد ہے۔ خانم نے ہم کو ایسا ہی بولا تھا۔ خانم کہنے سے چلی آتی ہے نواب! یہ دکان بند کرائی ہے۔ اب اس سے کوئی بات بولنی ہے تو اس کا خیال کر کے بولو۔"

"ہم خانم ہی کے خیال سے ادھر آئے ہیں۔ ہمارا خانم کا رشتہ دکان کا رشتہ نہیں ہے۔" نواب نے مشتعل لہجے میں کہا۔ "ہمارے سامنے سے ہٹ جاؤ۔ تم اس گستاخی کی سزا کا تصور نہیں کر سکتے جو تم کر رہے ہو۔"

"ہم کو اس کا دکھ ہے پر ہم کو ایسی گستاخیاں کرنے کی عادت ہے۔ ہم نے آپ کی شان کا پورا لحاظ کیا ہے۔ آپ بھی ہم بے نشان بے عزت لوگوں کا کچھ لحاظ کرو۔ ابھی ہماری ایک بہت ضروری آخری بات۔ گاڑی چلنے والی ہے۔ اگر آپ کے دل میں کوئی کھٹکا ہے تو ہم خانم کو آپ کے ساتھ کرتے ہیں۔ آپ اس سے علیحدہ میں بات کر لو لیکن اس سے پہلے ان لوگوں کو یہاں سے ہٹا دو اور سن لو کہ اس کے بعد نے خانم پر کوئی جبر کیا تو ہم وہ کریں گے جس کا تم ابھی تصور نہیں رکھتے۔ خانم اگر ہاں کہہ دیتی ہے تو ہم تمھارے پیروں پہ سر رکھ دیں گے پھر تم جو چاہے ہمارا کرنا، ہم کچھ نہیں بولیں گے۔ ہماری طرف سے خانم اوپر کی طرح آزاد ہے۔"

نواب گنگ ہو گیا۔ چند لمحوں تک وہ سکتے کے عالم میں خانم کو گھورتا رہا پھر کہیں دُور سے آتی ہوئی آواز میں بولا۔ "کیوں خانم! یہ ہم کیا

مہینے ڈیڑھ مہینے بعد لکھنؤ سے کپتن خاں بھی آجاتے تھے اور حویلی ہی میں ٹھہرتے تھے۔ کلکتے میں جب تجمل نے جامو استاد کو اپنے اڈے کا نگراں بنایا تھا تو یہاں فیض آباد میں جمرو نے اپنے بڑے بھائی کا اڈہ سنبھال لیا تھا۔ جامو نے اپنے دوست کپتن خاں کو خط لکھ دیا تھا کہ وہ جمرو کا خیال رکھے اور گاہے گاہے فیض آباد جاتا رہے۔ تجمل زرین کو بیٹھک میں چائے بھجوانے کا کہہ کے باہر چلا گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے بیٹھک میں پہنچ گیا۔ جمرو ہمیں دیکھ کے اچھل پڑا۔ اس کی عمر میرے برابر ہی ہو گی۔ تجمل نے اس کی انگلیاں مروڑیں، کولے پہ ہاتھ مارا اور سر کے بال کھینچ لیے "تو کیا ہے بالم تو، وہ جھینپ سا گیا تیری کمر پری سے نکل یا ابھی بہت کچی ہوئی ہے؟"

جمرو نے نظریں نیچی کر لیں۔ تجمل نے آگے بیٹھنے کو کہا۔ زرین چائے لے کے اندر آئی تو جمرو دوبارہ اپنی نشست سے اٹھ گیا اور بھرائی آواز میں بولا: "بی بی! مبارک ہو استاد آگئے۔"

زرین زیر لب مسکرانے لگی اور جمرو سے بولی: "جمرو بھائی! اب آپ جامو اور کالے بھائی کو بلا لیجیے اور ہاں کپتن بھائی کو بھی۔ میں بھی آج انھیں خط لکھتی ہوں۔"

"بس بس!" تجمل نے ڈپٹ کے کہا: "مجھ سے پوچھے بنا انھیں خط تحریر مت کرنا اور جمرو تو اس کی باتوں میں نہ آنا۔"

"نہیں بابا! بلا لیجیے جامو بھائی کو گئے ہوئے کتنے دن ہو گئے۔" زرین نے شکوتی لہجے میں کہا: "سب آجائیں گے تو بہت اچھا لگے گا۔"

"ہاں ہاں دیکھیں گے بٹیا! ابھی ذرا ٹھیرو۔" تجمل نے نرمی سے کہا اور جمرو سے اڈے کے متعلق پوچھنے لگا۔ وہ دوپہر کے کھانے تک وہیں ٹھیرا رہا۔ اس کے واپس نہ پہنچنے کے سبب اڈے کے کئی آدمی بھی ادھر آگئے تھے۔ انھوں نے شہر بھر میں خبر کر دی ہو گی۔ دوپہر تک بیٹھک میں بڑی تعداد میں لوگ جمع ہو گئے۔ جمرو تجمل کے منع کرنے کے باوجود اس کا جسم دباتا رہا۔ کسی اور نے اس کی جگہ لینے کی کوشش کی تو جمرو تیار نہیں ہوا۔ اس نے ساتھ ہی کہا کہ باہر سے چلنے گولیاں آتی رہیں اور حقہ چاروں طرف گھومتا رہا۔ ان میں بہت سے لوگ مجھے جانتے تھے، میں ان سے واقف نہیں تھا۔ تجمل کے کئی دن کے ملنے پر مجھے اتنا ہوش ہی نہیں تھا کہ ان کی صورتیں یاد رکھتا۔ تجمل حالانکہ رات بھر کا جاگا ہوا تھا مگر وہ ان کے درمیان بیٹھا انہماک سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ انھی باتوں میں چودھری الو کا بیگار، نواب لچھے اور چودھری رام پرشاد کا قتل، کپتن خاں اور کلن پور کے تشدد اور جھگڑے کی لڑائی، کوتوالی میں پولیس کی دہشت، دیپا کا جیل سے فرار، کتنے لوگ جیل میں ہیں، کتنوں کا وارنٹ جاری ہے، وہ جگہ جگہ کے واقعات اسے سنا رہے تھے اور ان وارداتوں میں اڑائے

جانے والے دلو انھیں از بر تھے۔ ان کی باتیں اتنی دلچسپ اور حیران کن تھیں کہ میں بھی وہیں بیٹھا سنتا رہا۔ میں نے اندر جا کے جہاں گیر، خانم یا نیساں میں سے کسی کا حال نہیں پوچھا کہ انھیں اس نئی جگہ آنے کے بعد کیا محسوس ہو رہا ہے۔ نیساں کا جی تو نہیں گھبرا رہا ہے۔ مجھے سب سے زیادہ اسی کی فکر تھی۔

سہ پہر ہو رہی تھی مگر کوئی اٹھنے کا نام نہیں لیتا تھا بلکہ ان کی تعداد بتدریج بڑھتی جا رہی تھی۔ ہر نئے آنے والے کے لیے تجمل کو اٹھنا اور گلے ملنا پڑتا تھا۔ گفتگو کے دوران میں اتفاق سے تجمل کو جمائی آگئی۔ جمرو اچانک بھڑک اٹھا: "ابے تم لوگوں کو کچھ خیال بھی ہے، یہاں بیٹھے بیٹھے استاد کا منہ کیا دیکھ رہے ہو۔" جمرو ناراضی سے بولا: "سنا تھا نے چلے آتے ہو ٹکر ٹکر بک بک۔ استاد کو کیا اس بوڑھے خانے میں ٹھہراؤ گے؟ جاؤ جا کے اڈے کی کچھ صفائی دھلائی کرو۔ رات کا کھانا استاد اڈے ہی پہ کھائیں گے۔ ہر قسم کا انتظام ہونا چاہیے۔"

تجمل نے جمرو کی گردن دبوچ لی اور اسے اپنے زانوؤں پر جھکا کے اس کی پیٹھ پر زور زور سے ہاتھ مارنے لگا۔ جمرو نے حرکت نہیں کی۔ وہ دم سادھے پڑا رہا۔ تمام لوگ کھڑے ہو گئے تھے اور جمرو کے اعلان کے بعد بہت عجلت میں نظر آنے لگے تھے۔ جمرو بھی انھی کے ساتھ چلا گیا۔

میں اندر گیا تو مجھے اپنی تنہائی پر شرمندگی ہوئی۔ خانم سادہ کپڑوں میں پلنگ پر بیٹھی زرین کی چوٹی گوندھ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کے وہ چپ ہو گئیں۔ زرین نے جھٹ دوپٹا اپنے سر پہ رکھ لیا اور دونوں میرے پیچھے بیٹھ گئی۔ "جیسے مائیں بیٹھی ہوں۔ بابر میاں! تم بھی کچھ آرام کر لو۔ طبیعت خراب ہو جائے گی۔" خانم آہستگی سے بولی۔

"جی آپا!"

"اسی کمرے میں،" زرین مجھے کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"وہاں تو اب تم قابض ہو۔" میں نے مسکرا کے کہا۔

وہ شرما گئی۔ اس کی آواز بھی جھنجھلانے لگی: "میں اپنے پرانے کمرے میں چلی گئی ہوں۔"

"نیساں کہاں ہے؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"وہ نہیں مانی۔ باورچی خانے میں گھسی بیٹھی ہے۔ کہتی تھی کہ بابر بھائی کے لیے اپنے ہاتھوں سے میٹھا بناؤں گی۔"

زرین تیکھے لہجے میں بولی جیسے اسے نیساں کا نام معلوم نہیں ہوا بلکہ اس نے میری کوئی چوری پکڑ لی ہے۔ معلوم نہیں صبح سے ان کے درمیان کیا کیا باتیں ہوئی ہوں۔ خانم نے کیا کہا ہو اور زرین نے اسے کیا کچھ بتایا ہو۔ ظاہر ہے وہ ایک دوسرے کو چپ چاپ تو نہیں دیکھتی رہی ہوں گی۔

ممکن ہے خانم نے اپنے بارے میں اسے تمام باتیں بتا دی ہوں کہ وہ بالاخانے سے اتر کے آئی ہے اور نیساں کا تعلق بھی وہیں سے ہے۔ بچپنے سے کیا حال تھا۔ بعد میں زرین کو یہ بات معلوم ہوتی تو اسے بہت اچنبھا اور دکھ ہوتا۔ خانم نے اپنے بارے میں کوئی بات ڈھکی چھپی نہیں رکھی ہو گی اور زرین نے ایک لفظ نہیں کہا ہو گا۔ ان دونوں کے تیوروں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو خوب اچھی طرح سمجھتی ہیں۔ زرین بھی ایک مرتبہ اس منزل سے گزر چکی تھی۔

دور سے کوئی دیکھے تو ایسا لگتا تھا کہ خانم زرین کی بڑی بہن ہو۔ حویلی کا موسم بدل گیا تھا۔ نیساں بہار آئی ہوئی پھر رہی تھی۔ جہاں گیر بھی اب کہیں آنے جانے کی کوئی پابندی نہیں تھی۔ وہ فیض آباد کی سڑکوں پہ کبھی میرے ساتھ اور کبھی تجمل کے ساتھ گھومتا رہتا تھا۔ ایسے حویلی ہی اتنی بڑی تھی کہ کہیں باہر جانے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ اچھا خاصا بڑا باغ تھا۔ کمروں کا ایک سلسلہ تھا۔ ایک کونے سے آواز لگاؤ تو دوسرے کونے میں نہیں پہنچتی تھی۔ لائبریری میں زرین کے آباجان کی کتابوں کا بڑا ذخیرہ تھا۔ اس دوران میں زرین نے بھی اس میں خاصا اضافہ کر لیا تھا۔ تیسرے ہی دن جہاں گیر کا تعلیمی سلسلہ دوبارہ شروع کر دیا گیا۔ زرین نے اسے الٰہ آباد سے انٹرنس کرانے کے لیے جمرو سے کہہ کے ایک ساتھ دو دو ماسٹروں کا انتظام کرا دیا تھا۔ نیساں کے لیے علیحدہ ماسٹرنی رکھی گئی۔ بعض اوقات زرین خود اسے پڑھانے لگتی تھی۔ خانم نے اپنے زیورات اور نقدی زرین کے حوالے کرنا چاہا لیکن زرین نے حویلی کی تمام چابیاں اس کے آگے ڈال دیں۔ صبح جب خادمہ کھانا پکانے کے لیے سبزی گوشت پوچھنے آتی تو زرین خانم کو منتظر رہتی۔ پھر مجبوراً خانم ہی کو بتانا پڑتا۔ ہمارے آنے کے تیسرے ہی دن کپتن خاں لکھنؤ سے آگیا تھا اور حویلی ہی میں ٹھیرا ہوا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد تجمل عموماً جامو کے اڈے چلا جاتا۔ کسی کسی دن وہ مجھے بھی ساتھ لے جاتا۔ جہاں گیر نے کئی بار اس کے ساتھ جانے کی ضد کی مگر تجمل کبھی اسے اپنے ساتھ اڈے نہیں لے گیا۔ جہاں گیر اتنا بچہ نہیں تھا۔ کچھ کچھ اسے بھی اندازہ ہو گیا ہو گا کہ تجمل بابا کا کیا کاروبار ہو سکتا ہے۔ صبح سویرے ہی سے بیٹھک میں لوگ آنے شروع ہو جاتے۔ تجمل نے جہاں گیر کو اس وقت بیٹھک میں آنے سے روک دیا تھا لیکن جہاں گیر کئی لوگوں کو جان گیا تھا۔ کپتن خاں تو اسے ہر وقت اپنے جلو سے لپٹائے رکھتا۔ زرین بھی اڈے کے کئی آدمیوں کے سامنے آتی تھی۔

جب میں نیساں اور خانم کو ایک ساتھ بیٹھے ہوئے دیکھتا تو مجھے جولین بہت یاد آتی۔ ہمیں آئے ہوئے پندرھواں دن تھا کہ بمبئی سے چیپا کا خط آیا۔ اس نے ہماری خیریت دریافت کی تھی اور لکھا تھا کہ اگر ظہیر تک میرا پیغام پہنچ سکے تو اسے بتا دینا کہ تمھارا اخوند آنے سے بہت مشوش ہے۔ اس نے زرین سے درخواست کی تھی کہ اگر اسے میرے بارے میں کچھ معلوم ہو تو وہ اسے ایک دو سطریں لکھ دے۔ جولین کی طرف سے کوئی پیغام نہیں تھا۔ حالانکہ خط انگریزی میں تھا اور جولین ہی نے اسے لکھا ہو گا۔ یہ خط تجمل نے ہی کسی استاد سے پڑھوایا۔ زرین نے اس سے اجازت چاہی کہ وہ اسے جواب لکھ دے۔ تجمل نے انکار نہیں کیا۔

سترھویں دن رات کو وہ اڈے سے جلد واپس آگیا۔ میں نے اس سے بات کرنے کا ارادہ کیا۔ جہاں گیر اپنی نئی زندگی سے بہت خوش معلوم ہوتا تھا اور تیزی سے تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ خانم اس کے ساتھ ہوتی اور ہر وقت اس کی دیکھ بھال میں لگی رہتی تھی۔ جہاں گیر کے سلسلے میں زرین نے خانم کی بہت سی دقتیں دور کر دی تھیں اور میں نے بہت غور سے دیکھا تھا کہ نیساں کی پیشانی پر کوئی لکیر تو نہیں تھی لیکن وہ ہمیشہ شگفتہ رہتی تھی۔ تجمل نے خانم کے لیے ایک سنار لگا دیا تھا۔ خانم نے اسے قبول نہیں کیا۔ بولی کہ وہ اب سے پچھونا نہیں چاہتی لیکن تجمل نے یہ کہہ کے اس کی بات مسترد کر دی کہ اب وہ اپنی خوشی کے بچے کو اپنے بیٹے کو پیار کرے۔ تجمل نے اس پر زور دیا کہ آگے یہ پاؤں اس جوتی گھسنا چاہیے۔ اس نے خانم کو بتایا کہ حیدرآباد میں ایک دن صبح اسے خانم کا گانا سننے کا موقع ملا تھا۔ اس وقت خانم ریاضت کر رہی تھی۔ میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ ہو سکتا ہے خانم نے صبح سویرے بند کمرے میں ریاضت شروع کر دی ہو۔ میں تجمل سے کہنا چاہتا تھا کہ میں اب جانا چاہتا ہوں اور زرین کے ساتھ آنے پہلے کی اجازت نہیں ہے۔ کھوئے ہوؤں میں خود ہی ڈھونڈتا رہوں گا۔ وہ پہلے اڈے سے واپس چلا جائے اور جامو کو فیض آباد بھیج دے۔ یہاں اس کے اڈے کے لوگ اس کی کمی کس طرح محسوس کرتے ہیں۔ میں نے سوچا تھا۔ اس سے کہوں گا کہ تین چار مہینے بعد میں فیض آباد آتا رہوں گا اور ان لوگوں کے ساتھ کچھ دن رہ کے پھر چلا جایا کروں گا۔ مجھے کوئی کام نہیں ہو گا کیونکہ میں کسی کام کو نہیں جانتا۔ میں پہلے آباجان کے مطبوعوں پہ پلتا رہا پھر جیل میں مجھے مفت کا کھانا ملتا رہا۔ بمبئی میں گزشتہ دنوں جب تک دوبارہ نہیں ملے تھے، مجھے چند روز مزدوری کرنی پڑی تھی۔ پھر گزشتہ ہی مجھے گھیرے گئے۔ میں زرین سے کبھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ خانم، نیساں اور جہاں گیر کے لیے حقیقی ذریعہ بنے۔ مجھ سے لے لے۔ میری بات سن کے وہ زہر کھا لیتی یا کبھی میرے سامنے نہ آتی۔ اس سے اس قسم کی بات کرنا ہی بے کار تھا۔

ممکن ہے تجمل یہ سمجھتا ہو کہ جہاں گیر کے ملنے کے بعد میں اک

کی خاطر اب کہیں آنے جانے کی بات نہیں کروں گا۔ اُس نے یہاں آ
کے اب تک جانے کا نام نہیں لیا تھا۔ شاید مجھے ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔
کھوئے ہوئے لوگ اتفاق سے مل جاتے ہیں کرشنا جی نے تمام دنیا میں
خط لکھے تھے کیا نتیجہ نکلا؟ قجل نے اتنی دوڑ دھوپ کی کیا حاصل ہوا؟
صرف جہاں گیر ملا، وہ نہیں ملی۔ جہاں گیر کو تو میں پہلے بھی چھوڑ کے چلا آیا تھا۔
ہزاروں کا سینہ اُس کی آنکھیں اُس کے پاس ہوتی ہیں اور اُس آدمی کی
آنکھوں اور چہرے میں کیا کچھ ہوتا ہے یہ وہی جان سکتا ہے۔ میں یہاں
بیٹھا لوگوں کی صورتیں دیکھتا رہتا ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میرا
سینہ بجھ گیا ہے۔ قجل مجھے صبر و ضبط کی تلقین کرتا تھا کرشنا جی بھی یہی
کہتے تھے [illegible] میں کیا اندازہ تھا کہ ان کی باتیں سننا بھی میرے لیے سب سے
بڑا ضبط ہے [illegible] لوگ میری جگہ ہوتے تو ان کے گریبان پھٹ جاتے [illegible]
میری جگہ [illegible] کہیں؟ [illegible] تھی پانچ ہزار میں بک گئی تھی۔ نیساں کی
قیمت ساٹھ [illegible] تھی۔ کاش اُس کی بھی کوئی قیمت ہوتی۔ پھر میں کہیں
ڈاکہ ڈال لیتا۔ میں کچھ بھی کر لیتا۔ ایسا ہوتا تو کتنا آسان ہو جاتا۔

اب اُس کے لیے محنت کرنے کو میرے پاس ایک ہی چیز رہ
جاتی تھی اور وہ بھی بار بار ہاتھ سے نکل جاتی تھی۔ شاید کبھی وقت مہربان
ہو جائے اور اُس کا سایہ کہیں نظر آ جائے۔ یہاں اس طرح گھر میں بیٹھا
میں اپنے بالوں کی جوئیں ہی تو چن سکتا تھا۔ جو لمحے ادھر اُدھر ضائع ہو
گئے۔ اس میں میری کوئی خطا نہیں تھی۔ وہ سنے گی تو مجھے معاف کر دے گی۔
اپنی طرف سے میں نے ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا تھا۔ اب جتنی دیر ہو
رہی تھی ہر وقت یہ اندیشہ رہتا تھا کہ اور دیر نہ ہو جائے۔ قجل بھی کچھ سوچ
رہا تھا۔ اچھی طرح سے اطمینان کر لینے کے بعد کہ اس وقت اُس سے کی
جانے والی بات بے سود نہیں جائے گی میں نے دبے دبے لہجے میں کہا۔
"میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"مجھے معلوم ہے تم کیا بولے گا۔ کل پرسوں چل دیں گے۔" وہ
پرسکون آواز میں بولا۔ "یہی بولنا چاہتا تھا؟"

"ہاں۔ مگر تم میرے ساتھ کیوں جاتے ہو؟"

"کیا تم مجھے اپنے ساتھ لے جانا نہیں چاہتا؟"

"نہیں یہ بات نہیں ہے۔" میں نے جھنجلا کے کہا۔ "مجھے تمہارا
ہی خیال ہے تمہیں اڈے سے دور ہوئے بہت دن ہو گئے۔ تمہیں اب
واپس جانا چاہیے۔"

"اڈے کی بات مت کر۔ یہ کہو کہ تو اکیلا ہی جانا چاہتا ہے۔"

"نہیں نہیں۔" میں نے گھبرا کے کہا۔ "غلط مت سمجھو۔"

"پھر ساتھ چلیں گے۔" وہ فیصلہ کن انداز میں بولا۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے سانس لے کے کہا۔ "تمہاری مرضی مگر
کب چلو گے؟"

"میں نے بول دیا نا کل پرسوں۔" وہ ناگواری سے بولا۔ میں چپ
ہو گیا۔ کچھ دیر حقہ گڑگڑانے کے بعد وہ کہنے لگا کہ اب دکن کی طرف
جانے کا ہے اُس کی رائے تھی کہ اب بھی ہمیں پروگرام بنا کے چلنا
چاہیے۔ ہم جنوبی ہند سارے کا سارا دیکھ چکے تھے۔ اگر حیدرآباد میں
جہاں گیر نہ ملتی تو ہم حیدرآباد سے اُوپر کی طرف ہی جا سکتے تھے۔ قجل کا خیال
تھا کہ دوسری مرتبہ تفتیش شمالی ہند میں مراد آباد سے قریب کہیں ہوتے تو
کسی نہ کسی کو ضرور نظر آتے۔ اسی کے پیش نظر اُس نے جنوبی ہند کے
انتہائی دور دراز حصوں میں سفر کیا تھا۔ قجل نے وسطی ہند جانے کا
ارادہ ظاہر کیا۔ میں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا میرے لیے ہر جگہ یکساں تھی
وہ کہیں بھی ہو سکتی تھی۔ دوسرے دن صبح قجل نے مجھ کو بتا دیا کہ وہ کل
یہاں سے روانہ ہو جائے گا۔ گھر میں بھی خبر ہو گئی اور زریں نے بھی سُن
لیا۔ سب کے چہروں پر بادل سے چھا گئے۔ جہاں گیر قجل کے پاس آ کے
رونے لگا۔ دوپہر کے کھانے پر خانم نے قجل سے درخواست کی کہ وہ
ابھی جانے کا ارادہ ملتوی کر دے۔

"ہم لوگ جو ہر میں رُکا جاتا ہوں لیکن اس سے کوئی فرق نہیں
پڑنے گا۔" قجل نے ملائمت سے کہا۔ "جتنی جلدی ہم جائیں گے اتنی
جلدی واپس آ جائیں گے۔" خانم نے اس کے بعد اصرار کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

شام کو میں باغ میں بیٹھا ہوا تھا۔ نیساں میرے پاس آ گئی اور
جھکی جھکی پلکوں سے وہی بات دہرانے لگی جو خانم نے قجل سے کہی
تھی۔ میں نے اُسے پاس بٹھا کے سمجھایا کہ مجھے بہت ضروری کام ہے۔
میں نے اُسے تاکید کی کہ زریں اور خانم کی کوئی بات اُسے بُری لگے تو
وہ دل پر میل نہ لائے مگر میں کسی نہ کسی سے کوئی بُری بات بُری جاتی
ہے۔ وہ کبھی خانم کی شکایت زریں سے یا زریں کی شکایت خانم سے
نہ کرے۔ نیساں بولی کہ مجھے تو خود ہر وقت یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ میری کوئی
بات آپی یا خانم کو بُری نہ لگ جائے۔ میں نے کہا۔ "پگلی! آپی اور خانم
بہت سمجھ دار ہیں۔ بڑوں کا کام نظر انداز کرنا اور معاف کرنا ہوتا ہے
اور ان سے بھی غلطیاں ہو سکتی ہیں۔ ان چھوٹی چھوٹی باتوں سے
اُداس مت ہو جانا۔ چھوٹوں کے رہنا اور انھیں بڑی سمجھ کے چپ
ہو جانا۔ اب یہی تمہارا گھر ہے۔" نیساں شکایت کرنے لگی کہ زریں باجی
مجھے کام نہیں کرنے دیتیں۔ میں نے کہا ٹھیک ہی کرتی ہیں۔ گھر میں نوکر
اور نوکرانیاں موجود ہیں تو تمھیں کام کرنے کی کیا ضرورت ہے تمھارے
لیے پڑھنے کا کام کیا کم ہے۔ اس نے منت کی کہ جب کام کرتا ہو
زریں بھی منع نہیں کرے گی۔ بولی میرا جی چاہتا ہے کہ میں ہر وقت
زریں باجی کے پاس بیٹھی دعا کروں۔ وہ بہت اچھی ہیں۔ پھر ایک دم
پوچھنے لگی کہ کیا آپ ان سے ناراض ہیں؟ میں نے کہا نہیں ناراض
ہوتا تو میں تمھیں یہاں کیوں لاتا۔ کہنے لگی مجھے ایسا ہی لگتا ہے تو پھر
آپ ان سے بات کیوں نہیں کرتے! میں نے کہا کہ کیوں نہیں بولتا
بولی ایسے بات تھوڑی کرتے ہیں وہ تو ہر وقت آپ کا خیال رکھتی
ہیں۔ بتانے لگی کہ زریں نے میرے لیے بہت سے کپڑے بنوائے ہیں
بہترین کپڑے کی شیروانیاں جن کے کرتے وہ خود اپنے ہاتھ سے سی
رہی ہے۔ نیساں مجھے بتانے لگی کہ جب بھی میرا ذکر آتا ہے زریں
خاموش ہو جاتی ہے یا بات بدل دیتی ہے یا وہاں سے اُٹھ کے ہی
چلی جاتی ہے۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ میں اُس کے لیے کیا لاؤں؟
اُس نے جواب دیا کہ بس آپ آ جائیں ساتھ ہے آپ جس کام کے لیے
جا رہے ہیں اُس میں پوری کامیابی ہو۔ میں نے اُس کے ہاتھ چوم لیے۔
نیساں کی آنکھیں بھر آئیں۔ کہنے لگی بابر بھائی میں آپ کے لیے روز
دعا کروں گی۔ میں نے کہا بہت سے لوگ دعائیں کرتے ہیں مگر کچھ بھی
نہیں ہوتا۔ کہنے لگی دیکھیے گا میری دعائیں بہت قبول ہوتی ہیں میں نے
آپی کے گھر دعا مانگی تھی دیکھیے قبول ہو گئی۔

میں اسی لیے دن بھر باہر بیٹھک میں بیٹھا رہا تھا ایک الجھا دماغ
میں لگا تھا کہ ایک ہی دن کی بات ہے۔ گھر کے لوگوں کے سامنے
کم سے کم آیا جائے مگر مجھے نیساں نہ جانے کہاں کہاں تلاش کرتی ہوئی یہاں
تک آ گئی۔ قجل اس دن آتے نہیں گیا لوگ اس سے ملنے آتے رہے
رات کا کھانا بھی قجل نے بیٹھک میں نہیں کھایا۔ ان لوگوں کو یہیں بھجوا دیا
گیا — ادھر ہم سب ساتھ بیٹھے تھے۔ جہاں گیر، قجل اور میں ایک طرف
اور وہ تینوں دوسری طرف۔ کسی سے کچھ نہیں جا رہا تھا ہم سب اُداس
بیٹھے تھے۔ مجھے کچھ ایسا لگا جیسے ان کی خاموشی کی وجہ میں ہوں میں وہاں سے
اُٹھ آیا۔ ایک رات اور باقی تھی کل کسی وقت جانا ہی تھا۔ کیا پتہ کل ہی
منزل ہو وہ مل جائے۔ سوچتے سوچتے میرا ذہن نہ جانے کہاں کہاں جا پہنچا۔
میں نے دیکھا کہ وہ ایک بہت بڑے عالی شان محل میں بیٹھی ہے کنیزیں
باندیاں اُس کی خدمت میں حاضر ہیں مگر فوراً مجھے احساس ہوا اگر وہ کسی
محل میں ہوئی تو میری رسائی اُس تک کس طرح ہو سکے گی۔ پر وہ محل میں
ہو یا جھونپڑی میں۔ جب اُسے یہ معلوم ہو گا کہ اُس کے دروازے پر کون
کھڑا ہے تو وہ ہزار بندھن توڑ کے [illegible] دوڑی ہوئی میرے پاس آ
جائے گی اور میں جب اُسے دیکھوں گا! میں نے کتنی بار سوچا تھا کہ جب
وہ میرے سامنے آئے گی تو میرا کیا حال ہو گا۔ مجھ سے اپنے پیروں پر کھڑا
نہ ہوا جائے گا میری آنکھیں جل جائیں گی۔

کمرے میں کسی کے آنے کی آہٹ ہوئی۔ میں جیسے سوتے سے
چونک پڑا۔ زریں اندر آئی تھی۔ اُس کے ہاتھوں میں بہت سی چیزیں
تھیں۔ وہ اُس نے میز پر ایک طرف رکھ دیں اور میرے نزدیک آ کے
آہستگی سے بولی۔ "یہ سامان ساتھ لیتے جانا۔"

وہ اِدھر آئی اور اُدھر جانے لگی۔ "ٹھہرو۔" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"رات خاصی ہو گئی ہے۔" وہ گھٹی ہوئی آواز میں بولی۔

"اچھا۔" میں نے حواس باختہ لہجے میں کہا۔ "کیا بہت وقت ہو گیا؟
کیا تم سو گئے تھے؟"

"نہیں نہیں۔" میں نے بے دھیانی سے کہا۔ "میں جاگ رہا تھا۔"

"میں جانتی ہوں۔" وہ سرگوشی میں بولی۔

"کیسے؟" میں نے تذبذب سے کہا۔ "بیٹھو۔"

اُس نے پلکیں اُٹھا کے مجھے دیکھا۔ میں اسی لیے یہاں آنا نہیں
چاہتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ زریں کی آنکھیں خشک نہیں رہیں گی،
میرے جانے سے اور بھر آئیں گی۔ وہ اپنے مخصوص لباس میں میرے
سامنے کھڑی تھی۔ یہ لباس اُس کے بدن پر بہت جچتے تھے۔ تنگ موری
کا پاجامہ، پشواز اور برد دوپٹا۔ اُس کے کانوں میں آویزے ہلکے ہلکے
تھے۔ یہ آویزے اُسے خانم نے دیے تھے۔ خانم نے مہینوں کر بلا کے
اُس کی کلائیاں چوڑیوں سے بھروا دی تھیں اور نیساں نے اُس کے ہاتھوں
پر مہندی سے نقش و نگار بنائے تھے۔ ٹھوڑی پر کالا تل بھی نیساں ہی نے
بنایا ہو گا کہ کہیں اُسے نظر نہ لگ جائے۔ وہ اس طرح سے بے حس و حرکت کھڑی
تھی جیسے ایک رنگین تصویر ہو جیسے ابھی اس میں جان ڈالنے کی کسر رہ گئی
ہو مرقع۔ گوری کا قد بھی اتنا ہی بڑا [illegible]
[illegible]
[illegible] لاؤ [illegible] اُس کے
ہاتھ تھام لوں گا اور اُن سے اپنا چہرہ چھپا لوں گا اس طرح رات بھر
[illegible]
اپنے سینے میں چھپا لے تاکہ میں خوب رو سکوں لیکن میں اس کی صورت
دیکھتا رہا میرا گلا بند ہو گیا تھا۔ وہ کچھ دیر کھڑی رہی۔ پھر جب جانے
لگی تو میں اُسے روک بھی نہیں سکا۔ تمام رات [illegible]
ذہن میں بے شمار باتیں منڈلا رہی تھیں پر میری زبان پر جیسے تالا لگ گیا
تھا۔ وہ چلی گئی۔ میں نے کچھ دیر اور ٹھہرنے کے لیے اُسے آواز دینا چاہا۔
دروازے پر جا کے اُس نے ایک بار مڑ کے دیکھا میری آنکھیں بھیگی ہوئی
تھیں۔ وہ چشم زدن میں نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ وہ ابھی دالان ہی میں
ہو گی میں نے اُس کے پیچھے بھاگنے اور اُس کا راستہ روکنے کا ارادہ کیا
مگر اُسے روک کے مجھے کیا کہنا چاہیے کہ میں نہیں جاؤں گا، یہیں رُکا جاتا
ہوں یا میں اُسے یہ اطمینان دلانے کی کوشش کروں کہ جلد واپس آ
جاؤں گا اور اس بار خیریت کے خط بھی لکھتا رہوں گا یہی وہ میرا انتظار

کرتی ہے اور آئے میری قسم کہ ایک آنسو بھی نہ بہائے۔

میں دروازے کی جانب تیزی سے بڑھا۔ اُس کی چوڑیوں کی بازگشت دالان میں گونج رہی تھی۔ وہ دالان سے گزر کے آہستہ آہستہ اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھی لیکن باہر آکے میرا جسم پھر منجمد ہو کے رہ گیا۔

دوسرے دن گیارہ بجے ہم فیض آباد سے چل کے لکھنؤ اور کانپور کے راستے سے جھانسی آگئے۔ جھانسی سے للت پور، گوالیار، بھوپال، اُجّین، اجمیر، اندور، امراوتی، رائے گڑھ۔ نام بھی یاد نہیں رہے تھے۔ چار مہینے تک ہم وسطی ہند کے کونے کونے میں پھرتے رہے۔ آپا جان بھوپال کے علاوہ اجمیر اور گوالیار میں بھی پھر رہے تھے۔ اس کے بعد اُن کا کوئی نشان نہیں ملا۔ جنوبی ہند کی طرح ہم نے اپنی دانست میں کوئی بستی نہیں چھوڑی تھی۔ جہاں ریلوں کے راستے نہیں تھے، وہاں ہم نے لاری سے سفر کیا۔ جہاں لاری بھی نہیں جاتی تھی، وہاں ہم گھوڑوں اور خچروں پر چلتے رہے۔ جہاں مسجدیں اور مدرسے تھے، جہاں بھی کوئی چھوٹی سی بستی تھی، وکالوں، لائبریریوں، محلوں کے چودھریوں اور مدرسوں سے پوچھ گچھ کی۔ جہاں جہاں بھی اُن کے ملنے کا امکان ہو سکتا تھا ہم وہاں گئے۔ پھر ایک دن تجمل نے اچانک وسطی ہند میں اور آگے جانے کے بجائے شمال مشرق کی طرف بڑھنے کا ارادہ کیا۔ کرسمس یا نئے سال کا زمانہ قریب تھا۔ ہم دوسرے راستوں سے ہوتے ہوئے پھر اجمیر واپس آگئے۔ تجمل نے اس بار بھی وہاں حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے ہاں حاضری دی اور ایک دن کے مزار کے احاطے میں پڑا رہا۔ اجمیر سے ہم جودھ پور آگئے۔ جودھ پور سے بیکانیر اور بیکانیر سے جیسلمیر۔ جیسلمیر راج پوتانے کی ایک چھوٹی سی ریاست تھی۔ جب ہم وہاں پہنچے، ظہر کا وقت تھا۔ سامنے جو مسجد نظر آئی، ہم اُس کے دروازے پر کھڑے ہو گئے۔ نمازی باہر آرہے تھے۔ ہم نے انھیں رنگ کے پہلے آپا جان کا حلیہ بتایا۔ آپا جان، پیا، بیگم — نام کہیں نہیں لیتے تھے۔ نمازیوں نے ایسے حلیے کے کسی شخص کو جاننے سے لاعلمی ظاہر کی۔ میں نے پھر اکبر کا حلیہ بیان کیا اور بتایا کہ اُن کے ساتھ تین لڑکیاں بھی ہوں گی مگر وہ لوگ آپا جان یا گھر کے کسی دوسرے سے واقف نہیں تھے۔ پھر میں نے اُن کے سامنے مولوی محمد شفیق کا نام لیا۔ اُن کا رنگ، قد اور ناک نقشہ بتایا۔ مولوی شفیق کا حلیہ سن کے [illegible] دوسرے کا چہرہ دیکھنے لگے اور ایک بزرگ شخص نے [illegible] بھاری آواز میں کہا، "میاں! تم انھیں کیسے جانتے ہو؟"

میرا سر گھومنے لگا۔ یکایک تجمل نے میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے کھینچ لیا اور خود اُن کے سامنے ہو کے بولا، "بڑے صاحب! کیا وہ یہیں ہیں؟"

"آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟" بزرگ آدمی نے خفگی سے کہا۔ "میں نے پوچھا تھا کہ آپ انھیں کیسے جانتے ہیں؟"

"ہم اُن کے کچھ لگتے ہیں۔" تجمل نے رُک رُک کے کہا۔

"میں یہی تو پوچھ رہا ہوں بھائی کہ آپ اُن کے کیا لگتے ہیں؟"

"ہم اُن کے رشتے دار ہیں۔"

"رشتے دار ہیں۔" بزرگ نے اپنے ساتھی نمازیوں کی طرف دیکھ کے دہرایا۔ اس کے لہجے میں حیرت تھی۔ "کیا رشتے داری ہے آپ کی جناب؟"

"بڑے صاحب! آپ ہمیں یہ بتاؤ کہ وہ کہاں ہیں؟ یہیں ہیں یا کہیں اور؟" تجمل نے بے صبری سے کہا۔

"آپ اُن سے کب سے نہیں ملے؟" ایک دوسرے شخص نے پوچھا۔

"بہت دن ہو گئے۔ برس بیت گئے۔ آٹھ برس سے بھی زیادہ۔" تجمل کے لہجے پر شکستگی چھا گئی۔ "لیکن آپ لوگ یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہے ہو؟ ہماری بات کا جواب دو؟"

"آپ کی بات کا کیا جواب دیں۔" بوڑھے آدمی نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔ "آپ لوگ کہاں سے آرہے ہیں؟"

"مراد آباد سے۔"

"جیسلمیر کب آئے؟"

"ابھی دیر ہوئی ہے۔"

"آپ کو اُن کا پتہ کس نے دیا تھا؟"

"ہم انھیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے یہاں تک آگئے ہیں۔"

مجھے اپنے سامنے کھڑے ہوئے لوگ دھندلے دھندلے نظر آرہے تھے۔ تجمل نے میرے پنجے میں سختی سے اپنی انگلیاں پھنسا رکھی تھیں۔ یہ لوگ پولیس والوں کی طرح نہ جانے کیسے کیسے سوال کر رہے تھے۔ جیسے ہم مولوی صاحب کے بارے میں نہیں کسی مجرم کے بارے میں پوچھ رہے ہوں۔ میرا سارا جسم پسینے میں شرابور ہو گیا تھا۔ مجھے چکر سا آرہا تھا۔ "آپ بولتے کیوں نہیں؟" میں نے [illegible] آواز میں کہا۔ "مولوی صاحب کہاں ہیں؟"

"تو چپ رہو۔" تجمل نے زور سے میرا ہاتھ مروڑ دیا اور تھکے تھکے سے لہجے میں بولا۔ "کیا اب وہ یہاں نہیں رہتے؟"

"نہیں بھائی!" بزرگ آدمی نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ "آئیے میرے ساتھ آئیے۔ آپ لوگ کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں؟"

"ابھی کہیں نہیں اور نہ کہیں ٹھہرنے کا ارادہ ہے۔ ہم صرف مولوی صاحب سے ملنے آئے تھے۔ آپ اُن کا پتہ جانتے ہو تو ہمیں بتا دو۔"

"خدا بہتر جانتا ہے، بڑی لمبی کہانی ہے۔ آئیے میرے ساتھ گھر چلیے۔ آپ مولوی صاحب کے عزیز ہیں تو سمجھیے ہمارے بھی عزیز ہیں۔ وہ نہیں ہیں تو کیا ہوا، اُن کے دوست اور بہی خواہ یہاں کم نہیں ہیں۔ [illegible] آپ

کو کیا بتاؤں۔ چلیے گھر چلیے۔ زیادہ دور نہیں ہے۔"

تجمل نے گردن جھکا لی۔ "آؤ لڑکے!" اُس نے میری کمر پہ ہاتھ رکھ کے سرگوشی کی۔ "سنبھل کے رہو۔ یہ نہ جانے کیا سمجھیں گے۔"

بزرگ آدمی کا گھر مسجد سے کوئی سو پچاس قدم دور ہوگا۔ کچھ نمازی بھی ہمارے ساتھ آگئے۔ میری آنکھیں لڑکھڑا رہی تھیں۔ وہ چھوٹی اینٹوں سے بنا ہوا قدیم طرز کا ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ بزرگ نے اندر جا کے چند لمحوں بعد بیٹھک کا دروازہ کھول دیا۔ وہاں زیادہ سامان نہیں تھا۔ اونچے پایوں کا ایک پلنگ، طاقوں میں چند کتابیں، تین چار شکستہ کرسیاں، بوسیدہ فرنیچر اور اس کے سوا کچھ نہیں تھا۔ میرا دل جیسے کسی نے بھینچ لیا۔ بڑا بوڑھا آدمی چارپائی پہ بیٹھ کے گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ اُس نے آنکھیں موند لیں اور زیرِ لب کوئی آیت تلاوت کی۔ پھر ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا۔ "آپ حضرات کا نام؟"

"اس کا نام ظہیر اور میرا اکبر خاں ہے۔" تجمل نے تیزی سے کہا۔

"میرا نام منیر علی ہے۔ مولوی صاحب مجھ پہ بہت کرم کرتے تھے۔ وہ میرے پڑوسی بھی تھے، مربی بھی۔ وہ برابر والے مکان میں رہتے تھے۔ آپ ہماری باتوں کا برا مانتے ہوں گے لیکن کچھ ایسی ہی بات تھی جو آپ سے اتنا کچھ پوچھا گیا۔ کسی کے ماتھے پہ کچھ نہیں لکھا ہوتا۔ کوئی بات ناگوار گزری ہو تو مجھے معاف کر دیجیے۔"

"کچھ نہیں بڑے صاحب!" تجمل نے دھیمی آواز سے کہا۔ "ہمارا غم جلتا رہتا ہے۔ آپ مولوی صاحب کے بارے میں کچھ بتا رہے تھے؟"

"کیا بتاؤں کیا نہ بتاؤں۔" منیر علی ہاتھ ملتے ہوئے بولے۔ "آپ نے آنے میں بہت دیر کر دی۔" میری سانس اکھڑنے لگی۔ "گزشتہ رمضان کی بات ہے۔ شاید دسواں روزہ تھا۔ سحری کے بعد مولوی صاحب معمول کے خلاف نماز پڑھانے نہیں آئے۔ نماز کے بعد ہم چند لوگ اُن کی خیریت دریافت کرنے اُن کے گھر پہنچے کہ خدانخواستہ اُن کی طبیعت تو ناساز نہیں ہے۔ پہلی دفعہ ایسا ہوا تھا کہ مولوی صاحب نے ناغہ کیا ہو۔ جب سے یہاں آئے تھے، پابندی کے ساتھ وقت پر پہنچ جاتے تھے۔ ہم نے آوازیں لگائیں، اندر سے کسی نے جواب نہیں دیا۔ ہمیں تشویش لاحق ہوئی۔ کنڈی کھٹکھٹانے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ہم نے پھر بھی آوازیں دیں مگر اندر کوئی ہوتا تو جواب دیتا۔ ایک چھوٹی بچی کو ہم نے حقیقتِ حال جاننے کے لیے ڈرتے ڈرتے مکان میں بھیجا۔ وہ سہمی ہوئی واپس آئی اور پھر جب ہم نے خود اندر جا کے دیکھا تو سارا گھر اُجڑا ہوا تھا۔ سامان تتر بتر تھا اور کوئی ذی نفس وہاں موجود نہیں تھا۔ نہ پوچھیے کیا حال ہوا۔ رات کو تراویح کے بعد وہ ہمارے ساتھ ہی گھر واپس گئے تھے۔ تراویح سے سحری کے دوران یہ سب کچھ گزر گیا۔ مولوی صاحب بہت..." منیر علی کا گلا رندھ گیا۔

"اور پھر اُن کا کوئی پتہ نہیں چلا؟"

منیر علی نے مایوسی سے سر ہلایا۔ "نہیں بھائی! ادھر اُدھر کئی جگہ آدمی دوڑائے، کچھ معلوم نہیں ہوا۔"

"اُن کے ساتھ اور کوئی بھی رہتا ہوگا؟" میں نے بیٹھی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"ہاں میاں! اُن کی ایک بیٹی بھی اُن کے ساتھ رہتی تھی۔ آپ تو اُسے جانتے ہوں گے۔ کیسی نیک سیرت بچی تھی۔ کبھی اونچی آواز سے بولتے نہیں سنا۔ ہم نے ہمیشہ جھکی ہی دیکھی۔"

"کیسی تھی وہ؟" میرا سارا جسم کپکپانے لگا تھا۔ میں اُٹھ کے کھڑا ہو گیا۔ پھر میں نے ہانپتے ہوئے پوچھا۔ "وہ...... اُس کا نام؟......"

تجمل نے اُٹھ کے میرے شانے پہ زور دے کے مجھے دوبارہ مونڈھے پر بٹھا دیا۔ "اِس کا مطلب ہے۔" وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ "اب تو وہ اچھی بڑی ہو چکی ہوگی۔"

"ماشاء اللہ۔ خدا اُس کا نگہبان ہو۔" منیر علی نے جھجکتے ہوئے کہا اور مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھنے لگے۔

"وہ دونوں ہی چلے گئے؟" تجمل نے اُلجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"چلے گئے کیا کہا جا سکتا ہے۔ جانا اسے کہتے ہیں بھلا؟ خدا انھیں اپنی امان میں رکھے، جہاں رہیں خوش رہیں۔ ہم تو یہی کہہ سکتے ہیں۔ طرح طرح کے خیال آتے ہیں۔ کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ رات کو ہم سے خوب اچھی طرح باتیں کرتے رہے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ مسجد کی چٹائیاں بوسیدہ ہو چکی ہیں، انھیں بدلوا دیا جائے تو بہتر ہے۔ ہم سے ناراض ہونے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا تھا اور کوئی بھلا اس طرح اچانک ناراض ہوتا ہے۔ جب سے گئے ہیں، مدرسہ بھی ویران ہو گیا ہے۔ بچے [illegible] اُن کی پڑھائی کے ایسے عادی ہو گئے تھے کہ اب کسی دوسرے کا پڑھایا ہوا اُن کے پلے ہی نہیں پڑتا۔ وہ مجھ سے کوئی بات نہیں چھپاتے تھے۔ جانا ہوتا تو مجھ سے ذکر ضرور کرتے۔ اور بھائی! صاف بات تو یہ ہے کہ کوئی یوں گھر سے نہیں نکلتا، وہ بھی جوان بچی کے ساتھ۔"

"وہ اپنے بارے میں کیا بتاتے تھے؟" تجمل نے آہستگی سے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ یہاں آئے تھے تو بچی ساتھ تھی، تھوڑا سا سامان تھا۔ سب سے پہلے مجھ سے اُن کی ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ میں یہاں اس شہر میں رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے وہ پہلی ہی نظر میں بھا گئے تھے۔ میں نے کہا بسم اللہ، میرے برابر کا مکان خالی ہے، دیتا ہوں، آپ یہیں رہیے۔ بس ہنسنے لگے۔ مجھ سے کہا کہ مجھے کوئی روزگار بھی فراہم کر دیجیے۔ میں نے اپنے ایک شناسا عبداللہ بھائی کے ہاں بات کرا دی۔ عصر کے بعد وہاں چلے جاتے تھے، مغرب کی نماز وہیں پڑھتے تھے اور عشاء سے پہلے واپس آجاتے تھے۔ حساب کتاب کا کام تھا۔ عبداللہ بھائی نے چند ہی مہینوں میں تنخواہ بڑھا دی۔ ادھر ہم لوگوں نے اُن کا کچھ انتظام مدرسے سے کرا دیا تھا۔ امامت کا وہ ایک پیسہ نہیں لیتے تھے۔ کبھی زبان سے کچھ نہیں کہا۔ قسم ہے جو کبھی ایک حرف بھی شکوہ کا ادا کیا ہو۔ عبداللہ تو اُن کے پیچھے مرید ہو گئے تھے۔ وہ انھیں اپنے ساتھ ہی رکھنا چاہتے تھے لیکن مولوی صاحب آمادہ نہیں ہوتے۔ میری منجھلی لڑکی زبیدہ اور زینب دونوں ہم جولیاں تھیں۔

بیٹا جو ہر وقت اس کی یاد میں روتی رہتی ہے۔ میں اُسے کیا سمجھاؤں کہ وہ کہاں گئی ہے اور کب واپس آئے گی؟"

"نرجس! کیا اُس کا... اُس کا یہی نام تھا؟" میں نے سراسیمگی سے پوچھا۔

"ہاں۔ مولوی صاحب اُسے نرجس ہی کے نام سے پکارتے تھے۔" منیر علی نے جواب دیا۔ "نرجس کو خدا نے اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا اور تمام صفاتِ حسنہ بھی اُسے ودیعت کر دی تھیں۔ وہ مولوی صاحب کی آنکھوں کا سکون تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے مولوی صاحب زندہ ہی اُس کے لیے ہوں۔ مسجد، مدرسے اور علالت سے جو وقت بچتا مولوی صاحب بچی کے ساتھ گھر ہی میں گزارتے۔ اُن کو بس نہیں چلتا تھا کہ ہر وقت کہاں سے نکال کے گھر میں گزاریں۔ ملنے جلنے میں وہ بہت محتاط تھے۔ تقریبات میں شرکت سے پرہیز کرتے تھے۔ یہاں تک کہ بہت سے لوگوں کو شکایت بھی ہوتی لیکن مولوی صاحب ایسے لہجے میں اُن سے معذرت کرتے کہ پھر کچھ کہا نہیں جاتا تھا بلکہ خود شرمندہ ہونا پڑتا تھا۔ بچی کا بھی یہی عالم تھا۔ دو تین گھروں میں جانے کے سوا وہ گھر سے قدم نہیں نکالتی تھی۔ وہ بھی کبھی کبھار۔ محلے کی بچیاں خود ہی اُس سے ملنے اُسے دیکھنے آجاتی تھیں۔ ہم لوگوں نے کئی بار اشارۃً مولوی صاحب کی توجہ اس طرف دلائی کہ آپ نرجس کو گھر سے کہیں نہیں بھیجتے، وہ مسکرا کے رہ جاتے تھے۔ کہتے تھے بھیا! تم کچھ درست کہتے ہو لیکن اُسے ایک لمحے کے لیے اپنے سے جدا کرنا مجھے گوارا نہیں ہے۔ رفتہ رفتہ ہم اُن کے مزاج کے عادی ہو گئے تھے۔ ہم نے اُن سے شکوہ کرنا ہی ترک کر دیا تھا۔ ہم نے محسوس کر لیا تھا کہ ہماری ایسی باتوں سے وہ اُداس ہو جاتے ہیں۔ ہمیں اور تو سب کچھ برداشت تھا مگر اُن کی پیشانی پر بل نہیں دیکھے جاتے تھے۔"

منیر علی بولتے بولتے رک گئے اور معذرت کر کے اندر چلے گئے۔ اندر سے کسی نے دروازے پر دستک دی تھی۔ دستک کے ساتھ چوڑیوں کی آواز بھی آئی تھی۔ اُن کے جاتے ہی بیٹھک میں بیٹھے ہوئے دوسرے لوگوں نے مولوی صاحب کی باتیں شروع کر دیں۔ فیصل خاموشی سے سنتا رہا۔ منیر علی جس لڑکی کا ذکر کر رہے تھے میرا دل کہتا تھا وہ کرن کے سوا کوئی نہیں ہوگی۔ مولوی صاحب نے یہاں آکے اُس کا نام بدل دیا ہوگا۔ میرے سامنے کرن کا ذکر ہو رہا تھا۔ وہ اس بیٹھک میں آتی ہوگی۔ مجھے یہ سب ایک خواب معلوم ہو رہا تھا۔ میری آنکھوں میں جلن ہو رہی تھی اور میری رگیں جیسے کوئی کھینچے لے رہا تھا۔ منیر علی واپس آئے تو اُن کے ہاتھوں میں مٹھائی اور نمکین چیزوں سے بھری ہوئی تام چینی کی دو پلیٹیں تھیں۔ انھوں نے پلیٹیں سامنے رکھ دیں اور اصرار کرنے لگے کہ ہم کچھ کھائیں۔ فیصل نے دل رکھنے کو لے لیے لیکن مجھ سے ہاتھ نہیں بڑھایا گیا۔ منیر علی نے زیادہ اصرار کیا تو فیصل نے آہستگی سے کہا۔ "بڑے صاحب! اِن کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"نصیب دشمناں کیا بات ہے؟" منیر علی تشویش سے بولے۔ "آب و ہوا بدلنے سے ہی ہوتا ہے۔ ویسے بھی تم لوگوں کو راس آتے آتے ہی آئے گی۔ گرم تیل میں تلی بڑی چیزیں نہیں ہیں گھر کی ہیں کچھ کھائیے میاں! ارے ٹھنڈے پانی سے تو کچھ نہیں ہوگا۔"

"نہیں نہیں۔" میں نے آہستگی سے کہا۔ "میرا جی نہیں چاہ رہا ہے۔"

"تو یہ لڈو کھائیے! تل کے ہیں میری بیٹی زہرہ نے بنائے ہیں۔ مولوی صاحب بھی بڑے شوق سے کھاتے تھے۔" منیر علی نے پلیٹ میرے آگے کر دی۔

"نہیں نہیں۔" میری آواز ڈوبنے لگی۔ "آپ... آپ کیا بتا رہے تھے؟"

"مولوی صاحب یہاں کب آئے تھے؟" فیصل نے نرمی سے پوچھا۔

"تین سال سے کچھ زیادہ ہونے ہی لگے۔" منیر علی نے تذبذب سے جواب دیا اور اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کے کہا۔ "مجھے خوب یاد ہے تین رمضان تو انھوں نے یہیں گزارے۔ یہ تیسرا ہی تھا نا؟" دوسرے لوگوں نے سر ہلا کے تائید کی۔

"آپ لوگوں نے انھیں کہاں کہاں ڈھونڈا؟" فیصل نے پوچھا۔

"ادھر اجمیر، بیکانیر، جے پور اور ادھر میرٹھ، مظفرنگر، غازی آباد، علی گڑھ، آگرہ، نزدیک دُور جتنے شہر تھے جہاں جہاں لوگ جا سکتے تھے انھیں تلاش کرتے رہے۔"

"آپ نے پولیس کو بھی بتایا؟"

"ہاں بھائی! یہ بھی کیا۔ کئی بار تھانے کوتوال کے چکر لگائے۔ ریاست کے بااثر لوگوں کو درمیان میں ڈالنے کی کوشش کی مگر کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ آخر اُن کا سامان ایک کوٹھری میں بند کر کے تالا ڈال دیا گیا۔ میں نے ابھی تک اُن کے لیے مکان خالی رکھا ہے۔ وہاں جاتے ہوئے جی دہلتا ہے۔ میری بیٹی زہرہ وہاں روز جھاڑو دیتی ہے۔ بچی کہتی ہے کہ وہ لوگ اچانک آ گئے تو کیا کہیں گے کہ گھر کتنا گندا رکھا تھا۔"

"جس دن سویرے مولوی صاحب دکھائی نہیں دیے اُس سے پہلے آپ لوگوں نے اُن کے پاس کسی کو آتے جاتے تو نہیں دیکھا تھا؟"

"پولیس نے بھی ہم سے یہ سوال کیا تھا مگر ہم نے کسی ایسے شخص کو نہیں دیکھا۔ تین سال کی مدت میں اُن سے کوئی ملنے نہیں آیا۔ دونوں مکانوں میں ایک دیوار ہی تو حائل ہے۔ اس طرف کی اونچی آواز اُس طرف پہنچتی ہے۔ بیچ میں خواتین کے آنے جانے کے لیے کھڑکی بنی ہوئی ہے۔ کوئی آتا تو ہمیں ضرور خبر ہوتی۔"

"اور یہاں مولوی صاحب سے کن کن لوگوں کا ملنا جلنا تھا؟"

"جہاں تک میرے علم میں ہے مسجد کے نمازی، محلے کے لوگوں اور عبداللہ بھائی کے ہاں آنے جانے والوں کے سوا اُن کو کوئی جاننے والا نہیں تھا۔ میں نے آپ سے کہا نا کہ وہ خود ملنا جلنا پسند نہیں کرتے تھے بلکہ میں تو یہی کہوں گا کہ وہ کترانے کی حد تک لوگوں سے الگ تھلگ رہتے تھے۔ جمعے کی تقریبوں میں انھیں بہ مشکل کبھی لے جا سکے۔ شاید وہ ایک ہی بار گئے ہوں۔ بس یہی طور پر رہتے تھے۔ تین سال میں صرف ایک بار وہ بھی ڈھائی دن کے لیے باہر گئے۔ یہ اُن کے جانے سے کوئی ڈیڑھ دو مہینے پہلے کی بات ہے۔ میرے اصرار پر ایک دفعہ اجمیر شریف چلنے کے لیے آمادہ ہو گئے تھے۔ میرا خیال تھا، نرجس کو

یہیں چھوڑ دیں گے مگر انھوں نے نرجس کو بھی ساتھ لے چلنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے گھر سے اپنی دونوں بچیوں کو بھی اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ ہم حاضری دے کے تیسرے ہی دن واپس آ گئے تھے۔"

"جانے سے ڈیڑھ مہینے پہلے؟" فیصل نے تکرار کی۔

"جی ہاں۔" منیر علی نے آنکھیں میچ کے جواب دیا۔

"اور اجمیر شریف کے سوا آپ کہیں نہیں گئے؟"

"نہیں کچھ وقت تو آنے جانے میں گزرا، باقی اجمیر شریف میں۔" منیر علی نے جھجک کے کہا۔ "سفر سے واپسی پر وہ بہت خوش تھے۔ میں نے کہا کہ اب گھر سے باہر نکلا کیجیے طبیعت بہل جایا کرے گی۔ انھوں نے وعدہ کیا تھا کہ عید بعد میرے ساتھ دلی چلیں گے اور حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کی درگاہ پر حاضری دیں گے۔"

فیصل خاموش بیٹھا کچھ دیر تک سر جھکائے رہا اور اندر سے آیا ہوا دودھ کا شربت پیتا رہا۔ پھر گلاس رکھ کے اٹھنے لگا۔ "بڑے صاحب! اب ہم پھر کسی وقت آئیں گے۔ آپ کا ہم نے بہت وقت لیا۔ اب ہمیں اجازت دیں۔"

"واہ صاحب! دوبارہ آنے کا کیا سوال۔ آپ یہیں میرے ساتھ رہیں گے۔ یہ گھر آپ کا اپنا گھر ہے۔ آپ کہیں اور نہیں ٹھہریں گے۔ آپ کا سامان کہاں رکھا ہے؟"

"تھوڑا سا سامان تھا، وہ ہم نے ایک ہوٹل میں رکھوا دیا تھا۔ آپ کی مہربانی۔ ہمیں چلنے دیجیے، ہم پھر آئیں گے۔"

"نا صاحب! یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ میرے ہوتے ہوئے مسافر خانے پہ ٹھہریں۔ میرے آپ سے کئی رشتے نکلتے ہیں۔ ایک تو آپ مولوی صاحب کے عزیز ہیں۔ اس شہر میں مجھ سے زیادہ کوئی اُن سے قریب نہیں تھا۔ دوسرے آپ میرے ہم وطن ہیں۔ تیسرے سب سے پہلے آپ کی مجھ سے بات ہوئی ہے۔ انکار کیا تو میں سمجھوں گا کہ آپ نے مجھے کسی لائق نہیں سمجھا۔"

فیصل نے بہت منع کیا مگر منیر علی ضد کی حد تک اپنی بات پر اڑے رہے۔ فیصل مجبوراً رکنے پر آمادہ ہو گیا۔ منیر علی نے اُسی وقت ہم سے ہوٹل کا پتہ پوچھ کے ایک آدمی روانہ کر دیا کہ وہ اُن کا نام لے کے ہمارا سامان اٹھا لائے۔ باقی لوگ رات کو آنے کا کہہ کے رخصت ہو گئے۔ اندھیرا ہونے لگا تھا۔ جب منیر علی اندر چلے گئے تو فیصل میرے قریب آ گیا اور مجھے جھنجھوڑتے ہوئے بولا۔ "میں جانتا ہوں تمھیں کیا لگ رہا ہوگا۔ تم ذرا اپنے آپ کو تھام کے رکھو۔ سب تمھاری طرف دیکھ رہے تھے۔ کوئی بات اُن پر کھل گئی تو تمھاری بڑی بدنامی ہوگی۔ لوگ اچھا برا سوچنے میں دیر نہیں لگاتے ہیں۔"

"میرا دم گھٹ رہا ہے۔" میں نے سسکتے ہوئے کہا۔

"مجھے پتہ ہے، یہ پانی آنکھوں ہی میں بند رکھو۔"

"یہ لوگ کیسی باتیں کر رہے تھے؟ کیا کہہ رہے تھے؟"

"میں نے تجھ سے کچھ الگ نہیں سنا ہے۔"

"یہاں سے چلے چلو۔ میرا دم گھٹ رہا ہے۔ ہم یہاں ٹھہر کیوں گئے ہیں؟"

"کیا اُس کے گھر تک آتے ہی جلدی چلا جائے گا؟"

"یہ تو ہے کہاں، اُس کا ملنا میرے نصیب میں نہیں ہے۔" پلکیں بند ہو گئیں۔ "وہ نہیں ملیں گے، کبھی نہیں ملیں گے۔" میں نے کانپتے ہوئے انداز میں کہا۔

"کچھ سوچ سمجھ کر لاڈلے! تجھے تو اس کی خوشی ہونا چاہیے کہ وہ خیریت سے ہے، عزت سے رہ رہی تھی۔ یہاں آکے بھی اُس کا کھوج نہ چلتا تو ہم کیا کر لیتے؟" دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ فیصل نے جلدی سے بات بدلی اور پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے بولا۔ "اپنا نہیں تو کچھ اُن کا خیال کرو۔"

"چائے پی لیجیے۔" منیر علی چائے کی پیالیاں لیے ہوئے بیٹھک میں آ گئے۔

"آپ بہت تکلیف کر رہے ہیں بڑے صاحب!" فیصل نے اُٹھ کے اُن کے ہاتھ سے چائے لے لی۔

"تکلیف کیسی جناب! یہ تو میری راحت ہے۔ آپ نے سنا نہیں کہاں عزیز ملتے ہیں؟ باتوں باتوں میں مجھے احساس ہی نہیں ہوا کہ شام کا وقت ہے اور آپ کو چائے کی طلب ہوگی۔ آپ مولوی صاحب کے وطن کے ہیں، آپ حضرات چائے شوق سے پیتے ہوں گے۔ مولوی صاحب بتاتے تھے کہ ادھر کے گھرانوں میں چائے کا رواج عام ہو گیا ہے۔ یہاں بھی اب بہت سے گھروں میں یہ رسم چل پڑی ہے۔ مولوی صاحب باقاعدگی سے صبح و شام چائے پیتے تھے۔ اُن کی دیکھا دیکھی ہمارے گھر کے بچے بھی عادی ہو گئے۔" منیر علی کہتے کہتے پھر بے چین ہو گئے۔ رومال سے اپنی آنکھوں کے گوشے صاف کرنے لگے اور معذرت کرنے لگے۔ "دیکھیے صاحب! اگر کوئی تکلف کریں گے تو شکایت ہوگی۔ گھر میں بچیاں رہتی ہیں۔ آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو بے تکلف کہیے گا۔" منیر علی پھر گھر کا نقشہ سمجھانے لگے۔ انھوں نے بتایا کہ اُن کی بیوی پانچ سال پہلے رخصت ہو چکی ہیں۔ سب سے بڑا لڑکا بھی فوت ہو گیا ہے۔ دوسرا لڑکا علی گڑھ میں تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ ایک لڑکی کی شادی ہو گئی ہے وہ جے پور میں اپنے شوہر کے ساتھ مقیم ہے۔ دو لڑکیاں اور ایک بارہ سالہ لڑکا اُن کے ساتھ ہیں۔ منیر علی کی ایک چکی محلے میں چل رہی تھی۔ تھوڑی بہت زمینیں بھی تھیں، ان سے بھی کچھ آمدنی ہو جاتی تھی۔ وہ مولوی صاحب سے صرف دس روپے مکان کا کرایہ لیتے تھے۔ یہ بھی اُن کی ضد پر۔ مولوی صاحب نے کرائے کے بغیر رہنے سے انکار کر دیا تھا۔ منیر علی دیر تک اپنے بارے میں بتاتے رہے۔ اس دوران ہوٹل کا آدمی ہمارا سامان لے کے آ گیا تھا۔ منیر علی مغرب کی نماز کو چلے گئے۔ انھوں نے ہم سے نماز کے لیے نہیں پوچھا۔ گھر کی بوڑھی ملازمہ نے آ کے لالٹین جلا دی اور بیٹھک کا دروازہ کھول دیا۔ یہ دروازہ دوسری جانب سے گھر میں کھلتا تھا اور شاید اسی خیال سے بند رکھا گیا تھا کہ مہمانوں کو کوئی تکلیف نہ ہو۔

منیر علی نماز پڑھ کے واپس آئے تو فیصل منہ ہاتھ دھو کے اور کپڑے بدل کے سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ منیر علی نے اپنے چھوٹے لڑکے کی مدد سے دوسری چارپائی بھی بیٹھک میں ڈال دی اور بوڑھی ملازمہ نے لالٹینیں

نے کوئی یادداشت نہیں لکھی تھی۔ فارسی ناول ایک کاپی پر جستہ جستہ اشعار درج تھے۔ فارسی اور عربی شعروں کی کثرت تھی۔ میں نے جستہ جستہ انھیں پڑھا۔ کوئی پرزہ ایسا نہیں تھا جو میں نے غور سے نہ دیکھا ہو کہ شاید کہیں کوئی نشان مل جائے یا کہیں میرا ذکر ہو لیکن مولوی صاحب کے کاغذات میں منتخب احادیث، اشعار، اقوال، بعض آیات کی تفسیریں، بعض مسائل کی تشریح، بعض منطقی موضوعات کے خلاصے اور حکایتوں کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ کتابوں میں انگریزی کی کتابیں بھی شامل ہیں۔ ورڈز ورتھ، انگریزی ناول، انگریزی اردو ڈکشنری، انگریزی الفاظ و معانی کی کاپی، شیکسپیئر کی چند کتابیں اس بات کی غمازی کر رہی تھیں کہ مولوی صاحب نے فرصت کے اوقات میں انگریزی سیکھنے کی کوشش کی ہے اور ان کی انگریزی تحریر سے پتہ چلتا تھا کہ انھوں نے اچھی خاصی مہارت بھی حاصل کر لی ہے۔ ابتدائی کتابوں کے علاوہ اگلے درجوں کی کئی کتابیں بھی رکھی ہوئی تھیں۔

اُس کی مسہری کی ذرا سی ٹیڑھی، دھول کی ہلکی سی تہ جمی ہوئی تھی۔ میں نے الماری کے خانے سے بے خیالی میں آئینہ اٹھایا کہ شاید اس میں کوئی کا کوئی عکس محفوظ رہ گیا ہو۔ آئینے کے پیچھے مجھے ایک کنگھی دکھائی دی۔ میں نے اسے آنکھوں سے لگا لیا۔ اس میں کوئی کی خوشبو بسی ہوئی تھی اور دندانوں میں اُس کے چند بال اٹکے ہوئے تھے۔ وہی مسہری، وہی سیاہ بال۔ کھلتے ہیں جب ہم دونوں ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے اور ہمیں کچھ پتہ نہیں تھا کہ ہم کہاں جائیں گے کیا کریں گے کوئی اپنے بال جھٹک کر جھٹک رہی تھی۔ مجھے وہ خوشبو اب تک یاد تھی۔ ہم کوئی ڈیڑھ گھنٹے تک سامان دیکھتے رہے۔ میرا جی وہاں سے ایک لمحے کے لیے بھی ہٹنے کو نہیں چاہتا تھا لیکن منیر علی ایک ایک کر کے صندوقوں میں تالے ڈالتے گئے اور پھر ساتھ دیکھنے کو کچھ نہیں رہا۔ فضل واپس جانے لگا تو مجھے بھی کمرے سے نکلنا پڑا۔ منیر علی نے دروازے پر تالا لگا دیا اور چلتے چلتے دوسرے کمرے میں جھانک کے دیکھا۔ وہاں ارشد موجود نہیں تھا۔ ہمارے باہر آتے ہی منیر علی کے گھر کے صحن میں کھلنے والی کھڑکی کے پٹ زور سے بند ہونے کی آواز آئی۔ منیر علی کا چھوٹا بیٹا اندر سے دروازے کی کنڈی لگانے کے لیے مکان ہی میں رہ گیا۔ ہم تینوں باہر چلے آئے۔ فضل کے چہرے پر دھند سی چھائی ہوئی تھی۔ بیٹھک میں آکے بھی وہ چپ چپ رہا۔ "آپ نے کیا اندازہ لگایا جناب؟" منیر علی نے سانس تھامے ہوئے، مضطرب لہجے میں پوچھا۔

فضل نے جواب نہیں دیا۔ منیر علی دیر تک اُس کی صورت دیکھتے رہے اور تپائی پر رکھی ہوئی خشک میوے کی پلیٹ سے کشمش ٹونگتے رہے۔ اُس لمحے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی اور بھی کمرے میں موجود ہے۔ میں نے بےچینی سے چاروں طرف نگاہ گھمائی تو سامنے کے روشن دان کی جالیوں سے دو بڑی بڑی آنکھیں جھانکتی ہوئی نظر آئیں۔ میں اس کا پورا چہرہ تو نہیں دیکھ سکا لیکن اس کا رنگ ہو سے جیسا تھا۔ وہ جالیوں کے پاس سے فوراً ہٹ گئی۔ منیر علی نے بھی شاید دیکھا مگر روشن دان خالی ہو چکا تھا۔ وہ منیر علی کی لڑکی زہرہ ہی ہو سکتی تھی کیونکہ [illegible]

دیکھا نے ایسے موقعے کے ساتھ میں کرانے اُس سے کیا کیا باتیں کی ہوں گی۔ کتنی ہی سہیلیوں میں کوئی پُر جوش نہیں ہوتا کہ اُس کے بارے میں جتنا وہ جانتی ہوگی کوئی اور نہیں جانتا ہوگا۔ ویسے بھی ملاقاتیں ہوں گی۔ تم کہیں آئے ہیں کو راکے عزیز کیسے ہیں۔ وہ بھی بہت کچھ جاننے کے لیے بے تاب ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ راشد نے اُسے تیرے بارے میں بھی کچھ بتایا ہو۔ صبح اٹھنے کے ملال میں بھی روشن دان میں مجھے کسی سائے کا گمان ہوا تھا مگر اس وقت اتنی روشنی نہیں تھی۔ منیر علی کچھ دیر تک فضل کے ردعمل کا انتظار کرتے رہے مگر فضل نے کچھ نہیں کہا تو انھوں نے ہم سے معذرت چاہی کہ انھیں چھوٹے لڑکے کو مدرسے چھوڑنے اور اپنے چند کام نمٹانے کے لیے باہر جانا ہے۔ وہ پہر کے کھانے سے پہلے واپس ہو جائیں گے۔ اس دوران کوئی بھی ضرورت ہو تو بے تکلف دستک دے دیجیے گا۔ ملازم بھی گھر پر موجود ہے۔ اگر آپ بھی ساتھ چلنا چاہیں تو بصد شوق۔"

"نہیں منیر صاحب! ہم یہیں رہیں گے۔" فضل پیالہ لیتے ہوئے بولا۔

منیر علی شاید خود بھی ہمیں ساتھ لے جانا نہیں چاہتے تھے۔ بس یونہی پوچھ لیا تھا۔ اُن کے جانے کے بعد فضل اور میں بیٹھک میں پھر تنہا رہ گئے۔ منیر علی کو گئے ہوئے خاصی دیر ہو گئی تھی۔ وہ آنکھیں دوبارہ مجھے روشن دان پر چپکتی ہوئی نظر آئیں۔ جیسے ہی میں نے نگاہ اُٹھائی اُس کے چہرے کے سفید رنگ کا ایک جھماکا سا ہوا اور معدوم ہو گیا۔ پھر بار بار میری نگاہ خود ہی روشن دان کی طرف اُٹھنے لگی مگر وہاں کوئی نہیں آیا۔ فضل گاؤ تکیے سے سر ٹکائے آنکھیں نیم وا کیے لیٹا تھا۔ میں اُسے چھوڑ کے باہر آ گیا۔ بیٹھک میں ہوا بند ہونے سی لگی تھی۔ گلیوں میں دور دور تک آگ برس رہی تھی لیکن اِدھر اُدھر سے چھتری لگانے والوں کی صدائیں آ رہی تھیں۔ میں محلے کی مسجد سے بھی آگے نکل گیا۔ کچھ فاصلے پر سبزی منڈی تھی اور اُس کے پاس ہی آڑھت والوں کی بہت سی دکانیں تھیں۔ میں گھومتا رہا۔ اب مولوی صاحب آنجہانی یا جہاں کہیں کی طرح گھر کا کوئی آدمی ملنے کا امکان نہیں تھا۔ میں پہلی بار وہاں سے گزر رہا تھا۔ شہر میرے لیے نیا تھا۔ منیر علی نے پہلے ہی انکار کر دیا تھا کہ مولوی صاحب کے علاوہ اور تو کے کسی آدمی سے واقف نہیں ہیں۔ میرا دماغ ویسے خالی خالی تھا اور مجھے اپنا جسم کھوکھلا لگ رہا تھا۔ میں جلدی ہی گھر کی طرف واپس ہونے لگا مگر راستے میں ایک جگہ میرے پیر رکنے لگے۔ سامنے سے کندھے لٹکائے اور منہ اٹھائے ہوئے آہستہ آہستہ ارشد آ رہا تھا۔ میں نے سوچا اُسے روک کے کچھ پوچھوں لیکن تھوڑی دور تک میں نے اُس کا پیچھا بھی کیا۔ اُسے خبر بھی نہیں ہوئی کہ اُس کے پیچھے کوئی آ رہا ہے۔ اُسے گھر سے باہر دیکھ کے میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا اور میرے قدموں میں تیزی آ گئی۔ ارشد آگے نکل گیا تھا۔ میں واپس گھر چلا آیا۔ بیٹھک میں فضل اسی طرح نیم دراز غنودہ پڑا ہوا تھا۔ میں دروازے پر دستک دیتے ہوئے جھجکا، میرے ہاتھ کو دونوں کرسی سے لگا کے رہ گئے۔

میں کرسی پر بیٹھ کے ہانپنے لگا۔ "چندل لے آئے؟" میرے کانوں میں فضل کی آواز گونجی۔ میں کرسی سے اچھل پڑا۔ وہ کروٹ بدلے مجھی کو دیکھ رہا تھا۔

"بھول گیا تھا لے آتا ہوں۔"

"جب جانے لگو تو لے آنا۔ ابھی کچھ نہیں۔"

"تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں معلوم ہوتی؟"

"ٹھیک ہے۔" اس نے اونچی آواز میں کہا۔ "بس ذرا من زور کر رہا ہے۔ سالا ادھر کو سر جمن کر نہیں لگ رہا۔"

"تو چلے چلو۔ اب یہاں کیا رکھا ہے۔"

"کچھ دیر اور ٹھیرنے میں حرج نہیں ہے۔"

"ٹھیرو۔" میں نے تشی سے کہا۔ "کیا ارادہ ہے طبیعت اور خراب نہ ہو جائے۔ لگتا ہے [illegible] جوار پانی ادھر کا بھی راس نہیں ہے۔ ہوا کے اوپر تلے ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ اُس میں برقرت بھی چلتی رہتی ہے۔"

"میں تمہارا سامان کمرے کے حوالے کر آتا ہوں۔ سبزی منڈی میں ایک کلو چوسنے میں نے آتے میں دیکھے تھے کہو تو وہ بھی لے آؤں؟"

وہ ہنسنے لگا۔ "تیرا تو بہت دن رکنے کا ارادہ معلوم ہوتا ہے۔"

"میں تو تمہاری وجہ سے کہہ رہا ہوں۔"

فضل کچھ کہہ ہی رہا تھا کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ میں اس کی بات سنے بغیر لپک کر وہاں پہنچا۔ دروازہ بھیڑا ہوا تھا۔ وہ غیر ارادی طور پر میرے ہاتھ سے کھل گیا۔ مجھے دیکھتے ہی اُس نے سسکاری بھری۔ اُس کے ہاتھ میں رکھی ہوئی چائے کی ٹرے میں پیالیاں کھڑکھڑانے لگیں۔ شرم سے اُس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اُس کا رنگ گندمی تھا۔ لباس سادہ تھا۔ تنگ موری کا پاجامہ اور دوپٹا سر سے ڈھلکا ہوا۔ کانوں میں بالیاں اور ہاتھوں میں رنگ برنگی چوڑیاں۔ قمیض تنگ نہیں، چہرہ ستواں، نقش دلگداز، قد نکلتا ہوا۔ میں اُسے ایک ہی نظر دیکھ سکا۔ ایک لمحے کے لیے جیسے وقت سکتہ سا ہو گیا پھر اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ بے ساختہ ٹرے گر گئی اور دودھ کا چھینٹا ہوا۔ وہ بد حواسی میں ایک طرف بھاگی اور میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ میں پیچھے ہٹنا چاہتا تھا مگر ایک لمحے میں یہ سب کچھ ہو گیا۔ مجھ سے دروازہ بھی بند نہیں کیا جا سکا۔ سامنے منیر علی کے گھر کا صحن اور دالان کا کچھ حصہ نظر آ رہا تھا۔ میں نے ذرا دیر گی سے فضل کی طرف دیکھا۔ وہ گاؤ تکیے میں منہ چھپائے چپ لیٹا ہوا تھا۔ آخر ہمت کر کے میں نے دروازہ بند کر دیا۔

مجھے یقین تھا کہ وہ پھر واپس آئے گی لیکن بہت دیر ہو گئی۔ دروازے پر دوبارہ دستک نہیں ہوئی۔ شاید اس نے ملازم کو بھیجا مگر وہ اُسے اندر بھیج سکتی تھی۔ میں نے ارادہ کیا کہ خود دستک دے کے معذرت کر لوں۔ منیر علی کی واپسی کا ابھی وقت ہے۔ ملازم کہیں باہر گیا ہے تو وہ بھی واپس آ سکتی ہے۔ میں وہاں تک گیا بھی لیکن پھر لوٹ آیا۔ اسی اثنا میں دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ میں نے جو طے کیا تھا سب ذہن سے نکل گیا اور میں دروازے کے پاس گم صم کھڑا رہا۔ دوسری دستک پر میں نے کھنکار کے اپنی موجودگی کی تصدیق کی۔ "یہ ..... یہ لے لیجیے۔" اندر سے سہمی ہوئی آواز میں کسی نے کہا۔

میں نے آہستگی سے ایک جانب کا پٹ کھول کے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ ٹرے میرے ہاتھ میں ہوتی تو اس نے اُسے تھام لیا۔ "معاف کیجیے" میں نے تیزی سے کہا۔

اُس طرف خاموشی طاری رہی۔ چوڑیاں بجنے سے مجھے اندازہ ہوا کہ ابھی دروازے کے پاس کوئی موجود ہے۔ "..... کیا آپ زہرہ ہی ہیں؟" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "آپ ہی ہیں نا؟" اُس نے جواب نہیں دیا۔ میں نے اُس کی خاموشی ہی جواب سمجھی۔ "دیکھیے مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔" میں نے دبی زبان میں کہا۔ "نرگس کے بارے میں صرف اُس کے بارے میں آپ مجھے کچھ بتا دیجیے۔ بڑے صاحب سے میں بہت سی باتیں نہیں پوچھ سکتا اور وہ اتنا جانتے بھی نہیں ہوں گے جتنا آپ۔ مجھے معلوم ہے آپ کے لیے بہت مشکل ہے۔ آپ ایک پردے والی ہیں اور میں آپ کے لیے اجنبی ہوں لیکن نرگس کے رشتے سے آپ مجھے اپنا دوست کہیے۔ بھروسا کیجیے جتنا آپ خود پر کر سکتی ہیں۔ آپ نرگس کی سہیلی تھیں [illegible] جتنی نرگس کی کوئی سہیلی ہو سکتی ہے۔ میں نے اس لمحے کے لیے ایک ایک لمحہ توقف کیا ہے [illegible] آپ سوچ لیجیے مگر جلدی سے سوچیے گا کیونکہ میں آپ کو مجبور نہیں کر سکتا صرف منت کر سکتا ہوں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ بڑے صاحب کو ہماری باتوں کا علم نہیں ہوگا۔ آپ ایک پڑھی لکھی لڑکی ہیں آپ خود کہیں اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔ نرگس کے لیے آپ بہت عزیز تھیں۔ مجھے صرف نرگس ہی کی بات کرنی ہے کچھ اور نہیں۔" میں نے اپنی زبان روک لی۔ اِدھر سے کچھ آہٹ نہیں ہو رہی تھی جیسے وہاں کوئی موجود نہ ہو اور میں اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہوں۔ میں وہیں کھڑا رہا۔ وہ شاید بات سنے بغیر چلی گئی تھی۔ خاصی دیر انتظار کرنے کے بعد میں نے دروازہ بھیڑ دیا اور ٹرے فضل کے آگے رکھ دی۔

کوئی پانچ دس منٹ کے اندر منیر علی واپس آ گئے۔ فضل پلنگ سے اُٹھ گیا۔ ظہر کی نماز پڑھنے اور کھانا کھانے کے بعد جب منیر علی ذرا دیر سستانے بیٹھے تو شہر کے حالات بتانے لگے۔ اسی دوران فضل نے اچانک اُن سے پوچھا۔ "منیر صاحب! آپ نے مولوی صاحب کو ارشد میاں کے بارے میں کچھ بتایا تھا؟"

"جی!" منیر علی نے حیرت سے کہا۔ "آپ ..... آپ کا کیا مطلب ہے؟"

"میں آپ سے جو پوچھ رہا ہوں وہی میری مراد ہے۔"

"آپ کو کیسے معلوم ہے؟" منیر علی نے تیز و تند لہجے میں کہا۔

"ارشد میاں کو دیکھ کے! میرا خیال ہے آپ نے اُن سے ضرور بات کی ہوگی۔ پھر وہ کیا بولے؟ ہو سکے تو مجھے بتائیے۔"

"مگر ..... مگر آپ اتنے وثوق سے یہ کیسے کہہ رہے ہیں؟"

"میں اندازے کی بات بول رہا ہوں۔"

"مگر یہ بہت بری بات تھی [illegible] اور مولوی صاحب کے

درمیان ہوئی تھی۔ آپ کا اندازہ۔۔۔ نہیں نہیں" مولوی صاحب کے لہجے میں لرزش آگئی۔ "بہرحال آپ کا اندازہ بہت خوب ہے۔"

"اور یہ کوئی بری بات نہیں تھی بڑے صاحب! لڑکی والے کا گھر دکان ہوتا ہے جہاں لڑکی ہوتی ہے وہاں گاہک آتے ہی ہیں۔ جس چیز کو لوگ اچھا سمجھتے ہیں اسی کو اپنے پاس رکھنا چاہتے ہیں۔ آپ ارشد میاں کے لیے کسی بھی لڑکی کے لیے بول سکتے ہیں، ہر جگہ لڑکیوں کی بولیاں لگی ہوئی ہیں، ہر جگہ یہ دکانیں ہیں، میں تو صرف اتنا پوچھنا چاہتا ہوں کہ مولوی صاحب نے آپ کو جواب میں کیا بولا؟"

"آپ اُن کے جواب کا اندازہ بھی کیوں نہیں لگا لیتے؟"

"وہ مجھ کو معلوم ہے پر مولوی صاحب بولے کیا تھے؟"

"کیا بولتے!" منیر علی کی آواز مدھم پڑ گئی۔ "انھوں نے ارشد میاں کو اس لائق نہیں سمجھا۔"

"انھوں نے کیا بولا بڑے صاحب؟" منیر علی میری طرف دیکھنے لگے۔

"اس کے سامنے ہی بولیں میں اس سے بہت کم باتیں چھپاتا ہوں۔" تجمل نے کہا۔

"رات کو کسی وقت گفتگو کریں گے۔" منیر علی نے تذبذب سے کہا۔

"یہ تب بھی موجود رہے گا۔ آپ اس کی فکر نہ کرو۔" تجمل مسکراتے ہوئے بولا۔ "میری اس کی بچپن کی یاری عمر کی ہے۔"

"نہیں صاحب! بڑے بچے کی بھی ہے میں ابتدا سے اُس کی تربیت دی گئی ہے۔"

"یہ بات یہ خوب جانتا ہے۔"

"آپ کی مرضی۔" منیر علی نے پلکیں سکوڑتے ہوئے کہا۔ "میں نے مولوی صاحب قبلہ سے بات کی تھی حالانکہ مجھے ایسا کرنا نہیں چاہیے تھا۔ شروع سے میرا اور بشیر مرحوم کا خیال تھا کہ ارشد میاں کی نسبت زہرہ سے کر دی جائے گی۔ اس خواہش کی رسمی تکمیل یوں ضروری نہیں سمجھی گئی کہ گھر کا معاملہ تھا۔ ارشد میاں کی تعلیم کے دوران ہی میری بہن اپنے بیٹے کو دولہا اور میری بیٹی کو دلہن دیکھنے کی حسرت دل میں لیے دنیا سے چلی گئی۔ ارشد میاں کو میں نے یہاں بلوا لیا۔ جب میں نے اُن کی رغبت مولوی صاحب کے گھر میں دیکھی تو زہرہ کے معاملے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ ارشد اور زہرہ کی بات بشیر اور میری تک محدود تھی۔ زہرہ بھی اپنی بچی تھی۔ خدا جانتا ہے کہ میں نے کبھی دو گھر نہیں سمجھے۔ زہرہ کے بجائے زرمین۔ مجھے یہ فیصلہ کرنے میں ذرا بھی گرانی محسوس نہیں ہوئی بلکہ خوشی ہی ہوئی۔ چنانچہ ایک روز میں نے مولوی صاحب کا مزاج خوش گوار دیکھ کے اس کا ذکر کر دیا۔ میرا خیال تھا انھیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ ارشد میاں کو وہ بھی اپنا بچہ سمجھتے تھے لیکن خلاف توقع مولوی صاحب نے اس دن پہلی بار مجھ سے عجیب رویہ اختیار کیا۔ انھوں نے صاف منع کر دیا۔ ایسے معاملے میں فوراً جواب نہیں دیا جاتا۔ انکار ہو تو رسماً سب عذر پیش کر دیا جاتا ہے۔ میں اُن کا منہ دیکھتا رہ گیا۔ انھوں نے آیندہ کے لیے بھی یہ کہہ کے بات کا دروازہ بند کر دیا کہ زرمین کے سلسلے میں ایسی کوئی بات نہ کی جائے تو بہتر ہے۔"

"پر انھوں نے ایسا کیوں کیا بڑے صاحب؟" تجمل نے بے چینی میں دخل دیا۔

"واللہ اعلم۔ اُن سے کچھ پوچھنے کی پھر میری ہمت نہیں پڑی۔ ہم دونوں نے اس کے بعد مولوی صاحب سے اپنے مراسم میں کوئی شکن نہیں آنے دی۔ زرمین بیٹی مجھے اسی طرح عزیز رہی اور مولوی صاحب اسی طرح میرے لیے محترم رہے۔"

"آپ نے بولا نہیں کہ مولوی صاحب تم کہیں تو زرمین بی بی کا ہاتھ تھامنے پھر آخر منع کیوں کرتے ہو؟"

"میں نے آپ سے کہا نا اصل میں انکار سننے کے بعد مجھے حوصلہ نہیں رہا۔ یوں بھی میں لاکھ زرمین کو اپنی بیٹی سمجھتا، اس کے بارے میں فیصلہ کرنے کا اختیار انھی کو تھا۔"

"پر بڑے صاحب! مولوی صاحب ادھر کئی سال سے بچے ہوئے تھے آپ کے علاوہ بھی اور لوگوں نے اُن سے ایسی بات بولی ہوگی کیا انھوں نے سب کو یہی جواب دیا؟"

"ہاں بھائی! یہی کر۔" منیر علی مایوسی سے بولے۔

"یہ کیوں بڑے صاحب؟"

"ارشد کی بات کے بہت دنوں بعد میں نے ایک دفعہ اشارتاً اُن سے کہا تھا کہ آپ نے ارشد میاں کو اپنی فرزندی میں قبول نہیں کیا مجھے کوئی شکایت نہیں ہے لیکن زرمین کے سلسلے میں آپ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر لیجیے۔ شہر کے کئی اچھے گھرانوں نے اُن سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تھا۔ مجھ سے اُن کی خاص رفاقت کی وجہ سے چند صاحبان نے میرے ذریعے اُن تک بات پہنچائی تھی۔ مولوی صاحب نے کسی میں کوئی تخصیص نہیں کی کسی کو کسی پر ترجیح نہیں دی۔ ان میں ایسے خاندان بھی تھے دولت جن کے گھر کی لونڈی ہے۔ کہیں سے کوئی سلسلہ جنبانی ہوتی تھی تو میں اُن کے سامنے بہت احتیاط سے اس کا تذکرہ کرتا تھا۔ ایک مرتبہ انھوں نے کسی قدر ناراض ہو کے کہہ دیا کہ جب وہ مناسب سمجھیں گے تو مجھے بتا دیں گے۔ اس وقت تک انھیں مجبور نہ کیا جائے۔ پھر میرے زبان کھولنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مگر میرے چپ ہو جانے سے کچھ نہیں ہوتا تھا۔ تمام لوگ مولوی صاحب کے مزاج سے واقف نہیں تھے۔ وہ بار بار اپنے امیدواری کے پیام کی تکرار کرتے تھے اور انکار کو اپنی ہتک سمجھتے تھے۔ میں انھیں سمجھاتا تھا کہ جانے کوئی ایسی ہی مجبوری ہوگی جو مولوی صاحب نے معذوری ظاہر کی ہے۔ سب کی یہی خواہش تھی کہ زرمین اُن کے گھر آیا کرے۔ ماشاءاللہ چندے آفتاب چندے ماہتاب۔ چاند کو شرماتی تھی۔ بالکل پھولوں جیسی تھی۔ کسی ملک کی شہزادی یا پرستان کی کوئی ملکہ۔ لڑکیاں بالیاں دور دور سے اسے دیکھنے آتی تھیں۔ وہ تو مولوی صاحب نے ملنے جلنے میں بہت احتیاط رکھی تھی، اس لیے لوگ آنے سے پرہیز کرنے لگے تھے۔ میں ہمیشہ خوف زدہ رہتا تھا کہ کبھی کچھ ہو نہ جائے۔ دل نہ جانے کیوں ہر آن دھڑکتا رہتا تھا۔ خدا نہ کرے جو اس کی نظر اتار دی رہتی تھی۔ یہی بات تو یہ ہے کہ مجھے خود بھی پتہ نہیں تھا کہ زرمین سب کے سامنے آیا کرے۔ آخر ایسا ہوا کہ گھر میں آنے

والوں کی نظروں سے زہرہ نے اُسے چھپائے رکھا۔ گھر میں اچانک کوئی آ جاتا تو خانم زہرہ اُسے کمرے میں بند کر دیتی تھیں اور پیچھے سے کھڑکی کے راستے اُسے اس کے گھر بھیج دیتی تھیں۔ اب میں آپ کو کیا کیا بتاؤں۔" منیر علی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"بولو بڑے صاحب بولتے رہو۔" تجمل نے اُن کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔

"میں بھائی! یہی کچھ داستان ہے۔" منیر علی گھگھیائی آواز میں بولے۔

"آپ نے ارشد میاں کو دیکھا ہے وہ گبرو جوان بہت ہونہار اور سعادت مند بچہ تھا۔ مولوی صاحب ایسے نا سمجھ نہیں تھے کہ اُس کا حال دیکھ کے کچھ اندازہ نہ کر سکتے ہوں۔ مگر انھوں نے توجہ نہیں دی۔ آج میں نے بھی اس سلسلے میں ایک لفظ نہیں کہا۔ وہ چلے ہی گئے۔ اب ارشد اللہ دیے۔ بشیر دور دور نکل جاتا ہے۔ کبھی یہاں کبھی وہاں۔ آس پاس کے لوگ محلے والے ہر وقت میرا سینہ جلاتے رہتے ہیں۔ میں تو اُس سے مایوس ہو چکا ہوں اب خدا ہی اس کی کچھ سن لے تو ٹھیک ہے ورنہ۔۔۔۔"

"بڑے صاحب! آپ نے خود بھی تو کچھ جاننا چاہا ہوگا کہ۔۔۔۔"

"میں جانتا ہوں آپ کو کیا کہنا ہے۔" منیر علی نے تجمل کی بات پوری نہیں کرنے دی۔ وہ ہولے سے بولے۔ "مجھے یہ جاننے کی سدا جستجو رہی اور میں کچھ جان لیتا۔ تجسس اس کے تدارک کی بھی کوشش کرتا۔ اگر مجھ سے کچھ کہتے میں ہی کچھ بولتا۔ لیکن ساتھ ساتھ ہمیشہ یہ احساس رہا۔ اگر میں کیا جاننا چاہتا ہوں اور پھر جان لوں تو کیا ہے۔ مولوی صاحب سراپا سر تو میرے سامنے تھے۔ وہ زرمین کی شادی کہیں کرنا ہی نہیں چاہتے تھے تو کوئی انھیں مجبور کیسے کر سکتا تھا اور وہ اپنے بچے کو کسی کو بانٹنا نہیں چاہتے تھے تو کوئی کیسے انھیں پابند کر سکتا تھا۔ میں آپ کو ایک واقعہ سناؤں ایک دفعہ کا ذکر ہے لوگوں نے مولوی صاحب کے پیچھے نماز پڑھنے سے اجتناب کرنا چاہا، اُن کا کہنا تھا کہ جب تک مولوی صاحب کی ذات کے بارے میں تمام باتیں واضح نہ ہو جائیں اُن کے پیچھے نماز پڑھنا مناسب نہیں ہے۔ میں نے اُن سے کہا صاحبو! خدا کے خوف سے ڈرو۔ مولوی صاحب ایک عالم شخص ہیں، میں اُن کے ساتھ رہتا ہوں اگر کوئی ایسی بات ہوتی تو سب سے پہلے تم سے میں کہتا۔ اُن کا الگ تھلگ رہنا کسی طور بھی اُن پر حرف زنی کا جواز نہیں بنتا۔ بدگمانی اللہ کو پسند نہیں ہے۔ تمھارے پاس آنکھیں ہیں اور اللہ نے تمھیں سننے کی خوبی عطا کی ہے۔ مولوی صاحب چار مرتبہ تمھارے سامنے آتے ہیں تم انھیں اچھی طرح دیکھتے اور سنتے ہو۔ وہ تمھارے بچوں کو درس دیتے ہیں اور گھر والے زمانے کی ساری آلائشوں سے دور ہو جاتے ہیں۔ میں نے اُن سے کوئی غلط بات نہیں کی تھی یا مولوی صاحب کی بے جا طرف داری کا جرم نہیں کیا تھا جو میں سمجھتا تھا بیان کیا۔ میں نے انھیں یاد دلایا تھا کہ میں نے کہا تھا۔ لوگ اس فقیر کی عزت کرتے ہیں۔ میرا بھرم قائم رہا لیکن انسان انسان ہے۔ اور بھی دو صاحبان جو مولوی صاحب سے ایک مستقل رشتہ استوار کرنے کے آرزومند تھے ظاہر ہے اُن کے دلوں پر غبار چھایا رہتا ہوگا جس کا وہ

بے شک مولوی صاحب کے سامنے اظہار نہیں کرتے تھے۔ مولوی صاحب کا برکش خلق اور کرم حسنی انھیں اُن کے سامنے جھکنے سے روکے رکھتی تھی۔ ہم چاہتے ہی کہ کچھ رنجش رہتی ہوگی، اچھے برے سے سبھی طرح کے لوگ بستے ہیں، کوئی اثر لیتا ہے کوئی کم۔ یہ غبار چھٹ جاتا اگر مولوی صاحب کوئی ایک خاندان منتخب فرما لیتے۔"

"آپ سب ٹھیک بولتے ہو بڑے صاحب!" تجمل نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ "پر تم کو یہ بتاؤ کہ مولوی صاحب کدھر چلے گئے؟"

"جناب!" منیر علی کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ "آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"میں بولتا ہوں بڑے صاحب! مولوی صاحب خود نہیں گئے تو اس طرح سے نہ جاتے کہ کوئی انھیں لے گیا ہے۔ کون لے سکتا ہے۔ آپ جانتے ہوں گے کہ کون انھیں لے جا سکتا ہے۔"

"جناب! جناب!" منیر علی لرزتے ہوئے بولے۔ "میں کیا۔۔۔ کیا جان سکتا ہوں۔ یعنی کیا آپ کا مطلب ہے کہ میں جانتا ہوں؟"

"دیکھو بڑے صاحب! بات بہت سیدھی ہے آپ بولتے ہو کہ مولوی صاحب نے ہر ایک کو منع کر دیا تھا اور لوگ اُن کی اس بات پر خفا ہونے لگے تھے اور آپ بولتے ہو کہ مولوی صاحب ایک دم اچانک چلے گئے۔ اس صورت میں اُن کو کون لے جا سکتا ہے، وہی لے جا سکتا ہے جو سب سے زیادہ خفا ہوگا اور وہ کون تھا یہ آپ کو پتہ ہوگا۔ معاف کرنا ہم کو صاف بولنا پڑا۔"

"صاحب! میرے بڑھاپے کا کچھ خیال کیجیے۔" منیر علی گلوگیر لہجے سے بولے۔

"بڑے صاحب! میں جو بولتا ہوں وہ آپ خوب سمجھتے ہو۔ میں کسی اور زبان میں نہیں بول سکتا ہوں مجھ کو زیادہ بات مت کرنے دو۔"

"بھائی! آپ غلط سمجھتے ہیں۔" منیر علی کی آواز بھرا گئی۔

"میں یہ نہیں بول رہا کہ وہ آپ ہی ہو یا آپ سب جانتے ہو۔ مجھے یہی ان جان ہو کہ آپ جو کچھ جانتے ہوئے جاننا نہیں چاہتے۔ مجھ کو پتہ نہیں کیا کیوں ہے پر ہو سکتا ہے ایسا اس لیے کہ آپ گھبراتے ہو۔ آپ کس بات سے گھبرا سکتے ہو۔"

منیر علی نے اپنی آنکھوں پہ ہاتھ رکھ لیا اور اُن کے ہونٹ کانپنے لگے۔ تجمل نے اُن کی طرف دیکھے بغیر بھاری آواز میں کہا۔ "ہو سکتا ہے کہ آپ کو اپنے جانے پہ پچھتاوا ہو اور آپ نے اپنی چپ کے پیچھے اس شبہے کو سہارا بنا لیا ہو۔ اپنے آپ کو اسی طرح تسلی دی ہوگی۔ اس کے سوا تیسری بات نہیں ہے۔ آپ کہتے ہو کہ جانے سے پہلے کوئی ایسا آدمی آپ نے مولوی صاحب کے پاس نہیں دیکھا۔ مولوی صاحب سب سے الگ تھلگ رہتے تھے۔ آپ سے زیادہ اور کوئی اُن کے نزدیک نہیں تھا۔ اور یہ بات کر لو ادھر اُدھر آنا جانا تھی۔ جن خاندانوں والوں کے پیام آتے وہ سب آپ کو پتہ ہیں۔ مولوی صاحب نے اُن کا ذکر آپ سے بھی کیا ہوگا اور اپنے آپ جواب دینے کے بجائے آپ ہی سے کہلوایا ہوگا۔" منیر علی کچھ کہنے کے لیے مضطرب ہوئے مگر تجمل نے

اپنی بات جاری رکھی۔ "آپ بولو گے کہ اگر مجھ کو پتہ ہوتا تو میں ان کی کھوج میں آدمی کیوں دوڑاتا۔ میں اُن کا مکان خالی کیوں رکھتا اور پولیس کو کیوں بلاتا۔ آپ نے اُن کی کھوج میں سب کچھ کیا پر ایک بات نہیں کی۔ آپ کو شاید چنگاری ڈالتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔ آپ کو ڈر تھا کہ پھر اپنے اوپر معاملہ آنے کا خوف ہوگا اور جب بہت دن بیت گئے تب آپ کا شبہ پیلا پڑ گیا۔ چھوٹے صاحب کانٹا ان بیچنے سے گھل نہیں جاتا۔ پتہ تو آپ کے بیچنے میں اٹکا تھا۔ آپ سب سے چھپا سکتے ہو پر اپنے آپ سے نہیں۔"

تجمل غصے سے بڑبڑانے لگا۔ بشیر علی بُت کی طرح ساکت ہو گئے تھے اور پھٹی پھٹی نظروں سے تجمل کو دیکھ رہے تھے۔ اُن کے جسم کا سارا خون جیسے چہرے پر سمٹ آیا تھا۔ "چھوٹے صاحب!" تجمل نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "آپ کے لیے ہمارے دل میں بہت عزت ہے۔ ہم آپ کے مہمان ہیں۔ آپ نے ہم کو مولوی صاحب کے نام پر اپنے گھر میں رکھا۔ ہم آپ کو مولوی صاحب ہی کا نام دیتے ہیں اور یہ دل ویسے کا ویسا سینہ قبر کی طرح ہے۔ آپ کو ہم سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ بس ہم اتنا ہی بول سکتے ہیں جتنا جرمانہ۔"

"آپ سے میں کیا کہوں۔" بشیر علی کی کپکپاتی آواز گونجی۔ "آپ ہی سوال کرتے ہیں، آپ ہی جواب دے رہے ہیں۔ میرے کہنے کے لیے کیا اب بھی کچھ باقی رہ جاتا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ مجھے کیا کہنا چاہیے۔ میں کسی پر الزام نہیں رکھ سکتا کیونکہ میں کچھ نہیں جانتا۔ بھلا میں نے اپنا وہم دور کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کا کوئی حاصل نہیں نکلا۔ آپ درست کہتے ہیں کہ میں اس نتیجے سے خود مطمئن نہیں ہوا مگر میں اپنی بساط کے مطابق ہی کر سکتا تھا۔ میں ہر وقت اللہ سے دعا کرتا رہتا تھا۔ میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میں ایک بوڑھا آدمی ہوں۔ دو بے ماں کی جوان بھتیجیوں اور دو بچوں کو اللہ نے مجھے وارث کیا اور ناتواں کر دیا ہے۔ زندگی بہت سنبھل سنبھل کے تنگ تنگ کے گزاری ہے۔ میں جانتا تھا کہ کوئی بات منہ سے نکالوں گا تو کوئی یقین نہیں کرے گا۔ سب کو اپنی عزت آبرو عزیز ہے۔ پھر میں کس بنیاد پر شور اُٹھا کے بات کرتا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے کچھ نہیں دیکھا تھا اور مجھے کسی جانب سے کوئی شہادت بھی نہیں ملی تھی۔ اس لیے میرا قیاس مجھ تک محدود رہا لیکن آپ یقین کریں اور یقین کرنے کی کیا بات ہے۔ آپ نے خود ہی کہہ دیا ہے۔ مجھے سکون نصیب نہیں ہوا۔ ایک اپنی بے سروسامانی کا احساس، تھوڑی بہت بدنامی کا خیال اور پھر یقین کی کمزوری۔ یہی باتیں تھیں جنھوں نے مجھے باندھے رکھا ورنہ شاید ایسا نہ ہوتا اور مجھے آپ کے سامنے یوں شرمندہ نہ ہونا پڑتا۔"

"نہیں چھوٹے صاحب۔ ایسا مت بولو۔ ہم کو اندازہ ہے کہ ایسی بات ضرور ہوگی۔ ہر آدمی بندھا ہوا ہے۔ وہ اپنی رسیاں اتنی ہی کاٹ سکتا ہے جتنا یقین ہوتا ہے کہ ہم جا ترت پالے گا۔ جہاں رسی تنگ ہوئی اور رسی تنگ ہوتی ہے کاٹ دو تو آدمی کھلا رہتا ہے۔ پر کمزوری رسی تنگ رہتی ہے اور پتہ نہیں چلتا۔ پھر آدمی جالوں میں لپٹا ہوا ہی چلتا ہے۔ ہم آپ سے صفائی نہیں مانگتے ہیں۔ ہم جو جاننا چاہتے ہیں وہ ہم کو بتا دو۔"

"ہاں بھائی! ایک ذرا ٹھہریے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہاں سے ابتدا کروں۔ تاہم میں آپ سے کچھ چھپاؤں گا نہیں۔ جس کا شبہ آپ ذکر کر رہے ہیں اس سلسلے میں جو کچھ میرے علم میں ہے آپ کے سامنے بیان کیے دیتا ہوں۔ اللہ مجھے معاف کرے۔" بشیر علی نے بیٹھک میں چاروں طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی کے لہجے میں کہا۔ "جیسا کہ میں آپ کو بتا چکا ہوں نرگس بی بی کی خوشبو چھپ نہ سکی۔ وہ ایک پھول ہی تھی۔ پھول کی خوشبو ہوا اس کی پابند نہیں ہوتی۔ دور دور تک گئی اور ایسی ایسی جگہوں سے بات آنے لگی جہاں کے لوگ مولوی صاحب سے واقف نہیں تھے اور مولوی صاحب بھی جن کے ہاں کبھی نہیں گئے تھے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ نرگس کا ذکر ایک گھر سے دوسرے گھر میں، دوسرے گھر سے تیسرے گھر میں کس طرح پہنچا۔ محلے کی وہ ایک تقریبات میں مولوی صاحب بہ مجبوری اس کی شرکت پر آمادہ ہو گئے تھے۔ آمادہ نہ ہوتے تو لوگ نہ جانے کیا سمجھتے۔ انھی میں سے ایک تقریب ڈاکٹر صاحب کے ہاں تھی جن کے بچوں کو مولوی صاحب شام کو گھر کی تاریخی کا کام کرتے تھے۔"

پھر لوگ تو مولوی صاحب کے انکار پر چپ ہو گئے۔ کچھ نے اُن سے اونچی کمائی مہیا کر کے انھیں دولت سے متاثر کرنا چاہا۔ بعض نے اپنی خاندانی امارت سے۔ القصہ میاں کہ پیش کش کی گئی کہ نرگس بی بی کے لیے ایک محل بنوا دیا جائے گا اور حق مہر میں جو کچھ مولوی صاحب طے کریں گے۔ میں سوچتا تھا کہ مولوی صاحب کا پائے ثبات کبھی نہ کبھی ضرور ڈگمگا جائے گا لیکن اُن کے ارادے میں جنبش نہیں ہوئی۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ آپ اسے الزام سمجھیں۔" بشیر علی کی زبان لڑکھڑانے لگی۔ "آخری دنوں میں رانا صاحب رانا آفتاب خاں کا اصرار بڑھ گیا تھا۔ وہ ہر دوسرے تیسرے روز پیغام بھیج دیتے تھے۔ کہیں دور جا کے پیری مریدی بھی اُن سے کوئی قرابت نکلتی ہو گی لیکن میرا اُن کے در آنا جانا بس شادی غمی تک محدود ہے۔ وہ بہت بڑے آدمی ہیں۔ دور دور تک ان کا رسوخ ہے۔ بہت بڑی حویلی میں رہتے ہیں۔ بااثر صاحب ثروت لوگوں میں اٹھتے بیٹھتے ہیں۔ دو کار، چار کارخانے، زمینیں، گاؤں، جاگیریں، چھوٹے شہروں میں کارخانوں میں حصے۔ سب کچھ اُن کے پاس ہے اور بڑے رانا صاحب آفتاب خاں کے انتقال کے بعد سارا کچھ انھی کے ہاتھ میں آگیا ہے۔ مگر خون بہے والا بھی نہیں۔ دو بیویاں ہیں اور دونوں صاحب اولاد ہیں۔ اُن کی طرف سے جب نرگس کے لیے رشتہ آیا تو مجھے بھی حیرت ہوئی۔ جواب مجھے معلوم تھا لیکن میں نے مولوی صاحب سے ذکر کر دیا اور بہت معذرت کے ساتھ پیغام لے کر جواب دے دیا۔ رانا صاحب نے دوبارہ قاصد بھیجا اور ساتھ میں تحائف کا ایک انبار۔ کئی قیمتی جوڑے، زیورات اور نقدی کا پیکٹ۔ مولوی صاحب نے دوبارہ جواب دے دیا۔ انھوں نے ان قیمتی تحائف کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ میں نے پھر معذرت چاہی لیکن یہ سلسلہ چلتا رہا۔ رانا صاحب قاصد پر قاصد اور ہر بار کوئی تحفے بھیجتے اور میں انھیں واپس کرتا رہا۔ کئی بار تو میں نے مولوی

صاحب سے ذکر بھی نہیں کیا کہ اُدھر سے اتنے شدید تقاضے ہو رہے ہیں۔ ذکر کرتا تو وہ خواہ مخواہ پریشان ہوتے۔ ممکن ہے رانا صاحب نے براہ راست یا اور کسی ذریعے سے بھی ان تک بات پہنچائی ہو مگر مولوی صاحب نے وہی جواب دیا ہو گا جو ان کی طرف سے میں دیتا رہا تھا۔ رانا صاحب کی تربیت جس ماحول میں ہوئی ہے اُس کا مجھے بخوبی علم ہے۔ انھوں نے آنکھیں کھولیں تو خوب صورت گھوڑیں اپنے اردگرد دیکھیں۔ رانا صاحب شاہ بڑے آدمی ہیں۔ ان کے آبا کے جو مشاغل تھے وہ انھیں ورثے میں ملے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے یہ پیش کش بھی کی کہ وہ اپنی دونوں بیویوں کو طلاق دے دیں گے۔ میں نے عرض کیا کہ وہ ہمیں زیادہ شرمندہ نہ کریں۔ اگر ایسا کوئی ارادہ ہو تو انھیں پیش نہ کیا جاتا۔ پھر میں نے مولوی صاحب کی اجازت کے بغیر یہاں تک کہہ دیا کہ لڑکی منسوب ہو چکی ہے۔ رانا صاحب چند دنوں تک خاموش رہے مگر پھر ان کا اصرار بڑھ گیا اور اس میں کچھ تلخی کی بھی آمیزش ہو گئی۔ مجھے احساس تھا کہ رانا صاحب کو یہ انکار شاق گزرتا ہو گا چنانچہ میں ہر بار نہایت عاجزی کے ساتھ قاصد سے معذرت کرتا تھا۔ میں نے عرض کیا کہ کچھ مجبوریاں مانع ہیں۔ قاصد پیام لے کے آیا کہ مجبوریاں کیا ہیں، بتائی جائیں۔ رانا صاحب ہر مجبوری دور کرنے کی کوشش کریں گے۔ میں نے صاف کہا کہ بعض باتیں ناگفتنی ہیں ورنہ کون رانا صاحب جیسے ذی حیثیت اور رئیس شخص سے رشتہ قائم کرنا پسند نہیں کرے گا۔ کسی بھی خاندان کے لیے یہ تعلق باعث عزت ہے۔ میں نے اس لیے کہا کہ رانا صاحب اپنی ذات اور شخصیت کی ہتک نہ سمجھیں۔ میں نے قاصد سے یہاں تک کہا کہ میں اپنی بچی زہرہ کا رشتہ کرنے کو تیار ہوں۔ وہ بھی حسنِ صورت اور حسنِ سیرت میں یکتا ہے۔ کہنے کے لیے میرے پاس اس سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔ پھر اتنا ضرور ہوا کہ رانا صاحب کے پیاموں کی شدت میں کمی آگئی بلکہ صرف ایک مختصر مدت کے لیے۔ اس کے بعد قاصد نے دوبارہ پھیرے شروع کر دیے اور وہی اصرار و انکار کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مولوی صاحب کے جانے سے کوئی دو ماہ پہلے کی بات ہے۔ پیام بر نے بڑا حتمی جواب سن کے یہ ایسی آزمائش کر دیا تھا۔ ہاں مولوی صاحب کے پاس کوئی آیا ہو تو آیا ہو۔ بس یہیں تک کی بات ہے بھائی! رانا صاحب کی پہنچ دور دور تک ہے۔ ان سے کچھ بھی بعید نہیں۔ بے شمار آجائیں تو کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ نمک خوار مصاحبین اور شورہ پشتوں کا اُن کے ہاں سے وظیفہ جاری ہے۔ ہم میں سے بہت سے اُن کے اثر و رسوخ کا تجربہ کر چکے ہیں۔ چنانچہ لوگ آپس میں بھی رانا صاحب سے متعلق کسی معاملے میں رائے زنی سے احتیاط کرتے ہیں۔ ظاہر ہے اچھے تجربے نہیں ہوئے ہوں گے۔ بس جناب!" بشیر علی گہری سانس لے کے بولے۔ "یہی حالات تھے جو میں نے آپ کے سامنے پیش کر دیے۔ اب غیب کا حال اللہ کو معلوم۔"

تجمل گردن جھکائے گم سم بیٹھا تھا۔ بشیر علی نے بات ختم کی تو اس نے اپنا چہرہ اوپر اٹھایا۔ اس کی آنکھوں میں سرخ ڈورے پڑے ہوئے تھے۔

دیر تک سکوت چھایا رہا۔ بشیر علی کبھی مجھے دیکھتے کبھی تجمل کو۔ وہ تجمل کے منہ سے کچھ سننے کے لیے مضطرب نظر آتے تھے مگر تجمل خاموش رہا۔ وہ سکتہ سا لیے میں بولے۔ "آپ نے توجہ دی؟"

تجمل نے آہستگی سے ہنکاری بھری۔ بشیر علی زیرِ لب اوراد اور مولوی صاحب اور گھر والوں کے لیے دعائیں مانگنے لگے۔ پھر وہ انھیں اپنے اوراد میں لگے۔ عصر کی اذان ہو رہی تھی۔ وہ اٹھنا نہیں چاہتے تھے لیکن مسجد سے ان کی پکار آ گئی۔ وہ ہم سے اجازت لے کے چلے گئے۔ اندھیرا دھیرے دھیرے بڑھ رہا تھا۔ ملازم نے آ کے لالٹین جلا دی۔ تجمل پلنگ سے اٹھ کے باہر جانا چاہا تو اس نے مجھے بھی سختی سے روک دیا۔

بشیر علی رات کے کھانے پر بیٹھک میں آئے تو خفا سے تھے لیکن کسی سے کہا نہیں گیا۔ بشیر علی نے وہ ہر طرح ہم سے بے تکلفی کے ساتھ کھانے کے لیے اصرار بھی نہیں کیا۔ ہم بمشکل لقمے توڑ رہے تھے۔ کھانے کے دوران محلے کے چند لوگ آگئے تھے۔ تجمل نے کھانے کے بعد معذرت کر دی کہ اُس کی طبیعت سست ہے۔ آنے والے لوگ اُسے آرام کا مشورہ دے کے جلد ہی رخصت ہو گئے۔ بشیر علی نے بھی تجمل کا منہ دیکھ لیا تھا۔ وہ اندر جا کے ایک پلیٹ میں آٹے کا حلوا لے آئے۔ "سونے سے پہلے یہ کھا لیجیے گا۔ ان شاء اللہ افاقہ ہو گا۔" انھوں نے دبی زبان میں تجمل کو تاکید کی۔ تجمل نے تھوڑا سا مجھے دیا، باقی اسی وقت خود کھا لیا۔ بشیر علی نے اندر سے بیٹھک کی کنڈی لگا دی اور لالٹین کی لو دھیمی کر دی۔

تجمل اُن کی موجودگی ہی میں چادر تان کے سر اور منہ لپیٹ کے لیٹ گیا تھا۔ میں نے بھی آنکھیں بند کرنے کی کوشش کی لیکن ایسا لگا جیسے میری سانس بند ہو جائے گی۔ میری رگوں میں برف دوڑ رہی تھی۔ کوئی زور زور سے سینہ دبا رہا تھا۔ میں نے شام سے اب تک کا وقت نہ جانے کس طرح کاٹا تھا۔ ایک بار میرے دل میں یہ خیال آیا تھا کہ شاید تجمل ہی نے بشیر علی سے کہا ہے کہ یہ سب کچھ سنا جائے اور شاید اسی لیے تجمل نے یہاں ٹھہرنے کا ارادہ کیا تھا۔ ممکن ہے اُس کے اور بشیر علی کے درمیان ساز باز ہو چکی ہو اور وہ مجھے یہ باور کرانے کی فکر میں ہو کہ اب اُس کی تلاش بے سود ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میری نظروں میں اُس کی تصویر دھندلی پڑ جائے گی۔ اُس کا تاثر کم ہو جائے گا۔

ایسی بے سروپا باتیں ہر وقت میرے ذہن میں کلبلاتی رہتی تھیں۔ مجھے ہر آدمی پر شک ہو جاتا تھا کہ وہ کرن کے بارے میں ضرور کچھ جانتا ہے اور مجھ سے جھوٹ بول رہا ہے۔ میں بشیر علی اور تجمل کے درمیان موجود رہا تھا۔ اس لیے اب بھی میری عجیب سی کیفیت تھی۔ میں نے اس کے کپڑوں میں اس کی خوشبو سونگھی تھی۔ کبھی یوں بھی مجھے گمان ہوا تھا کہ کرن گھر کے اندر ہی موجود ہے اور بشیر علی نے مولوی صاحب کے جانے کی ایک فرضی داستان ہمیں سنا دی ہے یا تجمل نے یقین دلایا ہے۔ روانہ ہونے سے پہلے ہی کسی آدمی کو پیچھے سے یہاں بھیج کے ایک شخص بشیر علی کو ہموار کیا ہے کہ ہم دو روز کے سفر کے بعد جب سلیم

ہیں دادا کو بھی۔ وہ اپنے مالک کے بیٹے گھر گھر تو بنی بنی چھوکریاں تاکتے رہتے
ہیں۔ ادھر چھوکری کا بچپن ختم ہونا شروع ہوا، ادھر ان کے پیچھے شروع ہو گئے۔
چھوکری ابھی دو ہاتھ اونچی نہیں ہوتی کہ یہ اس کی بولی بول دیتے ہیں۔ چھوکریاں
تو گیان ہوتی ہیں چھوٹی سی گٹھڑی میں آ جاتی ہیں۔ یہ موم کے بنے ہوتے ہیں جیسا
آدمی اٹھا لیتے ہیں اور پتہ نہیں چلتا کہ کدھر غائب ہو گیا۔"

"دادا کی کتنی بیویاں ہیں؟"

"بیویاں؟" جولا کے منہ سے ہنسی چھوٹ پڑی۔ "کیسا اوٹ پٹانگ بولا بابا!
وہ دو ایک عورت کر سکتا ہے، ساتھ بچے ہیں … بیٹے دادا کے
نام سے پکارے جاتے ہیں۔ ورنہ کہتے ہیں کہ دادا چھوکری کو ایک بار چھو کے دوبارہ
ہاتھ نہیں لگاتا۔ کبھی کچھ اور نہیں تھا تو اس کے آدمی ڈھونڈ ڈھونڈ کے اس
کے لیے بچیاں اور کنواریاں لے آتے ہیں۔ کچھ بولا جاوے سے دادا کو …
ہیں۔ دادا کو بس یہی ایک شوق ہے۔ ادھر حویلی میں اس جیسا رنگ دار آدمی
کوئی نہیں۔ حویلی میں روز رات کو ناچ گانا دھوم دھڑکا ہوتا ہے۔ ہم تو ادھر
کبھی نہیں گئے لیکن یہی بھنگڑا ونگ بولتے ہیں کہ رات کو نشے پیالے کھنکنے سے …
کرنے میں ادھر شہر کے اندر اس پاس کے بہت سے رلیا لوگ اکٹھے
ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کے ولایتی شراب کو چھڑکاؤ کرتے ہیں۔ حویلی سے
ہر مہینے گھڑوی والوں کو پیسہ جاتا ہے۔ ابھی پچھلے دنوں دادا کی بہن کی منگنی
ہوئی تھی۔ بارات نظام حیدرآباد شہر سے آئی۔ پندرہ دن تک میلا ٹھیلا لگا رہا۔
سنو تو نگر لال اور دھوم دھڑکا ہو گیا۔ ہر طرف سے گانے بجانے اور کوٹھے …
والیاں آئیں۔ ایک اندر سبھا اتری تھی تو ایک پرستانوں کے لیے۔ دادا نے
کئی ہاتھی ابھیرے منگوائے تھے۔ بینڈ باجے والے تو تمہارے والے شہر سے
آئے تھے۔"

"دادا کے ہاں تم نے کون کون سے خاص خاص آدمیوں کے نام سنے
تھے؟" جمیل نے دھیمی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"ہم نے بولا ادھر ایک آدمی نہیں ہے۔" جولا نے بے بسی سے کہا۔
"ایک سے ایک بگڑا ہے۔ ادھر اٹھو بیٹے بانڑے بیٹے فرید خاں ہے جس
کا کام دادا نے سب پر غالب رکھ دیا ہے۔ اچھو ہے، کالے جیلیں ہے، دل بیچو
چینا ہے، سنگھ ہے، آپت سنگھ ہے۔ کس کس کا نام بولیں باوا، ان سب سے بڑھ
کے رستم خاں ہے۔ رستم کا نام پہلے بشیرا تھا۔ دادا نے اس کا نام بھی بدل کر رستم کر
دیا۔ بشیرا دادا کے پاس حویلی میں ہی رہتا ہے۔ اس سے زیادہ کوئی اور دادا کا
منہ چڑھا نہیں ہے۔ دادا ادھر بھوپال میں اپنے کسی رشتے دار کے ہاں
مہمان تھا۔ شکار کھیلتے ہوئے کسی جھگڑے میں اس نے بشیرے کے ہاتھ کا بل
دیکھا۔ پھر وہ بشیرے کو ساتھ ہی لے آیا۔ چاقو بشیرے کے ہاتھ میں آ کے
سالا گردن سے جیسے چپک جاتا ہے۔ وہ چیتے کی طرح اپنے شکار پر جھپٹتا ہے۔
دادا یہ تماشا دیکھا ہے کہ بشیرے کو دشمن کے پیچھے بنا اس کو چین نہیں تھا۔ باقی
لوگ بھی بشیرے کا بہت خیال کرتے ہیں۔ جب کوئی کام خاص ہوتا ہے تو
دادا بشیرا ہی سے ہوتا ہے۔ ورنہ وہ سالا حویلی میں اینٹھا رہتا ہے اور
رگ پٹھوں کو تیل چڑھاتا رہتا ہے۔ دادا نے بشیرے کو گھوڑے کی سواری بھی
سکھا دی ہے۔ دادا کا حکم ہے کہ بشیرا جو چیز بھی مانگے اسے فوراً دی جائے۔
بولتے ہیں کہ بشیرا روز صبح پینے کے لیے بادام پستے دودھ اور میوے کا جوشاندہ
جو تا ہے اس کا ایک گلاس! دادا کو بھجواتا ہے ایک خود پیتا ہے۔ دادا نے
اس کی شادی بھی اپنے ایک پرانے آدمی کی بیٹی سے کرا دی ہے اور بشیرا
کی ماں کو بھی بھوپال سے بلا لیا ہے۔ میلوں میں اور دنگل میں بشیرا کو پچھاڑ
گرانے والا ہماری جان پہچان میں نہیں ہے۔ ایک بار ہم نے بھی اسے
فرید خاں سے بھڑتے دیکھا تھا۔ فرید خاں ڈیل ڈول میں اس سے بیشی ہے
اس نے بہت زور لگایا لیکن بشیرے نے چاقو اس کے ہاتھ میں لگے جوڑ کے
پیچھے باندھ دیا تھا۔ ایک دم بیکار کر دیا تھا۔ فرید خاں اس کے شکنجے سے کو
نہیں توڑ سکا۔ پھر اس نے چاقو بشیرے کے پیروں پر پھینک دیا اور بشیرے
نے اس کو گلے لگا لیا۔ اسی دن دادا نے فرید خاں کا نام بدل کے سہراب رکھ دیا
تھا۔ بشیرا اب بہت کم باہر نکلتا ہے۔ اس کا کام زیادہ تر یہی ہے کہ وہ دادا کے
دوسرے آدمیوں کو ہاتھ چلانا سکھائے۔"

"بس جولا! ہم کو جانا ہے۔" جولا بشیرے کے بارے میں کچھ اور کہنا
چاہتا تھا مگر جمیل نے اسے روک دیا۔

"کیوں؟" جولا حیران نظروں سے ہماری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "کیا
اپنے سے کوئی بات زیادہ ہو گئی؟ ہم نے تم سے کچھ غلط نہیں بولا ہے۔"

"تم نے سب ٹھیک بولا ہے۔"

"پھر کیسے تم لوگ ایسے کیوں اٹھنے لگے؟"

"ہم کو اب جانا ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے بابا! پر تھوڑی دیر ابھی بات سمجھو، ابھی اور بہت
سی باتیاں باقی ہیں۔" جولا ٹھیکے لہجے میں بولا۔

"کل ہو سکا تو ادھر آئیں گے۔"

"کل کس نے دیکھی ہے بولا۔"

"کل ہو گی تو آنے کی کوشش کریں گے۔"

بیرا قریب ہی موجود تھا۔ جمیل نے اسے اشارہ کر کے اپنے پاس
بلایا اور دس روپے کا نوٹ اس کے ہاتھ میں تھما کے اٹھنے لگا۔ بیرے نے
نوٹ لے لیا تھا لیکن جولا نے جھپٹ کے اس کا گریبان پکڑ لیا۔ بیرے کو
نوٹ وہیں میز پر پھینکنا پڑا۔ جمیل نے اسے نہیں اٹھایا۔ جولا بیرے سے
الجھا ہوا تھا کہ وہ آگے بڑھ گیا اور ہوٹل کے چبوترے سے نیچے گلی میں
اتر آیا۔

ہم ابھی گلی میں کچھ ہی قدم گئے ہوں گے کہ جولا نے ہمیں آ لیا اور
قریب آ کے بولا "کیوں سیٹھ! کچھ خفا ہو گئے؟ ہم اپنی ماں کی قسم کھا کے
بولتے ہیں کہ اپنا مطلب کچھ اور نہیں تھا۔" جمیل نے اس کے کندھے پر

ہاتھ رکھ کے تھپکی دی۔ "ابھی اپنا خیال تھا کہ تم کو پٹھو کے پاس لے
چلیں گے، اس کی ذات سے بھی مل کے دیکھو۔"

"چلیں گے جولا، پھر کبھی چلیں گے۔"

جولا ہم سے ہمارا پتہ پوچھنے لگا کہ ہم کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں
اور بولا کہ اگر ہمیں رہنے کی کوئی تکلیف ہو تو اس کا گھر موجود ہے جہاں اس
کی ایک بیوہ بہن اور اس کے بچے رہتے ہیں۔ بہن کا شوہر لڑائی میں مارا
گیا تھا۔ اس کی اور بچوں کی دیکھ بھال ہی کے لیے اسے واپس بمبئی سے
آنا پڑا ہے۔ وہ ہم سے اور بہت سی باتیں پوچھ رہا تھا لیکن جمیل نے اسے
ٹال دیا اور وعدہ کیا کہ ہمیں رہنے کی بابت اگر ایسی کوئی مشکل پیش آئی تو
ہم اسی کے پاس آئیں گے۔ جولا جمیل کی باتوں سے مطمئن نہیں ہوا۔ "ہاتھ کے
نیچے لگتے ہوئے پیالہ ادھر ہاتھ کو رنگ لگ جاتا ہے۔ ادھر کی بات نرالی ہے
اس لیے ہم نے یہ سب تم کو بولا تھا۔" راستے بھر وہ یہ مسلسل بکواس کرتا رہا۔ بازار
بھی گزر گیا لیکن وہ ہمارے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ پھر جمیل نے سبزی منڈی کے
نزدیک ایک جگہ ٹھہر کے تیز لہجے میں اسے واپس جانے کے لیے کہا تب
کہیں وہ ہم سے جدا ہوا۔ اس کے جاتے ہی ہم منیر علی کے گھر نہیں گئے بلکہ ایک لمبا چکر
کاٹ کے دوبارہ بازار میں آ گئے۔ جمیل نے اپنا ایک راہگیر کو روک کے
تار گھر کا پتہ پوچھا۔ مجھے بہت حیرت ہوئی مگر میں نے کچھ پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔

تار گھر اور ڈاک خانہ ایک ہی عمارت میں تھا۔ جمیل نے تار کا فارم
اور کھڑکی کے اندر بیٹھے ہوئے ایک بابو سے قلم مانگ کے مجھے تھما دیا اور
کہنے لگا "پیجو کو تار دو کہ وہ پہلی گاڑی سے بیکانیر پہنچے۔"

"کیوں؟" میں نے بوکھلا کے کہا۔ یہ لفظ میرے منہ سے بے اختیار
نکل گیا تھا۔ میں نے فوراً اپنے ہونٹ بھینچ لیے اور جمیل سے کوئی دوسرا
سوال نہیں کیا۔

"کہو، پیجو تو تمہیں یاد ہو گا؟"

میں نے سر ہلایا اور تار کے فارم پر پیجو کا پتہ لکھنے لگا۔

"کیا لکھنا ہے؟"

"جو تم نے کہا ہے۔"

"پڑھ کے سنائیے۔"

"لکھا ہے فوراً بیکانیر پہنچو … کہاں؟" میں نے مضطرب لہجے میں پوچھا۔

"اتنا ٹھیک ہے لیکن … یہ تار کب تک پہنچ جائے گا؟"

"ممکن ہے رات تک … دیر بھی ہو سکتی ہے۔"

"بابو سے کہو زیادہ پیسے لے کے اسے جلدی بھیج دے۔"

میں نے فارم پر ارجنٹ لکھ دیا۔ بابو کو فارم دینے کے بعد پیسے ادا کر کے
ہم باہر چلے آئے۔ جمیل نے گھر جانے کے بجائے بازار سے کئی چیزیں خرید لیں۔
شیرینی، دو ریشمی گلابی دوپٹے، چوڑیاں، چاندی کے کڑے، شیروانی کا کپڑا اور
ایک شال۔ دھوپ اوپر جانے لگی تھی۔ ہم سامان سنبھالے تیز تیز گھر کی طرف
جا رہے تھے کہ راستے میں منیر علی مل گئے۔ وہ بھی ہم کو ڈھونڈنے کے لیے گھر سے
نکلے تھے۔ جمیل نے گھر والوں کے لیے سارا سامان ان کے حوالے کر دیا۔ منیر علی نے بہت
انکار کیا مگر جمیل نے مزدور کے ہاتھوں سامان اندر بھجوا دیا۔ منیر علی زیادہ جاننے
کے لیے بے تاب نظر آتے تھے کہ ہم کہاں کہاں گئے تھے۔ کھانے کے بعد
جیسے ہی جمیل بیٹھک میں آیا اور چارپائی پر پاؤں پسار کے بیٹھا، منیر علی نے
مسکراتے ہوئے پوچھا "کہاں کہاں کی سیر کی جناب نے؟"

"بس یوں ہی گلی گلی گھوم رہے تھے بڑے صاحب!" جمیل نے لاپروائی سے
جواب دیا۔

"کیسے شہر آپ کو کیسا معلوم ہوا؟" منیر علی نے تجسس سے پوچھا۔

"صرف ناموں کی بات ہوتی ہے۔"

"ہاں! آپ سچ کہتے ہیں۔" منیر علی ہنس کے بولے۔ "بعض آپ کے
خیال میں بستیاں بھی آدمیوں کی طرح ہوتی ہیں مگر صاحب آدمی آدمی میں
تو بہت فرق ہوتا ہے۔"

"ہاں بڑے صاحب! بستی بستی میں اتنا فرق نہیں ہوتا۔"

منیر علی نے گھر پہنچتے ہی ہم سے کھانے کو پوچھا تھا۔ ہم نے منع کر دیا
تھا لیکن چائے کے ساتھ کھانے ہی کے برابر سامان آ گیا۔ منیر علی نے امرود
کے لیے سنگترے، ناشپاتی کی چاٹ، نمک پارے وغیرہ۔ منیر علی سمجھے تھے کہ شاید ہم
تکلف کر رہے ہیں۔ "ویسا کھانا کھا کے نہیں آئے ہیں" منیر علی صاحب کا
قیاس درست تھا کیونکہ ہم نے ہوٹل میں چند ہی لقمے لیے تھے۔

چلتے چلتے کچھ ہی دیر بعد جمیل نے ان سے کہہ دیا "ہم آج رات
کسی وقت یہاں سے چلے جائیں گے۔" "کیوں بھلا؟" منیر علی نے حیرانی سے
پوچھا جیسے جمیل نے کوئی انوکھی بات کہہ دی ہو۔

"آپ نے اچانک جانے کا ارادہ کیوں کر لیا؟"

"کیا کریں بڑے صاحب! جانا تو کسی وقت ہے۔ … ہو
گئے ہیں۔"

"کہاں! تیسرا ہی دن تو ہے بلکہ تیسرا دن تو اب شروع ہوا ہے۔ نہیں
جناب! ابھی آپ اور ٹھہریں گے۔" انھوں نے حتمی لہجے میں کہا۔

"نہیں بڑے صاحب! ان شاء اللہ پھر کبھی آئیں گے۔"

"ابھی تو آپ کا آنا ہی معلوم نہیں ہوا۔" وہ ناراضی سے بولے "آدمی
آتا اپنے بس سے ہے، جاتا پرائے بس سے ہے۔ میں آپ کو اتنی جلدی
نہیں جانے دوں گا۔ اتنے دور دراز کے سفر کے بعد آپ آئیں اور الٹے پاؤں
یہ کیسے ممکن ہے۔ مجھے تو آپ کی خاطر تواضع کا موقع ہی نہیں ملا۔ ابھی تو میں
کہوں گا کہ ہم نے ایک دن کے لیے بھی اچھی طرح دیکھا بھی نہیں۔ جیسے ارمان تو
ارشد میاں نے بے حال کر رکھے ہیں۔ آپ کو اگر کسی قسم کی تکلیف ہوئی ہو تو
مجھے معذور سمجھ کے معاف کر دیجیے۔ آپ کو کیا بتاؤں، آج وہ میرا ارشد میاں …
وہی دو دن کا تھا جب گم ہو گیا تھا۔ اس کے … آکرشے لگے تھے …

بندو بڑنے کے بعد وہ گھر سے اپنے آدمی بھیجے تھے۔ اس کی وجہ ایک تو یہ تھی کہ پولیس مسلسل نظر رکھے ہوئے تھی۔ دوسرے نواڑی کے نیچے کچھ چند آدمی گڑبڑ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بعد میں ان میں سے کئی بمبئی سے بھاگ گئے۔ کئی نے بیرو کے پاس آ کے چاقو پھینک دیئے۔ بیرو کے آدمیوں نے ان میں سے ایک ایک کو ڈھونڈ نکالا تھا۔ نواڑی کے خاص اڈے پر بیرو نے اپنے ایک پرانے دوست پیرو کو بھیجا تھا جس نے شادی کرنے کے بعد چاقو نہ اٹھانے کی قسم کھائی تھی اور بمبئی کی ایک بستی میں خاموشی کے دن گزار رہا تھا۔ بیرو نے چند دن پہلے اس سے مدد کی درخواست کی تو وہ واپس آ گیا لیکن اس نے چاقو کو پھر بھی ہاتھ نہیں لگایا۔ اس کا کام نواڑی کے وسیع علاقے پر کام کے آدمی متعین کرنا تھا۔ کبھی کسی بڑی مزاحمت کا اندیشہ ہوا تو اس نے خود جانے کے بجائے اپنے آدمیوں کو بھیج دیا۔ وہ صرف ایک مہینے تک وہاں رہا، پھر واپس اپنے گھر چلا گیا اور دوبارہ کارخانے میں زرمین کی حیثیت سے کام کرنے لگا۔ اس نے بیرو کی دی ہوئی ایک بڑی رقم بھی لینے سے انکار کر دیا تھا۔ تین مہینے پہلے نواڑی کے تمام اڈے بیرو کے پاس آ گئے تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ اڈوں سے متعلق علاقوں کے تمام لوگ بہت خوش ہیں جیسا کہ ہمارے سامنے اُن کے درمیان سے ہوا تھا۔ سارا انتظام اسی طرح چل رہا ہے۔ پہلے جو اڈے نواڑی اور بیرو میں کسی کے پاس نہیں تھے، وہ جن کے تھے انھوں نے درمیان میں آنے کی کوشش کی نہ بیرو اور اس کے آدمیوں نے ان سے جنت کی۔ میرے دل میں آیا، پوچھوں کرشنا کے اڈے کا کیا ہوا لیکن میں خاموش رہا۔ بیرو کہہ رہا تھا کہ اس نے اپنا اڈا ابھی کے سپرد کر دیا ہے اور خود ادھر اُدھر علاقوں میں گھومتا رہتا ہے مگر اس کی مل بیٹھک اب بھی اپنے پرانے علاقے میں ہے۔ تمام وقت وہ بمبئی کی باتیں کرتے رہے۔ اُن میں سے کسی کو بھی اپنے گرد و پیش کی خبر نہیں تھی۔ ایک خاموش ہو جاتا تھا تو دوسرا بولنے لگتا تھا۔ دوسرا کچھ بولتا تھا تو تیسرا اُسے ٹوک دیتا تھا۔ جمیل توجہ سے ان کی باتیں سنتا اور درمیان میں دخل دیتا رہا۔ کمرے میں اندھیرا ہونے لگا تھا۔ جمیل نے اٹھ کے بتی جلائی تو وقت گزرنے کا احساس ہوا اور بیرو نے زور کر قہقہہ لگایا۔ "سالا زبان کو بریک مار۔ ابھی ہم نے پوچھا ہی ہے کہ جمیل بھائی نے اپن کو کیوں بلایا ہے۔ سچ دادا! راستے بھر دل دھکو پچکو کرتا رہا کہ جمیل بھائی نے اتنے دن بعد اچانک اپن کو کیوں بلایا ہے۔ تار میں بسیلیر لکھا تھا اور بولا تم نے ایمرجنسی میں تھا۔ اپن اسی بات سے سوچتا رہا۔ ادھر آ کے اور تم کو دیکھ کے اپن کا جی اچھا ہوا۔ ایسی کیا بات ہے جمیل بھائی راستے میں یہ دونوں لوگ بولتے تھے کہ ضرور جمیل دادا پر کوئی مصیبت آ پڑی ہے۔ اپن بولتا تھا کہ جمیل بھائی سالا اتنا جنگلی نہیں ہے کہ سالا ہاتھ چلاتے پھرے۔ ہاتھ کم چلاتا ہے اور بھیجے کی چرخی زیادہ گھماتا ہے۔ بولو دادا ایسا کیا ہے؟"

"بیرو!" جمیل نے سکون سے کہا۔ "مجھے تمہاری ضرورت پڑ گئی ہے۔"

"ایسا ہے۔" بیرو اچھل کے بولا۔ "بولو دادا!"

"تم کو بسیلیر جانا ہے۔"

"تم جہنم میں بولو۔"

"میں نے تم کو جان کے بلایا ہے تم اِدھر خود بھی نہیں تھے، ہم تم ..."

"کام بولو جمیل بھائی!" اُس نے تیزی سے کہا۔ "اپن حیران ہے سالا ایسا کیا کام ہے جو تم نہیں کر سکتا۔"

"ایسا ہی ہے بیرو دادا!"

"اپن کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔"

"میں تم کو نہیں بتاتا۔ بیرا اُس طرف جانا ٹھیک نہیں تھا۔ جدھر تم کو جانا ہے۔ اگر میں بسیلیر پہنچتے ہی اُدھر چلا جاتا، تب دوسری بات تھی پر ..."

"صاف بات بولو جمیل بھائی!"

جمیل نے بیرو کو وہاں کچھ نہیں بتایا۔ وہ اُسے لے کے کمرے سے باہر چلا گیا۔ اُس کے جاتے ہی زہرا اور ماجی مجھ سے پوچھنے لگے کہ جمیل کو کیا پریشانی ہے۔ میں نے اُن سے کیا کہتا۔ میں نے کہا تم خود اُس سے پوچھ لینا۔ وہ پھر آپس میں ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے اور پھر مجھے لے کے باہر آ گئے۔ جمیل جس علاقے میں واقع تھا، بازار میں دکانیں جگمگا رہی تھیں۔ زہرا اور ماجی چپ چاپ سے ہو گئے تھے۔ میں نے اُن کی خاموشی توڑنے کے لیے مارتی کے بارے میں پوچھا اور مجھے حیرت ہوئی کہ زہرا جولین کے متعلق سب کچھ جانتا ہے۔ وہ بتا رہا تھا کہ مارتی اب بھی پہلے دہاں پر آتا ہے، پھر اڈے پر آ کے یا علاقے میں گھومتا ہے۔ پیرو بھی اُن کی خیر خبر لینے کے لیے اکثر جاتا رہتا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا وہ خود بھی گیا تھا۔ پاڑے کے بہت سے آدمیوں کو معلوم ہے کہ جولین کا مارتی سے کیا تعلق رہا ہے۔ لوگ نئی نئی باتیں کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ مارتی اس بستی میں ہے، وہ اس سے ملنے ضرور آئے گا۔ میری ماں سے اُن کی مراد تھی۔ میں نے تو یہ نہیں کہا۔ وہ گھر جا کے میرے بارے میں پوچھتے ہوں گے تو جیسا مجھے اپنا بیٹا ہی کہتی ہو گی۔ زہرا کہتا تھا کہ مارتی بہت بدل گیا ہے۔ وہ باتیں بھی کم کرتا ہے۔ ہر وقت کچھ سوچتا رہتا ہے۔ پاڑے میں آ کے وہ پابندی سے دو تین گھنٹے ورزش کرتا ہے اور کبھی خالی جا کے بیٹھ کر مرزک کی مشق کرتا رہتا ہے۔ مارتی کے ہاتھ میں بہت پھرتی آ گئی ہے۔ ابھی پان کھانے اور سگریٹ لینے کے لیے ایک دکان پر ٹھہرا تو زہرا نے مجھے اس سے کچھ دور لے جا کے سرگوشی کی کہ اگر میں اپنے ساتھ ہو جانے کا وعدہ کروں تو وہ مجھ سے ایک بات کہنا چاہتا ہے۔ میں نے جلدی سے وعدہ کر لیا۔ اُس نے بتایا کہ وہ ایک مہینے پہلے بمبئی آیا تھا۔ وہ اِدھر اُدھر کسی اڈے پر نہیں گیا۔ جولین کے گھر ہی ٹھہرا رہا۔ اس نے مارتی کے ذریعے صرف زہرا کو بلایا تھا اور مارتی اور زہرا دونوں کو قسم دلائی تھی کہ وہ اُس کی آمد کا ذکر کسی سے نہیں کریں گے۔ کھلتے ہیں کبھی وہ کسی سے کہہ کے نہیں آیا۔ خاندان کا کہنا تھا کہ اُسے کی آمد سے جولین بہت خوش نظر آتی تھی۔ وہ صرف تین دن وہاں ٹھہرا۔ اُس کی زبانی زہرا کو معلوم ہوا تھا کہ میں جمیل کے ساتھ ہے

سفر کر گیا ہوں اور ہماری واپسی کا وقت طے نہیں ہے۔ زہرا نے بتانے سے پہلے ہوئے عہد کا پاس کیا یا کسی کو نہیں بتایا۔ نہ ملی نے کسی سے کچھ ... دہلے کہ کیا ہے۔ باقی بیرو نے جمیل اور بیرو میں اُلجھا ہوا تھا جو راستے میں بھی کہیں رکی نہیں تھے۔ میں نے ہوٹل واپس چلنے کو کہا۔ وہ دونوں بھی یہی چاہتے تھے مگر ہوٹل میں جمیل اور بیرو موجود نہیں تھے۔ رات کو کافی دیر بعد وہ واپس آئے۔ میں نے دزدیدہ نظروں سے بیرو کا چہرہ دیکھا۔ وہ سنجیدہ تھا۔ آنکھوں میں تیز چمک تھی۔ اس نے جھپٹ کے مجھے گلے سے لگایا اور دیر تک بھینچے رہا۔ میں نے خود کو بہت روکا لیکن پھر بھی میری آنکھیں اشک آلود آنکھیں بھیگنے لگیں۔ بیرو نے مجھے اور زور سے جکڑ لیا اور میرے ساتھ خود بھی رونے لگا۔

وہ تینوں صبح کی گاڑی سے بسیلیر روانہ ہو گئے۔ ہم انھیں اسٹیشن چھوڑنے بھی نہیں گئے۔ جمیل جس وجہ سے وہاں جانا نہیں چاہتا تھا، وہی وجہ میرے ساتھ تھی۔ یہ جاننے کے باوجود میں نے ان سے بہت منت کی کہ وہ مجھے بھی ساتھ لے چلیں لیکن نہ جمیل تیار ہوا نہ ان میں سے کوئی۔ جمیل نے مجھے بھی رکنے کی اجازت نہیں دی۔ بیرو نے بھی مجھ سے کچھ نہیں پوچھا۔ میں نے کچھ کہنے کی کوشش کی تو اس نے درشت لہجے میں مجھے خاموش رہنے کی تاکید کی اور بولا کر مجھے بیرو کی واپسی کا انتظار کرنا چاہیے۔ وہ چلے گئے۔ پہلے میرا خیال تھا کہ جمیل بسیلیر سے قریب ہی کسی گاؤں یا قصبے میں ٹھہرے گا لیکن وہ اسی ہوٹل میں پڑا رہا۔ بیرو نے چلتے چلتے امید ظاہر کی تھی کہ وہ ایک ہفتے کے بعد یا تو خود آ جائیں گے یا بیرو ابھی اور زہرا میں سے کسی کو ایک وقت کے لیے یہاں بھیج دے گا۔ گویا ایک ہفتے سے زیادہ بھی لگ سکتا تھا۔ ایک ہفتہ ایک سال جیسا کٹھن تھا کہ وہ کبھی واپس نہ آئیں یہ نہیں۔ وہاں جا کے وہ کیا کریں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے رانا کی حویلی دیکھی تھی اور اپنے کانوں سے منیر علی اور جلال کی باتیں سنی تھیں۔ حویلی میں داخل ہونا اور رانا تک پہنچنا اتنا سہل نہیں تھا۔ سات پہرے گزر چکے تھے۔ اس عرصے میں نہ جانے کیا ہو گیا ہو۔ ہم نے جس قدر احتیاط کی تھی، اگر انھوں نے نہ کی اُن سے ذرا سی بھی چوک ہو گئی۔ رانا یا اس کے آدمیوں کو ذرا سا بھی شبہ ہو گیا تو وہ زندگی بھر اُن کا پتہ نہیں پا سکیں گے۔ بیرو کو بتاتے ہوئے جمیل کے ذہن سے کوئی بات رہ گئی ہو، انھوں نے عجلت کر دی یا تیزی دکھا دی تو بسیلیر سے اُن کا واپس آنا مشکل ہو جائے گا۔

ضروری نہیں کہ وہ بسیلیر میں ہی پھرا ہوں، کہیں اور لکی ہو، وہ اب اُس کی حویلی ہی میں نہ ہو۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ حویلی کے تمام آدمیوں کو یہ بات معلوم ہو مگر چند خاص آدمیوں کو ضرور معلوم ہو گی۔ جلال نے رانا کے جن خاص آدمیوں کے نام بتائے تھے، اُن میں سے چند کو یقیناً اُس کے بارے میں علم ہو گا کہ وہ اب کہاں ہے۔ وہ حویلی میں کس طرح داخل ہوں گے اور جا کے کیا کہیں گے۔ رانا کے کسی خاص آدمی کا اعتماد میں لیے بغیر وہ رانا تک کس طرح پہنچیں گے اور اگر پہنچ بھی گئے تو اس سے کس طرح معلوم کریں گے اور حویلی کا خاص آدمی آسانی سے اُن کے اعتماد میں کیسے آ سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اُسے صرف اس قدر معلوم ہو کہ وہ اُس رات اسے وہاں سے لے جانے میں شریک تھا، بعد کے حال سے وہ ناواقف ہے۔

اور ابھی اس بات کی تصدیق کہاں ہوئی تھی کہ اسے رانا کے آدمی ہی لے گئے ہیں۔ کوئی اور بھی ہو سکتا ہے۔ رانا کی طرح بسیلیر کا کوئی اور رئیس یا کوئی اور۔ اگر وہ رانا ہی تھا تو رانا کے آدمی مولوی صاحب کو کیوں اپنے ساتھ لے گئے۔ ضرور مولوی صاحب نے مزاحمت کی ہو گی اور ان میں سے کسی کو دیکھ لیا ہو گا اور وہ اسی خدشے کے پیش نظر مولوی صاحب کو لے گئے کہ اگر انھیں چھوڑ دیا گیا تو وہ ان کے جانے ہی ہوش میں آتے ہی شور مچا دیں گے اور رانا کے لیے اور مشکل پیدا کر دیں گے۔ یہ بات رانا نے مولوی صاحب کو ساتھ لانے کی ہدایت کی ہو گی۔ رانا کا خیال ہو گا کہ اگر اس نے اُس کو بار بار پیغام بھیجا کے شادی کی تھی تو وہی ہو اور وہ مولوی صاحب کی وجہ سے اپنی ضد پر قائم ہو۔ ضروری سمجھا ہو کہ وہ سامنے ہوں گے تو انھیں ہموار کرنا آسان ہو گا۔ مولوی صاحب کو ختم کرنے کی صورت میں پورے محلے میں وحشت پھیل جاتی اور منیر علی شاید احتیاطاً کو وہاں چھوڑ دیتے۔ وہ بسیر کا پریس اور شہر کے لوگوں کی توجہ رانا کی طرف مبذول کر دیتے۔ ظاہر ہے مولوی صاحب آ جاتے تو منیر علی جاتے تو ترتیب وجوہ میں کسی کو نظر آتے۔ وہ اُن کے ساتھ بیچ بیچ میں ہو گئے۔ رانا نے اتنی مدت تک انھیں کوٹھری میں بند نہیں رکھا ہوگا۔ یہیں ملنے لگے تو رانا کے آدمیوں نے انھیں راستے سے ہٹا دیا ہو گا اور وہ اکیلی رہ گئی ہو گی مگر وہ اتنی نازک ہے۔ اتنی باتیں اس کی آنکھوں نے کیسے برداشت کی ہوں گی۔

جمیل کو بیرو کو بلانے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے اُس سے کہا تھا کہ وہ واپس چلا جائے۔ مجھے تنہا چھوڑ دے۔ میں خود اُسے ڈھونڈ لوں گا۔ مجھے کہیں واپس نہیں جانا ہے۔ جو مجھے وقت کی تنگی کا احساس ہوتا، اکیلا ہوتا تو رانا کی حویلی میں ضرور داخل ہو جاتا۔ میں رانا کے ہاں ملازم ہو جاتا۔ میں سیدھا اُس کے پاس جا کے کہتا کہ وہ رحم یا سراب میں سے کسی کو مجھے دے دے۔ کسی نے اس معاملے پر ہنستا، مذاق اُڑاتا اور رحم و سراب کو مجھے اُن کے سامنے کر دیتا۔ مجھے یقین تھا کہ ان میں سے کوئی بھی چند دن سے زیادہ کام نہ کرتا۔ مجھے رانا کے ہاں ملازمت کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آتی۔ جہاں وہ کے اُن لوگوں سے قریب رہ کے کسی نہ کسی دن مجھے معلوم ہو ہی جاتا کہ وہ کہاں ہے۔ ہم منیر علی کے ہاں تین دن ٹھہرے تھے۔ اگر کوئی شخص مجھے وہاں دیکھ لے، کسی کو یہ بتا دیتا کہ ہم مولوی صاحب کے رشتے دار کی حیثیت سے منیر علی کے مہمان رہے تھے تو پھر شاید ایک لمحے بھی میرا وہاں رہنا ممکن نہ ہوتا۔

اور کیا عجب ہے کہ جب وہ یہیں آئے تو اُن کے ساتھ وہ بھی موجود ہو۔ وہ یہاں خالی ہاتھ تو نہیں آئے گا۔ جھل نے کچھ سوچ سمجھ کے ہی ہیرو کو بمبئی سے بلوایا ہے۔ وہ قمار بازی کے بعد بمبئی کا سب سے بڑا استاد تھا۔ اُس کی نظر بہت تیز ہے۔ ابھی بھی دیکھ بھال کے قدم اُٹھائے گا۔ اگر اُس میں یہ خوبی نہیں ہوتی تو وہ ہیرے کے اس قدر قریب نہ ہوتا۔ ہیرا اُس کے حوالے کرنا۔ مزا کو بھی ہیرے یہ خیال ہوگا کہ بعد میں میرے سامنے منہ دکھانے کی شرمندگی نہ اٹھانا پڑے۔ وہ ضرورت سمجھیں گے تو بمبئی سے اور آدمی بلا سکتے ہیں۔ اُن کے پاس آدمیوں کی کمی نہیں۔ سامنے بسیلی میں اتنے آدمی نہیں ہوں گے جتنے ہیرے کے ایک پاڑے میں ہوں گے۔ اگر وہ واقعی اُن کے ساتھ تھی، وہی انھیں گھیرے ہوئے ہے، وہ نہیں ہوتی تھی۔ مجھے اپنے آپ سے بہر حیرت سے ڈر لگ رہا تھا۔ سینہ بار بار کرتی تو جیسے لیا تھا۔ رگوں میں جیسے برف سی جم گئی تھی۔ میں کبھی باہر جاتا، کبھی ہوٹل میں واپس آجاتا۔ اس طرح شام ہوگئی۔ وہ پہنچ گئے ہوں گے اور ہماری طرح حویلی کے گرد و پیش کا جائزہ لے رہے ہوں گے۔ رات کو بھی میں کھڑکی میں کھڑا بس اندازے لگاتا رہا۔ ایک دن گزر گیا۔ پھر دوسرا دن بھی گزر گیا۔ مجھے ہر لمحے یہ احساس ہوتا تھا کہ ہوٹل کی سیڑھیوں پر کوئی چڑھ رہا ہے۔ حالانکہ انھوں نے ایک ہفتے بعد آنے کو کہا تھا مگر وقت کی اتنی پابندی تو تھی نہیں۔ وہ پہلے بھی آسکتے تھے۔ دروازے پر ذرا سی آہٹ ہوتی تو میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگتا۔ اے خدا کوشش وہ مل جائیں، کرشنا جی کی دی ہوئی ساری دولت اُسی وقت لٹا دوں گا۔

ابھی ایک ہفتہ نہیں گزرا تھا، پانچواں دن تھا اور سہ پہر کا وقت۔ یکا یک دروازے پر زور زور سے دستک ہوئی۔ یہ ہوٹل کے کسی ملازم کی دستک نہیں تھی۔ میں بستر سے اُچھل پڑا۔ دروازے پر قدم رکھتے ہی مجھے پچھتاوا آنے لگا مگر جھل کے پہنچنے سے پہلے ہی میں نے ڈگمگاتے قدموں سے جھک کے دروازہ کھول دیا۔ سامنے ہیرو کھڑا تھا۔ ماچھی اور زورا اُن کے پیچھے کھڑے تھے۔ اُن کے چہروں ہی پر سب کچھ لکھا ہوا تھا۔ میں پڑھنے لگا۔

"جھل بھائی!" ہیرو کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ "وہ اور نہیں ہے۔"

جھل اُسے شانے سے تھام کے اندر لے آیا۔ "اور اُسی رات ہی رستم خاں نے اُس کو اور مولوی کو فرار کروا دیا تھا۔ اپن کچھ ساتھ لے کے نہیں آسکا۔ واویلا……"

اُس نے جیب میں ہاتھ ڈال کے ایک ریشمی رومال جھل کے آگے ڈال دیا۔ اُس میں دو آنکھیں بندھی ہوئی تھیں۔ خون میں لتھڑی ہوئی دو بڑی بڑی آنکھیں تھیں۔!

اُن کے کپڑے سیاہ ہوگئے تھے اور چہروں پر دھول جمی ہوئی تھی اور وہ مختصر سامان اُن کے ساتھ نہیں تھا جو وہ اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ جھل نے دونوں آنکھیں جلدی سے رومال سے ڈھک دیں اور

ہیرو کو کھینچ کے پلنگ پر بٹھا لیا۔ "وہ کہاں ہے؟" اُس نے چیخ کر پوچھا۔

"وہ اور نہیں ہے جھل بھائی!" ہیرو نے آہستگی سے جواب دیا۔

"پھر…… تم کیا لے آئے؟"

"اپن کو خالی ہاتھ آنا اچھا نہیں لگا۔" ہیرو گہری سانس کھینچتے بولا۔

"پر تم…… تم اتنی جلدی کیسے آگئے؟" جھل کا سر چکرا رہا تھا۔

"وہاں جا کے گھیرنے کی ضرورت نہیں پڑی جھل بھائی!"

"زبان کھولو ہیرو دادا!" جھل اُس کا بازو جھنجھوڑنے لگا۔

"کیا زبان کھولے!" ہیرو نے خود کچھ کہنے کے بجائے تھکے ہوئے لہجے میں ماچھی سے کہا۔ "بول دے ماچھی! جھل بھائی کو سب بول دے۔"

جھل نے اپنی سرخ آنکھیں ماچھی کی طرف مرکوز کر دیں۔ ماچھی دروازے کے پاس سر جھکائے کھڑا تھا۔ "ماچھی اپن کیا بولے۔" وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔

"بول دے سب بول دے۔" ہیرو نے درشت لہجے میں اُسے حکم دیا۔

"اپن اُدھر گیا تھا۔" چند لمحوں کے توقف کے بعد ماچھی نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "پہلی رات تو دادا نے اپن کو حویلی کا جائزہ لینے بھیجا کہ اندر سامنے کے راستے سے جانے کا یا کسی اور جگہ سے۔ اُدھر پہرے داروں کا بہت تھا۔ پھر ہیرو دادا بولا کہ اس طرح اُدھر گھسنے سے اچھا ہے کہ اپن کو سیدھا رستم خاں کے پاس چل کے دیکھنا چاہیے۔ اندر جانے کو کوئی روک ٹوک نہیں تھا۔ یہ سالا پوچھتا تو خود اپنا کیسے اندر گھس سکتا تھا۔ ساری رات اپن دیوار کے نزدیک باغ میں پڑا رہا۔ دادا نے پچھواڑے کو پار کرکے دیکھ لیا اور دوسرے دن سویرے سویرے اور دور گیٹ پہ جا کے کھڑا ہوگیا۔ تو وہاں دربان نے دیکھ کے پہرے داروں نے پوچھا۔ اپن نے رستم کا نام بولا اور اُس کو سب جانتا ہے۔ اپن نے کتنے ہی دادی کو ادھر آیا اور ان دونوں کو دیکھ کے آنکھیں پھاڑنے لگا۔"

"جھوٹ مت مار۔ کام کی بات بول۔" ہیرو نے ماچھی کو دہلیز پر ٹہل دیا۔ ماچھی کی زبان پھر لڑکھڑانے لگی تھی۔

"چھلنی بکر ہوتا رہ۔" جھل نے بے چینی سے کہا۔

ماچھی چند قدم آگے بڑھ کے جھل کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ "اپن رستم سے بولا کہ دور سے آیا ہے اور تم سے کچھ خاص بات کرنا مانگتا ہے۔" اُس کی آواز رفتہ رفتہ ٹھہر رہی تھی۔ وہ بتا رہا تھا کہ پہلے تو رستم خاں نے اُن سے پوچھا کہ وہ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں۔ انھوں نے دوبارہ وہی جواب دیا کہ وہ اُس سے ملنے کے لیے دور دراز سے آئے ہیں۔ رستم خاں اُن کی بات سے مطمئن نہیں ہوا۔ دروازے پر کھڑا ہوا سوچتا رہا۔ پھر وہ انھیں اندر گھر میں لے گیا اور اُس نے اُن کے کہنے پر کسی قدر جھجک کے بعد دروازہ بند کر لیا۔ ماچھی اور ہیرو آتی صبح جان بوجھ کے اُس کے پاس گئے تھے تاکہ گھر میں کسی اور کی موجودگی ممکن نہ ہو۔ رستم خاں کے گھر میں اُس کی بیوی کے سوا کوئی نہیں تھا اور وہ لنگوٹ کسے بیٹھے ورزش کرنے کی حالت میں تھا۔

دروازہ بند ہوتے ہی ہیرو نے چاقو نکال کے اپنے اور اُس کے

درمیان فرش پر ڈال دیا۔ رستم خاں چونکا اور خشمگیں نظروں سے انھیں گھورنے لگا۔ پھر اُس نے بھی طاق سے اپنا چاقو اُٹھا کے ہیرو کے چاقو پر پھینک دیا۔ کوئی اور ہوتا تو شاید اتا پتا پوچھے بغیر انھیں گھر سے نکلوا دیتا مگر وہ رستم خاں تھا۔ رانا شتاب خاں کا سب سے قابلِ اعتماد آدمی۔ یہ اعتماد اُس نے اپنی بے باکی اور جرأت ہی سے حاصل کیا تھا۔ ماچھی کے کہنے کے مطابق اُس نے گفتگو میں پہل نہیں کی بلکہ اُن سے دریافت کیا کہ پہلے وہ ناشتہ کرلیں۔ ہیرو کے انکار پر اُس نے زیادہ اصرار بھی نہیں کیا۔ تاہم وہ پوری طرح چوکنا بیٹھا تھا۔ ہیرو نے اُس سے مولوی صاحب اور گوری کے بارے میں سوال کیا تو وہ اپنی جگہ اُچھل کے کھڑا ہوگیا لیکن دوسرے ہی لمحے اُس نے سنبھل کے صاف منع کر دیا کہ وہ کسی ایسی لڑکی یا آدمی کو نہیں جانتا۔ وہ غلط جگہ آگئے ہیں۔ ہیرو نے فوراً دونوں چاقو زمین سے اُٹھا لیے اور رستم کا چاقو اُس کی طرف اُچھال کے دوبارہ یہی سوال کیا۔ رستم خاں انکار کرتا رہا۔ پہلے ماچھی اور ہیرو کا ارادہ تھا کہ گوری اور مولوی صاحب کی بات کرنے سے پہلے رستم کو جھانسے میں لیں اور اُسے اپنے ٹھکانے پر مجبور کرنے کے بجائے کسی تنہا جگہ لے جائیں گے مگر انھیں کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ کمرہ بند تھا اور پھر اُن دونوں کے لیے اس اجنبی شہر میں اس سے مناسب جگہ کی تلاش آسان نہیں تھی۔ دوسرے یہ کہ وہ رستم سے مولوی صاحب اور گوری کا ذکر کر چکے تھے۔ اب رستم خاں کا اُن کے ساتھ باہر جانا ممکن نہیں تھا۔ انھیں جو بات کرنی تھی، وہیں کرنی تھی۔

ہیرو نے سخت لہجے میں اُس سے کہا کہ وہ گوری کا پتا بتائے بغیر یہاں سے نہیں جائے گا۔ رستم خاں وحشی ہو اُٹھا۔ اُس نے اُن دونوں کو حکم دیا کہ وہ اُس کے گھر سے فوراً نکل جائیں ورنہ نتیجہ بُرا ہوگا۔ اُس نے اپنے چاقو کو لہرا کے کہا کہ وہ دونوں حویلی سے زندہ واپس نہیں جا سکیں گے لیکن رستم خاں کی جذباتی حالت دیکھ کے ہیرو کو یقین آگیا تھا کہ مولوی صاحب اور گوری کے بارے میں وہ بہت کچھ جانتا ہے۔ وہ وہاں سے نہیں اُٹھے۔ ہیرو نے رستم خاں کو للکار کے اُس پر وار کر دیا۔ ماچھی کہہ رہا تھا کہ وہ خود رستم خاں سے نمٹنا چاہتا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ ہیرو نے بہت دنوں سے چاقو نہیں اُٹھایا، ہاتھ کھلنے میں شاید دیر لگے۔ کوئی بھی اُونچ نیچ ہو سکتی تھی مگر ہیرو نے اُسے ایک طرف خاموش بیٹھے رہنے کی ہدایت کر دی تھی۔ رستم خاں نے کئی پینترے بدلے مگر اُسے معلوم نہیں تھا کہ اُس کے سامنے بمبئی کا سب سے بڑا اُستاد ہیرو ہے۔ وہ تین ہی بار لوٹ پلٹ کے ہیرو نے اُس سے چاقو گرا لیا۔ جیسے ہی رستم خاں بے بس ہوا، ہیرو نے اپنا چاقو بند کر لیا اور چارپائی پر بیٹھ گیا۔ رستم خاں جھپٹ کے اُس کے گلے لگ گیا اور اُس کی انگلیاں چومنے لگا اور کچھ کہے سنے بغیر دروازہ کھول کے باہر نکل گیا۔ وہ دونوں وہیں بیٹھے رہے۔ رستم چند ہی منٹ بعد واپس آگیا۔ اُس کے ہاتھوں میں پیتل کی ایک لٹیا اور کٹورے تھے۔ لسّی سے

معمور تھے۔ پیالہ اور وہ لوٹ کے اُس نے ایک کٹورا ہیرو کے آگے کر دیا۔ ہیرو نے اُس میں سے چند گھونٹ پیے ہوں گے۔ پیالہ اور رستم نے ایک ہی سانس میں حلق سے اُتار لیا اور ہیرو کا ہاتھ تھامتے ہی پوچھنے لگا کہ وہ کون ہیں اور اُس کا پتہ اُنھیں کس نے دیا ہے۔ ہیرو نے پھر یہی بات دُہرائی کہ جب تک رستم اُس کے سوال کا جواب نہیں دے گا، وہ اپنے بارے میں کچھ نہیں بتائے گا۔

رستم نے پھر ضد نہیں کی اور اقرار کیا کہ اُس رات وہ مولوی صاحب اور گوری کو گھر سے لے آیا تھا۔ وہ چھ آدمی تھے۔ اُس کا منصوبہ اُس نے کئی دن پہلے بنا لیا تھا۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ محلے کے لوگ تراویح پڑھ کے جلد ہی سو جاتے تھے۔ آدھی رات کے وقت وہ مولوی صاحب کے گھر میں اُترے۔ مولوی صاحب نے بساط بھر مزاحمت کی۔ گوری اُن لوگوں کو دیکھ کے بے ہوش ہوگئی تھی۔ رانا نے انھیں حکم دیا تھا کہ مولوی صاحب کو زخم نہ آنے پائے۔ وہ رانا کی ہدایت کے مطابق شہر سے دور اُس کی جاگیر پر واقع ایک حویلی میں انھیں لے آئے۔ یہاں رانا کبھی کبھار سیر و تفریح اور شکار کے لیے ٹھہرتا تھا۔ خاص خاص مہمانوں کے لیے رانا کی نگاہ اسی حویلی پر جاتی تھی۔ حویلی کے آس پاس باغات اور کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ یہ سب کے سب رانا کی ملکیت تھے۔ یہاں آکے رستم نے پہلی بار گوری کو غور سے دیکھا۔ گوری کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں اور وہ ایک کونے میں سکڑی ہوئی بیٹھی تھی، جس میں حرکت ختم تھی۔ مولوی صاحب بُری طرح رو رہے تھے۔ وہ رستم کے پیروں پر گر گئے اور گڑگڑانے لگے کہ لڑکی کسی کی امانت ہے۔ مولوی صاحب نے رستم کو خدا رسول کا اور اُس کی ماں بہن کا واسطہ دیا۔ ماچھی کہہ رہا تھا کہ رستم خاں نے اُنھیں بتایا کہ گوری کو دیکھ کے اُس کا جی گھبرانے لگا۔ گوری پھولوں کی طرح نازک تھی۔ وہ اُسے دیر تک ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ جب وہ مولوی صاحب اور گوری کے کمرے کی کنڈی لگا کے باہر کی طرف آیا تو اُسے اپنے قدم بوجھل محسوس ہوئے۔ اُس کا ارادہ متزلزل ہو چکا تھا۔ اُس نے اشارتاً اپنی اس خواہش کا اظہار اپنے ساتھیوں سے کیا تو انھوں نے اُس کی توقع کے خلاف اُس کی حمایت کی۔ [illegible] ایک قاصد رانا کے پاس اطلاع دینے کے لیے روانہ کر دیا گیا تھا اور اب رانا کسی بھی وقت وہاں پہنچ سکتا تھا مگر اُس کی آمد سحری کے بعد ہی متوقع تھی۔

چلتے وقت رانا پہلی بار [illegible] رستم کو رخصت کرنے آیا تھا۔ اس اہتمام سے اُسے یہ جتانا مقصود تھا کہ وہ ایک اہم کام کے لیے جا رہا ہے۔ رانا نے رستم اور اُس کے ساتھیوں سے وعدہ کیا تھا کہ واپسی پر اُن کا منہ موتیوں سے بھر دے گا۔ رستم کو اس حقیقت کا پوری طرح احساس تھا کہ رانا اُسے بہت نازک اور عجیب وقت ہی طلب کرتا ہے۔ اُس نے رستم کو بطورِ خاص یہ ہدایت کی تھی کہ مولوی صاحب اور گوری کو خاص کمرے میں رکھا جائے اور رستم کے سوا کوئی گوری کے بدن کو ہاتھ

ہیں ایک اونچا چبوترا تھا جو کسی اسٹیج کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ یہاں راما کے آدمی ورزش کرتے اور داؤ پیچ سیکھتے تھے۔ اب وہاں فرش پر دری بچھی تھی اور اطراف میں گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ سامنے سازندے بیٹھے تھے۔ ان کے بیچ میں ایک ناچنے گانے والی لڑکی تھی۔ رستم نے ان سے کچھ کہے بغیر یہ اہتمام کیا تھا۔ محفل چند ہی لوگوں تک محدود تھی اس لیے کہ پیرزادہ اور ماجھی نے پہلے ہی رستم سے کہہ دیا تھا کہ انھیں بھیڑ بھاڑ کا پسند نہیں ہے۔ وہ جلد از جلد یہ محفل ختم کرنے کی تجویز میں تھے لیکن رستم فرمائشوں کی فرمائش پر فرمائش کر رہا تھا۔ بہت رات گئے یہ سلسلہ بند ہوا۔ انھیں ایک اور رات ضائع جانے کا افسوس تھا۔ گھر آنے کے بعد بھی رستم دیر تک انھیں اپنے واقعات رنوں کے تذکرے اور راما کی باتیں سناتا رہا اور وہ اُس سے کرید کرید کے پوچھتے رہے۔ ان کی دلچسپی کا محور صرف راما کا تذکرہ تھا اور وہ پیار کر جوالا نے ہیں بتایا تھا۔ رستم نے بھی راما کے متعلق انھیں وہی باتیں بتائیں۔ دوسرے دن صبح گیارہ بجے کے قریب وہ راما کو دیکھ سکے۔ رستم انھیں سہراب کے ہاں دوپہر کے کھانے کی دعوت پر لے جا رہا تھا کہ راما سے ان کا آمنا سامنا ہو گیا۔ راما کو دیکھ کے رستم ٹھہر گیا اور اس نے ان دونوں کو اُس کی خدمت میں اپنے مہمان کے طور پر پیش کیا۔ راما کو شاید ان کی آمد کے بارے میں پہلے معلوم ہو گیا تھا۔ اُس نے خندہ پیشانی سے ان کا خیر مقدم کیا اور کہا کہ اگر رستم کے گھر میں تنگی ہو تو انھیں مہمان خانے میں ٹھہرا دیا جائے۔ ماجھی تیار تھا کہ راما کو اپنے سامنے کھڑا دیکھ کے اس کی آنکھوں میں خون اُترنے لگا۔ وہ سُرخ و سپید رنگ کا ایک دراز قد شخص تھا۔ اس کا جسم فربہی کی طرف مائل تھا۔ عمر زیادہ نہیں معلوم ہوتی تھی۔ باریک مونچھیں، سیاہ بال پیچھے کی طرف اُلٹے ہوئے، سفید کرتے اور پاجامے میں وہ ایک نواب لگ رہا تھا۔ راما ان کے لیے کوئی نیا آدمی نہیں تھا۔ اب تک وہ اُس کے بارے میں بہت سی باتیں سن چکے تھے اور ان باتوں سے انھوں نے اس کے متعلق جو تصور قائم کیا تھا، وہ ہو بہو اس کے مطابق تھا۔ راما کے چہرے پر سب سے نمایاں اُس کی آنکھیں تھیں۔ بڑی بڑی سُرخ آنکھیں۔ ان میں خون کے سُرخ ڈورے پڑے ہوئے تھے۔

شام کو وہ زرداے سے ملنے کے لیے تنہا شہر جانا چاہتے تھے مگر رستم اُن کے ساتھ ہو گیا۔ وہ بازاروں اور گلیوں سے گزرتے ہوئے اس سرائے کی طرف جا نکلے جہاں زرداے ٹھہرا ہوا تھا۔ زرداے نے انھیں دور سے دیکھ لیا لیکن ماجھی کا اشارہ پا کے دور دور ہی رہا۔ ان کا مقصد بھی زرداے کو اپنے چہرے دکھانے تھے لیکن جب وہ سرائے سے قریب پان کی ایک دکان پر پہنچے تو زرداے ان کے قریب آ گیا۔ وہ رستم کے سامنے ایک دوسرے کے لیے اجنبی بنے رہے۔ پھر پیرو نے رستم کو اپنی طرف متوجہ کر لیا اور ماجھی کو زرداے سے چند باتیں کرنے کا موقع مل گیا۔ اس نے زرداے سے کہا کہ کل دوپہر تک اگر وہ اُس کے پاس نہ آسکیں تو وہ سیٹی تارڑ کے اور لوگوں کو بلا لے اور اگر وہ ان لوگوں کے حویلی سے آنے کے بعد بھی اُس کے پاس نہ پہنچ سکیں تو وہ جس طرح مناسب سمجھیں حویلی میں داخل ہونے کی کوشش کریں اور فرض کر لیں کہ وہ بھی اور پیرو کسی مصیبت میں گرفتار ہو گئے ہیں۔ ادھر یکے نیر ہیں اُستاد جگل اور لاڈلے کو فوراً مطلع کر دیا جائے۔ اُن کے ذہن میں بہت سی باتیں تھیں لیکن جو انھوں نے سوچ رکھی تھا وہ آسان نہیں تھی۔ وہ تعداد میں صرف دو تھے اور راما کی حویلی ایک چھوٹے سے قلعے کی حیثیت رکھتی تھی اور وہ اس قلعے کے اندر بیٹھے تھے۔ دوسری رات رستم خاں مجرے کا اہتمام کر رہا تھا۔ انھوں نے اصرار کر کے مجرا دوسرے دن کے لیے ملتوی کرا دیا۔ رستم خاں نے اس محفل کے لیے خاص طور پر سبزی کے پیالے بنوائے تھے۔ پیرزادہ ماجھی نے اس تقریب کو ہوتے ہیں رہ سکیں البتہ رستم خاں نے خوب پی کھا، کھی بے تحاشا کھایا اور جلد ہی اپنے آپ سے دور ہونے لگا۔ پھر بھی رات کے ڈیڑھ دو بجے سے پہلے ماجھی کو رستم کے گھر سے باہر نکلنے کا موقع نہیں مل سکا۔ حویلی میں سرگوشیاں ہو گئی تھی۔ پیرزادہ رستم کے پاس بیٹھے رہے اور ماجھی رات کے اندھیرے میں کوارٹر سے باہر نکلا۔

انھوں نے رستم کی زبانی راما کی ایک چھوٹی بہن کے متعلق سنا تھا۔ انھوں نے طے کر لیا تھا کہ راستے میں جتنے آدمی آئیں گے، اُن کے ساتھ وہ کوئی رعایت نہیں کریں گے اور کسی نہ کسی طرح اندر زنان خانے میں داخل ہونا ایسا مشکل مرحلہ نہیں تھا۔ وہاں وہ ایک ہی چوکی دار ہو سکتے تھے۔ راما بہر حال ایک جاگیردار تھا، کوئی دیہاتی صوبے دار یا راجا نہیں۔ حویلی کے چاروں طرف پھیلی ہوئی دیوار اور اِدھر اُدھر دروازوں ہی پر بہت پہرے دار تھے تو اندر رکھوال کی اتنی ضرورت کہاں تھی مگر جب انھوں نے آئندہ پیش بعد کے مراحل پر غور کیا تو راما کی بہن کو لانے کا خیال ملتوی کر دیا۔ اُسے بے ہوش کر کے وہاں سے اٹھایا جا سکتا تھا لیکن حویلی کی دیوار کے پار لے جانا بھی مشکل تھا جب ان کے پاس زیادہ آدمی نہ ہوں۔ اپنے دوسرے آدمیوں کی آمد کا انتظار کرنے میں دن بہت لگ جاتے۔ انھیں وہیں جگل کے پاس پہنچنا تھا۔

ماجھی نے خود کو ایک چادر میں لپیٹ لیا تھا۔ اندھیرے میں خود کو چھپاتا ہوا وہ حویلی کے پچھواڑے صحن میں آ گیا اور بارہ دری کی محرابوں اور جالیوں کا سہارا لے کے زنان خانے کی چھت پر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس جگہ کی اُس نے پہلے ہی نشان دہی کر لی تھی۔ صحن زنان خانے اور مردان خانے کے سامنے درمیانی حصے میں تھا اور حوض کے پاس بارہ دری شاید اس خیال سے بنائی گئی تھی کہ حویلی کے دونوں حصوں کے مکینوں کو وہاں آنے جانے میں دشواری نہ ہو۔ ماجھی چھت چھت اور منڈیر منڈیر گزرتا ہوا مردان خانے تک آسانی سے پہنچ سکتا تھا۔ چھت پر اُسے اِدھر سے اُدھر جانے میں کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئی۔ اُسے کسی زینے کی تلاش تھی اور اُس کا خیال تھا کہ اس طرح کی عمارتوں کے زینے عموماً کھلے ہوتے ہیں۔ وہ کسی جگہ سے دوبارہ نیچے پہنچنے میں کامیاب ہو جائے گا مگر اس طرف جو زینہ نظر آیا

اُس کا دروازہ بند تھا۔ ماجھی نے اُسے کھولنے کی بہت کوشش کی مگر ناکام ہو کے نیچے اُترنے کے لیے کوئی اور مناسب جگہ ڈھونڈنے لگا۔ چھت سے موٹے پائپ کی شکل ہی کے پرنالے باہر اُٹھے ہوئے تھے۔ اگر اُس کے پاس رسی ہوتی تو وہ اُسے اُن سے باندھ کے نیچے اُتر سکتا تھا۔ پرنالا دونوں ہاتھوں سے پکڑ کے اور جسم نیچے گرا کے زمین پکڑنے سے ہاتھ پیر ٹوٹ جانے کا اندیشہ تھا۔ چھت بہت اونچی تھی۔ اسی لحاظ سے پرنالے بھی اونچے تھے۔ وہ چھت پر یہاں سے وہاں دبے قدموں گھستا رینگتا رہا اور آخر اُس کی سمجھ میں یہی بات آئی کہ وہ جس راستے سے اوپر آیا ہے اُسی سے واپس جائے اور نیچے ہی کہیں سے مردان خانے میں جانے کا راستہ تلاش کیے کی گنجائش ڈھونڈے۔ مجبوراً وہ بارہ دری کے ذریعے واپس صحن میں آ گیا اور رکتا جھجکتا درختوں کی آڑ لیتا مردان خانے کی طرف بڑھنے لگا۔ اُسے ایک لمبا چکر کاٹ کے عمارت کے سامنے آنا تھا لیکن ایک بار پھر اُس کے ذہن میں آیا کہ کہیں زنانہ عمارت کے پچھلے ہی حصے میں کسی طرف رستے کا سراغ لگائے۔ کسی کسی جگہ کمروں میں ہلکی روشنی تھی۔ مردان خانے کی عمارت میں پیچھے کی جانب اُسے ایک تنگ گلی سی نظر آئی۔ ماجھی اُسے گلی کر رہا تھا مگر وہ راہداری تھی۔ ماجھی بے آواز چاپوں سے اُس کے قریب گیا۔ راہداری دور تک چلی جاتی تھی اور ادھر اُدھر بائیں دوسری راہداریوں سے مل جاتی تھی۔ چند قدم چل کے اُسے اندازہ ہوا کہ آگے کچھ فاصلے پر راہداری کا دروازہ بند ہے۔ اندر کوئی آواز جھنکار نہیں ہے۔ ماجھی نے لوہے کے جالی دار دروازے سے اندر جھانک کے دیکھا۔ مدھم روشنی میں چارپائی پر ایک شخص سویا ہوا نظر آیا۔ چارپائی کے سرہانے فرش پر دھیمی جلتی ہوئی لالٹین رکھی ہوئی تھی۔ پاس ہی ایک لاٹھی بھی دیوار سے ٹکی ہوئی تھی۔ ماجھی دیر تک یہ سوچتا رہا کہ کیا کرے۔ اگر وہ اُس شخص کو پکڑتا ہے تو ضروری نہیں کہ سویا ہوا شخص دروازہ کھول کے باہر نکل آئے اور آہٹ کی تصدیق کرے اور اسی اثنا میں ماجھی اُس پر قابو پالے۔ وہ اندر ہی رہ کے آوازیں لگا سکتا تھا کہ کون ہے۔ اسے خواہ مخواہ شک ہی ڈال کے مزید کوئی الجھن پیدا نہیں کرنا چاہیے تھی۔ ماجھی نے اُسے چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا اور آگے بڑھنے کا فیصلہ کر لیا۔ عمارت کی دیوار سے چپکا ہوا وہ کونے تک پہنچ گیا۔ اُسے دائیں جانب مڑ کے عمارت کے ساتھ ساتھ ہی چلنا تھا۔ اُس نے مُڑ کے سر نکال کے دیکھا۔ اُدھر کوئی نہیں تھا۔ آہستہ آہستہ چلنے کے بجائے اُس نے پنجوں کے بل بھاگنا شروع کر دیا اور چند ثانیوں میں دوسرے کونے پر آ گیا مگر جب اُس نے وہاں سے جھانک کے دیکھا تو عمارت کے سامنے کے حصے میں خاصی روشنی تھی۔ اُسے محسوس ہوتے جیسے حویلی کی ڈیوڑھی کے پہرے پر دو تین آدمی بھی بیٹھے ہوئے نظر آئے۔ دو دروازوں میں بھی کھڑکیاں کھلی تھیں۔ وہ وہیں ٹھہر گیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ راما کی محفل ابھی ختم نہیں ہوئی ہے۔ رات کا بڑا حصہ گزر چکا تھا۔ اس نے رستم سے سنا تھا کہ کبھی

کبھی تو رات رات بھر ناچ گانا ہوتا رہتا ہے۔ باہر آدمیوں کی موجودگی سے ظاہر تھا کہ اندر بھی بہت سے لوگ ہوں گے۔ پتہ نہیں کب یہ محفل ختم ہو۔ ممکن ہے صبح ہو جائے۔ وہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ کب تک انتظار کر سکتا ہے۔ اس درمیان میں کسی پہرے دار یا کسی اور شخص کی نظر پڑ گئی تو وہ اس سے کیسے نمٹے گا۔ اس قسم کے کئی اندیشوں نے ماجھی کو الجھن میں مبتلا کر دیا۔ صحن اور درمیان کے درختوں کی آڑ میں آتے بڑے دروازے پر ہل چل کے آثار نظر آ رہے تھے۔ دروازہ بند معلوم ہوتا تھا۔ ماجھی نے واپس جانے کا ارادہ کیا تو واپس مڑتے ہوئے اُس کے پیر اٹکنے لگے۔ وہ پھر کوئی جواب دے گا اور کل کا موقع نہ معلوم کس انداز سے نمودار ہو۔ سوچ کر وہ رک گیا اور اس نے انتظار کرنے کا عزم کر لیا لیکن کسی ایسی جگہ چھپنا بہتر تھا جہاں سے وہ آنے جانے والوں کو دیکھ سکے اور عمارت کا وہ حصہ بھی قریب رہے جس طرف اُسے جانا تھا۔ ماجھی کو ان عمارات میں ایک ہی راستہ دکھائی دیا کہ وہ عمارت اور چار دیواری کے بیچ کی کشادہ جگہ عبور کر کے چار دیواری کے ساتھ لگی ہوئی گھنی کیاریوں کی آڑ میں خود کو چھپا لے۔ اُس نے یہی کیا اور ایک ایسے مقام پر آ کے بیٹھ گیا جہاں اُس کی نظروں کے سامنے سب کچھ عیاں تھا۔ آہٹ کے بغیر کوئی اُسے دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔ اُس نے چادر سے اپنا جسم ڈھانپ لیا تھا۔ اس طرح وہ زمین پر اُٹھا ہوا مٹی کا ایک تودا معلوم ہوتا تھا۔ وہ وہیں موجود رہا۔ کچھ دیر بعد ہی شور اُٹھا۔ صحن میں ایک ساتھ کئی افراد آتے ہوئے دکھائی دیے۔ اُن میں راما نہیں تھا۔ شیروانی پہنے ہوئے ایک دبلے پتلے شخص نے اُن چند لوگوں کو دروازے تک رخصت کیا۔ سب کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ پھر شیروانی والا شخص لوٹ آیا۔ اُس کے جاتے ہی سازندوں کی ایک ٹولی اندر سے نکلے صدر دروازے کی طرف چل گئی۔ ماجھی نے اپنی نگاہیں جمائے رکھیں۔ لوگ آئے اور چلے گئے۔ سازندوں کے ساتھ گانے والی نہیں تھی۔ اُسے شاید اندر روک لیا گیا تھا۔ تھوڑی دیر میں لمبے چوڑے پختہ صحن میں خاموشی غالب آ گئی۔ وہ شخص بھی اُٹھ کے کہیں چلا گیا تھا جو آخری سرے پر پہرے داری کر رہا تھا۔ باہر کی روشنیاں مدھم پڑ گئی تھیں۔

ماجھی نے وہیں بیٹھے بیٹھے وہ جگہ آنکھوں میں محفوظ کر لی تھی جہاں سے لوگ باہر آئے تھے۔ صحن میں جب آہٹ معدوم ہو گئی تو ماجھی اپنی جگہ سے اُٹھا۔ صحن میں اب بھی اتنی روشنی ضرور تھی کہ دور سے کوئی بھی اس کی نقل و حرکت دیکھ سکتا تھا۔ ماجھی صحن میں آ کے لوٹتا پوٹتا عمارت سے قریب ہو جاتا مگر یہ ایک طویل اور تھکا دینے والا عمل تھا۔ صحن میں ہر طرف کھلا ہوا تھا۔ بڑے دروازے پر پہرے دار اب بھی جاگ رہے تھے مگر وہ بہت دور تھے۔ خاصی دیر رینگنے کے بعد اُس نے خطرہ مول لینے کی ٹھان لی۔ اُس نے طے کیا کہ وہ کھلے طور پر صحن میں چلتا ہوا عمارت میں داخل ہو گا۔ دور سے کسی نے اُسے دیکھا تو پہرے دار کا گمان کرے گا۔ عمارت

وہ بھی فرسٹ۔ جیل ہی رہ کے میں یہی کر سکتا تھا۔ اخباروں میں یہ خبر چھپی تھی مگر مولوی صاحب کو کچھ پتہ ہی نہیں تھا۔ اُن کی نظر سے یہ خبر بھی نہیں گزری۔ گزرتی تو وہ مجھے مبارک باد کے دو لفظ ہی لکھ دیتے اور پھر کہ ایسے میں اتنا پکا اُن کے علم میں ہوتا تو بھی معلوم ہوتا کہ میری سزا کتنی مدت کی ہے اور جب میں نے اپنی سزا پوری کر لی ہے تو دوبارہ تفتیش کا سوال ہی نہیں اُٹھتا۔ دو سال تین سال پانچ سال۔ اس دوران میں جیل کے بہت سے حکام بدل گئے تھے اور لوگ بھول گئے تھے کہ میں کس معاملے میں جیل آیا ہوں۔ بات پُرانی ہو گئی تھی۔ ایک عرصہ گزرنے کے بعد مولوی صاحب کا یہ اندیشہ دُور ہو جانا چاہیے تھا۔

مولوی صاحب جیسے شخص کے لیے جیل کا تصور ہی بہت بھیانک ہو گا۔ انھوں نے یہی سمجھا ہو گا کہ اب میری طرف توجہ دینا خود کو اُلجھن میں ڈالنے کے مترادف ہے۔ میں جیل سے رہا بھی ہو گیا تو کرا کے لائق نہیں۔ بس گو بیزار ہو سا بھی کر اب نہیں پڑنا چاہیے۔ وہ یہ فیصلہ کرنے کا اختیار رکھتے تھے اس لیے کہ اب وہی کرا کے سب کچھ تھے۔ اُس کے لیے انھوں نے اپنے ماضی سے یکسر ناتا توڑ لیا تھا۔ نہ جانے انھوں نے کرا کو کیا بتایا ہو گا۔ ہو سکتا ہے کہ انھوں نے اُسے میرے واپس آنے کی تسلی دی ہو گی۔ کہا ہو گا کہ میں کھو گیا ہوں اور وہ مجھے تلاش کر رہے ہیں۔ اگر وہ کرا کو یہ نہ بتاتے تو وہ اپنا گلا گھونٹ لیتی۔ چوہے مار دوا کھا لیتی۔ انھوں نے اسی طرح کچھ کہا ہو گا اور یہی اس سے کہنا بھی چاہیے تھا مگر ساتھ ہی انھیں یہ بھی احساس ہو گا کہ وہ کرا کو کب تک یہ دلاسا دے سکتے ہیں۔ کرا نے انھیں ہزاروں بار کہا ہو گا کہ وہ مجھے کراچی آپا جان یا امی کو خط لکھیں۔ مولوی صاحب نے ہمیشہ یہی جواب دیا ہو گا کہ وہاں سے کوئی جواب نہیں ملتا ہے۔ لیکن چھ سال یا دو سال بعد کرا کے بتائے ہوئے پتے پر مولوی صاحب نے گھر کوئی خط لکھا ہو اور وہاں کوئی موجود ہی نہ ہو کیونکہ امی کے انتقال کے کچھ دن بعد آپا جان نے گھر بیچ دیا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ابتدا ہی میں کہیں مولوی صاحب کا تعاقب انھیں قبیلے کے لوگوں نے کیا ہو جو کرا کی تلاش میں سرگرداں تھے اور مولوی صاحب محتاط ہو گئے ہوں کہ اگر کہیں کسی ذریعے سے اُن لوگوں کو پتہ چل گیا تو وہ پھر اُن کے سامنے آ جائیں گے۔ اُن کی گوشہ نشینی کا سب سے بڑا سبب یہی ہو گا کہ انھیں ایسے چند لوگ ضرور راستے میں مل گئے ہوں گے اور اُن کی نیت کا بھی انھیں اندازہ ہوا ہو گا کہ وہ ہر حال میں کرا کو حاصل کرنا چاہتے ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ اتنی طویل مدت کے دوران انھیں کوئی ایسا شخص نظر آ گیا ہو جسے وہ کرا کے لیے سب سے موزوں سمجھتے ہوں۔ اسی لیے انھوں نے باقی تمام لوگوں کو منع کر دیا ہو۔ جب انھوں نے امانت کا لفظ لکھا تھا تو اُن کے ذہن میں کوئی اور شخص بھی ہو سکتا ہے۔ جیسلمیر آنے سے پہلے وہ متعدد جگہوں پر رہے ہوں گے اور اَن گنت خاندانوں سے اُن کا واسطہ پڑا ہو گا۔ ہو سکتا ہے اُن کی نظرِ انتخاب کسی شخص پر پڑ گئی ہو اور وہ اُسی کے انتظار میں ہوں یا پھر یہ ہو کہ کرا کو منسوب کرنے کا تصور ہی اُن کے لیے سوہانِ روح ہو۔ ایک طرف انھوں نے کرا سے کہا ہو گا کہ وہ میری کھوج میں ہیں اور اس صورت میں دوسری طرف اُسے مستقل طور پر کسی اور سے وابستہ کرنے کا ذکر وہ اُس کے سامنے کیسے کر سکتے ہیں۔ کرا نے انھیں یقیناً کوئی ایسا تاثر دیا ہو گا کہ وہ صرف میرے لیے زندہ ہے جیسے میں اُس کے لیے زندہ تھا۔ اس نے ایسا کچھ ضرور کہا ہو گا اور مولوی صاحب کو یہ بھی یقین ہو گا کہ وہ کرا کی رائے نہیں بدل سکتے۔ چاہے صدیاں بیت جائیں اور جب انھیں یقین ہو گیا تھا تو سات سال دنیا میں ہی تھے۔ اس عرصے میں کرا اُنھی کے ساتھ تھی۔ لازماً انھیں میری زندگی اور موت کی کشمکش ضرور ملنی چاہیے تھی جیسے کے دماغ میں بہت سی مکڑیوں نے جالا بُن لیا تھا۔

ہال گاڑی بھاگ رہی تھی۔ وہ بھی باتیں کرتے کرتے اونگھنے لگے تھے۔ صرف گارڈ جاگ رہا تھا۔ کہیں گاڑی رکتی تو سپاہی چونک کے آنکھیں ملنے لگتے اور گاڑی پھر چل پڑتی تو گارڈ کے ساتھ نیچے اُتر جاتے۔ گاڑی چلنے لگتی تو پھر اونگھنے لگتے۔ رات کو کسی وقت اُس نے ہمیں جودھپور پہنچا دیا اور یہاں سے ہم مختلف لاریوں میں سفر کرتے ہوئے گیارہ بجے کے قریب اپنی منزل پر پہنچ گئے۔ ایک بجنے کے بعد جیسلمیر شہر کا اونچا قلعہ ہمارے سامنے تھا۔

محلے کی گلیوں میں زیادہ بھیڑ نہیں تھی۔ اسٹیشن سے یہاں تک کا فاصلہ ہم نے تیز رفتاری سے طے کیا تھا۔ شاید سارے مرد گھروں سے باہر نکل چکے تھے۔ راستے میں ہمیں جاننے والا کوئی شخص نظر نہیں آیا۔ ہماری دستک پر دروازہ منیر علی ہی نے کھولا اور ہمیں اپنے سامنے دیکھ کے ٹھٹک سے رہ گئے۔ اُن کے پپوٹے سوجے ہوئے تھے اور ماتھے پر شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ رات بھر نہیں سوئے ہیں اور جیسے ایک ہفتے کے دوران وہ بہت بوڑھے ہو گئے ہوں۔ "آپ...." بمشکل تمام اُن کے حلق سے کانپتی ہوئی آواز نکلی۔

"ہاں بڑے صاحب!" عقیل نے نرمی سے کہا۔

"آپ.... آپ کہاں سے آ رہے ہیں؟" انھوں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"زیادہ دُور سے نہیں۔"

"مگر آپ تو.... آپ تو...."

"ہاں!" عقیل بڑھ کے اُن کے گلے سے لگ گیا۔ "جلدی ہی واپس آنا ہو گیا۔ ادھر جیسلمیر سے گزر رہے تھے۔ سوچا اپنا وعدہ بھی پورا کر لیں۔ آپ کو سلام کرتے چلیں۔ آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ لگتا ہے کچھ...." وہ کہتے کہتے رُک گیا۔

"آپ اتنے دنوں کہاں کہاں رہے؟" منیر علی نے اضطراری انداز میں کہا۔

"ہمیں حیدرآباد تک، زیادہ دُور نہیں جا سکے۔"

"حیدرآباد...." منیر علی کی آواز لرز رہی تھی۔ انھوں نے ہم سے اندر آنے کے لیے نہیں کہا۔ وہ ایسی نظروں سے ہمیں گھور رہے تھے جیسے ہماری شکلیں بدل گئی ہوں یا ہم اُن کے لیے بالکل اجنبی ہوں۔

"بیٹھک کھولیے بڑے صاحب!" عقیل نے انھیں ٹوکا۔

"جی.... جی" وہ حواس باختہ انداز سے سر ہلانے لگے۔ "ایسا ہے...." اُن کی زبان لڑکھڑا کے رہ گئی۔ "آپ آپ لوگ اندر ہی سے آ جائیے۔" وہ اندر کی طرف تیزی سے جاتے ہوئے بولے۔ عقیل نے مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ میں نے پلکیں جھپکائیں۔ منیر علی اندر پہنچ کے فوراً دروازے پر پہنچ گئے اور ہمیں گھر کے اندر سے بیٹھک میں لے گئے۔ انھوں نے بیٹھک کا گلی میں کھلنے والا دروازہ بھی نہیں کھولا۔ اندر چیزیں اسی طرح رکھی ہوئی تھیں جس طرح ہم چھوڑ گئے تھے البتہ وہ چارپائی نہیں تھی جو بیٹھک کے لیے منیر علی نے اندر گھر سے یہاں ڈلوا دی تھی۔

"بات یہ ہے" منیر علی نے سنبھل سنبھل کے کہنے کی کوشش کی۔ "کچھ حالات کی وجہ سے مجبوری ہے۔" اُن کے لہجے سے عیاں تھا کہ وہ ہم سے جھوٹ بول رہے ہیں اور اُن کا مقصد یہ کہنا ہے کہ اب وہ اپنے گھر میں ہمیں ٹھہرانے سے معذور ہیں۔

"ہمارا ارادہ اتنی جلدی اس طرف واپس آنے کا نہیں تھا۔" عقیل نے اُن کی بات سُنی اَن سُنی کر دی۔ "بچوں کے لیے بھی کچھ نہ لا سکے۔ گھر میں سب ٹھیک ٹھاک ہے؟"

"جی ہاں! اللہ کا فضل ہے" منیر علی نے شکستہ لہجے میں جواب دیا۔

"آپ کچھ پریشان سے لگ رہے ہیں۔ کیا بات ہے؟"

"نہیں نہیں۔ کچھ نہیں" منیر علی ہاتھ ملتے ہوئے بولے۔

"کچھ تو بات ہے۔ راشد میاں کا کیا حال ہے؟"

"وہ بھی ٹھیک ہیں لیکن...."

"لیکن کیا بڑے صاحب!" عقیل نے کہا۔

"کچھ نہیں جناب!" منیر علی کے لہجے میں اضطراب تھا۔ وہ ہمیں دزدیدہ نظروں سے دیکھتے رہے۔

"کچھ ضرور ہے۔ ہم آپ کا بھلا چاہنے والوں میں ہیں بڑے صاحب!"

"بے شک بے شک لیکن کچھ صورت بدل گئی ہے۔" اُن کی آواز اٹک رہی تھی۔ "میں آپ سے معذرت کروں گا کہ اس مرتبہ کہیں اور ٹھہر جائیے۔ شاید میں پہلے کی طرح آپ کی خدمت نہ کر سکوں۔"

"کیا صورت بدل گئی ہے؟" عقیل نے حیرانی سے پوچھا۔

"مجھ سے کچھ نہ پوچھیے۔ بہتر ہے مجھ سے کچھ نہ پوچھیے۔"

"پھر کس سے پوچھیں؟ ہم سے کوئی غلطی ہو گئی ہے بڑے صاحب؟"

"نہیں جناب! خطاکار میں ہوں۔"

"آپ نے بھلا کیا خطا کی ہے؟ آپ کیا بول رہے ہیں؟"

"آپ کو کچھ پتہ نہیں؟" منیر علی نے بدحواسی کے انداز میں کہا۔

"کس کا پتہ؟"

"آپ کچھ نہیں جانتے؟ ... مطلب آپ کچھ نہیں جانتے؟"

"کس بارے میں؟"

"وہی رانا کے بارے میں؟" منیر علی نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔

"رانا! کیا اُس نے پھر کوئی بات چھیڑی ہے؟"

"نہیں صاحب! کیا آپ کو واقعی کچھ نہیں معلوم؟"

"آپ کچھ بولیں گے تو پتہ ہو گا" عقیل نے ملامت سے کہا۔

"رانا کو اندھا کر دیا گیا ہے۔ آٹھ دن پہلے کسی نے اندھا کر دیا۔" منیر علی لرزیدگی سے بولے۔ "سارے شہر میں چرچا ہے۔ بڑے بڑے ڈاکٹر بلائے گئے ہیں وہ ابھی تک ہوش میں نہیں آیا ہے۔"

"رانا کے اندھے ہونے سے آپ کا کیا تعلق؟" عقیل نے بے چینی سے پوچھا۔

"خدا بہتر جانتا ہے کہ مجھ سے کیا تعلق ہے۔ معلوم نہیں اُسے کیا منظور ہے" منیر علی ہانپتے ہوئے بولے۔ "کل رات دو آدمی دیوار پھاند کے اندر گھر میں گھس آئے۔ میری آنکھ کھل گئی تھی۔ انھوں نے مجھے پلنگ سے اُٹھا لیا۔ اُن میں سے ایک کے ہاتھ میں خنجر تھا۔ کہنے لگے شور مچانے کی کوشش مت کرنا۔ کسی نے ... میرے ہوش و حواس گم ہو گئے تھے۔ میں نے بیٹھک کی طرف اشارہ کیا۔ وہ گھسیٹتے ہوئے مجھے یہاں تک لائے اور پوچھنے لگے کہ کچھ دن پہلے تمھارے یہاں جو دو مہمان ٹھہرے ہوئے تھے وہ کون تھے۔ کہاں سے آئے تھے اور اُن کا پیشہ کیا ہے۔ مجھے آپ لوگوں نے صرف اپنے نام ہی بتائے تھے۔ میں نے وہی بتا دیا اور کہا کہ مجھے نہیں معلوم۔ پوچھنے لگے کیا مولوی صاحب سے اُن کا کوئی رشتہ تھا۔ میں نے جواب دیا: ہاں انھوں نے خود کو اُن کا بھتیجا ظاہر کیا تھا۔ پھر پوچھا کہ مولوی صاحب کے بارے میں اُن سے کچھ کہا تھا کہ وہ مولوی صاحب کی لڑکی کو ... تھا۔ مجھے بہ صد کراہ اقرار کرنا پڑا لیکن وہ اور مشکوک ہو گئے کہ میں جان بوجھ کے آپ کا پتہ چھپا رہا ہوں اور دیر تک ... کے آپ کے قیام کی مدت اور دیگر باتیں پوچھنے لگے۔ میں نے اُن سے کہا کہ آپ رات ... ٹھہرے وہ دونوں مہمان یہاں سے چلے گئے۔ انھوں نے میری داڑھی پکڑ لی۔ مجھے طمانچے مارے اور گردن پکڑ کے بولے کہ اُن لوگوں کا پتہ بتا دو۔ اسی میں تمھاری بھلائی ہے۔ میں نے قرآن کی قسمیں کھائیں اور کہا کہ اس کے سوا مجھے کچھ نہیں معلوم۔ وہ صاحبان یہاں ٹھہرے ضرور تھے۔ مولوی صاحب سے تعلق کی بنا پر میں نے انھیں اپنے ہاں مہمان رکھا تھا۔ مولوی صاحب اور لڑکی کی باتیں پھر چھڑیں تو رانا صاحب کے پیام کا ذکر بھی آ گیا۔ وہ صرف تین دن ٹھہرے۔ انھوں نے بتایا تھا کہ وہ مراد آباد سے آئے ہیں۔ مولوی صاحب کا تعلق بھی شاید وہیں سے تھا۔ لیکن وہ بتا کے گئے ہیں کہ مراد آباد کی طرف نہیں جا رہے ہیں اور واپسی میں پھر یہاں جیسلمیر آئیں گے۔ میں نے جو کچھ تھا اُسے کہنے میں ہچکچاہٹ نہیں کی مگر وہ یہ ضد پر مجھے قتل کے

سازش بھی آنے لگے، دھمکیاں دیتے رہے کہ میں اپنے حق میں بڑا کر دا ہوں جن کے کمانے کے جرم میں جو کچھ تھا میں نے کر دیا۔ اب میرے پاس انھیں بتانے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ میں نے اُن سے کہا کہ وہ مجھے بڑے لوگ نہیں معلوم ہوتے تھے جیسے آدمیوں کی طرح یہاں رہتے ہیں۔ آخر ان لوگوں سے ایسا کون سا گناہ سرزد ہو گیا ہے۔ وہ رعونت سے بولے: ہمیں ان کی تلاش ہے، ہم انھیں دیکھنا چاہتے ہیں اُن کے تصور کو، انھیں اُس وقت پتہ چلے گا جب ہم اُن کی بیڑیوں تک کو اندھا کر دیں گے۔ میں انھیں ان کی لاعلمی کا یقین دلاتا رہا، میری عاجزی سے وہ کسی قدر نرم پڑے، ایک دوسرے سے اشاروں میں کچھ کہا اور چلے گئے لیکن چلتے چلتے کہہ گئے ہیں کہ ان کے آنے کی اطلاع پولیس یا محلے والوں کے کانوں میں نہیں پڑنی چاہیے ورنہ اپنی ذلت کا میں خود ذمے دار ہوں گا اور وہ یہ بھی کہہ گئے ہیں کہ اگر انھیں بعد میں پتہ چلا کہ میں نے اُن سے کچھ پردہ پوشی کی ہے یا جھوٹ بولا ہے تو وہ دوبارہ آئیں گے اور دوبارہ اس طرح واپس نہیں جائیں گے اور اگر اس دوران میں نے کہیں روپوش ہونے کی کوشش کی تو میں جہاں کہیں بھی ہوں گا دنیا کے آخری کونے تک وہ مجھے ڈھونڈ لیں گے۔ منیر علی کی آنکھوں سے جھر جھر آنسو بہنے لگے۔

"بڑی گڑبڑ ہے بڑے صاحب۔" جمیل اُٹھ کے اُن کے پہلو میں بیٹھ گیا اور کھوئے کھوئے لہجے میں بولا: "آپ نے یہ سب بتا کے ٹھیک کیا۔ ہم وقت پر پہنچ گئے۔ اُن کو کوئی دھوکا ہو گیا ہے۔"

"دھوکا؟" منیر علی کی آواز بھرا گئی۔ "یہ کیسا دھوکا ہے؟"

"ہو سکتا ہے وہ جو لوگ آپ سے ملنے آئے تھے اب ہم خود ادھر آ گئے ہیں تو آپ ایسا کریں ہم کو اُن کے سامنے کر دیں، اُن کا شبہ دور ہو جائے گا۔"

"بات اتنی آسان نہیں ہے جتنی آسانی سے آپ کہہ رہے ہیں۔" منیر علی نازاں سے بولے: "انھیں آپ کے پہنچنے کی ضرورت کیوں پڑ گئی، کسی غلط فہمی کی وجہ سے؟ مگر کیا اس طرح اُن کی غلط فہمی دور ہو جائے گی؟ کیا انھوں نے آپ کو پہلے کہیں دیکھا ہے جو سامنا ہوتے ہی وہ آپ کو پہچان لیں گے کہ آپ وہ نہیں ہیں جو انھیں مطلوب ہیں، آپ کیسے ثابت کریں گے؟"

"ثابت ہو جائے گا اس لیے کہ ہم وہ نہیں ہیں۔"

"یہ تو آپ مجھ سے کہہ رہے ہیں، جب تک آپ ثابت کریں گے۔" بھلا کیا کریں جب انھوں نے اپنے چہرے مجھ سے چھپائے ہوئے تھے لیکن ان کی آنکھوں، آواز اور اطوار انداز سے میں اُن کی اُفتادِ طبع کا اندازہ اچھی طرح کر سکتا تھا، وہ خون پیاسے لوگ ہیں، میں ایک خاندانی آدمی ہوں، عزت اور بات بڑھنے کو کسی اُلجھن میں پڑنا نہیں چاہتا، میری جگہ کوئی بھی ہو گا تو یہی چاہے گا۔ میں آپ کو مشورہ دوں گا بلکہ درخواست کروں گا کہ آپ فوراً یہاں سے چلے جائیے، میری سمجھ میں یہی آتا ہے۔"

"ہم آپ کو اس حالت میں چھوڑ کے کیسے چلے جائیں۔"

"چلے جائیے، میرے ساتھ خدا ہے جو سب دیکھ رہا ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے بڑے صاحب! مجھ کو اللہ نے ہی تم کو سمجھانے … آپ گھبراؤ نہیں، وہ لوگ دوبارہ آئیں گے تو ایک دو دن ان کا شک نکل جائے گا، سب بات ٹھیک ہو جائے گی۔"

"لیکن یہاں میری عزت کا کیا ہو گا، شین نہیں۔" منیر علی نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے: "یہاں سے چلے جائیے ورنہ ایسا ہی ہے تو مجھے اپنا پتہ دیتے جائیے، میں انھیں بتا دوں گا۔ وہ آپ کو ڈھونڈ لیں گے اور اپنی تسلی کر لیں گے۔"

"آپ اپنے گھر میں نہیں رہنے دو گے تو ہم نہیں رہیں گے لیکن … بولتے ہیں ابھی ہمارا ادھر رہنا ٹھیک ہے جیسے آپ جانتے ہیں … اپنا شک دور کرو، پھر ٹھنڈے دل سے سوچ کے بولو کہ ہمارا آپ کو چھوڑ کے جانا ٹھیک ہے یا آپ کے ساتھ ادھر رہنا؟"

"میں آپ پر کوئی شک نہیں کر رہا ہوں نہ کرنا چاہتا ہوں لیکن ساری بات میں نے کہہ دی ہے۔ آپ خود سوچیے … آپ گئے اور آپ سے رانا کے متعلق بات ہوئی اُدھر وہ لوگ پہنچ گئے … اُن کی نظر سیدھی میرے گھر کی طرف کیوں آئی؟"

مجھے توقع تھی کہ منیر علی جلد یا بدیر یہ سوال کریں گے۔ انھوں نے … کی رسمیں مہمان کسی گھر میں آتے جاتے ہیں … اُن کے جانے کے بعد … کوئی انھیں اس طرح پوچھتا ہوا نہیں آیا تو … مجھے جمیل کا جواب جاننے کی … منتظر تھی۔ منیر علی مجھ سے یہ سوال کرتے تو میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ جمیل کا چہرہ دھندلانے لگا مگر وہ دھیمی آواز میں بولا: "آپ کھل … نہیں بول رہے بڑے صاحب، ہم بھی جانتا ہوں آپ کا مطلب کیا ہے … میں آپ کی بات کا جواب ابھی نہیں دے سکتا، آپ کے پاس پولیس … آئی تھی اور ہم دونوں آئے تھے اور جس طرح آئے تھے وہ آپ کو پتہ ہے … ابھی اُن کو خبر نہیں ہے … ہو سکتا ہے … ابھی آدمیوں میں سے ہوں جو مولوی صاحب اور لوگ کو لے گئے تھے … بہت سی ایسی جگہوں پر بھی گئے ہوں گے جہاں جہاں رانا نے اُن سے … لیکن اُٹھوائی ہوں گی، ادھر بھی آ گئے اور یہاں محلے میں آ کے آپ کو پتہ چلا … کیونکہ ان پہلے دو دنوں میں لوگ مولوی صاحب کو پوچھتے ہوئے آئے تھے … آپ کے گھر ٹھہرے تھے۔"

"مگر آپ … آپ اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہیں کہ …" … ہی کے لیا تھا۔ منیر علی کپکپاتی ہوئی آواز میں بولے۔

"ہم آپ بھی خوب سمجھتے ہو، پھر وہ آپ کے پاس نہیں آ سکتے … آپ کہتے ہو کہ انھوں نے آ کے آپ سے رانا کا نام لیا تھا۔"

"پھر آپ خود ہی اپنی تمام باتوں کی تردید کر رہے ہیں۔"

"لیکن میں یہ بھی بول رہا ہوں کہ وہ کسی ایک جگہ نہیں گئے ہوں گے … انھوں نے اور بھی بہت سے گھر گھیرے ہوں گے، یہاں بھی آ گئے …

کا رانا اپنے شک پر پانی ڈالنے کے لیے ہے، کہ آپ اپنے بچنے کے لیے اتفاق بھی کر سکتے ہو۔"

"میرا دماغ پھٹ جائے گا، چند دن پہلے رانا کے سلسلے میں مجھے بلبل کا آپ کے سامنے زبان کھولنا، رانا کا اپنی آنکھیں کھو دینا، اُن کا یہاں آنا اور آپ کو پوچھنا، سب کتنے عجیب اتفاقات ہیں۔"

"بہت عجیب ہیں بڑے صاحب۔" ذرا دیر خاموش رہ کر جمیل اشتعال سے بولا: "اسی لیے میں بولتا ہوں کہ ہم کو ادھر ہی رہنے دو، وہ پھر آئیں تو ہماری طرف انگلی اُٹھا دینا، میں اور کیا کہوں۔"

جمیل نے منیر علی کو سمجھانے کی ہر طرح کوشش کی، کسی حد تک کامیاب بھی ہو گیا۔ منیر علی چپ ہو گئے مگر اُن کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ میں جانتا تھا، اُن کی خاموشی چند لمحوں کی ہے، اس جہان رنگ و بو کے دماغ میں کسی بھی لمحے یہ بات آ سکتی ہے کہ وہ ہم نہیں ہوں گے تو رانا کے ساتھی ہوں گے، یا تو ایک ہی شخص کوئی مسلسل کھیل رہا ہو گا۔ ابھی انھیں یہ معلوم نہیں تھا کہ جس رات رانا کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا، اس کی حویلی میں رستم خاں کے ہاں وہ دونوں بیٹھے تھے، جو اس رات کے بعد حویلی میں نظر نہیں آئے۔ وہ اپنا تھوڑا بہت سامان بھی چھوڑ گئے مگر منیر علی کے پاس آنے والے آدمی انھیں بھی بتا چکے کہ رستم کے وہ دونوں مہمان حویلی سے غائب ہیں تو پھر منیر علی کو یقین دلانا جانے کتنا مشکل ہو جاتا کہ وہ کوئی اور لوگ تھے، ہم نہیں تھے۔ لیکن جلد ہی کسی نہ کسی وقت یہ بات منیر علی کو معلوم ہونی تھی۔ ابھی صرف دو دن گزرے تھے، سب کچھ تھا اور واقعہ ایسا ہے جیسے آدمی کا خیال اب بھی طرح طرح کی افواہیں پھیلی ہوئی ہوں گی۔ حویلی میں بہت سے لوگوں کو یہ اور اُن کی آمد کا پتہ تھا۔ پولیس کو بھی انھی دو آدمیوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہو گا مگر حویلی کے رہنے والوں کو یہ علم نہیں تھا کہ رستم خاں کے وہ دو معزز مہمان مولوی صاحب اور گوہر سے کوئی وابستگی رکھتے تھے اور اسی بنیاد پر انھوں نے رانا کو آنکھوں سے محروم کر دیا۔ رستم نے یہ بات عام نہیں کی ہو گی کہ اُس کے ہاں مخبر رانا کا بات جاننے کے لیے آئے تھے۔ وہ یہ بات بتا دیتا تو مولوی صاحب اور گوہر کی گمشدگی کے حوالے سے سارا شہر باخبر ہو جاتا اور رانا کی رسوائی کا سلسلہ جاری رہتا۔ ساتھ ہی رستم اور اُس کے ساتھیوں کو پریشانی کا سامنا ہو جاتا، اس لیے بھی اُسے یہ کسی کو نہیں بتانا تھا کہ اسی نے اس بات مولوی صاحب اور گوہر کو جانے دیا تھا۔ اس راز سے صرف اس کا شاگرد سہراب واقف تھا۔ رستم خاں کے اشارے بھی یہ یقین کرنا چاہیے تھا کہ اس کے یا مخبر نے لا کے لوگوں نے مولوی صاحب اور گوہر کا کوئی ذکر اس سے کیا خاص حویلی کے تمام لوگوں کی طرح حیرت کا اظہار کر دیا ہو گا لیکن یہ حقیقت خود اس کے سینے پر بوجھ بنی ہو گی کہ اُن دو آدمیوں کے سوا یہ کام کسی کا نہیں ہے۔ رستم کو بہ خوبی علم ہے کہ ذریعہ بنا ہو گا کہ جن مہمانوں کو اس نے اپنے پرانے ساتھی کے کہنے پر حویلی کے لوگوں سے ملایا تھا وہ کون تھے اور اچانک

کہیں چلے گئے۔ اُن سے اُس کی کب سے شناسائی تھی۔ رستم اپنی لاعلمی پر سب سے زیادہ شک کا وقت دیتا ہو گا، حالانکہ حویلی میں کسی کی ذات تک اور قصبے سے بالا تھی۔ ہو سکے، آس کے خاص مراسم نہ تھے، چھپے نہیں تھے۔ اُس نے پولیس اور حویلی کے تمام لوگوں سے اپنے مہمانوں کے متعلق اُلٹ سلٹ باتیں کہی ہوں گی، کیا ہو گا، آگے پیچھے نہیں آ کے، ایسا انھوں سے کہا اور اگر واقعی انھوں نے کیا ہے تو اُسے بہت بڑا دھوکا ہو گیا، وہ اسے زیب دے گئے۔ اُس رات انھوں نے اُسے غافل پایا تھا، ممکن ہے اُس نے پولیس کو بھی اور بیرونی کوئی نشان پتہ بھی دے دیا ہو، کسی دوسرے مقام کا پتہ کہ پولیس انھیں ڈھونڈتی رہے۔

بیتی شہر دور نہیں تھا لیکن رستم خاں کی جھلک اور میری یہ حکمت جو تھیں بیچ سکتی تھی، ایک ہی جملے۔ میرا ایک بچا ہوا تبصرہ … رستم کے دائرے میں آئی ہو گی کہ منیر علی کو کریدا جائے۔ وہ مجھے ہی لاوارث صاحب کے سب سے قریب رفیق تھے اور انھی کے ذریعے رانا نے مولوی صاحب کو کسی طرح بھجوایا تھا۔ رستم خاں کے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ حویلی میں نے کے پہلے پیر اور باپ کی کو منیر علی اور دوسرے محلے والوں سے راز نہ رکھا ہو ضبط ہو گیا اور منیر علی نے اُن سے رانا کے سلسلے میں اپنے قصبے کا اظہار کیا ہو گا۔ منیر علی ہی اُسے ملنے کے آداب بتائے ہوں گے، انھی سے یہ معلوم ہو سکتا تھا کہ وہ لوگ کہاں سے آئے تھے، انھیں کہیں سے کوئی اطلاع حاصل کیا تھا یا وہ مولوی صاحب کے بچھڑے ہوئے عزیز تھے۔ رستم اس بات کو وہ اکیلا یہ سب کچھ نہیں کر سکتا۔ اس نے یہ سمجھ لیا تھا کہ ہر وار اُس کے ہاتھ کیسی بکھرتی ہے، جمیل کے بقول یار اُن کی آنکھیں کے ارادے پر ناچتا تھا، اُس کی آنکھیں میں ختنے جلیس لگا رہا تھا، جو مار چکا تھا، لگتا تھا اور دوسرے کو چاقو کھینچ لیا تھا۔ ان انکیوں دور کرنے کے لیے رستم کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا ہو گا کہ وہ اپنے شاگرد سہراب کو یہ بات بتائے، ہو سکتا ہے رستم کو پولیس نے اپنی تحویل میں لے لیا ہو یا اپنی ہی حویلی میں اُس کی کڑی نگرانی کی جا رہی ہو، ایسی حالت میں اُس کا حویلی سے باہر نکلنا بھی مناسب نہیں تھا۔ وہ سہراب اور اس کا کوئی دلی اعتماد ساتھی ہو گا، جو منیر علی کے گھر میں چوروں کی طرح داخل ہوئے تھے۔ یہ رستم اور سہراب جیسے رانا کے تمام ملازمین کے لیے اپنے مالک سے وفاداری اور جاں نثاری دکھانے کا وقت تھا، وہ دو دن کس لیے تھے، کس کی آنکھیں نکل جانے کا انھیں اتنا ہی صدمہ ہو گا جتنا کسی کے پیار اندیشہ کر سکتا ہے۔ رانا کی بہت سی باتیں بہت سے لوگ انھیں پسند نہیں تھیں مگر کوئی بھی یہ نہیں چاہتا ہو گا کہ رانا کو ایسی سزا ملے۔ اُن کے دل میں آگ لگ گئی ہو گی۔ بہ ظاہر اس وجہ سے کہ سب کچھ اُن کے ہوتے ہوئے ہو گیا، وہ اُن دونوں آدمیوں کو ڈھونڈنے کے لیے بے چین ہوں گے، اُن کا چین اُسی وقت بحال ہو سکتا ہے جب وہ کہیں سے رانا کے پیروں میں ڈال

"زبیر کا ارادہ ہے کہ نام بھر دیں اور اسی سال امتحان دے دیں۔"

میں کیا کہتا۔ میں نے کہا: "بہت اچھا ہے۔"

"لیکن... لیکن کورس بڑا ہے۔" زریں سنجیدگی سے بولی: "کیا یہ ممکن ہو گا کہ ایک سال میں یہ ساری تیاری مکمل کر لیں؟"

میں نے مسکرا کے جواب دیا: "یہ تو اس پر منحصر ہے کہ کورس کیا ہے اور آپ کتنی جلدی گرفت میں لیتی ہیں۔" میں استعداد کہنا چاہتا تھا لیکن میرے منہ سے نہیں نکلا۔

زریں میری بات سمجھ گئی اور زہرہ کی جانب تکتی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بولی: "زہرہ ماشاءاللہ بہت پڑھی لکھی ہیں لیکن کورس میں حساب وغیرہ بھی تو شامل ہے۔ میرا خیال ہے پہلے ان کا ایک امتحان لے لیا جائے؟"

"بہت اچھا خیال ہے۔"

"سنا ہے نام جانے کا وقت قریب ہے۔"

"مجھے معلوم نہیں۔" میں نے تذبذب سے کہا۔

"جہانگیر کے ماسٹر صاحب بتا رہے تھے۔"

"انہی سے صحیح معلوم ہو گا اور وہی ان کا امتحان بھی لیں گے۔"

"مگر کچھ مدد تمہیں بھی کرنی ہو گی۔" زریں فیصلہ کن لہجے میں بولی: "کبھی وقت نکال کے زہرہ کو پڑھا دیا کرو۔"

"میں! — زریں! میں تو.... میں نے کبھی کسی کو نہیں پڑھایا۔ میں تو جیسے سب بھول گیا ہوں۔" میں نے بے چینی سے کہا: "اتنی مدد تم بھی کر سکتی ہو۔"

"میں تو کروں گی ہی گھر میں بھی کریں گے۔ ارشد بھائی سے بھی میں نے وعدہ لے لیا ہے۔ تنویر صاحب آئیں گے تو ان سے بھی کہا جائے گا۔ زہرہ کو پڑھنے لکھنے سے بہت دلچسپی ہے۔"

"جو کچھ مجھ سے ہو سکے گا۔ میں بھی کروں گا۔"

"میں یہی کہنا تھا۔ زہرہ! تم خود کیوں نہیں کہتیں؟"

زہرہ کا چہرہ سرخ ہو گیا: "میں کیا کہوں۔" وہ شرماتے ہوئے بولی۔

"تم بھی زریں بس کمال ہو، کیا تمہاری بات یہ ٹال سکیں گے؟"

"ہی ہی!" زہرہ نے اپنا چہرہ سینے میں چھپا لیا۔

لیکن زہرہ نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ وہ اپنے دامن سے ہاتھوں پہ منہ چھپائے بیٹھی رہی۔ زریں اٹھی تو وہ بھی ہڑبڑا کے کھڑی ہو گئی۔ میں نے سوچا بھی کہ کچھ دیر کے لیے انہیں روک لوں لیکن وہ دروازے سے باہر نکل گئیں۔ میں ارادہ ہی کرتا رہ گیا۔

دوسرے دن رات کو میں اپنے کمرے میں لیٹا ہوا کتاب پڑھ رہا تھا کہ دروازے پر کسی نے دستک دی۔ دروازہ کھلا ہی ہوا تھا۔ زریں ہوتی تو میں اس کی آہٹ فوراً پہچان لیتا۔ وہ ہر رات کو دودھ کا گلاس میز پر رکھ جاتی تھی لیکن اس رات بہت دیر ہو گئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں دودھ کا گلاس تھا۔ میری آنکھوں پہ ایک لمحے کے لیے دھند سی چھا گئی۔ وہ دروازہ پیٹتے ہوئے تھی۔ سر پر آسمانی دوپٹہ تھا اور وہ زہرہ ہی تھی۔ مجھے کچھ کہے سے پہلے وہ اندر کمرے میں آ گئی اور گلاس میز پر رکھ کے واپس جانے لگی۔ "زریں کہاں ہیں؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"ان کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔" زہرہ دھیمے لہجے میں بولی۔

"کیا ہو گیا؟ کھانے کے وقت تو وہ بالکل ٹھیک تھیں؟"

"کھانے کے بعد ہی شاید طبیعت کچھ بگڑ گئی۔" زہرہ کی آواز میں لرزش تھی۔

"کچھ زیادہ خراب تو نہیں؟"

"نہیں کوئی ایسی پریشانی کی بات نہیں۔ کہہ رہی تھیں سر میں درد ہے اور دل گھبرا رہا ہے۔" زہرہ ٹھہر ٹھہر کے بولی۔

"کوئی دوا وغیرہ دی؟"

"میں نے سر کی مالش کر دی ہے اور گلاب کا عرق پلا دیا ہے۔ اب پہلے سے بہتر ہیں۔ یہ دودھ رکھا ہے۔" وہ واپس پلٹتے ہوئے بولی۔

"زہرہ—" وہ دروازے پر پہنچ گئی تھی میری آواز سن کے رک گئی۔ مجھے خود حیرت ہوئی کہ میں نے اسے کیوں آواز دی ہے۔ اس نے مڑ کے ایک نظر مجھے دیکھا اور جھجکتے ہوئے دروازے ہی پر کھڑی رہی۔ "کچھ دیر کے لیے ٹھہر جائیے۔" میں نے عاجزی سے کہا: "آپ کو جلدی تو نہیں ہے؟"

"انہیں سر دبانے میں دیر ہو گی۔"

"مجھے آپ سے ایک بات پوچھنا ہے۔ اندر آ کے بیٹھ جائیے۔"

اس کے سامنے ہلکی سی ایک کرسی رکھی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی کرسی پر سمٹ کے کسی بت کی طرح بیٹھ گئی۔

"آپ کو یاد ہو گا" میں نے اپنا حلق تر کرتے ہوئے کہا: "وہاں گھر میں میں نے آپ سے کچھ کہا تھا۔ کیا آپ کو یاد ہے؟"

وہ تیز تیز سانس لے رہی تھی۔ جسم کا سارا خون جیسے چہرے پر جم گیا تھا۔ سینہ تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے یکبارگی سر اٹھا کے پھر جھکا لیا۔

"یاد ہے نا؟" میں نے لرزیدہ آواز میں پوچھا۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"سنا ہے آپ کا مولوی صاحب کے گھر ہر وقت کا آنا جانا تھا۔ وہ بظاہر تو دو گھر تھے لیکن لگتے ایک ہی۔ مولوی صاحب آپ کو اپنی بیٹی ہی سمجھتے تھے اور آپ نرگس کی سہیلی تھیں۔"

اس کی پلکیں تھرتھرانے لگیں۔ "جی!" اس نے زیر لب کہا۔

"بڑے صاحب سے ان کے بارے میں کچھ معلوم ہوا ہے مگر آپ شاید ان سے زیادہ جانتی ہوں۔ میں آپ سے منت کرتا ہوں آپ مجھے کچھ بتائیے۔"

"میں کیا بتاؤں؟" وہ سراسیمگی سے بولی۔

"جو کچھ بھی آپ جانتی ہوں۔ شاید آپ کے لیے یہ بات حیرت انگیز ہو

گی کہ مولوی صاحب ایک طرح تمام دنیا سے قطع تعلق کر کے گوشہ نشین کیوں ہو گئے تھے۔ وہ پہلے کہاں تھے اور وہاں کیوں آ گئے تھے؟"

"وہ مجھ سے بہت کم بات کرتے تھے۔"

"لیکن نرگس تو آپ سے ہر وقت باتیں کرتی ہو گی۔ اس نے آپ سے بہت کچھ کہا ہو گا۔ آپ اس کی رازدار سہیلی تھیں۔ ممکن ہے اس نے آپ کو کوئی قسم دلوائی ہو یا آپ اپنے اور اس کے درمیان ہونے والی باتیں دہرانا مناسب نہ سمجھتی ہوں یا آپ کو کوئی اور جھجک ہو۔ یہ قسم توڑ دیجیے۔ آپ کو اسی کی قسم ہے، میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ یہ سب میرے سینے ہی میں دفن ہو جائے گا۔ آپ کسی جھجک کے بغیر سب کچھ بتا دیں۔ مجھ پر بھروسا کریں۔ یقیناً آپ کو یہ اچھا نہیں لگتا ہو گا مگر اس لیے ضروری ہے کہ شاید نرگس کی بھلائی کا کوئی پہلو نکل آئے اور آپ کی کسی بات سے اس کی تلاش میں مدد مل سکے۔ کوئی ایسی بات جو آپ اطمینان کر کے بھی نہ بتا سکی ہوں؟"

"میں آپ سے کچھ نہیں چھپاؤں گی۔"

"یہ آپ کا احسان ہو گا۔"

"آپ یہ مت کہیے۔" وہ اداسی سے بولی۔

"میں آپ کو ہر طرح سے یقین دلانا چاہتا ہوں۔"

"آپ مجھے آپ آپ کیوں کہہ رہے ہیں؟"

"اوہ نہیں یوں ہی۔" میں نے خفت سے کہا: "یہ میری غلطی ہے۔"

"مجھے بہت ذلت ہوتی ہے۔"

"تو اب نہیں کہوں گا۔"

زہرہ کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے اور ہونٹوں پر ہلکی سی لرزش تھی جیسے سانس رک رہی ہو۔ "بڑے ابا (مولوی صاحب) سے میری کوئی بات نہیں ہوتی تھی، بس سلام دعا۔ مجھے دیکھ کے کبھی وہ میری خیریت پوچھتے اور کبھی کسی کھانے کی فرمائش کرتے تھے۔ میرے ہاتھ کے شامی کباب انہیں بہت پسند تھے۔" زہرہ کی آواز بھرانے لگی۔

"اور نرگس؟" میں نے جلدی سے کہا۔

"نرگس تو ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے رہتی تھی۔ ہم دونوں کا دل ایک دوسرے کے بغیر نہیں لگتا تھا۔ کبھی مجھے ذرا سی دیر ہو جاتی تو وہ کھڑکی پہ آ کے مجھے آوازیں دینے لگتی... اس نے مجھے بھی کچھ نہیں بتایا۔"

"کچھ نہیں بتایا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"جی ہاں، وہ اپنے بارے میں کچھ نہیں بولتی تھی۔"

"پھر تمہاری اس سے کیا باتیں ہوتی تھیں؟" میں نے تند لہجے میں کہا۔

"سمجھ لو کیسی باتیں۔ تمام دنیا کے قصے کہانیاں۔"

"تین سال سے وہ سہیلی تھی۔ تین سال میں تم نے کبھی اس سے نہیں پوچھا کہ وہ کون ہے، کہاں سے آئی ہے۔ اس کے بارے میں یہ سب جاننے کی تمہیں جستجو نہیں ہوئی؟"

"شروع شروع میں میں نے یہ جاننے کی کوشش کی تھی۔ کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ وہ اس ذکر پہ اداس ہو جاتی تھی بلکہ رونے لگتی تھی۔ ایک دن اس نے کہا تھا کہ سب چھوٹ گئے۔ اب شاید کوئی نہیں۔ وہ لوگ بچھڑ گئے۔ ان کے ذکر سے کیا حاصل۔ پھر ہمیشہ مجھے ٹوک دیتی تھی کہ "میں اب کچھ نہیں کہوں گی" وہ رونے لگتی تھی۔ پھر کبھی کبھی اس کے منہ سے نکل جاتا تھا۔ ایک دن اس نے مجھ سے ہاتھ جوڑ کے کہا "زہرہ! مجھ سے کچھ مت پوچھا کرو۔ مجھے کچھ یاد نہیں۔" بس پھر میں نے اپنی زبان بند کر لی۔"

"لیکن محلے والے گھر میں آنے والے دوست لڑکیاں تم سے سوال کرتے ہوں گے۔ انہیں وہ کیا جواب دیتی تھی؟"

"آنے والے طرح طرح کے سوال کرتے تھے۔ تمہاری ماں کہاں ہیں؟ کوئی بہن بھائی ہے یا نہیں؟ تم کہاں کی ہو؟ اس کا ایک ہی جواب تھا کہ میرا کوئی نہیں ہے، اماں بچپن میں مر گئیں، بہن بھائی کوئی نہیں ہے۔ اس نے بتایا تھا کہ ان کا تعلق کبھی مراد آباد شہر سے تھا لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہ مراد آباد اسے یاد نہیں ہے اور وہ مختلف شہروں میں رہے۔ مختلف شہروں کے نام ان کے سامنے لے دیتی۔ لوگ اس سے جب اس کا اظہار کرتے اور ایک بات کے بعد دوسری بات پوچھنے لگتے۔ وہ کبھی ٹال جاتی، کبھی بات بنا دیتی۔ کوئی بہت کرید کرتا تو تنگ آ کے کہتی "مجھے کچھ نہیں معلوم۔ بابا سے پوچھ لو۔" مجھے احساس تھا کہ یہ ذکر اس کے لیے تکلیف دہ ہے اس لیے میں بھی اپنی طرف سے ادھر ادھر کی باتیں کر کے لوگوں کا رخ بدلنے کی کوشش کرتی تھی۔ میں نے محلے کی بی بی سے کہہ رکھا تھا کہ وہ اس کی ماں بھائی عزیزوں اور گھر وغیرہ کے متعلق اس سے کچھ نہ پوچھا کریں۔ اسے کوئی بڑا صدمہ پہنچا ہے۔ اس ذکر سے وہ پرانی باتیں یاد آنے لگتی ہیں، ان کا بھول جانا ہی اس کے لیے اچھا ہے۔ لیکن لوگوں کی زبان کون روک سکتا ہے؟ وہ اس کے سامنے کوئی نہ کوئی ایسی بات کہہ ہی دیا کرتے تھے۔" زہرہ سسکنے لگی۔

میں نے چند لمحے انتظار کیا۔ وہ چپ ہو گئی تھی اور دوپٹے کے پلو سے آنکھوں کے گوشے صاف کر رہی تھی مگر آنسو اس کی آنکھوں میں امڈے ہی چلے آتے تھے۔ "مجھے کچھ اور بتاؤ۔" میں نے اضطراب سے کہا۔

"اور کیا بتاؤں؟" وہ شکستہ آواز میں بولی۔

"تم نے اتنے دن اس کے ساتھ رہتے سہتے اپنے طور پر بھی کچھ اندازہ کیا ہو گا۔ کیا اس نے تم سے کبھی بھولے سے بھی اپنے گھر یا رشتے داروں کا بھی ذکر نہیں کیا؟"

"کبھی نہیں کیا۔" وہ سسکتے ہوئے بولی۔ "وہ ہمیشہ کھوئی کھوئی رہتی تھی۔ ہر وقت گم صم، کچھ نہ کچھ سوچتی ہوئی۔ بادل اس کی کھوئی کھوئی ہوئی ذات سے الگ تھلگ خاموش۔ ذرا سے کھٹکے پر چونک جاتی اور قریب سے کوئی گزرتا تو یہی ہوتا جیسے بھاگ جائے۔ کسی سے ملنا پسند نہیں تھا لیکن جو کوئی آتا تھا اس سے خوش اخلاقی سے ملتی تھی۔ جب ہم اس کے گھر میں بیٹھی ہوتیں اور کوئی آ جاتا تو وہ

دوسرے کے سامنے بیٹھے ہیں۔ راجا ڈارلنگ! ابھی کوئی ایسا داؤ چلاؤ کہ
ایک ہی مجھی تمھارے پاس سے نہیں جا سکے۔ کا وہ جانتا ہے کہ اور تمھارے
جانے کے بعد ایک ہوسٹل کے بچے بھی اپن کا دل نہیں لگا۔"

میں صرف سر ہلا کے رہ گیا۔ ممتا بھی اُس کی ہاں میں ہاں ملا رہا
تھا اور اپنے چھوٹے ہاتھوں سے میرے شانے دبا رہا تھا۔ "تم نے
کرن کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا راجا؟" مجھے چپ دیکھ کے مارتی متعجب
سے بولا۔ وہ دولہن کو شروع ہی سے کرن کہتا تھا۔

"ٹھیک ہی ہوگی مارتی!" میں نے بجھی ہوئی آواز میں کہا۔

"ہاں کرن ویسے آل رائٹ ہے راجا! ایک دم پرفیکٹ۔" مارتی چہل
لہجے میں بولا۔ "پر سائیلنٹ رہتی ہے۔ وہ تم اُس کو دیکھے ... تو دیکھنے
جاتا ہے۔ کرن اپنا بہت ریگارڈ کرتی ہے۔ اپنے ہاتھ سے روز چائے
پلاتی ہے اور ... اور وہ ...."

"اور ممیا کا کیا حال ہے؟" میں نے اُس کی بات کاٹ کے پوچھا۔

"وہ اپن کی ممد کے ماتق ہے۔ اُودھر اپنی دوندہ ہے۔ ایک کرن
کی ممد دوسری چھپا۔ میں اور ممتا ... اُودھر جاتا ہے تو وہ گھر میں اندر
بلا کے بٹھاتا ہے اور ڈز تمھارے لیے پوچھتا ہے۔ پر کرن نے کبھی اپن
سے ایک دو ڈز نہیں بولا۔ ہم سمجھتا ہے راجا! اُس کی آنکھ اپن سے پوچھتا
ہے اور اپن روز جھوٹ بول دیتا ہے کہ راجا کا خبر آیا ہے وہ سفر میں ہے
اور بالکل فٹ فاس ہے۔ کرن جانتا ہے کہ اپن جھوٹ بول رہا ہے۔
پر اپن اور کیا بولے؟"

"وہ اسکول پڑھانے جاتی ہے؟" میں نے بے دلی سے پوچھا۔

"ڈیلی۔ پر اسکول سے آ کے گھر میں بند ہو جاتی ہے کہیں اور نہیں
جاتی۔ اپن نے کتنا ٹائم بولا کہ کرن کو باہر نکالو، گھر میں بیٹھے بیٹھے سالا
زنگ لگ جائیں گا۔ اُودھر اُس کا مام کرن چرچ بھی نہیں گیا۔ ...
بھاپن اُنھی رات اُس کے گھر پہ رہا۔ کرن نے کپڑے بھی نہیں پہنا۔ اپن اس
دن پہلی بار کرن سے ڈرتے ڈرتے بولا کرن! مارتی کو بولو دھات از
دی میٹر؟ مارتی تمھارا اسٹیو ہے۔ ... کر کے اپنے اُودھر چلا گیا۔ کیسا
اچھا لگتا ہو راجا! اپن سے ... پوچھا کہ مارتی کو جاتو مار کے چلا گیا ہے
مارتی کے منہ پر تھوک کے چلا گیا ہے۔ ممتا بھی اپن کے ساتھ تھا۔ بولو ممتا
ماسٹر ایسا تھا کہ نہیں؟" ممتا درمیان میں لقمے دیتا رہا۔

میں نے اپنے کان بند نہیں کیے۔ جو وہ کہتے رہے سنتا رہا۔ قیس
نے دہانے کے بعد ہی کہیں رنگ دیا تھا۔ جب خانم زیبا اور منیر علی کا
سارا گھر حویلی میں سما سکتا تھا تو دولہن وہاں کیوں نہیں آسکتی تھی۔ حویلی میں
ان سب کو اکٹھے بیٹھا دیکھ کے کتنی ہی بار مجھے اُس کا خیال آیا تھا۔ زیبا سے
اُس کی خوب بنتی۔ وہ زیبا ہی کی طرح نیساں خانم اور زہرہ کے آنے سے خوش
تھی۔ دولہن سے مل کے بھی بہت خوش ہوتی۔ مجھے معلوم تھا کہ مارتی اُس
کے بارے میں اسی طرح کی باتیں کرے گا۔ وہ جیتے چلے جب زبان ...
بمبئی بھر میں ملا تھا اُس نے اتنا کچھ نہیں بتایا تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے ...
کیسی ہوگی۔ اس نے گرفتاری کی وہ رقم بھی لوٹا دی تھی جو میں نے اُسے
چلتے وقت دی تھی۔ مجھے سب اندازہ تھا لیکن مارتی کی زبانی
کا ذکر سن کے میرا دل ڈوبنے لگا۔ میں نے مارتی کو کوئی جواب نہیں
دیا۔ میرے ذہن میں اس کا ایک ہی جواب آیا تھا کہ آج بابل ... کسی دن تو ...
ضرور تم لکھوں گا۔ اب مارتی وہاں سے چلا آیا ہے۔ وہ سوالات
بھی خود بخود حل ہو جاتی ہوگی۔ مارتی کے دل زنا جانے سے کم از کم آئے
تنہائی محسوس نہیں ہوتی ہوگی۔ دولہن کو چھوڑ دی آنکھوں میں گھومتی رہی ...
مارتی اور ممتا دیر تک اُسی کی باتیں کرتے رہے۔

کانٹے مجھے پکاتا ہوا اُدھر گیا اور تم تینوں کو جا ...
کمرے میں لے آیا۔ دو لوگ بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ جیل پیرو، باجی ...
اور جا ہر سامنے دیوار سے کمر ٹکائے ہوئے اُن کے آگے تھے ...
مٹھائی کا ایک بڑا ڈبا رکھا تھا اور چائے کی پیالیاں تھیں۔ شراب اور ...
نوکری سے دو نے اٹھا اٹھا کے لوگوں میں تقسیم کر رہے تھے۔ جیل ...
پیرو کے سامنے آگ سنگانی کا ایک گلاس موجود تھا۔ کمرے میں ...
جری ہوئی تھیں اور ہر شخص اپنی اپنی بولی بول رہا تھا۔ میں نے پیچھے
بیٹھنا چاہا لیکن پیرو نے آواز دے کے مجھے اپنے پاس بلایا اور ...
گردن میں ہاتھ ڈال کے جیل کو بمبئی کا حال سنا رہا۔ میرا خیال تھا کہ ...
کے کھانے سے پہلے اُن میں سے کوئی نہیں اٹھے گا لیکن مٹھائی ختم ...
اور چائے پینے کے بعد جیل رفعتاً اُٹھ کھڑا ہوا اور پیرو کو لے کے ...
فلیٹ میں چلا گیا جہاں کبھی زیبا ٹھہری تھی۔ اس کا زینہ اوپر ... سے
سے بھی اوپر جاتا تھا۔ جا سر بھی اُن کے ساتھ تھا۔ انھوں نے مجھ سے ...
کو نہیں کہا حالانکہ میں اُن کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ وہ ضرور کوئی ...
کرنے فلیٹ میں گئے تھے۔ قیس آباد میں بیٹھے بیٹھے جیل کا اچانک ...
کا ارادہ کرنا اور پیرو کو بمبئی کے پاڑوں کے آدمیوں کے ساتھ ...
یہ سب نہیں تھا میری سمجھ میں نہیں آیا کہ مجھے بتانے میں کیا حرج ...
قیس آباد سے کلکتے کے طویل سفر کے دوران جیل مجھے کہیں بھی ...
تھا۔ میں نے خاصی دیر اُن کے نیچے آنے کا انتظار کیا۔ وہ نہیں ...
میں نے مارتی اور ممتا کو باہر چلنے کا اشارہ کیا۔

گلی کے نکڑ پر ایک ٹیکسی کھڑی تھی۔ ہم تینوں اس پر ...
گئے۔ ٹیکسی والے نے منزل کا پتہ پوچھا تو میں نے اس سے کہہ دیا کہ ...
جہاں چاہے لے جائے۔ میری جیب میں چند روپے پڑے تھے ...
کلکتے کے بازاروں اور سڑکوں پہ گھومتی رہی۔ ممتا اور مارتی اشتیاق ...
عمارتیں اور دکانیں دیکھ رہے تھے۔ جدھر دیکھو آدمی ہی آدمی نظر ...
تھے۔ میرا مقصد بھی یہی تھا کہ وہ کلکتہ دیکھ لیں۔ پھر شاید فرصت کو ...

جانے کے بعد ایک بیراگی کو گھورنے لگا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے عمارتیں
اور دکانیں گردش سی کرنے لگی ہوں۔ میں نے منڈے کو ایک طرف
ہٹا کے باہر گھوم کے دیکھا۔ ٹیکسی والا مختلف راستوں سے گزرتا ہوا اُس
علاقے میں آ گیا تھا جہاں مولوی صاحب کا مدرسہ تھا۔ سب کچھ وہی تھا۔
گلی میں پہنچ کر بائیں جانب کے مسجد اور مدرسہ تھا۔ میں نے ڈرائیور کا کندھا چھو کے
اُسے روک دیا۔ اگر دیر ہو گئی کار میں بیچھے نہیں اُترا تو مارتی مجھے جھنجھوڑتے
ہوئے پوچھنے لگا "کیا بات ہے راجا استاد؟"

"کچھ نہیں مارتی!" میں نے بڑبڑا کے جواب دیا۔ "کچھ نہیں۔"

"تم نے ایدھر ٹیکسی کو کیوں ہالٹ کر دیا؟"

"یوں ایسے ہی۔"

"راجا۔ یہ تمھارا آنکھ بھرا ہوا ہے۔" وہ بے تابی سے بولا۔

"کچھ نہیں مارتی!" میں نے منہ پھیر لیا۔ "آگے چلو۔"

ٹیکسی والے نے گاڑی اسٹارٹ ہی کی تھی کہ میں نے اُسے پھر
روک دیا۔ "تم ٹھہرو مارتی! میں ابھی آتا ہوں۔" میں جلدی سے اُتر گیا۔

"کیدر؟ کیدر راجا؟"

"میں ابھی آیا۔"

"اپن بھی چلیں گا۔" مارتی بھی باہر اُترنے لگا۔

"نہیں تم یہیں ٹھہرو۔" میں نے اس سے التجا کی۔

"راجا کوئی لفڑے کا بات تو نہیں؟" اُس نے سڑک پہ چاقو نکال لیا۔

"میرے پاس بھی چاقو ہے مارتی!" میں نے تلخی سے کہا۔ مارتی
نے نظریں جھکا لیں۔ میں نے چند لمحوں میں واپس آنے کی تاکید کر کے
بھاگتا ہوا گلی میں پہنچا اور مدرسے کا دروازہ پھلانگ کے سیدھا دفتر میں
داخل ہو گیا۔ سیدی کی ٹوپی اور ... کرتے پاجامے میں ملبوس وہاں
صرف ایک ادھیڑ آدمی بیٹھا تھا۔ مجھے یوں اندر آتا دیکھ کے اُس کے
ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔ "جناب!" میں نے اپنی سانسیں قابو میں کرتے
ہوئے پوچھا۔ "مولوی محمد شفیق کا کچھ پتہ چلا؟"

"مولوی محمد شفیق؟" وہ ذہن پہ زور دیتے ہوئے بولا۔ دوسرے
ہی لمحے اُسے احساس ہو گیا کہ میں بے محل چلا آیا ہوں۔ میں اُس کا
جواب سنے بغیر جانے لگا۔ اس نے ... ہوئے لہجے میں
پوچھا۔ "کیا آپ ... والے مولوی محمد شفیق کو پوچھ رہے ہو؟"

"جی ہاں ..." میں نے تیزی سے جواب دیا۔

"تم اُن کے کون ہوتے ہو؟"

"میری بات کا جواب دیجیے کیا اُن کی کوئی خیر خبر معلوم ہوئی؟"

"... سے بولا۔ "تم شاید ایک بار پہلے بھی آئے ہو؟"

"جی" میں نے ... آواز میں کہا۔ "کیا آپ کچھ جانتے ہیں؟"

"... بہتر جانتا ہے۔"

"وہ کسی کو بھی دکھائی نہیں دیے؟"

اُس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

"اور اُن کا سامان؟"

"جوں کا توں رکھا ہے۔ گل گلا گیا ہوگا۔ میں نے مدرسے کے ناظم
احسان الحق صاحب سے کہا تھا کہ کسی غریب کو دے دیجیے، کسی کے کام
ہی آ جائے گا لیکن وہ بھلے آدمی نہیں مانے۔ تم بتاؤ کہ تم اُن کے کون
ہوتے ہو؟"

"میں اُن کا ایک عزیز ہوں۔" میں نے بے دلی سے کہا۔

"بھلا کیا رشتہ ہوتا ہے آپ کا اُن سے؟"

"کوئی بھی نہیں اور تمام رشتے۔" میں نے شکستہ لہجے میں جواب
دیا۔ وہ حیران نظروں سے میری صورت دیکھنے لگا۔

"تم نے انھیں کہاں کہاں تلاش کیا؟"

"بہت سی جگہوں پر۔"

"برس گزر گئے میاں! آخر تھیں اُن کی اتنی .... صبر کرو۔" وہ کہتا
ہوئے بولا۔ "اللہ کسی نہ کسی دن انھیں ضرور ملائے گا۔" میں اُٹھنے لگا تو
اُس نے مجھ سے چائے پینے کے لیے اصرار کیا۔ "اگر اُن کا کوئی پتہ چلے
تو تمھیں کہاں اطلاع دی جائے؟"

مجھے اُس کی بات عجیب سی معلوم ہوئی۔ "میرا پتہ ..." میں نے رکتے
ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں پھر کبھی آ جاؤں گا مگر .... بہتر آپ مجھے..."
میں نے اُسے اپنا نام صرف بابر بتایا اور پتہ فیض آباد کا لکھوا دیا۔

"خدا کرے کوئی ایسی صورت پیدا ہو جائے۔"

"لیکن .... کہیں آپ مجھ سے کچھ چھپا تو نہیں رہے ہیں؟" میں
نے اچانک لرزیدہ آواز میں پوچھا۔

"لاحول ولا قوۃ۔ میاں کیسی بات کرتے ہو۔"

"مجھے معاف کر دیجیے یوں ہی خیال آ گیا تھا۔" میں نے ندامت
سے کہا اور فوراً وہاں سے اُٹھ کے باہر آ گیا۔ وہ مجھے آوازیں دیتا رہا۔
مجھے وہاں جانا اور اُس کا وقت برباد کرنا ہی نہیں چاہیے تھا لیکن مجھے
کسی کے وقت کی کوئی فکر تھی۔ میں کا وقت ضائع ہو رہا تھا۔ مجھ
کو اور نہ جانے کتنے لوگوں کا۔ جس طرح میرے پاس وقت ہی وقت
تھا میں سمجھتا تھا سبھی میری طرح خالی بیٹھے ہیں۔ میرے سوا دنیا میں
انھیں اور کوئی کام نہیں ہے۔ مولوی صاحب اور اُسے جدا ہوئے
برسوں سے زیادہ ہو چکے تھے۔ ہر دن ایک دن کا فاصلہ اور بڑھ جاتا
تھا۔ اب تو میرا چہرہ بھی مولوی صاحب کو یاد نہیں رہا ہوگا۔ مجھے سامنے
دیکھیں تو شاید پہچان بھی نہ پائیں۔ ممکن ہے وہ بھی بہت بدل گئے ہوں
اور وہ مجھے بھلانا ہی چاہتے ہوں گے۔ میرا چہرہ اپنی نظروں سے اوجھل
ہی کرنا چاہتے ہوں گے کہ وہ اُسے بھی اُن کی ہی کوشش ہوگی کہ

"میں سمجھ گیا پھر مجھے واقعی یہاں نہیں ٹھہرنا چاہیے۔"

"مگر میں گاتو نہیں رہی ہوں۔"

"یہ تو تم ٹھیک کہتی ہو۔"

"آپ کا دل یہاں بیٹھنے کو نہیں چاہ رہا؟"

میں نے تیزی سے اثبات میں سر ہلایا۔

"مجھے یقین تھا کہ آپ ایک دن ضرور واپس آئیں گے۔ اب آپ اتنے دنوں بعد آئے ہیں تو میں آپ سے دو باتیں بھی نہ کر سکوں۔"

"یہ تو تم بہتر سمجھ سکتی ہو۔"

"آپ کے خیال میں کیا یہ نامناسب بات ہے؟"

"میں کیا کہوں میں سمجھتا ہوں تمھیں اتنا اختیار تو ہونا ہی چاہیے۔"

"آپا جانی کہتی ہیں وہ پابندی لگانے کا اختیار رکھتے ہیں اُنھوں نے کرایہ دیا ہے۔" وہ تھکے ہوئے لہجے میں بولی۔

"کتنا کرایہ؟" میں نے یوں ہی پوچھ لیا۔

"پتہ نہیں بہت ہی ہوگا۔"

"تمھیں نہیں معلوم؟"

"میں معلوم کر کے کیا کرتی۔"

"تو پھر وہ تمھیں یہاں کیوں لیے ہوئے ہیں؟"

"یہ تو اُن کی اور آپا جانی کی مرضی پر ہے۔ وہ چاہیں تو لے بھی جائیں۔ اُن کے پاس بہت دولت ہے۔ پر آپا جانی نے شاید اُنھیں منع کر دیا ہے کہ ابھی وہ مجھے سمو چاکسی کی تحویل میں دینا پسند نہیں کرتیں اُنھوں نے تو منتظر کر دیے کہ ابھی میری عمر کم ہے۔ مجھے ابھی اور دیکھنا ہے ابھی اُن کا ایسا کوئی خیال نہیں وہ کچھ عرصے اور مجھے اپنی آنکھوں کے سامنے رکھنا چاہتی ہیں۔ البتہ جہاں تک گانے کی بات ہے تو مجھے کسی ایک شخص کے لیے وقف کر سکتی ہیں۔ اُنھوں نے یہی کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کسی دن آمادہ ہو جائیں اور سیٹھ جی مجھے یہاں سے لے جائیں یا پھر یہیں رکھیں اور میں بس اُنھی کے لیے محدود ہو جاؤں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سیٹھ جی ابھی آپا جانی کی منہ مانگی مراد قبول کرنے میں ہچکچا رہے ہوں۔ آپا جانی نے کچھ زیادہ ہی طلب کر لیا ہوگا۔ یہ گھر بھی سیٹھ جی نے لے کے دیا ہے۔"

"تمھارا اپنا کیا خیال ہے؟"

"میرا خیال کیا۔"

"سیٹھ جی کیسے ہیں؟"

"اچھے آدمی ہیں۔" وہ سر دآہ بھر کے بولی اور دیر تک چپ بیٹھی رہی کمرے میں میرے اور اُس کے سوا کوئی نہیں تھا۔ اُس کی آواز بہت دھیمی تھی جیسے اُن کی کھنک کھوئی ہوئی۔ جی چاہتا تھا وہ بولتی رہے کسی بات پر وہ خراقی تو تھوڑی دیر کے لیے جسم کو جھاسا پڑ جاتا۔ آہیں کرتے کرتے اُس کے ہونٹ جیسے جیسے لرزتے تھے چہرے کا رنگ اور لال ہو جاتا تھا۔ اُس کا لہجہ بہت صاف نرم کسی مرچ کی طرح تھا لیکن پھر مجھ سے کچھ پوچھا نہیں گیا۔ میرا سر گھومنے سا لگا تھا۔

"آپ نے بتائیے، آپ نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟"

"کیا بتاؤں؟"

"ایک بات پوچھوں؟" وہ منتشر آواز میں بولی۔ "کبھی میرا نام یاد رہا آپ کو؟"

"ہاں، کئی بار خیال آیا۔"

"سچ؟" اُس کی پتلیاں چمکنے لگیں۔ "میں نے آپ کے بارے میں بہت کچھ معلوم کیا۔"

"کیا کیا۔ تم نے کیا معلوم کیا؟" میں نے وحشت سے کہا۔

"یہی کہ آپ کے ساتھ کیا کیا گزری۔"

"تم کیا جانتی ہو؟"

"زیادہ نہیں بس اتنا کہ آپ نے بہت دکھ اٹھائے ہیں۔"

"مجھے تفصیل سے بتاؤ۔"

"آپ اپنی ہی باتیں جاننے کے لیے اتنے بے تاب کیوں ہیں؟"

"شاید تم نے کچھ غلط سنا ہو۔"

"مگر میں نے آپ کو دیکھا بھی تو ہے۔"

"کتنی بار؟"

"بعض اوقات تو ایک ہی بار کافی ہوتا ہے۔" وہ لرزیدہ لہجے میں بولی۔

"ایک بار میں تم نے کیا سمجھا ہوگا؟"

"بہت کچھ سمجھ لیا۔ میں نے آپ کی آنکھیں دیکھی تھیں جو لوگ میں نے اب تک دیکھے ہیں، آپ کی آنکھیں اُن سب سے الگ ہیں۔ جن لوگوں کے ساتھ آپ آئے تھے اُن میں بھی الگ الگ نظر آ رہے تھے۔ میرا دل چاہا تھا کہ آپ کو روک لوں مگر ہمت نہیں پڑی۔ پھر میں آپ کا انتظار کرتی رہی کہ شاید آپ پھر آئیں۔ میں نے بہت سی باتیں سوچ رکھی تھیں کہ آپ آئیں گے تو کہوں گی لیکن اب کچھ یاد ہی نہیں آ رہا ہے۔ نہ جانے کیا کیا سوچا تھا۔ میں اس چار دیواری میں بند ہوں اور میرے پیروں میں گھنگھروؤں کی زنجیر پڑی ہے۔ میں آپ کے لیے کچھ نہیں کر سکتی اور میرے کرنے نہ کرنے سے ہوگا بھی کیا؟ ہو سکے تو اپنے کچھ دکھ مجھے دے دیجیے۔ مجھے احساس ہے کہ یہ ایک مہمل سی بات ہے کون کسی کے دکھ سمیٹ سکتا ہے مگر مجھے معلوم نہیں کہ آپ کے سامنے اور کیا کہنا چاہیے۔"

"شہپارے! میری آواز بیٹھ گئی۔ تم نے کیا کیا سُنا ہے؟"

اُس نے جو کچھ سنا تھا اندازہ کر لیا تھا اور جتنا اندازہ کیا تھا اُسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اصل کا عشر عشیر بھی نہیں ہے۔ وہ صرف اتنا ہی جانتی تھی کہ مجھے ایک طویل مدت جیل میں گزارنی پڑی ہے اور وہاں میں نے تعلیم بھی حاصل کی ہے۔ اُسے کسی نے بتایا تھا کہ شاید اس دوران میرے گھر والے مجھ سے کھو گئے ہیں، میں اُنھی کی تلاش میں شہروں شہروں مارا مارا پھر رہا ہوں۔ نے خانم اور جہاں گیر کی بابت کچھ علم نہیں تھا لیکن وہ خانم سے واقف ضرور ہوگی۔ نسرین بانو، میاں مرتضیٰ، اکبر، واقعہ زرین کا نام، فیض آباد میں اُس کی حویلی یہ سب کچھ اُسے معلوم تھا۔ بمبئی کے چند واقعات بھی اُس کے علم میں تھے۔ اُس نے نہیدہ کا ذکر نہیں کیا کوئی بعید نہیں کہ فیض آباد سے یہ بات کھلتے کھلتے بمبئی تک پہنچ گئی ہو۔ افواہوں کے آدمیوں ہی نے غالباً یہ ساری باتیں بتائی ہوں گی۔ یہاں طرح طرح کے لوگ آتے رہتے ہوں گے۔ شہپارہ نے اُن سے خود ہی پوچھا ہوگا اور اُنھوں نے اُس کی خاطر الٹا سیدھا بتانے میں کوئی حرج نہیں سمجھا ہوگا۔ جلال مُنے کی اولاد اور مولوی صاحب کے بارے میں کچھ پتہ نہیں تھا۔

"کیا یہ سب کچھ غلط ہے؟" اُس نے وارفتگی سے پوچھا۔

"نہیں بہت کچھ درست ہے۔ تو کیا تمھیں مجھ پر ترس آتا ہے؟"

"نہیں۔" وہ پریشان لہجے میں بولی۔ "یہ ترس نہیں ہے۔ آپ ایسا کیوں کہتے ہیں جب مجھے کچھ پتہ نہیں تھا تو بھی میں نے کچھ یہی جانا تھا۔ اتفاق سے بعد میں اس کی تائید بھی ہو گئی۔ اسے ترس کہہ کے مجھے الزام نہ دیجیے۔ ترس تو مفلوک الحالوں بے بسوں پر کیا جاتا ہے۔ ہاں مجھ پر آپ ضرور ترس کھا سکتے ہیں۔" میں نہ آپ کی طرح آزاد ہوں نہ مختار۔ آپ مرد ہیں اور خدا نے آپ کو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت عطا کی ہے۔ آپ کے بازو مضبوط ہیں اللہ بھی آپ کے ساتھ ہے، ایک عمر پڑی ہے۔ خدا آپ کو بہت زیادہ عمر دے، بہت زیادہ اور آپ کی ساری مرادیں بر آئیں۔"

"شہپارے!" میں نے خجالت سے کہا۔ "تم نے اگر میری بات محسوس کی ہے تو مجھے معاف کر دو میری زبان تابو میں نہیں رہتی۔ کتنا کچھ جانا جاتا ہمل کچھ ہوتا ہے جنھوں نے دکھ سہا ہے دکھ وہی سمجھ سکتے ہیں۔ تم مجھے بہت دکھی لگتی ہو۔ یقین کرو پہلے بھی جب میں یہاں آیا تھا تو میں نے یہی محسوس کیا تھا لیکن میں تم سے کچھ کہہ نہیں سکا۔ تم نے کہہ دیا ہے میرے لیے تمھاری طرح اور لوگ بھی دعا کرتے ہیں، کچھ ہوتا ہی نہیں۔"

"مایوس کیوں ہوتے ہیں؟"

"تم بھی تو مایوس نظر آتی ہو۔"

"مایوسی کے ساتھ ساتھ ایک اُمید بھی ہے خدا کبھی تو سنے گا۔"

"سب یہی کہتے ہیں۔"

"کوئی غلط تو نہیں کہتے کیا دیکھتے دیکھتے لوگوں کی قسمتیں نہیں بدل جاتیں؟ اتنا اندھیر نہیں ہے۔"

"تم یہاں اس قید خانے میں بیٹھ کے یہ کہہ رہی ہو تو واقعی اندھیر نہیں ہے۔ تمھارے دکھ بھی میں جانتا ہوں تم اسے بیزار ہو گے جو یہاں بہت مثل کے ہوتے ہیں۔ بہت کم لوگ دُکھی رہتے ہوں گے یہاں اور تم جیسی لڑکی تو بالکل نہیں۔" میں نے وثوق سے کہا کہ وہ نئی طرح معصوم ہے یا نازیں جولین اور نیلمان کی آرزو ہی ہے۔

"قسمت کا تماشا ہے۔"

"تم سب یہ پسند نہیں کرتیں نا؟" اُس نے گہرا کہا۔

"مجھے یقین ہے کہ میں بیگم تمھاری اصل ان سے ہی ہو گی۔"

"اب تو وہی سب کچھ ہیں۔"

"تمھیں کہاں سے لایا گیا تھا؟"

"مجھے کچھ یاد نہیں صرف دھندلا دھندلا سا ایک نقش ہے۔" پھر مجھے پتہ چلا اُس نے بمشکل تمام بتایا کہ وہ بہت چھوٹی تھی کسی نے اُسے حیدرآباد کے بازار میں پہنچا دیا۔ اُسے صرف اتنا یاد ہے کہ اس دن گھر میں بہت سے لوگ آئے تھے اور اس کے باپ کا سہرا تیار کر کے بیٹھے رو رہے تھے۔ لوگوں کی دیکھا دیکھی وہ بھی رونے لگی۔ اُسے حیرت تھی کہ اُس کے باپ کو اچانک کیا ہو گیا ہے، وہ بولتے کیوں نہیں۔ آنکھیں بند کیوں ہیں۔ اُس کا ایک بڑا سا گھر تھا، بہن بھائی تھے۔ اُن کی شکلیں اب تک اُس کے ذہن میں محفوظ تھیں۔ جب اس کے ابا کو لوگ کندھوں پر اٹھا کے لے جانے لگے تو وہ بھی باہر آگئی گلی میں بہت بڑا ہجوم تھا۔ لوگ اُسے سینے سے لگا کے پیار کرنے لگے اور انھی میں سے کسی شخص نے اُسے گود میں لے لیا۔ پھر جب اُسے ہوش آیا تو وہ ایک دوسری جگہ تھی حیدرآباد کے بازار حسن کی مہندی میں۔ وہ وہیں پلی بڑھی۔ بعد ازاں بیگم کلکتے سے حیدرآباد آئی تو شہپارہ اُس کے سپرد کر دی گئی کہ کس عورت کے ہاں اُس نے پرورش پائی تھی وہ کون بیگم کی قریبی عزیز تھی۔ "سب ایک خواب کے مانند ہے۔" اُس کی آواز ڈگمگانے لگی۔ "وقت کے ساتھ یہ دھند بھی چھٹ جائے گی۔"

"کبھی نہیں چھٹے گی اور گہری ہو جائے گی۔ آدمی سمجھتا ہے کہ وہ بھول جائے گا لیکن بہت سی باتیں بھولنے کی شے نہیں۔ وقت کا اُن پر اثر نہیں ہوتا۔"

"ہو ہی جاتا ہے۔ کئی مثالیں تو میرے سامنے ہیں۔ وقت نے اُن کے زخم بھر دیے۔ اُنھیں اب کسی سے کوئی شکوہ نہیں ہے۔"

"پتہ نہیں یہ اچھا ہوتا ہے یا بُرا۔"

"اچھا ہی ہوتا ہے۔ یوں زندہ رہنا بھی ایک طرح وقت سے سمجھوتا کرنا ہے۔ وقت کے ساتھ سر خم کر دینا ہے۔ صرف اس لیے کہ شاید رُت بدل جائے اور رُت کبھی بدل جاتی ہے کبھی نہیں بدلتی۔ کسی کے لیے بدل جاتی ہے کسی کے لیے نہیں اور آدمی عمر بھر اُس کے انتظار کے فریب میں رہتا ہے۔"

"کاش میں تم سے کچھ کہہ سکتا لیکن فضول باتیں کرنے سے کیا حاصل۔ بہرحال زبان کہتے کہتے رک جاتی ہے۔"

"آپ کا اتنا کہنا ہی میرے لیے بہت ہے۔" اُس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ "مجھے احساس ہے کہ آپ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتے۔ دکھی آدمی جھوٹ نہیں بولتا ورنہ اُس کے ذکر جھوٹ ہوتے ہیں۔ دل پر بوجھ مت رکھیے گا۔ میری باتیں جن سے آپ کا جی اور گراں ہو گیا ہوگا۔"

"یہ ذکر تو میں نے خود چھیڑا تھا شہپارے! اپنے آنسو روک لو۔ ابھی تک تو مجھے صبر و ضبط کے لیے کہہ رہی تھیں۔ اب بتاؤ ضبط کرنا کیا مشکل ہے۔"

وہ کچھ نہیں بولی۔ دوپٹے سے اپنے آنسو پونچھ کے گم سم بیٹھی رہی۔

"ہم لوگ جا رہے ہیں شہپارے! دیکھو واپسی کب ہوتی ہے لیکن جب بھی ہوگی میں ادھر ضرور آؤں گا۔"

"پھر جا رہے ہیں؟" وہ شکستہ لہجے میں بولی۔

"ہاں اور مجھے خود نہیں معلوم کہ کس طرف جا رہے ہیں۔ ممکن ہے جلدی آ جائیں یا ممکن ہے بہت دیر ہو جائے یا کبھی واپس نہ آ سکیں۔"

"نہیں نہیں۔" وہ بے قراری سے بولی۔ "ایسی بدفالیں منہ سے کیوں نکالتے ہیں۔ خدا نے چاہا تو آپ کامیاب لوٹیں گے۔"

"کیا کہا جا سکتا ہے۔" میں نے مایوسی سے کہا۔

"میں آپ کا انتظار کروں گی۔"

"اور تم مجھے یاد آتی رہو گی۔" میں نے ڈولتی ہوئی آواز میں کہا۔ "مجھے ہر دم تمہارا احساس رہے گا۔ میں آ گیا تو ٹھیک ہے لیکن نہ آ سکا تو تم تم۔۔۔" میرے دماغ میں گڈمڈ ہو گیا کہ میں اُس سے کیا کہنا چاہتا تھا۔

"آپ آئیں گے انشاءاللہ جلد واپس آئیں گے۔ میرا کوئی احساس نہ کیجیے گا۔ میں یہاں بالکل ٹھیک ہوں۔ حوصلے سے جائیے اور مایوسی دل میں مت لائیے۔" وہ مجھے تسلیاں دینے لگی۔

دیر ہو گئی تھی۔ ابھی سے کوئی واپس نہیں آیا تھا۔ کرمین بیگم ایک بار آ کے جا چکی تھی۔ شہپارہ میرے پاس ہی بیٹھی رہی۔ ایک لمحے کے لیے بھی اٹھ کے کہیں نہیں گئی۔ میں سوچ رہا تھا کہ باہر جا کے کانتے وغیرہ کو خود تلاش کرنا چاہیے۔ معاً سامنے کے دروازے سے کرمین بیگم حواس باختہ انداز میں اندر داخل ہوئی۔ "وہ آ گئے ہیں۔" کمرے میں اُس کی گھبرائی آواز گونجی۔

"کون آیا ہے آپا جانی؟" شہپارہ نے آنکھیں پٹ پٹا کے پوچھا۔

"کرم جی! وہ اوپر چڑھ رہے ہیں۔ مرشد پیچھے کھڑی ہے۔"

"تو آنے دیجیے۔" شہپارہ تحمل سے بولی۔

"میں چلتا ہوں۔" میں نے درمیان میں کہا۔

"آپ بیٹھیے۔ کہاں کانتے جی کو ڈھونڈتے پھریں گے۔"

"کیا یہ مناسب ہوگا؟" کرمین کتراتے ہوئے لہجے میں بولی۔ "شاید انھیں یہ پسند نہ ہو۔"

"میں نے کون گناہ کر ڈالا ہے؟ میں کوئی چور ہوں جو یہاں سے اٹھ جاؤں۔ آپ موجود ہیں۔"

"ضرورت کتنی ہو بخوبی محسوس کر لیں گے۔ مجھے جو اندیشہ تھا، وہی ہوا نا۔ وہ آ گئے۔ انسان کے مزاج سے تم اچھی طرح واقف ہو۔ وہ تنہا اسے معاملے میں کتنے حساس ہیں۔ ہمیں اُن کا خیال رکھنا چاہیے۔ ہم پر اُن کے احسانات کچھ کم نہیں ہیں۔"

"مگر آپا جانی!" شہپارہ نے احتجاج کیا۔ "کیا یہاں ہمارا کوئی مہمان نہیں آ سکتا؟ ہم تھوڑی دیر کے لیے اپنے کسی مہمان کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتے؟"

"میں نے تمہیں بتایا ہے تم خود سمجھ دار ہو۔" کرمین اداسی سے بولی۔ "کیا یہ مناسب نہیں ہے کہ اُن کے آتے ہی ہم اپنے مہمان کو اٹھا دیں۔"

"تم جانو۔ وہ آ رہے ہیں۔"

دروازے پر کسی کے آنے کی آہٹ ہوئی پھر چشم زدن میں سانولی رنگت، درمیانہ قد اور ادھیڑ عمر کا ایک شخص برآمد ہوا۔ اُس کی آنکھوں پر سنہرے فریم کا چشمہ لگا ہوا تھا۔ کھچڑی بالوں کی مونچھیں سب سے زیادہ نمایاں تھیں۔ اس نے بند گلے کا ایک سلکن کوٹ پہن رکھا تھا۔ دھوتی سفید تھی۔ چہرے مہرے سے وہ اچھا خاصا صاف ستھرا شخص تھا۔ ہونٹ موٹے موٹے، ناک ابھری ہوئی۔ کوٹ کے باہر گلے میں سونے کی زنجیر پڑی ہوئی تھی۔ انگلیوں میں کئی رنگوں کے نگینوں کی مرصع انگوٹھیاں تھیں۔ پہلے اس نے شہپارہ کو دیکھا، پھر مجھے پھر کرمین بیگم کو۔ اُس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ اُس کے تیور اچھے نہیں ہیں۔ شہپارہ نے کھڑے ہو کے آداب تسلیم کی۔ اس نے سر کو ایک خفیف سی جنبش دی۔ میں نہیں اٹھا تھا۔ "تشریف لائیے کرم جی!" شہپارہ نے شائستگی سے کہا۔

وہ آگے نہیں بڑھا۔ دروازے سے کچھ فاصلے ہی پر کھڑا رہا۔

"یہ لاڈلے میاں ہیں۔" کرمین نے جلدی سے کہا۔ "یہ استاد جھل کے خاص آدمی ہیں۔"

سیٹھ کرم چند نے جواب نہیں دیا۔ شہپارہ اُس کے پاس جا کے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ "کیوں! آپ بیٹھتے کیوں نہیں؟"

"کرمین بیگم!" اُس کی بھڑی ہوئی آواز ابھری۔ "ہم اس کو کیا سمجھے؟"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔"

"تم مطلب خوب سمجھ گئی۔ کیا ہم ادھر دوبارہ نہیں آئے؟"

"کون کم بخت کہتا ہے۔ سیٹھ! آپ کو کیسے غلط فہمی ہو گئی ہے۔"

"تمہارا خیال ہے ہم کو کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ ادھر ہمارے پیچھے کون آتا جاتا ہے کیا ادھر ہم نے اپنا کوئی آدمی نہیں چھوڑا ہوگا جو ہم کو پل پل

کی خبر دے۔"

"سیٹھ صاحب! اگر آپ کا اشارہ لاڈلے میاں کی طرف ہے تو یہ ہمارے مہمان ہیں۔" کرمین عاجزی سے بولی۔ "آپ سکون سے کرسی پر بیٹھیے ذرا سانس لیجیے۔ یہ بھی عزت دار آدمی ہیں۔"

"ہم کو اس سے کوئی ناتا نہیں ہے۔ یہ کون ہے کدھر سے آیا ہے؟ ہماری بات تم سے ہے۔ تم سے ہمارا کیا طے ہوا تھا، ادھر کوئی نہیں آئے گا۔ کوئی بھی نہیں۔ سوائے گو کے شہپارے کے پاس تیں۔ ہم کو پتہ چلا ہے کہ ابھی ادھر سے بہت سے لوگ آتے گئے ہیں۔ وہ ادھر کیا کرنے آتے تھے؟ شہپارے کے سوا ادھر اور کون چیز دیکھنے کی ہے؟"

"خدا گواہ ہے سیٹھ صاحب! شہپارے نے جو اُن کے سامنے گھنگرو باندھے ہوں۔ وہ اس علاقے کے لوگ ہیں۔ اُن کا بھی کچھ خاطر کرنا پڑتا ہے۔"

"ایک سو باتوں کی ایک بات ہم کہہ چکے ہیں۔ بول دیا تھا کرمین بیگم! یہ سب ہم کو ایک وار پھر بھی اچھا نہیں لگا۔ شہپارے کو ہم باہر کے کسی آدمی کے سامنے کرنا نہیں چاہتے اور ہم اس کے لیے بڑی سے بڑی قیمت چکانے کو تیار ہیں۔"

"آپ بیٹھیے تو سہی پھر جو جی میں آئے کہہ لیجیے گا۔"

"تم کو معلوم ہے ہم کو ادھر کسی کے ساتھ بیٹھنا پسند نہیں ہے۔"

"لاڈلے میاں بس جانے ہی والے تھے۔"

"یہ ادھر کیوں ہے؟" اس کی آواز تیز سے تیز ہوتی جا رہی تھی۔ کرمین بیگم کی خوشامدوں کے باوجود اُس کا پارہ نہیں اترا۔ شہپارہ نے بھی اُسے ٹھنڈے لہجے میں سمجھانے کی کوشش کی۔ اُس نے اُس کی بات پر بھی توجہ نہیں دی۔ میں چپ رہا لیکن مجھے اُس کی بدزبانی بہت بری لگی۔ شہپارہ کبھی میری طرف دیکھتی، کبھی اُس کی طرف۔ "یہاں اس کسی کا ہونا کرم چند کا اپمان ہے۔ بے عزتی ہے۔ اپنے مہمان سے بولو کہ چلا جائے۔"

مجھے سخت غصہ آ گیا۔ جی چاہا بڑھ کے اُس کا گریبان پکڑ لوں۔ شہپارہ کو ان میں کر رہا تھا کرمین بیگم نے شکایت کی۔ "آپ ایسا نہ کیجیے یہ چلے جائیں گے۔ یہ غور کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔ سچ تو یہ ہے ہم نے ہی انھیں روک لیا تھا۔ ڈیڑھ سال بعد آج نظر آئے ہیں۔ دروازہ اسی لمحے کھلا تھا کہ آپ آ گئے۔ ننھے لاڈلے میاں!" کرمین اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکی۔ میری سرخ آنکھیں دیکھ کے چپ ہو گئی۔

"اپنے سیٹھ سے کہو کرمین بیگم کہ زبان سنبھال کے بات کرے۔ اسے پتا نہیں۔ ناتو زبان بند رکھے۔" میں نے درشتی سے کہا۔

"لاڈلے میاں! خدا کے لیے خاموش رہیے۔ میری خاطر، شہپارہ کی خاطر۔" کرمین گڑگڑا کے بولی۔ "سیٹھ کرم چند جی نے ہمارے ساتھ بہت سلوک کیا ہے۔ جو کچھ کہتے ہیں سب سچ ہے۔ شہپارہ باہر کے لوگوں سے کم ملتی ہے۔ کسی کے سامنے آتی ہے تو انشاءاللہ آپ سمجھ دار ہیں سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ اس سے پہلے بات طول کھینچے میں منت کرتی ہوں کہ اپنے آپ کو ذرا دور رکھیے۔"

"بات کرو تو سیٹھ کرم چند طول دے رہا ہے۔"

"کرمین بیگم!" کرم چند گرجتی آواز میں بولا۔ "چھوکرے سے بولو کہ یہ ہمارا گھر ہے اور ہم کو اپنے گھر میں ایسی بات برداشت نہیں۔ چلے جاؤ چھوکرے۔" وہ پہلی بار براہ راست مجھ سے مخاطب ہوا۔

"میں نہیں جاؤں گا۔"

"تم ادھر نہیں رہ سکتا۔"

شہپارہ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ "خدا کے لیے۔۔۔"

"اس سے دور رہو شہپارے جان!" کرم چند نے چیخ کے کہا۔ شہپارہ نے اس طرح میرا ہاتھ چھوڑ دیا جیسے اسے کرنٹ لگ گیا ہو۔

"سیٹھ کرم چند!" میں نے نسبتاً پرسکون آواز میں کہا۔ "تم حکم مت چلاؤ۔"

"ہم نے ادھر روکڑا دیا ہے۔" وہ انگلیوں سے اشارہ کرتے ہوئے بے رخی سے بولا۔ "ہم کا روکڑا۔ روکڑا ہو تو کھولو۔"

"ضرورت پڑی تو وہ بھی کھول دیں گے۔"

"اس کی ضرورت ایسے ہی زور پڑتی ہے۔ ادھر خالی نہیں چلتا۔"

"تم نے کتنا روکڑا دیا ہے؟" میں نے نرم لہجے میں کہا۔

"وہ ادھر دو لاکھ کرمین بیگم کی مانگ ہے۔"

"ہم چار لاکھ دیں گے۔"

"چار لاکھ۔۔۔ ہم چھ لاکھ دے گا۔"

"میں اسے دگنا کر دوں گا۔"

"پہلے ادھر لے آؤ۔" وہ حقارت سے بولا۔ "اور اس سے پہلے ادھر سے چلا جا۔ جب پیسے لے کے آئے پھر بات کرنا۔ رنگ اور پیسہ کا دیکھا ہے! آنکھیں پھٹ جائے گا۔"

"آنکھیں تیری پھٹیں گی سیٹھ کرم چند! اگر ایک پیسہ دکھانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ میں اسے یوں تیرے سامنے لے جاؤں گا۔ پوچھ لے شہپارے سے۔"

"مفت کا مال نہیں سمجھو کے! بازار میں کھڑا ہے۔"

"پوچھ لے شہپارے سے کہ وہ تیرے پیسے کے ساتھ جانا چاہتی ہے یا میرے ساتھ۔ میری جیب میں اس وقت اتنے پیسے نہیں ہیں۔"

"ہا، ہا، ہا۔ آپ کا تصور کو۔۔۔ دن میں سپنا دیکھتا ہے پوچھ لے، پوچھ لے اور اپنے غرور سے یہ حسرت بھی نکال دے۔"

"یہ کیسی باتیں ہو رہی ہیں۔ خدا کے واسطے یہ گفتگو بند کیجیے۔" کرمین نے جذباتی انداز میں بولی۔ "سیٹھ جی! آپ ہی بڑے پن کا ثبوت دیجیے۔ یہ باتیں آپ کے شایان شان نہیں۔"

"ایسی شان پہ جو کالک لگانی تھی وہ تم نے لگا ہی دی ہے کرین بیگم! اب اور کیا چاہو ہو۔ مجھو کو سے بولو کہ چلا جائے ورنہ ہم اس کو دھکے دے کے باہر نکال دے گا۔"

"سیٹھو! تمھاری عمر کا دھیان ہوتا ہے تم صرف زبان سے کہتے ہو، میں ابھی تمھیں سیڑھی سے نیچے پھینک دوں گا۔"

"اوہ اوہ۔" کرین دونوں ہاتھ کان پہ رکھ کے ملہار کرنے لگی۔

سیٹھ نے پھر کچھ نہیں سنا۔ سیدھا دروازے کی طرف پلٹ گیا۔ میں سمجھا وہ چلا گیا ہے۔ زینے پہ جا کے اس نے تالی بجائی۔ اسی لمحے زینے میں بھاری بھاری قدموں کی آہٹ گونجی۔ کرین بیگم دہائیاں دینے لگی۔ آنے والے دو آدمی تھے۔ دو مشٹنڈے۔ پہلوانوں کے مانند۔ لباس سے فوجی معلوم ہوتے تھے۔ دونوں کی کمر سے چمڑے کی ایک ایک بیلٹ بندھی تھی اور بیلٹوں کے خانوں میں کارتوس بھرے ہوئے تھے۔ کندھوں سے رائفلیں لٹک رہی تھیں۔ خنجر بھی پیٹی میں اڑسے ہوئے تھے۔ دونوں کے چہرے پہ سے ہمیشہ جھکے ہوئے اور تند نکلتے ہوئے تھے۔ مونچھیں تلوار کی طرح کھنچی ہوئی تھیں۔ مگر چھوٹی چھوٹی کسی ہوئی تھی۔ ان کی عمروں میں زیادہ فرق نہیں تھا۔ ایک کی چالیس ہو گی تو دوسرے کی تیس۔ رنگت خاکی تھی، جیسے جھوری تھی۔ وہ اس طرح اندر آئے جیسے انھیں کسی چیز کی تلاش ہو، دیدے پھاڑے ہوئے۔ ان کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ آتے ہی انھوں نے چاروں طرف گھوم کے دیکھا پھر ان کی نظریں مجھ پر آ کے ٹک گئیں۔ "اس کو اٹھا کے نیچے پھینک دو۔" کرم چند نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"یہ تمارا قبیل کے آدمی ہیں۔" کرین سیٹھ کے سامنے آ گئی۔

"ان لوگوں نے بڑے بڑے استادوں کا نشہ ہرن کر دیا ہے کرین بیگم!"

"میں کہتی ہوں آپ انھیں روک لیجیے۔"

"ہم ان کو روک لیتے ہیں۔ مجھو کو سے بولو آخری موقع ہے۔ ادھر سے دفع ہو جا۔ پھر کبھی اس گھر کی طرف سر اٹھا کے نہ دیکھنا۔"

"لاڈلے میاں! میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔" اس نے اپنا دامن میرے آگے پھیلا دیا۔ "سیٹھ جی اس وقت ہوش میں نہیں ہیں۔ کچھ نہیں سمجھ رہے ہیں لیکن تم ہوش مت کھونا۔"

دونوں آدمی مجھ سے ایک فاصلے پر آ کے ٹھیر گئے تھے۔ "سیٹھ کرم چند!" میں نے تلخی سے کہا۔ "بازو بھی دوسرے کا استعمال کرتے ہو۔"

"ہم بھی اپنا بازو ہے سمجھو! دوسرے کا بازو اور دوسرا بازو بلائے بغیر نہیں آتا۔ بولو! جلدی فیصلہ کرو۔ ہم ان کو اشارہ کرے؟"

"بس کرو۔ بس کرو۔" کرین چلانے لگی۔

"چپ ہو جاؤ۔" کرم چند نے اسے ڈانٹ دیا۔

"دہلیز سے چلے جاؤ سیٹھ!" میں نے ترش لہجے میں کہا۔

"ہم جائے؟" وہ حیرت سے بولا۔ "پھینک دو اسے نیچے۔" اس نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔ وہ مجھ پر ایک دم نہیں جھپٹے۔ پہلے مجھے نظروں ہی نظروں میں تولتے رہے۔ میں نے اپنے کندھے گرا لیے تھے لیکن میری آنکھیں بھی پرسکون تھیں۔ کرین اور شبہ پارہ میرے آگے ڈھال بن کے کھڑی ہو گئیں۔ میں نے انھیں دھکیلنے کے خوف سے وہ دو کیا۔ کرم چند کے آدمیوں نے خنجر نہیں نکالے۔ دونوں مجھے بازوؤں سے پکڑ کے دھکیلنے اور گھسیٹتے ہوئے زینے تک لے جانے کی جستجو میں ہوں گے۔ شروع شروع میں وہ یہی کر سکتے تھے۔ سیٹھ کمرے کے درمیان ایک ستون سے سہارا لے کے کھڑا ہو گیا۔ وہ آہستگی سے میرے قریب آئے جیسے مجھ سے دو دو کچھ کہنا چاہتے ہوں کہ میں ان پر ہاتھ نہ اٹھانے دوں۔ میں اپنی جگہ سے نہیں ہٹا۔ انھیں آنے دیا۔ شبہ پارہ سسکنے لگی تھی۔ ان دونوں نے ہاتھ بڑھائے مگر اس سے پیشتر کہ وہ میرے بازو پکڑ کے مجھے آگے دھکیلتے، میں نے خود پھرتی سے جھپٹ کے ان کے دراز ہاتھ نیچے سے پکڑ لیے اور زور سے جھٹکا دیا۔ دونوں ایک ساتھ فرش پر گرے اور قلابازی کھا گئے۔

ان کے لیے یہ بہت غیر متوقع ہو گا۔ میں نے ایک الٹا پینترا لیا۔ گرتے ہی پھر پیچھے ہو کے اپنا رخ بدل لیا تھا۔ وہ ذرا جلدی گئے لیکن پھر انھوں نے مجھ پر حملہ کرنے میں جلدی نہیں کی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور استہزائی انداز میں مسکراتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔ پھر رفتہ رفتہ انھوں نے دوبارہ آگے بڑھ کے مجھ سے فاصلہ کم کیا۔ میں دوسری بار ان کے ارادے کا تعین نہیں کر سکا تھا۔ کئی باتیں ممکن تھیں۔ یا تو وہ عام لوگوں کی طرح طیش میں آ کے مجھ سے چمٹ جاتے یا خنجر نکال لیتے یا کچھ اور کرتے لیکن وہ دو گز کی دوری پر آ کے ٹھیر گئے اور اچانک طوفان کی تیزی سے دونوں ادھر ادھر سے بیلوں کی طرح اپنے سر آگے کیے میرے سینے پر حملہ آور ہوئے۔ مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ وہ اب کریں گے۔ میں دونوں کے بیک وقت زور کی تاب نہیں لا سکا۔ گو میں نے بچنے کی ایک کوشش کی تھی تاہم انھوں نے بہت عجلت کی۔ مجھے سنبھلنے کا ذرا سا وقفہ بھی نہیں دیا اور میرے ساتھ ہی گرے۔ وہ میرے جسم پر دباؤ ڈالے ہوئے تھے کچھ اس طرح کہ بے فائدہ ٹانگیں چلانے کے سوا میرے لیے باقی جسم کو حرکت دینا مشکل ہو گیا تھا۔ اب ایک ہی صورت مناسب تھی کہ میں مزاحمت کے بجائے اپنا جسم ڈھیلا کر لوں۔ اس طرح قدرتی طور پر ان کے ہاتھ سست پڑ جاتے کیونکہ ابھی ابتدا تھی۔ پہلا واقعہ انھوں نے اتفاق پر محمول کیا ہو گا۔ اپنے ڈیل ڈول پر انھیں پورا اعتبار ہو گا اور سیٹھ کرم چند کو جتانے کی بھی خواہش ہو گی کہ انھیں زیادہ ہاتھ پیر چلانے اور زور کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ وہ صرف ایک لمحے ہی میں مخالف کو زیر کر لیتے ہیں۔ چنانچہ مجھے یقین تھا، جلد ہی ان میں سے کوئی اپنے دوسرے ساتھی کو یہ کہہ کے ہٹائے گا کہ وہ اکیلا کافی ہے لیکن یہ سب فضول باتیں تھیں۔ کیا میرے پاس ان کی رعایت ملنے کے سوا اپنے بچاؤ

کا کوئی اور طریقہ نہیں رہ گیا تھا؟ ایسا نہیں تھا۔ ایک کی نسبت دو آدمیوں سے نمٹنا زیادہ آسان ہوتا ہے۔ ان دونوں میں اپنے عمل کی یکسانی ممکن نہیں ہوتی۔ سوچ میں اختلاف ہو سکتا ہے۔ وہ پہلے سے کتنی ہی منصوبہ بندی کریں مگر مخالف کے غیر متوقع جوابی داؤ پر غور کرنے اور آپس میں تبادلۂ خیال کرنے کا وقت نہیں ہوتا اور پھر ایک کو دوسرے کا بھی خیال رہتا ہے۔

میں ان کے نیچے دبا رہا۔ مجھے اپنے اور ان کے جسموں کے درمیان حرکت کے لیے ایک گنجائش درکار تھی۔ گنجائش انھیں دینی ہی تھی۔ وہ نہ دیتے تو میں نیچے سے زور کر کے انھیں ایسا کرنے پر مجبور کر دیتا۔ ظاہر ہے میری کشمکش سے ان کا حرکت کرنا لازم ہو جاتا اور مجھے کوئی راستہ مل جاتا۔ میرا کوئی ہاتھ کھلا ہوتا تو اتنی دیر بھی نہ لگتی۔ میں نیچے سے ہاتھ سے ان کے کولھوں اور کمر پر ضرب لگا سکتا تھا۔ میں نے کسی کشمکش کا اظہار نہیں کیا۔ انھوں نے میری کنپٹیوں پر ضربیں لگائیں۔ وہ میری کراہیں اور چیخیں سننے کی آرزو میں ہوں گے مگر میں جیسے بے دم پڑا رہا۔ مجھے بے مزاحمت دیکھ کے انھیں کچھ تردد ہوا۔ اپنی دانست میں انھوں نے ذرا سا اوپر اٹھ کے میرا جائزہ لینا چاہا۔ میں نے پھر بھی کوئی جدوجہد نہیں کی۔ نتیجتاً ان کی گرفت میں اور ڈھیل پیدا ہوئی اور انھوں نے گویا اپنے طور پر طے کر لیا کہ اب مجھے اٹھا کے زینے میں پھینک دیا جائے۔ جیسے ہی ان کا دباؤ کم ہوا اور وہ میرے جسم سے کسی قدر اوپر ہٹے، میں نے اسی لمحے سینے کے بل پوری طاقت کے ساتھ نیچے سے زور کیا۔ وہ منتشر ہو گئے۔ ایک میری ٹانگوں سے چمٹ گیا۔ میں نے دوسرے کا خیال ترک کر کے پہلے اس کے منہ پر گھونسا مارا۔ پھر بے دریغ ٹانگیں چلاتے ہوئے کم از کم اسے چند لمحوں کے لیے دور کر دیا۔ دوسرا جس کی عمر زیادہ تھی غصے میں آ گیا تھا۔ اگر وہ مجھ سے لپٹا رہتا تو اتنی دیر میں دوسرا آ جاتا مگر اس نے بیل بارک کی طرح مجھے مارنا شروع کر دیا۔ میری ٹانگیں کھلی ہوئی تھیں اور وہ میرے کولھوں پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے مارنے کے سبب میرا ایک ہاتھ بھی آزاد ہو گیا تھا۔ دوسرے کو اس نے دبا رکھا تھا۔ میرے لیے اب زیادہ دشواری نہیں تھی۔ میں نے کوئی پل ضائع کیے بغیر کھلے ہاتھ سے اس کے منہ پر تھپڑ مارا۔ وہ بڑبڑا کے پیچھے ہٹا۔ اس طرح میرا دوسرا ہاتھ بھی کھل گیا۔ پھر میں نے ادھر ادھر کروٹ بدلنے کے انداز میں اپنے جسم کو زمین پر جھٹکے دیے۔ اس عمل سے میری مراد تھی کہ وہ اور متذبذب ہو جائے حالانکہ میں اس کی گردن پر ایک ترچھی ضرب لگا سکتا تھا لیکن مجھے خیال تھا کہ انھیں اپنے پیروں سے نیچے جانا چاہیے۔ انھیں کندھوں پر اٹھا کے موڑ تک لے جانے میں اور انھیں پھینکنے میں جس طرف میں کروٹ بدلنے کا ارادہ ظاہر کرتا تھا، اسی طرف وہ بھی جا کے ڈالتا تھا۔ وہ میری تیزی کا ساتھ نہیں دے سکا۔ جو تھی ضرب میں صاف

اُس کے نرخرے سے نکل گیا اور وہ الٹی پر لوٹتا ہوا ایک لمحے میں لڑ کے کھڑا ہو گیا۔

میں نے فیصلہ کیا تھا کہ اب پیش قدمی مجھے کرنی پڑے گی۔ اتنی دیر میں میں ان کے کس بل کا بڑی حد تک تخمینہ لگا چکا تھا۔ وہ زور میں کم نہیں تھے مگر انھیں بازو مختلف طریقوں سے آزمانا تھا جیسا کہ میرا خیال تھا۔ پہلا آدمی رہے اٹھنے کے دوران مجھے دوبارہ دبوچ لینے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ میں اٹھ گیا تو اس نے احتیاط مناسب سمجھی۔ دونوں کی پگڑیاں اتر چکی تھیں اور لمبے بال بکھرے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھوں سے خون ابل رہا تھا۔ ان کا یہ اشتعال میرے لیے سود مند تھا۔ دونوں ہاتھ پھیلائے ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر کھڑے ایک قسم کی جھپکیاں لے رہے تھے۔ بڑی پیش قدمی سے قبل آنکھ ملانے بہرحال ایک داؤ آزمایا۔ دونوں ایک ساتھ آگے بڑھے۔ تھے میں ایک مجھ سے چمٹ گیا۔ دوسرا اس کا ساتھ دینے کے بجائے میرے پیچھے چلا گیا۔ میں ادھر سامنے کے آدمی کو ہاتھوں پر لیے ہوئے تھا کہ پیچھے والے نے جست لگا کے میرے بازوؤں میں بازو ڈال کے انھیں باندھ دیا اور سامنے والا اطمینان سے میرے منہ پر گھونسے اور طمانچے مارنے لگا۔

"شبہ!" کرم چند کے چیخنے کی آواز آئی۔ [illegible]

کرین بھی کم سے کم اس سے التجائیں کر رہی تھی۔ شبہ پارہ اشارہ کر کے میں نے خواہش سے ہٹنے کی تاکید کر دی تھی۔ وہ خوف زدہ نگاہوں سے یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔

مجھے احساس تھا کہ یہ کرین بیگم کا بالاخانہ ہے۔ معاملہ [illegible] تو شبہ پارہ کی بھی رسوائی ہو گی۔ دوسرے کوئی ایسی ویسی بات ہو جانے سے قبیل کی ناراضی کا بھی اندیشہ تھا۔ ہمارے سفر میں بھی رکاوٹ پڑ سکتی تھی۔ پھر اگر [illegible]۔ ساجھی ادبی وغیرہ اس اثنا میں [illegible] تو یہ ماجرا دیکھ کے اپنے آپ کو اس میں شریک کر لیتے لیکن ان ذہنی کی خاطر میں اپنے ہاتھ پیر نہیں باندھ سکتا تھا۔ جو کچھ مجھے کرنا تھا، جلدی کرنا تھا۔ پیچھے والا آدمی میرے بازو مقفل کیے ہوئے تھا۔ اس کے باوجود میں سامنے والے کی طرف جھپٹا اور زینے کی طرف چند قدم بڑھنے میں کامیاب ہو گیا۔ مجھے یہ عمل پھر دہرانا تھا۔ پیچھے والا ابھی میرے بازو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ادھر آگے والا اپنے گھونسوں کا نشانہ بنائے ہوئے تھا۔ اس نے میرے دانتوں سے خون نکال دیا تھا۔ میں پیچھے والے کو ساتھ لیے ایک بار پھر سامنے کی طرف لپکا اور چند قدم اور آگے بڑھ گیا۔

میرا رخ واضح طور پر زینے کی سمت تھا۔ وہ یہ سمجھے کہ اب میں بھاگنے کی فکر میں ہوں۔ اس سے زیادہ خوش گوار بات ان کے لیے کوئی نہیں تھی۔ چنانچہ انھوں نے مجھے بڑھنے دیا۔ سامنے والا الٹے پاؤں

قدموں سے مجھ پر ہاتھ چلاتا ہوا آگے آ گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ زینے پر
وہ ہٹ جائے گا۔ میں اچانک پیچھے کے اور پیچھے والے کے زینے
گرا کے زینے میں لوٹ دوں گا۔ اسے ڈوب کا داؤ کہتے ہیں۔ اتنی
دیر تک مجھے اپنے سامنے کے آدمی کی ضربیں اور برداشت کرنے رہنا
چاہیے تھا لیکن زینے کے پاس پہنچ موقع پر میں نے اپنا ارادہ بدل
دیا۔ ایک مرحلہ آ گیا تھا کہ میں اچھل کے پیچھے والے کی ٹانگوں کے
درمیان ایڑی مار سکتا تھا۔ میں نے آہستہ سے ٹانگیں اٹھائیں اور ضربیں کھاتے
ہوئے اپنے پیچھے کے آدمی پہ وار سکتا تھا مار دی۔ وہ ضبط نہیں کر سکا تھا۔
بلبلاتا ہوا میرے بازوؤں میں جھول گیا۔ اپنے ساتھی کی ہولناک چیخ سن
کے دوسرے کے ہاتھ سست پڑ گئے اور وہ بدحواسی میں مجھ سے چمٹ گیا۔
میں نے اس کا جسم زینے کے دروازے سے ٹکرا دیا۔ کنپٹی سے اس
کے سر کو گہری چوٹ لگی ہو گی۔

میں زینے سے کچھ اندر کمرے میں آ گیا کیونکہ مجھے پیچھے والے
کو بھی دیکھنا تھا۔ اس کے پاس تمنچہ بھی تھا اور خنجر بھی۔ میرے اندازے
سے ضرب میں کوئی کسر نہیں رہ گئی تھی پھر بھی ایک بار اسے غور سے دیکھ
لینا بہتر تھا۔ وہ فرش پہ دوہرا پڑا کراہ رہا تھا۔ اس کی آواز گھٹی ہوئی تھی۔
اس کے جلد حرکت میں آنے کا کوئی امکان نہیں تھا بلکہ بے ہوش ہونے
کا امکان زیادہ تھا۔ میں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کے احتیاطاً چاقو
باہر نکال لیا۔ سامنے والے کے سر سے خون بہہ رہا تھا اور بعید نہیں تھا کہ
وہ آخری حربے کے طور پر تمنچہ یا چاقو نکال لے۔ میرے پیچھے ہونے
اور اس کے ساتھی کو دیکھنے کے دوران اس نے سنبھلنے میں چند لمحے لیے
ہوں گے۔ میں نے مڑ کے اس کی طرف دیکھا تو وہ تمنچہ باہر نکال چکا تھا۔

"نہیں!" کمرے میں شہ پارہ کی سسکتی ہوئی چیخ گونجی۔ وہ
کرم چند کا بازو پکڑے فریاد کر رہی تھی۔ میں نے چاقو کھول لیا تھا۔ اس
نے جلدی سے چرخی گھمائی اور تمنچہ مجھ پر تان لیا۔ اسے وہ دونوں ہاتھوں
سے پکڑے ہوئے تھا۔ اتفاق کی بات تھی کہ آج سے ڈیڑھ دو سال
پہلے کرین بیگم کے بالاخانے پر ایسی ہی صورت پیدا ہو گئی تھی۔ اس وقت
سیٹھ کشمی داس نے مجھ پر تمنچہ تان لیا تھا۔ موتی نے اس کے اسی ہاتھ
پہ اتنی چابک دستی سے چاقو مارا تھا کہ سیٹھ دیکھتا رہ گیا تھا۔ تمنچے کے
سامنے میرے لیے بھی موتی کی ترکیب پر عمل کرنے کے سوا کوئی چارہ
نہیں تھا۔ اس نے بھی دیکھ لیا تھا کہ میرے ہاتھ میں چاقو ہے۔ مجھے
ایک ہی خدشہ تھا کہ چاقو کہیں اور نہ لگ جائے۔ سو بہت احتیاط سے
اسے اچھالا تھا۔ میری نظریں اس کے چہرے اور انگلیوں سے بندھی
تھیں۔ آخر کھٹکا دبانے کے لیے اس کے ماتھے پر شکنیں اور انگلیوں
میں جنبش ہوئی۔ ادھر میں نے بجلی جیسی سرعت سے بائیں طرف ہو کے
چاقو پھینکا۔ کمرے میں گولی کا تیز دھماکا ہوا۔ ساتھ ہی تمنچہ اس کے

ہاتھ سے گر گیا اور خون کی تیز پھوٹ پڑی۔ چاقو کھچا ہوا گڑا تھا
اور اس کے سیدھے ہاتھ کی دو انگلیاں کٹ کے ہاتھ میں جھول رہی
تھیں۔ میں نے جھک کے اس کا تمنچہ اٹھا کے جیب میں ڈال لیا اور
اس کی پیٹی سے خنجر بھی نکال لیا۔ دوسرے کو ٹھوکر مار کے میں نے اس
کے دونوں ہتھیار بھی قبضے میں کر لیے۔ ان دونوں کو ان کی حالت پر چھوڑ
کے میں دور چلا آیا۔ شہ پارہ اور کرین بیگم دیوانہ وار میرے پاس آ کے
میرے ہاتھ اور شانے ٹٹولنے لگیں۔ میرے منہ سے ابھی تک خون جاری
تھا۔ شہ پارہ اپنے دوپٹے کے پلو سے اسے صاف کرنے لگی۔ کرین
الٹے قدموں گئی اور ملازمہ بڑا سا اگالدان لے آئی۔ غرارے کرنے
سے خون کچھ رک گیا لیکن ہونٹ کئی جگہ سے پھٹ گئے تھے۔ کرتے پر
خون کی بوندیں گر گئی تھیں۔ شہ پارہ نے ایک پھاہا فکر میرے منہ میں
ڈال دی اور میرے گال اور گردن سے پسینہ خشک کرتی رہی۔ کرین
پنکھا جھلنے لگی۔ میں نے اسے روک دیا۔

کرم چند ساکت و جامد کھڑا تھا۔ زینے پہ اس کے آدمیوں کے
آنے اور مجھ پر حملہ آور ہونے کے بعد صرف چند منٹ صرف ہوئے
ہوں گے مگر وہ چند منٹ بہت طویل تھے۔ اسے اپنے کرائے کے اور
سسکتے ہوئے آدمیوں کا کوئی ہوش نہیں تھا۔ وہ ششدر ہوئی نگاہوں
سے مجھے تک رہا تھا۔ میں نے سوچا جا کے اسے ایک طمانچہ ماروں مگر
بس نہیں گیا۔ میں نے دور ہی سے دھیمی آواز میں اسے مخاطب کیا۔
"کرم چند! ان کو اٹھا لو۔"

میری آواز سن کے اس نے ایک جھرجھری لی اور خود کو سنبھالا۔
اپنے دونوں آدمیوں کو سنبھالنا اس کے لیے مشکل تھا اور اس کی شان
کے خلاف بھی ہو گا۔ میرے اشارے پر کرین نے گھر کے تمام ملازم اور
سازندے بلا لیے۔ دونوں آدمی اس قابل نہیں تھے کہ زینے جا سکیں۔
پیچھے والا تو تقریباً بے ہوش ہو گیا تھا۔ دو اسے پانی پلانے، جھنجھوڑنے
اور مالش کرنے لگے۔ دوسرے کی انگلیوں پر کپڑا باندھ دیا گیا۔ اس بات
کا قوی امکان تھا کہ سیٹھ کرم چند نیچے جاتے ہی پولیس کا رخ کرے۔
پھر میرے لیے پولیس کو سمجھانا اتنا آسان نہ ہوتا۔ کرم چند پہلے ہی
انھیں بھر رہا تھا اور میرے پچھلے ریکارڈ کے باعث سارا الزام مجھی پہ آتا۔
کرین اور شہ پارہ پولیس میں اس کے خلاف گواہیاں دیتیں تب بھی
دیر تو لگ ہی جاتی۔ مناسب یہی تھا کہ کرم چند پولیس تک جانے کی
ہمت ہی نہ کرے۔ ایک اور احمقانہ بات میرے ذہن میں آئی کہ
میں یہاں سے فرار ہو جاؤں اور اڈے پہ جا کے چھپ جاؤں۔ پولیس
اڈے پر پہنچی تو مغل اس سے نمٹ لے گا، پھر میں اسی وقت باہر
نکلوں گا جب سفر کے لیے روانہ ہونا ہو گا۔ کرم چند نے اپنی آنکھوں
سے یہ سب دیکھا تھا کہ کرین نے اس کے سامنے مغل کا حوالہ بھی دیا تھا۔

اسے کرین کی ایک ایک بات یاد آ رہی ہو گی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ مزید
کسی ہنگامے سے بچنے کے لیے پولیس کو درمیان میں نہ لائے لیکن
اس نے پہلے ہی کرین اور شہ پارہ کی فریادوں پر کان نہیں دھرے تھے۔
اب کیا ضمانت تھی کہ وہ باز رہے گا۔ ساری بات وقت کی تھی۔ وقت
کم تھا۔ ہمیں جلد ہی کلکتے سے روانہ ہونا تھا۔ ایک اور تدبیر بھی تھی کہ
کرم چند کو اتنا تھکا کے اور شکست خوردہ کر کے بھیجا جائے کہ اس
کے پولیس تک جانے کی نوبت ہی نہ آئے۔ میں نے ایک ملازم
سے کہا کہ وہ کالے کو جہاں کہیں بیٹھا ہو اسے بلا لاؤ مگر پھر میں نے اسے
خود ہی منع کر دیا۔ وہ کرم چند کا پروردہ بھی ہو سکتا تھا۔ اسی گھر کے
کسی آدمی نے ہمارے یہاں آنے کی خبر اسے پہنچائی تھی۔ "کرم چند!
اب اپنے لیے تم نے کیا سوچا ہے؟" میں نے اپنی آواز سخت نہیں ہونے
دی۔ "تمھیں یہاں کھڑکی سے نیچے پھینک دیا جائے یا تھانے اور
کرین بیگم کی شہادت پر پولیس کے حوالے کر دیا جائے یا ہم تمھیں
تمھاری ہی موٹر میں اڈے پر لے جائیں جہاں تم تینوں کی قربانی
بھی دی جا سکیں؟"

"ٹھیک ہے۔" وہ گہری سانس لے کے بولا۔ "ہم جاتا ہے۔"
"اور کبھی واپس آنے کے لیے تم یا تمھارا کوئی آدمی اگر بھولے سے
زینے پر چڑھتا دیکھا گیا تو وہ واپس زینے سے نہیں جائے گا۔"
"ہم سمجھتا ہے۔" وہ آہستگی سے بولا۔
"نہیں! اگر سمجھنے میں کوئی کسر رہ گئی ہو تو تم اور میں دونوں یہاں
موجود ہیں۔ تم کو اپنے ان باڈی گارڈوں کو بلانے کی اجازت ہے۔"
"اب ان حرام زادوں کو دیکھ کے کیا کرے گا۔" وہ مایوسی سے
بولا۔ "جو تم بولتے ہو وہ سب ٹھیک ہے۔ تم خوش رہو، سمجھو تو ہم ایک
بات بولے۔"

"بولو۔" میں نے نرمی سے کہا۔
"ہم تمھارے گلے میں اپنی زنجیر ڈالنا چاہتا ہے۔"
"جاؤ جاؤ۔" میں نے اسے دھتکار دیا۔
"ہم ٹھیک دل سے بولتا ہے۔"
"زیادہ باتیں مت کرو۔ دفع ہو جاؤ۔"

شہ پارہ نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کے تحمل کی التجا کی۔ جس
آدمی کی انگلیاں کٹ گئی تھیں وہ دیوار سے ٹیک لگا کے بیٹھ گیا تھا۔
اس کے چہرے سے ظاہر تھا کہ اسے شدید تکلیف ہے۔ سازندے اسے
پنکھا جھل رہے تھے۔ دوسرا بے دم سا پڑا تھا۔ سازندے اسے نیچے لے
جانے کے لیے اٹھانے لگے۔ میں نے انھیں ٹھہرنے کو کہا اور خود
بیٹھک کے دروازے پر اس آدمی کے پاس پہنچا جس کا خون پٹی باندھنے
کے باوجود نہیں رکا تھا۔ پٹی کا کپڑا سارا لال ہو گیا تھا۔ میں نے سازندوں

کو اس کی پٹی کھولنے کی ہدایت کی۔ شہ پارہ اور کرین بیگم میرے قریب
آ کے بیٹھ گئیں۔ اتنے کپڑا منگوا کے میں نے اس کی دو بیکار ہو چکی
جھولتی ہوئی انگلیاں سیدھی کر کے انھیں علیحدہ پٹی سے باندھا اور ان
کو کسنے کے لیے کلائی پر ایک اور پٹی کس دی۔ پھر میں نے اس کا الٹا
ہاتھ لپیٹ دیا۔ تمھارے واسطے دو رنگا اچھی تھی۔ کرم چند کا کوئی بھروسا
نہیں تھا کہ پیچھے جا کے اس کے دماغ میں کیا آ جائے۔ وہ چال بازی
بھی کر سکتا تھا۔ پٹی سے فارغ ہو کے میں دوسرے آدمی کی طرف متوجہ
ہوا۔ کرم چند کو ٹھیرانے کے لیے میری دیر کارگر ہوئی۔ اسی دوران نیچے
سے ان لوگوں کی آوازیں آنے لگیں۔ نیچے انھوں نے موٹر دیکھ لی
ہو گی۔ اس لیے آگ کی رفتار تیز تھی۔ سب سے پہلے کالا اندر داخل
ہوا اور ہونقوں سا ہو کے کمرے کی ابتری دیکھنے لگا۔ "لاڈلے!"
بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "یہ کیا ہے؟"
"ہاں کچھ گڑبڑ ہو گئی تھی۔" میں نے مختصر جواب دیا۔
"تم نے اپائنٹ کیسے نکالا؟"
"بس ہو گیا لاڈلے!"
"ہم کو نے چاند سا لا کے لایا۔ کرین بیگم! اپنے کو لو یہ سب
سالا کیا ہے؟" اس نے کرین کو گلا دبوچ لیا۔
ساتھ ہی ایک دہاڑا۔ "ان کے لاڈلے پر کس حرام کے جنے
نے ہاتھ اٹھایا؟" اس نے کالی نے کے لوچے اور سیٹھ کرم چند کا
گریبان سے اٹھا کے فرش پر پٹخ دیا۔
"ٹھیرو!" میں نے چیخ کر کہا۔ "بات ختم ہو چکی ہے۔"
"اپن کیا دیکھتا ہے لاڈلے! مارتی نے بھی چاقو نکال لیا۔"
"یہ دو آدمی ساتھ لے کے آیا تھا۔"
"اور تجھے کوئی دیر تک لاڈلے؟" کالے نے غصے سے بولا۔
"دیر بھی لگ گئی۔ میں اسے کیا بتاتا کہ میرے ہاتھ کس سے تھے۔"
"کیا یہ سور کے بچے تیرے پیچھے لگے تھے؟"
"کالے!" میں نے بیزاری سے کہا۔ "جانے دے۔"
"کیسے جانے دے۔" وہ سیٹھ کے منہ پر الٹے ہاتھ سے طمانچہ مارتے
ہوئے بولا۔ "کرین اے! اس حرامی کی اولاد کو پتا نہیں کہ لاڈلا
کون ہے؟"
"پتا تھا خالی قسم بتا بابا۔" کرین گڑگڑانے لگی۔
"پھر بھی یہ سالا نہیں مانا۔ اپن کون ہے اور کو پتا تھا؟"
"یہ سیٹھ کرم چند ہیں۔" کرین بہت دھیمی آواز میں بولی۔
"یہ ہے وہ سالا!" کالے نے فرش پر تھوک کے کہا۔ "سکتے ہیں
نیا نیا لگتا ہے۔ فرق کرنے کے نکلا تھا اور تیرا ابھی اپنے کو جیسے لے کے
نہیں [illegible] لاڈلے نے فرش پر [illegible] کے بارے کا دھیان کیا۔"

میں نے جا کے کانتے کا ہاتھ پکڑ لیا۔
"اُستانی کے سامنے کیا یہ شور جا بجا ہوا سنے کے جائے گا؟" کانتے
برہمی سے بولا۔ "وہ کیا بولے گا؟"
"کچھ نہیں عقل جانی نہیں گے تو کچھ نہیں کہیں گے۔"
"پر لاڈلے پہلے اِدھر جو کر جواب دے۔ مجھ کو دیر کیوں لگی؟"
"بہت سی باتوں کا خیال تھا ورنہ کیا دیر لگتی۔" میں نے جھلا کے کہا۔
"وہی تو میں پوچھ رہا ہوں بیٹے۔"
"بتا دوں گا تیری سمجھ میں اس وقت کچھ نہیں آئے گا۔"
"ایمان سے اپنی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔" وہ سر جھٹکنے لگا۔
"میں چاہتا تھا کہ انھیں اُٹھا کے لے جایا جائے۔ تجھے یاد نہیں
کہ میں آگے جلدی جاتا ہے۔" میں نے سرگوشی میں کہا۔
"لاتوں کے بھوت تیری باتوں سے مان جاتے۔ عزیز جو تو اُلٹا ہے
تو پڑھا لکھا ہے۔ سمجھ کی بات ہے۔ میری کھوپڑی تیرا ساتھ نہیں دیتی۔"
کانتے اونچی آواز میں بولا۔
"ان کو پیچھے پہنچانے کا انتظام کرو۔"
"زینے پہ لوٹ دیتا ہوں۔ اپنے آپ چلے جائیں گے۔"
"وہ تنے کو تو میں بھی لوٹ سکتا تھا۔"
"یہی تو میں بول رہا ہوں۔"
"اور یہی بات تیری عقل میں نہیں آ رہی ہے۔ تجھ کو کچھ آگے
پیچھے کا ہوش نہیں۔ تو چپ رہ۔"
کرم چند اور اُس کے آدمیوں کو نیچے چھوڑ کے وہ اُوپر آئے تو
میرے گرد اکٹھے ہو گئے۔ کمرے میں کچھ دیر تک سکوت طاری رہا۔ میرے
زبان نہیں کھولی۔ وہی کرین سے سوالات کرنے لگا۔ جب تک کرین نے
انھیں ایک ایک بات نہیں بتا دی، اُن کی تسلی نہیں ہوئی۔ سازندے
بھیگے ہوئے کپڑوں سے تالیوں سے عمل کے دھبے مٹانے کی کوشش کر
رہے تھے۔ ایک ملازم چائے لے آیا۔ شہ پارہ نے چائے دودھ اور چینی
ملا کے ہم سب کو پیش کی۔ رات بہت ہو گئی تھی۔ کانتے اُٹھا۔ اُس
کے اُٹھ جانے پر سبھی اُٹھ گئے لیکن میں بیٹھا رہا۔
"کیوں لاڈلے؟" کانتے نے ترشی سے بولا۔ "تو نہیں چلے گا؟"
"مجھے کرین بیگم سے ایک بات کہنی ہے۔"
"کیا بات ہے لاڈلے میاں! بندی سے کوئی غلطی ہو گئی ہو تو
معاف کر دینا۔" کرین مضطرب آواز میں بولی اور میری شکل دیکھنے لگی۔
"کرین بیگم! شہ پارہ اب کبھی گائے گی نہ ناچے گی۔"
کرین کے ہونٹ لرز کے رہ گئے۔
"تم نے سیٹھ کرم چند سے دو لاکھ کو کہا تھا، وہ میں تم کو دے
دوں گا۔" میں نے اُس کے جواب دینے سے پہلے تیزی سے کہا۔ "شہ پارہ
اب میری ہے۔ اس کا تم سے کوئی واسطہ نہیں۔ ابھی میں سفر پہ جا رہا ہوں۔
تم کو پچیس ہزار روپے کل کانتے دے دیں گے۔ باقی روپے مل جائیں گے۔ باقی رقم
میرے آنے پر ملے گی جب میں شہ پارہ کو یہاں سے لے جاؤں گا
لیکن اس عرصے میں بالا خانہ بالکل بند رہے گا۔ کانتے تمھارے اور شہ پارہ
کے خرچ کے لیے پانچ سو روپے ماہانہ دیتا رہے گا۔ منظور ہے؟"
شہ پارہ کی بے تاب نظریں میرے چہرے پر پھیل رہی تھیں۔
کرین نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا۔ کمرے میں سوئی بھی گرتی تو آواز آ
جاتی۔ وہ سب مجھے عجیب نگاہوں سے دیکھ رہے تھے جیسے میں پاگل ہو گیا
ہوں۔ "شہ پارہ تمھارے پاس میری امانت کے طور پر رہے گی اور میں
تمھیں صاف بتا دوں کہ مجھے یہاں سے اسے کسی اور بالا خانے پر نہیں
لے جانا ہے۔ اگر تم اس سے کچھ بھی ہمدردی رکھتی ہو تو میری بات مان
لو گی اور یوں بھی یہ شہ پارہ کی مرضی کے مطابق ہے۔ بولو تمھارا کیا
جواب ہے؟"
"تم ہوش میں تو ہو لاڈلے میاں؟" کرین کانپتے لہجے میں بولی۔
"میں بالکل ہوش میں ہوں۔" میں نے اپنی آواز پر ضبط پاتے
ہوئے کہا۔ "تمھیں آج نہیں تو کل شہ پارہ کو کسی نہ کسی کے حوالے کرنا ہی
ہے تو میرے حوالے کرنے میں کیا حرج ہے؟ یہ تمھارے ساتھ اتنے
دنوں سے ہے۔ مجھے تو اس کی منشا کا خیال کرو۔ اگر تم نہیں مانو گی تو میں اسے
یہاں سے اُٹھا کے نہیں لے جاؤں گا لیکن میں تم سے کہتا ہوں ایک دن
یہ ضرور گھٹ گھٹ کے مر جائے گی۔ تم کچھ کم ہو تو مجھے بتا دو۔ سیٹھ نے
مجھ سے یہی کہا تھا کہ تم نے دو لاکھ مانگے تھے۔ وہ دو لاکھ پہ آمادہ نہیں تھا
ورنہ پہلے ہی دے دیتا۔"
"پھر کس وقت بات ہو گی لاڈلے میاں؟ تم جا کے آرام کرو۔"
"بات اسی وقت ہو گی۔ کیا تم مجھ پہ یقین نہیں کرتیں؟ کیا تمھیں
شک ہے کہ میرے پاس رقم نہیں ہے؟"
"میں تم پہ شک نہیں کر رہی ہوں۔ بہتر ہوگا کہ تم اُستاد جی سے
پوچھ لو۔"
"اُن کی بات بعد کی ہے۔ پہلے تم بتاؤ کیا تمھیں کوئی انکار ہے؟"
"میری عقل چکرا گئی۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا جواب دوں۔ ٹھیک ہے، میں نے
سن لیا ہے۔ اگر تمھیں شہ پارہ کی مرضی کا اتنا پاس ہے تو مجھے کچھ سوچنے اور
سمجھنے کا موقع دو۔"
"اس میں سوچنے سمجھنے کی کیا بات ہے۔ تم نے ہزار بار اس پہ
غور کیا ہو گا۔ شہ پارہ تمھاری بیٹی نہیں ہے۔ تم نے بھی
اسے خریدا ہے اور یہی سوچ کے خریدا ہے کہ کل تمھیں اس کے منہ مانگے
پیسے مل جائیں گے۔ ایسا ہے کہ نہیں؟ پھر تمھیں کاہے کا پیچ پڑا ہے؟"
"یہ درست ہے کہ شہ پارہ میرے پیٹ سے پیدا نہیں ہوئی لیکن
یہ میری بیٹی کی طرح ہے۔ پوچھ لو شہ پارہ سے کہ کیا میں نے کبھی اس سے
اُونچے لہجے میں بات کی ہے۔"
"لیکن کوئی ماں اپنی بیٹی کو یوں لوگوں کے سامنے نہیں کر دیتی۔
تم اسے بیٹی تو کہتی ہو مگر ماں کی طرح اس کا خیال نہیں کرتی ہو۔ مجھے
نہیں معلوم تم خود کیسے یہاں آئی تھیں۔ تم بھی ایسے ہی لائی گئی ہو گی جیسے
شہ پارہ کو لایا گیا تھا۔ پھر تم کیوں شہ پارہ کے دکھ کو محسوس نہیں کرتیں؟ اور اگر
تم شروع سے یہاں ہو تو بھی کم سے کم شہ پارہ کی ایک ہم صنف ہونے کے
ناتے تمھیں میری پیش کش پہ تو غور ہی کرنا چاہیے کیونکہ میں شہ پارہ کے لیے
تم سے بہتر ارادہ رکھتا ہوں۔ میں اس کے لیے غلط نہیں سوچ رہا ہوں۔
میں سیٹھ کرم چند نہیں ہوں۔"
"میاں!" وہ تند لہجے میں بولی۔ "کیسی باتیں کرتے ہو۔ ماشاء اللہ
ابھی چڑھتی جوانی ہے، خون گرم ہے۔ زندگی کی اُونچ نیچ سے واسطہ
نہیں پڑا ہے۔ یہاں ساری عمر لوگوں کو دیکھتے ہوئے بیت گئی ہے۔ کتنے
لوگ آئے اور چلے گئے۔ آدمی کا بوجھ سنبھالنا سب سے مشکل کام ہے
خصوصاً کوڑے کے ڈھیر پہ بیٹھے ہوئے آدمی کا۔ اچھے کپڑوں پہ دھبے
پڑ جاتے ہیں۔ آدمی کو تو سنبھال لو گے نگاہیں نہیں سنبھالی جائیں گی۔
کیوں ننگے بچھوتے ہو کس بدنصیب کا بھی یہاں رہنے کو جی چاہتا ہے؟
جو لگتا ہے اُسے کوئی کیسے روک سکتا ہے۔ زمین پہ رہنے والے کو زمین
ہی کی طرف دیکھنا چاہیے۔ تم دو ہی ملاقاتوں میں شہ پارہ کے عزیز ہو
گئے اور جو اس کے ساتھ مدت سے ہے اُسے اس کا بُرا بھلا سوچنے
کے لیے تھوڑا وقت دینے کو بھی تیار نہیں ہو۔ رہی کرم چند کی بات تو
کیا تمھارا خیال ہے میں شہ پارہ کو ہمیشہ کے لیے اُس ہرجائی کے حوالے
کر دیتی؟ مجھے معلوم ہے کب تک اُس کی آنکھ سمٹی رہتی۔ شہ پارہ کو پھر
ایک دن یہاں آنا تھا اور پھر میں ...... میں شہ پارہ کو جُدا کر کے یہاں
کیا خاک پھانکتی۔ میری پونجی شہ پارہ کے سوا اور کیا ہے۔"
"بھی ایسی باتیں کرتے ہیں۔ میں جانتا ہوں سوچنے کا وقت
مانگنا محض ٹال مٹول ہے۔ حیدرآباد کا بازار بند نہیں ہوا ہے۔ تمھارے پاس
پیسے ہوں گے تو تم دس لڑکیاں اور لے آؤ گی۔ پہلے یہاں ایک پری بیگم
بھی تھی، اب نظر نہیں آ رہی ہے۔ وہ کہاں گئی؟ اگر تم زیادہ رقم کی طلب گار ہو تو
بتا دو میں سودے بازی نہیں کروں گا اور تم۔ تمھیں یہاں بیٹھنے کی کیا
ضرورت ہے۔ تم اب اللہ اللہ کیوں نہیں کرتیں۔ اگر تم ضمیر رکھتی ہو کہ
اللہ میاں یہ باتیں ناپسند کرتا ہے تو اس کا احساس کر لو اور چاہو تو
شہ پارہ کے ساتھ ہی رہو۔ تم اُستاد جی سے کہاں جاؤ گی؟ کیوں
اتنی ہوس کرتی ہو؟"
"زیادہ آدمی مت کرو کرین!" کانتے اُسے چپ دیکھ کے ناراضی
سے بولا۔ "لاڈلا اتنی باتیں بول رہا ہے۔"
"ٹھیک ہے میاں! تم جیسا کہتے ہو ویسا ہی ٹھیک ہے۔" خاموشی کے
بعد کرین نے جھجکتے ہوئے زبان کھولی۔ "سفر سے واپس آ جاؤ۔ میرا
شہ پارہ تمھاری رہے گی۔"
شہ پارہ اُس کے بازو سے چمٹ کے بلکنے لگی۔ کرین نے اس کے
سر پہ ہاتھ رکھا۔ خود اُس کی آنکھوں میں بھی آنسو چھلک آئے
آواز میں بولی۔ "قسمت کو یہی منظور ہے تو کون اسے بدل سکتا ہے
"کیا تم خوش نہیں ہو شہ پارہ؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔
اُس نے ڈبڈبائی نظروں سے مجھے دیکھا اور کرین کو چھوڑ
میرے پیروں سے لپٹ گئی۔ اُس کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں۔
کے لیے اُس کے شانے تھامتے وقت میرے ہاتھ بھی کپکپانے لگے
جب میں نے اُسے کھڑا کیا تو اس کا سر میرے کندھے پہ ڈھلک گیا
"کیوں روتی ہو؟" میں نے
سے اُس کی آنکھیں خشک کرنا چاہا لیکن مجھ سے بھی آنسو نہیں
جا سکے۔ جتنا میں روکنے کی کوشش کرتا تھا، آنسو اتنے ہی اُمڈ
کے چلے آتے تھے۔
کانتے میری کمر پہ تھپکیاں دیتا رہا۔ پھر شاید اسی نے کچھ کہا
کرین بیگم نے آ کے شہ پارہ کو تھام لیا اور اُسے مجھ سے جُدا کر کے
گئی۔ میرا دل اُسے ایک لمحے کے لیے وہاں چھوڑنے کو تیار نہیں تھا
لیکن میں اُسے ساتھ بھی نہیں لے جا سکتا تھا۔ سبھی خاموش تھے
سبھی کی آنکھیں بھری ہوئی تھیں۔ کانتے کا سارا جوش جھاگ
اُسے فیض آباد میں چمپا بیگم کے بالا خانے کی بات یاد آ گئی ہو گی۔
مجھے رخصت کرنے کے لیے شہ پارہ ڈیوڑھی تک ساتھ
آئی اور مجھ سے زیرِ لب پوچھنے لگی کہ اب میں کب آؤں گا؟
"اگر کہیں نہ جا سکے تو کسی وقت آنے کی کوشش کروں گا۔ چلے گئے تو
پھر دیکھیں کب ملاقات ہوتی ہے۔ میں کانتے کو سب سمجھا دوں گا۔ وہ سارا انتظام
کرے گا۔ تم کسی چیز کی ضرورت ہو کوئی ایسی ویسی بات ہو تو کانتے کو
بلا کے کہہ دینا۔ میں جلد واپس آنے کی کوشش کروں گا اور اگر نہ
آ سکا! ....." شہ پارہ نے میرے منہ پہ ہاتھ رکھ دیا۔
کرین بیگم بھی پاس ہی کھڑی تھی۔ باہر نکلنے سے پہلے میں نے
اُسے تاکید کرنا ضروری سمجھا۔ "میں اگر نہ آ سکا تو کانتے اسی شہر میں موجود
ہے۔ رقم اسی کے پاس ہو گی۔ یہ تمھیں ادا کر کے شہ پارہ کو اپنے ساتھ
لے جائے گا۔ تم چاہو گی تو کانتے تمھارے اور شہ پارہ کے لیے کسی
اچھی جگہ مکان کا بندوبست بھی کر دے گا لیکن اچھی طرح سن لو تم نے
درمیان میں کوئی چال چلی یا شہ پارہ کو کسی اور کے سپرد کیا تو پھر سمجھ لینا
میں اکیلا نہیں ہوں۔"
"زبان دے چکی ہوں میاں!" کرین ٹھنڈی سانس بھر کے بولی۔

نصیب میاں نے بھی تو بے لہجے میں مجھ سے جامو کے سلسلے میں بات کرنی چاہی تھی۔ میں نے توجہ نہیں دی تو نصیب میاں چپ ہو گئے۔ وہ ایک طرح کی شکایت ہی تھی۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ فرصت ملی تو کسی سے کہے بغیر ان لوگوں کے پاس جاؤں گا تاکہ انھیں پتہ چل جائے کہ تجمل کی وہ آنکھیں نہیں ہیں۔ ایک مرتبہ میں گھمنڈی کو بھی تجمل کے پاس بچا کے لایا تھا۔ تجمل نے میرے کہنے پر اُسے معاف کر دیا تھا مگر اُس نے اسی وقت کہہ دیا تھا کہ یہ پھر کمینہ پن کرے گا۔ کاش تجمل میری بات نہ سنتا۔ ہمارے جانے کے بعد گھمنڈی پھر بدل گیا اور جامو کو اُسے آخری سزا دینی پڑی۔ جامو کی بھی کوئی غلطی نہیں تھی۔ وہ سختی نہ کرتا تو اب تک تو آدمیوں نے نواحی علاقوں ہی میں اڈے جمائے تھے پھر رفتہ رفتہ شہر میں جم جاتے۔ غلطی تو میری تھی کہ میں سب کچھ جانتے بوجھتے کے باوجود تجمل کے ساتھ لگا رہا یہیں تک کہ اس نے مجھے ڈھونڈ لیا تھا مگر اس کے بعد بھی کئی مواقع مجھے اس سے دور ہونے کے ملے تھے البتہ اب دوری کا کوئی امکان نہیں تھا۔

مگر اس وقت تجمل نے یہ بتا کے سب کو دنگ کر دیا کہ نواحی علاقوں میں جینے والے تمام اڈے شہر کے دوسرے اڈوں کی اینٹ کاٹنے اور کمین خان کو مسلسل بھتا پہنچایا کریں گے۔ "میں ان سب کو دیکھ چکا ہوں۔ اُن لوگوں نے مجھ سے وعدہ کیا ہے۔" تجمل نے ہمیں بتایا۔ "صرف کاشی لہو میں ایک سلطان باقی رہ گیا ہے۔ آج رات مجھے اسی کو دیکھنا ہے۔"

میں سلطان کا ذکر کا سننے سے سن چکا تھا۔ ایک دو بار اُس سے جیل میں ملاقات بھی ہوئی تھی۔ کسی زمانے میں وہ تجمل کے اڈے سے متعلق تھا پھر قتل کے ایک معاملے میں اُسے چار سال دلّی جیل میں کاٹنے پڑے تھے۔ آیا تو تجمل نے اُسے اپنے ساتھ نہیں رکھا۔ وہ پہلے اِدھر اُدھر گھومتا رہا اور بعد میں مرجیدار کے اڈے سے مل گیا پھر جب مرجیدار کے تمام اڈے تجمل کی تحویل میں آ گئے تو اس نے سلطان کو نہیں نکالا۔ سلطان لمبے قد کا ایک پھرتیلا آدمی تھا۔ عمر اب کوئی تیس سے اوپر ہو گی۔ چاقو پہ اس کی گرفت مضبوط تھی۔ تجمل ہی نے اُسے چاقو چلانا سکھایا تھا۔ وہ بلند شہر کا رہنے والا تھا اور تجمل کے پاس بچپنے میں آ گیا تھا۔ وہیں سلطان نے اپنی عادت سے مجبور ہو کے پھر ٹھگی مچانی شروع کی تھی۔ جامو نے اُسے تنبیہ کی مگر وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آیا نتیجتاً جامو نے اس سے اڈا چھین لیا اور اُسے کلکتے سے نکل جانے کا حکم دیا۔ وہ شہر کی ایک نواحی بستی کاشی لہو میں چلا گیا۔ وہاں اس نے اِدھر اُدھر سے آدمی اکٹھے کرنے شروع کیے۔ پھر ایک دن کاشی لہو کے استاد جلو کو بے دخل کر کے خود اڈے کا مالک بن بیٹھا۔ کاشی لہو زیادہ آمدنی کا علاقہ نہیں تھا اور پھر سلطان شہر کے اڈوں سے چھیڑ چھاڑ بھی نہیں کرتا تھا اس لیے جامو نے اُسے ڈھیل دی مگر وہ جامو کو اُس سے نمٹنے کے لیے کسی مناسب موقع کی تلاش ہو گی۔ جامو اُسے [illegible] کرنے کے لیے کھلا نہیں چھوڑ سکتا تھا اور اِدھر جامو کو شہر کے اڈوں سے فرصت نہیں ملتی تھی۔ تجمل کی زبان سے سلطان کا نام سنا تو [illegible] کے کان کھڑے ہوئے۔ رات کا کھانا ہم نے خاصی دیر سے کھایا۔ [illegible] اوڈیو ٹیلیٹ میں جانے کے بجائے مجھے چیرہ جامو کا نے [illegible] اور لاچی کورے کے اڈے سے باہر نکل آیا۔ ظاہر ہے وہ باقی [illegible] چاہتا ہوگا۔ وقت گزرا جا رہا تھا۔ مجھے اِدھر شبہ باڑی کی نکڑ [illegible] نے دن بھر میرا انتظار کیا ہوگا۔ میں اب بھی دیر پہنچا تو وہ واپس [illegible] وہ کھڑکی میں کھڑی ہر آنے جانے والے کو تکتی ہو گی۔ ڈیڑھ [illegible] آہٹ پر اس کے کان لگے ہوں گے اور بار بار اُسے کریمن کی [illegible] نظروں کا سامنا کرنا پڑتا ہوگا۔ تقریباً ہزار روپے کا چیک [illegible] رکھا تھا جو میں نے بینک ہی میں لکھ لیا تھا لیکن دو دن [illegible] مجھے دونوں کو وقت نہیں ملا۔ ہم میں سے کوئی ایک ہی [illegible] تھا۔ میں نے نصیب میاں کی بابت سوچا تھا کہ انھیں چیک [illegible] بھیج دوں گا لیکن ان سے کہنا مناسب نہیں لگا۔

اڈے سے کاشی لہو کا فاصلہ دس میل سے کم نہ ہوگا۔ [illegible]

تو سلطان اپنے آدمیوں کے ساتھ اڈے کی گلی کے نکڑ پر [illegible] کی سمت چلے سے آ چکی تھی۔ وہ ہنگ کھیل رہا تھا۔ تجمل اس [illegible] تھا اب ہم چباڑی پڑنے سے وہ کچھ اوندھا گیا۔ [illegible] پڑتے ہی اس نے تن دہی سے اسے سلام کیا اور اس کے [illegible] اس کے ساتھ کے بھی آدمیوں نے اس کی تقلید کی لیکن [illegible] کے کسی آدمی نے ہمیں سلام نہیں کیا۔ اس کے انداز سے [illegible] کہ اُسے تجمل کے آنے کی خبر تھی۔ تجمل ہی نے کہلوا دی ہوگی۔ مجھے اس کی تصدیق بھی ہو گئی۔ اس نے تجمل سے پوچھا: [illegible]

"ہاں رے راستہ بڑا ہے۔" تجمل نے جباڑی [illegible]

سلطان ہمیں اڈے کی عمارت میں لے گیا۔ عمارت [illegible] بڑی نہیں تھی لیکن صاف ستھری تھی۔ صحن میں تخت پر سفید [illegible] تھی۔ اس نے تجمل کو وہیں بٹھا دیا اور خود کھڑا رہا۔ تجمل کے [illegible] بھی تیار تھا۔ شروع شروع میں وہ کچھ گھبرایا ہوا نظر آتا تھا مگر [illegible] کے چہرے پہ ایک ٹھہراؤ پیدا ہو گیا اور وہ اپنے آدمیوں کو [illegible] مدارات کے حکم دینے لگا۔ "رہنے دے۔ مجھ کو جلدی ہے۔" تجمل [illegible] اُسے منع کر دیا۔

"کیسے میرے بھاگ کھلے، اُستاد غریب کی جھونپڑی [illegible]" ایک وار آواز میں بولا۔ "مجھ کو بلا لیا ہوتا۔"

"تجھ کو دیکھنا تھا سلطانے کہ تو نے کیا تیر ملے ہیں۔"

"تیر کیا" وہ کندھے اچکا کے بولا۔ "جینے کا سہارا کر لیا ہے۔"

تجمل برہنے لگا۔ "یہ پراب کیا تیرے سر میں ہے؟"

[illegible] وہ بری سے بولا: "کیا تم ہی کہنے آئے ہو؟"

"میرے پاس وقت نہیں ہے سلطانے کہ میں تجھ سے لمبی باتیں [illegible] سکوں۔ میں نے اِدھر کاشی لہو میں اُستاد جلو کو رکھا تھا اور اپنی جگہ [illegible] جامو کو چھوڑ گیا تھا۔ تو نے جلو سے اڈا لے لیا۔ کیا یہ سمجھ کے [illegible] کہ اُستاد مر گیا ہے؟"

"یہ بات ما تھا اُستاد۔ اب سب یہی کہتے ہیں کہ اُستاد ختم ہو گیا [illegible] بات دوسری تھی لیکن اپنے کو کسی اور کی تابعداری کرنی [illegible] اور پھر جامو نے خود ہی ہتک کی۔ بار بار ہتک اڑاتا تھا۔ [illegible] اڈے کے آدمیوں کے سامنے اپنے کو بے عزت کیا۔ مجھے [illegible] کے سامنے کیا رہا ہوں۔ ہم نے بھی سب تمھارے ہاتھوں سے سیکھا [illegible] تو ہم پر بھی حق بنتا ہے۔ نئے نئے آدمی آ کے تمھارے سر پر [illegible] پرانے سالے اور پیچھے چلے گئے۔ کبھی تم نے نہیں پوچھا [illegible] سلطانے تیرے منہ میں کے دانت ہیں۔ خوار کہیں پھر رہا ہے۔ مجبوراً [illegible] جامو کی گلی میں جانا پڑا۔ میں جو کر اب بھی کاشی لہو سے نہ [illegible] اگر جامو ٹھیک طرح چلتا۔ اپنی بھی کوئی عزت ہے اور یہ تمھاری [illegible] دی ہوئی ہے۔"

تجمل اب سن رہا۔ جامو اس کے پیچھے کرنے میں گردن [illegible] بیٹھا تھا۔ "اور کچھ بولنا ہو تو بول لے۔" تجمل نے تختی ہو لی [illegible] میں کہا۔

"اور کیا بولوں۔ تم سب سمجھتے ہو۔" وہ بگڑ کے بولا۔

"کچھ رہ گیا ہو تو پھر اس نکال لے۔"

"کبھی پہلے بھی ایسے کہنے کا موقع دیتے۔ سالا چپ کا ہو گئے تھے جیسے [illegible] بولنا آتا ہی نہیں تھا۔ میں نے بھی چپ اپنا حق لے لیا ہے اُستاد۔"

"ابھی تو میں زندہ ہوں سلطانے۔ حق تو میرے مرنے کے بعد کرتا۔"

"تم نے پوچھا ہے تو سیدھی بات بتا دی ہے۔ تم سدا زندہ رہو۔ [illegible] تمھارا دشمن ہے۔"

"[illegible] تجمل [illegible] لہجے میں بولا۔ "تو نے کبھی دھیان نہیں دیا [illegible] سر پہ کیوں چڑھ بیٹھا۔"

"اپنے سے وہ بات نہیں ہوتی جو اور لوگ تمھارے ساتھ کرتے [illegible] اپنی زبان بھی کچھ ہوئی ہے۔ ہاتھ میں اپنے کو برداشت [illegible] صاف بولتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ اڈا کسی کے باپ کی جاگیر نہیں ہوتا اور اگر کوئی ایسا [illegible] دیر تک نہیں رہتی۔ اڈے کا جو آدمی مال [illegible] ٹھیک طرح نہیں ہوتا۔ اسی کو ملتا ہے جس کا سر اور ہاتھ [illegible] اس کا بوجھ اٹھا سکے اور جس کا ذہن ٹھیک ہو۔ تیرا ذہن پہلے ہی سے خراب رہا ہے۔ تیرے ہاتھ بھی بہک جاتے ہیں سلطانے! ٹھیک چلتا چلتا پچھاڑی دکھانے لگتا ہے۔ تجھ کو تو منہ کھولنا بھی نہیں آتا۔"

"تمھارے ہی ساتھ رہا ہوں۔"

"میرے ساتھ رہ کے بھی میرے ساتھ نہیں رہا سلطانے، ورنہ ہوتی نہیں مارتا [illegible] لیے! میں پھر جا رہا ہوں کالے اور کمین کو جامو کی جگہ چھوڑ کے تیری رائے کیا ہے؟"

"آج میری رائے پوچھنے کی ضرورت کیسے پڑ گئی؟" وہ زہرخندے بولا۔

"اس لیے کہ جو کر تو اپنی کھال میں ہی ہے۔ اوقات بھی بولتے ہیں اسے۔ کیوں لاڈلے؟" وہ مجھ سے مخاطب ہو کے بولا۔ میں چپ رہا۔ وہ کہنے لگا: "میں کالے اور کمین دونوں کو لایا ہوں اور بھی لوگ ہیں۔ اپنا حق جتانا ہے تو چاقو کھول کے جتا لے اور ایک بار پھر ذرا غور سے دیکھ لے کہ کون لوگ میرے سر پہ بیٹھے ہیں۔ نکال لے اپنی حسرت۔ ان کے سامنے چاقو کھولتے ہوئے تجھے لاج آتی ہے تو اور بھی ہیں۔ اِدھر میں بھی ہوں۔ دیکھتا ہوں تیرا ہاتھ کتنا کھلا ہے۔ ویسے ڈیل تو تو نے بیل کی طرح پھیلا لیا ہے۔"

"کیا تم اسی واسطے سے آئے ہو؟"

"میں نے تجھے کہلوایا تھا۔ تیرے ٹھکانے میں جیسا ہوتا تو میرے پاس خود آ جاتا مگر تو نے میرا اِدھر انتظار کیا۔ تیری اولاد! چاقو یہ رکھا ہے۔ بول کس کو دوں؟ فیصلہ کر لے کہ کس کا حق بنتا ہے۔ پھر تو ٹھنڈا پڑ جانے لگی تیرے کلیجے میں؟ بڑا اسی طرح ہوتا ہے۔ تیرے وار کرنے کی ضرورت ہے تبھی سر پہ ہے سکیں گے۔" سلطان کی آنکھیں پھٹنے لگیں۔

"دیر ذرا کر رات بہت ہو گئی ہے۔ لوٹنا بھی ہے۔ میں بولتا ہوں سالا کلکتہ تیرا ہے نہ تیرے باپ کا ہے۔ ہم سب اِدھر سے اپنا بوریا بستر لے کے چلے جائیں گے تو اِدھر مستی کرنا۔ جامو کو بھی اٹھا لے یا سب کو لے۔ اور بھی لوگ اُدھر اڈے پر پڑے ہیں۔ تو بولے تو اُن میں سے کسی تیرے جوڑی دار کو بلا لوں؟"

سلطان نے کوئی حرکت نہیں کی بت کی طرح کھڑا رہا۔

"کیوں کا ہے جھجک کرتا ہے۔ اٹھا ہتھیار۔"

سلطان دم سادھے اُسے تکتا رہا۔

"جب تک میری آنکھیں کھلی ہیں سلطانے! میرا واسطہ تجھ سے ہے۔ میں گیا کے بچے کو بھی کہیں نہ اپنی جگہ بٹھا جاؤں۔ [illegible] پیچھے تو پہلے کے بھی کھڑا ہوں۔ بٹھایا تو میں نے اسے ہے اور کچھ دھیان کر کے ہی بٹھایا ہوگا۔ اس سے تم گرم اس سے نہیں مجھ سے ہے اور مجھ سے تم گرم اس وقت تک میرے لیے بنے ہے جب تک میرے پاس چاقو ہے اور میرے ہاتھ کو اسے سنبھالنا آتا ہے اور میں

ٹوٹ پھوٹ کے آثار ہوں گا۔ میرے بعد تو جس سے چاہے زاد کر کے
دیکھ لینا۔ اب ان کے پیچھے تو میں ہوں۔"
سلطان نے اپنا چاقو نکال لیا۔ چند لمحوں تک وہ آنکھیں بند
کیے اور ہونٹ بھینچے کھڑا رہا۔ پھر اس نے جھٹکے ہوئے انداز میں اپنا
چاقو اور سر جھبل کے پیروں میں ڈال دیا۔
جھبل نے اس کے بال پکڑ کے کھینچنے شروع کر دیے۔ سلطان بڑبڑانے
لگا۔ "اکیلا چاقو کچھ نہیں ہوتا ہے۔ جانتا ہوں تیرا ہاتھ خوب چلتا ہے۔
پر صرف ہاتھ ہی نہیں چلتا، کچھ اور بھی چلتا ہے اور اس میں تیرے کئی
پڑے ہیں۔ چل میرے ساتھ۔"
جھبل نے اسے اٹھایا تو وہ جیسے ٹوٹ گیا۔ جھبل اسے اٹھائے
ہی پرے لے آیا۔ پھر چاہا اور پیرو کے ساتھ اوپر عمارت میں لے گیا۔
رات کے ڈھائی بجے ہوں گے۔ اب شبہ باڑے کے پاس جانے
کا کوئی سوال نہیں تھا۔ میں یا کانتے اتنی رات گئے۔ دروازے کیسے کھٹ
کھٹاتے۔ پہنچتے پہنچتے اور رات ہو جاتی۔ ہم دونوں بستروں پر لیٹ
گئے۔ تھوڑا سا ہی نہیں مانا۔ میں نے آخر کانتے کو جھنجھوڑا۔ وہ جاگ رہا تھا۔
"کانتے! اُسے بھی نیند نہیں آ رہی ہوگی۔" تھا کے پر چپک دیے آنکھیں
نے اس کی منت کی۔
"صبح ہونے آئیں گے لاڈلے!" وہ غمزدہ لہجے میں بولا۔
"صبح اگر پھر وقت نہ ملا جیسے آج..."
"ایک دو دن دیر بھی ہو جائے تو کیا حرج ہے۔"
"وہ کیا سمجھے گی، تجھے اس کا خیال نہیں آتا؟"
کانتے نے کچھ دیر سوچا پھر ہم دونوں نیچے آ گئے۔ باہر کے
دروازہ بند تھا۔ کانتے نے نلوا کو جگا کے دروازہ کھلوایا۔ سواری ڈھونڈنے
میں اور وقت گزر گیا۔
وہاں گلیوں میں بھی ایک آدھ دکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ سپاہی
گشت کر رہے تھے۔ بعض بالا خانوں پر بھی روشنی تھی مگر کسی طرف سے
گانے بجانے کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ کرمن بیگم کا سارا گھر اندھیرے میں
ڈوبا ہوا تھا۔ میں ڈیوڑھی کے باہر نزدیک ہی ایک جگہ رک گیا۔ کانتے
نے مجھ سے بھی چلنے کو کہا لیکن میں آگے نہیں گیا۔ شبہ باڑے مجھے روک
لیتی اور اس کے سامنے کرمن بیگم کو چیک دیتے ہوئے بھی مجھے اچھا
نہیں معلوم ہوتا تھا۔ کانتے نے آنے میں دیر لگا دی حالانکہ دروازہ
کھلنے میں دیر نہیں ہوئی تھی۔
"کیا ہوا؟" اس کے آتے ہی میں نے بے چینی سے پوچھا۔
"دے دیا۔" وہ ہانپتے ہوئے بولا۔
"کرمن بیگم ملی تھی؟"
"وہ بھی تھی۔"

"کچھ کہتی تھی؟"
"کہتی کیا؟ چھالیہ ساندنے لگی کہ لے شکر کے بدلنے کی
ضرورت نہیں ہے۔ لاڈلے میاں جب بھی آئیں آ کے تماشے
جائیں۔ میں نے چیک اس کے آگے ڈال دیا اور چلا آیا۔"
"پھر تجھے اتنی دیر کیسے ہو گئی؟"
"وہ بڈھا ضرار ہی شباہت نے مجھے روک لیا۔ تیرا خیال ٹھیک
وہ جاگ رہی تھی۔ دروازے پہ وہ تیں ہی پہ لکھے کو کیا ہوگا کہ
پوچھتی رہی کہ لاڈلے کیوں نہیں آیا۔ میں نے بولا لاڈلے کو کچھ کام
"کیسی تھی وہ؟"
"بہت خوش تھی لاڈلے! میں نے شباہت کو اتنا
دیکھا۔ مجھے دیکھتے ہی گال جھبل کی طرح کھل گئے۔ بس جانی
میں مجھ سارے پیسے وصول ہو گئے۔ تیرے آنے میں اگر دیر
میں آئے پیچھے نہ کے لے آؤں گا اور بمبئی سے ہوئی کرکی
بالوں گا۔ استاد نے آئری کی تو اس کو بھی دیکھ لوں گا۔"
"ایسا ہو جائے تو کیا بات ہے کانتے! جتنی جلدی اُسے
یہاں سے نکال لے اچھا ہے۔ مجھ پر بڑا احسان ہوگا۔" کانتے نے
زور سے تھپیڑ مارا اور گلے لگا لیا۔

میں آ کے سو رہا۔ اس دن نصیب میاں نے مجھے
اٹھایا۔ آنکھ کھلی تو دن نکل آیا تھا۔ نیچے جھبل موجود نہیں تھا اور
کئی لوگ نہیں تھے۔ نصیب میاں نے مجھے بتایا کہ جھبل پیرو
دوسرے لوگ میں کو اسٹیشن پہنچانے گیا ہے۔ مجھ سے
گیا۔ نصیب میاں کو اس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں تھا۔ پھر
پتہ چلا کہ وہ دونوں بالاکو، جمنی، پلٹو، زودا اور عذیرے کے
روانہ ہو چکے ہیں۔ ان کی سمت کی خبر ملی کرکی نہیں تھی۔
کے مطابق ان کے ساتھ سامان زیادہ نہیں تھا۔ سوچتے سوچتے
بھٹکنے سا لگا۔ ہزاروں وسوسے ذہن میں گردش کر رہے تھے
پہلے سے روانگی کے باعث مجھے اپنا یہ اندازہ درست معلوم
کہ جھبل انہیں مختلف مقامات پر بھیجنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ یہاں
وہ ایک ساتھ گئے ہیں آگے کسی مقام سے جدا جدا بھی ہو
وہیں سے دور دور جا سکتے تھے اور اس میں پردہ پوشی کی
بات تھی۔ کسی کو کچھ خبر نہیں تھی یا وہ سب مجھ سے چھپا
جھبل کی یہ احتیاط بے سبب تو نہیں ہوگی۔ جب میں ساتھ
تھا تو بتا دیتے ہیں کیا رکاوٹ تھی اور نہ بتانے میں کون سی مصلحت
دن کے باقی حصے میں روانگی سے خائف رہا۔ سلطان
منٹن کو لیے نہ جانے کہاں کہاں گھومتا رہا۔ رات کو اس کی

مجھے بالکل منہ کر رکھا تھا کہ آج اس سے ضرور بات کروں گا لیکن پھر
اس کی صورت دیکھ کے میری ہمت پست ہو گئی۔ وہ بہت تھکا ہوا
نظر آتا تھا۔ چہرے پہ شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔ رات کا کھانا بھی اس نے
نہیں کھایا۔ میں نے منٹن اور سلطان کو ٹٹولنے کی کوشش کی تو ان سے
اس کے سوا کوئی خاص بات معلوم نہیں ہو سکی کہ وہ بازار میں خریداری
کرتے رہے اور جھبل انہیں باہر چھوڑ کے شہر کی کئی دکانوں میں گیا۔
عجلت میں تو پرسوں کے لیے جانے وقت جھبل نے ہمیں جلد اٹھنے
کی تاکید کی اور بتایا کہ صبح ہم رگون کی روانگی ہے۔ مجھے کسی قدر سکون
ہوا۔ ایک رات کی بات اور تھی۔ مگر رات بھر ایک پل کے لیے میری آنکھ
نہیں لگی۔ صبح سب سے پہلے میں ہی جاگ گیا۔ ناشتہ کرتے ہی جھبل نصیب
میاں اور دوسرے لوگوں سے گلے مل کے اڈے سے چل پڑا۔
اسٹیشن پر ہمیں رخصت کرنے کے لیے بھیڑ نہیں تھی۔ کانتے
تھا، کیمن میاں، ماجھی، سلطان، حمیدا اور مٹو۔ اس وقت بھی جھبل کو دیکھتے
رہ گئے جب اس نے سلطان کو گاڑی سے نہیں اترنے دیا۔ اپنے ساتھ
ہی بٹھائے رکھا۔ میرے، سلطان اور جھبل کے علاوہ ڈبے میں سارے
مسافر اور ماجھی بھی تھے۔ کانتے اور کیمن میاں مجھ سے لپٹ کے رونے
لگے اور نہ جانے کیا کیا کہتے رہے۔ جب تک گاڑی نہیں چلی کانتا میری
آنکھوں سے چپکا کھڑا رہا۔
میری آنکھوں پر پٹی نہیں بندھی تھی۔ میں گزرتے ہوئے تمام
اسٹیشنوں کے نام صاف پڑھ سکتا تھا۔ جیسے جیسے گاڑی آگے بڑھتی گئی
میری حیرت سوا ہوتی گئی۔ ہم بنگال عبور کر کے آسام کی طرف بڑھ رہے
تھے۔ ان علاقوں سے کبھی میرا گزر نہیں ہوا تھا۔ جھبل درمیان میں کہیں
نہیں اترا۔ دوسرے دن ہم شمالی آسام کے ایک بڑے قصبے یا ایک چھوٹے
شہر ڈبرو گڑھ میں اتر گئے۔ جیسے ہی گاڑی رکی سامنے پلیٹ فارم پر
ماجو کو دیکھ کے میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا مگر وہ ہمارے قریب
نہیں آیا۔ دور کھڑا ہمیں دیکھتا رہا۔ میں نے اس کی طرف بڑھنے کا ارادہ
کیا تو جھبل نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ماجو اجنبیوں جیسے انداز میں ہماری
جانب سے گزرتا ہوا اسٹیشن سے باہر نکل گیا۔ اس کے ساتھ ایک اور
شخص بھی تھا۔ وہ شخص کلکتے میں جانثار خاں کے اڈے سے تعلق رکھتا
تھا۔ میں اس کا نام تو نہیں جانتا تھا لیکن صورت آشنا تھا۔ صورت بھی
مجھے یوں یاد رہ گئی کہ اس کے خط و خال عجیب اور وحشیوں جیسے تھے۔
سفر کے دوران کئی ہی موقع آئے کہ میں جھبل سے کچھ پوچھ سکوں مگر
کچھ سوچ کے میں ہر بار خود کو روک لیتا تھا کہ اب جلد ہی سب کچھ خود بخود
معلوم ہو جائے گا۔ جھبل کب سے ایک خاص شخص ہے۔ ڈبرو گڑھ کے پلیٹ
فارم پر قدم رکھتے ہوئے میرا خون رگوں میں سنسنانے لگا تھا۔
شہر میں پختہ مکانات کم، لکڑی اور بانس کے گھر زیادہ بنے تھے۔

مچھروں کی بہتات تھی۔ ٹھنڈ بھی اچھی خاصی تھی۔ جھبل کے کہنے پر ہم سب
نے گرم کپڑے پہن لیے تھے۔ ہمیں اسٹیشن سے بہت دور نہیں جانا پڑا۔
قریب ہی ایک سرائے جیسے ہوٹل میں پہنچ کے ہم ٹھہر گئے۔ مسلمان ہم
سے پہلے ہیرو، زودا، جمنی، پلٹو اور بالاکو موجود تھے۔ سرائے میں ہمیں
داخل ہوتے وقت انھوں نے بس ایک اجنبی نظر سے دیکھا اور خاموش
بیٹھے رہے۔ ہم میں سے کسی نے آپس میں بات چیت نہیں کی۔ کچھ دیر
بعد ماجو بھی وہاں پہنچ گیا۔ جھبل کے ساتھ کوئی خاص سامان تھا۔ بستر بند الگ
تھے۔ یہ چیزیں ہم جیسے کمروں میں منتقل کر کے شہر دیکھنے کے لیے
باہر نکل آئے۔ منٹن، سارے اور سلطان کو جھبل نے ہوٹل ہی میں چھوڑ
دیا تھا۔ ڈبرو گڑھ میں چھوٹے موٹے کئی بازار تھے۔ طرح طرح کی شکل
صورت اور رنگ روپ کے لوگ نظر آ رہے تھے۔ عام طور پر پست قد اور سیاہ۔
اس دن مینڈھوں کا کوئی تہوار تھا۔ بڑے بازار میں شور مچا ہوا تھا۔ لوگ
ناچ رہے تھے۔ لوگ جلوس کی شکل میں ایک بڑی مورتی اٹھائے اس پر
پھولوں کی پتیاں پھینکتے ہوئے آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے۔ کچھ
دور جا کے ہمیں بدھوں کا ایک مندر بھی دکھائی دیا۔ اچانک تیز بارش
ہو گئی۔ جلوس تتر بتر ہونے لگا۔ ہم دوڑتے ہوئے ہوٹل واپس آ گئے۔
ہوٹل میں بجلی بھی نہیں تھی۔ لیمپ اور گیس کے ہنڈوں سے روشنی
کی جاتی تھی۔ ہم سے کسی کمرے میں بیٹھا نہیں جاتا تھا۔ مچھر کانوں میں بھن
بھناتے تھے اور جسم سے چمٹ چمٹ جاتے تھے۔ رات کو کھانے کے وقت
یکایک ہوٹل میں ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ سارے اور زودا میں کسی بات پر تو تو
میں میں شروع ہوئی اور نوبت ہاتھا پائی تک پہنچ گئی۔ ہم نے اور ہوٹل
میں ٹھہرے ہوئے دوسرے لوگوں نے بیچ بچاؤ کرایا تو ہنگامہ فرو ہو گیا۔
سارے اور زودا اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے لیکن ہوٹل کی فضا میں ایک
تکدر پیدا ہو گیا تھا۔ ہوٹل کے بنگالی مالک نے انھیں تنبیہ کی اور ہم سے
معذرت چاہی۔ بیچ بچاؤ میں جھبل اور ہیرو کی بات چیت شروع ہو گئی
تھی۔ وہ آپس میں ایک دوسرے سے ایسے ملے جیسے پہلی بار مل رہے ہوں۔
مسافروں اور ہوٹل کے لوگوں کو دور دور تک یہ گمان نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ
ایک دوسرے سے واقف ہیں۔ ان میں تھوڑی ہی دیر بات ہوئی پھر
وہ اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ ہوٹل میں ناخوشی چھائی ہوئی تھی۔
رات تنہا یہ وہاں جلد ہو جاتی تھی۔ ہم تین تین ایک ایک کمرے میں تھے۔
جھبل، ماجو اور میں ایک کمرے میں، دوسرے میں سارے، منٹن اور
سلطان۔ کمرے میں اندھیرا کم تھا اور روشنی باہر سے بڑی کھڑکی سے آ رہی تھی یا
سکتی تھی۔ مجھے وحشت ہو رہی تھی اور ڈر سا بھی لگ رہا تھا جیسے ابھی
کچھ ہو جائے گا۔ دل کبھی ڈوبنے لگتا، کبھی اتنا تیز دھڑکتا کہ میں ہانپنے
لگتا۔ مجھ سے ایک کروٹ نہیں لیٹا جا رہا تھا۔
مارکی کرسیاں لگی تھیں۔ جھبل اپنی چارپائی پر پڑا لمبی لمبی سانسیں

کھینچ رہا تھا۔ کمرے میں بہت سردی تھی۔ روزنوں سے ہوا اندر تک آ رہی تھی اور لیمپ کی لَو تھرتھرا رہی تھی۔ رات کو کسی وقت مجھے ثجل کی آواز سنائی دی۔ میرا سارا جسم دہل سا اُٹھا۔ وہ مجھے پکار رہا تھا۔ جواب دیتے ہوئے میری زبان لکنت کرنے لگی۔ وہ اُٹھ کر میرے ہی بستر پر چلا آیا اور میرا رجیب چھپاتے ہوئے آہستگی سے بولا "سو یا نہیں رہے؟" میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ میں نے اپنے ہونٹ بند ہی رکھے۔

"مجھ کو پتہ ہے تو مجھ سے خفا ہوگا پر میں تجھ سے کیا بات کرتا۔ مجھ سے ایک دن بھی چپ سے نہ کاٹا جاتا۔"

"تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" میں نے لرزیدہ لہجے میں کہا۔

"درمیان سے روکنی بات بیچ میں آیا، تجھ کو بول دوں پر اس لیے چپ کا رہا کہ تو ٹھیک طرح ہاتھ پیر بھی نہیں چلانے دے گا۔"

"کیا بات ہے؟"

"بات بڑی نہیں ہے پر بڑی بھی ہو سکتی ہے۔"

"پہیلیاں مت بجھاؤ۔ جلدی بتاؤ۔"

"بتاتا ہوں رے۔" وہ خفگی سے بولا۔ "اُدھر فیض آباد میں چلنے سے تین چار دن پہلے بمبئی سے شکلا کی چٹھی آئی تھی۔ میں نے تجھ کو نہیں دکھائی۔ شکلا نے لکھا تھا کہ تیرے باوا کو ڈیڑھ دو مہینے پہلے شیلانگ میں دیکھا گیا ہے۔"

"نہیں۔" میری آواز گلے میں گھٹ گئی۔

"ہاں رے، ابھی میں بات پوری سنا دوں۔ چٹھی ملتے ہی شکلا کو گیا۔ وہ اُدھر بمبئی میں نہیں تھا۔ شملے پھیری پر گیا ہوا تھا۔ آ کے اُس نے چٹھی پڑھی تھی۔ لکھا تھا کہ تیرے باپ کی صورت کا آدمی شیلانگ میں دیکھا گیا ہے۔ ایک پولیس والے نے تیرے باوا کے سامنے اُس کا اصل نام بولا تو وہ گھبرا گیا۔ ہوٹل میں اُس نے دوسرا نام لکھوایا تھا پر اُس کا حلیہ وہی تھا جو کرشنا جی نے چٹھیوں میں لکھا تھا۔ پولیس والے نے اُس سے پوچھا کہ کیا تم صفدر زماں کو جانتے ہو؟ تیرے باوا نے منع کر دیا مگر اُس کی گھبراہٹ دیکھ کے پولیس والا ہوشیار ہو گیا۔ اُس کے پاس کوئی چالان نہیں تھا۔ نہ اُسے کسی جرم کا پتہ تھا۔ وہ چپ چاپ چلا آیا اور اُس نے بمبئی پولیس کو لکھا۔ چٹھی پڑھتے ہی شکلا نے فوراً شیلانگ تار دیا۔ جواب آیا کہ وہ اُدھر نہیں ہے۔ پولیس والا دوسرے ہی دن اُسے دیکھنے گیا تھا مگر وہ ہوٹل سے جا چکا تھا۔ پھر شکلا نے مجھ کو سارا حال لکھ کے بھیج دیا۔"

میرے کان جلنے لگے۔ ثجل کہہ رہا تھا کہ جیسے ہی اُسے ایس پی شکلا کا خط موصول ہوا، اُس کے دل میں آئی کہ وہ فوراً فیض آباد سے آسام کی طرف چل پڑے لیکن اُس نے تامل کیا۔ شکلا کے خط کے مطابق ابا جان ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اُن کے ساتھ گھر کا کوئی فرد نہیں تھا۔ میں نے ابا جان سے متعلق ایک ایک بات ثجل کو بتائی تھی اور بمبئی میں ابا جان کے دوست مولوی اکرم سے ملنے کا واقعہ بھی وہ مجھ سے سن چکا تھا۔ پھر اسے ان کے بارے میں جہانگیر سے معلومات حاصل ہوئی ہوں گی۔ میرے گھر سے نکلنے کے بعد ایک عرصے تک ابا جان کے ساتھ وہی رہا تھا۔ اس نے بھی اسے یہی بتایا ہوگا کہ ابا جان نوادرات کی چھان بین میں شب و روز مصروف رہتے تھے۔ نہ انھیں صبح کی فکر تھی نہ شام کی۔ کیونکہ ان نوادرات کے ساتھ جو ہو لہراتی تھی، انھیں بقیہ زندگی کے دن وہ اپنا گزارا کرتے تھے۔ مکان اور زمینوں کی فروخت سے بھی انھیں ایک معقول رقم حاصل ہوئی ہوگی۔ کچھ نقدی اُن کے پاس ہوگی۔ وہ جواہرات اتنے بیش قیمت تھے کہ شاید انھیں اپنی نقدی خرچ کرنے کی ضرورت بھی نہ پڑی ہو۔ بمبئی میں کرشنا جی کے ساتھ میں جس جوہری سے ملا تھا، اُس کی باتوں سے اُن جواہر کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا تھا۔ کاش کہ اس رات خالی ہاتھ آ جاتی۔ جواہرات اور نوادرات ہمیشہ کے لیے ساتھ نہ لاتی۔ پھر شاید یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ نہ یہ نوادرات ہوتے نہ ابا جان اپنے آپ سے اتنے بے خبر ہوتے اور اتنی جلدی یوں ... ہوتے۔ ابا جان میری تلاش میں ضرور نکلتے یا رو پیٹ کے بیٹھ جاتے مگر سب گھر ہی میں رہتے اور فہمیدہ مجھے دیکھ کے اس طرح گھر سے کو نہ جاتی۔ مولوی اکرم نے جب بھی ابا جان کو ٹوکا، انھوں نے ایک ہی بات دہرائی کہ مولوی اکرم، تم نہیں جانتے ان نوادرات میں کیا چھپا ہوا ہے۔ میں ان میں صرف ہونے والے ایک ایک پیسے کی قیمت وصول کروں گا اور اس دوران انھوں نے فہمیدہ کو ضائع کر دیا۔ ثجل کو معلوم تھا کہ مجھ سے پہلے کرشنا جی نے ہندوستان بھر کی پولیس کو ابا جان کے بارے میں خط لکھے تھے۔ کرشنا جی کو امید تھی کہ ایک دن وہ ان کا سراغ یقیناً لگا لیں گے۔ کرشنا جی زندہ رہتے تو انھیں ڈھونڈنے کی اور کوئی نہ کوئی ضرور سبیل کرتے۔ اُن کا کام ہی سراغ لگانا تھا لیکن وہ بھی چلے گئے۔ اُن کے جانے کے بعد ایس پی شکلا کو دو ایک جگہ سے کرشنا جی کے لکھے ہوئے خطوط کے جواب موصول ہوئے مگر سب بعد از وقت تھے۔ ابا جان وہاں سے پہلے ہی جا چکے تھے۔ کرشنا جی کی طرح شکلا جی کو بھی امید تھی کہ جلد یا بدیر کہیں سے کوئی تسلی بخش جواب آ جائے گا۔ انھوں نے میرا ... مضمون کے خط مختلف شہروں کو بھیجے تھے۔ ممکن ہے کہیں اور سے بھی آ جائے مگر شکلا جی نے مجھے اطلاع دینا اس لیے ضروری نہ سمجھا ہو کہ ابا جان اس شہر سے بھی روانہ ہو چکے ہوں۔ شکلا جی نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنی تمام کوششیں جاری رکھیں گے۔ بار بار یاد دہانی سمجھتے رہیں گے۔

ثجل کہہ رہا تھا کہ فیض آباد میں جب شکلا جی کا خط ملا تو صرف ارشد اُس کے قریب تھا۔ ارشد نے بی اے تک تعلیم حاصل کی تھی۔ ثجل نے ارشد سے ہوٹل اور شیلانگ کے محل وقوع کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ یہاں تک کہ اس نے نقشہ بھی شکلا کے ... دیکھا۔ ہم ابا جان کی

حالت میں کیا، شہر کے قریبی علاقوں میں واقف نہیں گئے تھے کیونکہ ابا جان شہر سے دُور دُور کے علاقوں میں جا سکتے تھے جہاں انھیں بدھ راہبوں، رشتے داروں یا شناساؤں سے آمنا سامنا ہونے کا اندیشہ نہ ہو۔ چنانچہ وہ بمبئی گئے جہاں انسانوں کا جنگل ہے۔ کسی کو کسی کی خبر نہیں ہوتی۔ نیچے کی منزل والے کو اُوپر کی منزل والے سے متعلق نہیں ہوتا۔ بمبئی میں طویل قیام کے بعد ابا جان شہر بدلتے رہے ہوں گے۔ آج یہاں کل وہاں۔ تین مہینے اِس بستی میں تین مہینے اُس بستی میں۔ وہ غیر ضروری واقفیت کا اعادہ نہیں چاہتے ہوں گے اور سب سے زیادہ فکر تو انھیں نوادرات کی ہوگی کہ ان کی کسی کو بھنک نہ مل جائے۔ زیادہ عرصے ایک جگہ رہنے سے آس پاس کے لوگ دلچسپی لینا شروع کر دیتے ہیں۔ نوادرات پر تحقیق کے لیے انھیں لائبریریوں کی ضرورت بھی پڑتی ہوگی۔ مولوی اکرم کے سوا انھوں نے نوادرات کا کسی سے ذکر نہیں کیا ہوگا۔ مولوی اکرم سے بھی تب کیا ہوگا جب انھیں اُن پر پورا اعتماد ہو گیا ہوگا۔ ادھر مولوی صاحب اور کرشنا کے ساتھ بھی یہی تھا۔ کلکتے یا مراد آباد کے علاقوں اور بدھ راہبوں کے مرکزوں سے دور ہی رہنے میں اُن کی عافیت تھی۔ وانگ قبیلے کے لوگ کرشنا کی جستجو میں تھے۔ ہم نے بمبئی سے بنگال اور آسام کے علاقوں کا رُخ نہیں کیا تھا تاہم وہ کہیں اور نہ ملتے تو ہمیں اس طرف بھی آنا پڑتا۔

ابا جان کا کسی ایسی جگہ نظر آنا ثجل کے لیے چونکا دینے کا سبب تھا جہاں بدھ راہبوں کے تجارتی قافلے گزرتے ہوں اور گرد و نواح میں بڑی بڑی خانقاہیں موجود ہوں۔ نو سال سے اوپر ہو چکے تھے۔ اس مدت میں نوادرات کی تفتیش کے بعد ابا جان نے اپنی دانست میں کوئی نتیجہ اخذ کیا ہوگا۔ اتنا وقت انھوں نے صرف گنوایا تو نہیں ہوگا۔ وہ پاگل تو نہیں تھے۔ ہر پہلو پر غور کرنے کے بعد ثجل بھی اس نتیجے پر پہنچا کہ کہیں اُن کے شیلانگ میں ہونے کا مطلب تبت کی طرف کوچ کرنا تو نہیں ہے۔ اگر انھیں فوراً مطلوب تھی تو ایک نہ ایک دن تبت جانا ہی تھا۔ ثجل نے فوراً پیرو کو بمبئی اور وزیر کو آسنسول دوڑا دیے۔ پھر خود ارشد کو ساتھ لے کے کلکتے آ گیا۔ اُسے معلوم تھا کہ تبت میں داخلے کے لیے باقاعدہ پرمٹ لازمی ضروری ہے اور اسے حاصل کرنے میں دن بھی لگ سکتے ہیں۔ درخواست نامنظور بھی ہو سکتی ہے۔ کلکتے کے بہت سے مال دار لوگوں کے کارخانے بنگال اور آسام میں پھیلے ہوئے تھے اور کلکتے کے ... کی حیثیت سے اُس کا واسطہ اُن لوگوں سے پڑتا رہتا تھا۔ کسی سے کم کسی سے زیادہ۔ کلکتے آنے کے بعد وہ مختلف ٹھکانوں پر مختلف طبقوں کے لوگوں کے پاس جاتا رہا۔ ایک طرف اُس نے راہ کے علاقوں میں تمام ہوٹلوں اور ... کا بندوبست کیا، دوسری طرف رات دن سفر سے متعلق معلومات حاصل کیں۔ اُس نے جاپانی ... کے اڈے کے ایک تبتی باشندے سونم سے بھی رابطہ قائم کیا۔ سونم تبتی زبان بھی جانتا تھا اور ان راستوں سے گزر چکا تھا۔ یہی وہ شخص تھا جسے ... زنت میں میں نے جانو کے ساتھ اسٹیشن پر دیکھا تھا۔

ہم دونوں اکیلے بھی جا سکتے تھے لیکن ثجل کے کہنے کے مطابق وہ یہ مناسب نہیں سمجھتا تھا۔ کچھ تو اسے خود بھی اندازہ تھا اور کچھ اُسے بتایا گیا تھا کہ یہ سفر اور سفروں کے مانند اتنا آسان نہیں ہے۔ دشوار گزار پہاڑی راستے ہیں اور اونچی برفیلی چوٹیاں ہیں۔ نہ ریل ہے نہ موٹر۔ نہ سڑکیں ہیں نہ منزلوں کے نشان۔ قدم قدم پر قبائلی قزاقوں کا خدشہ۔ نوادرات کا تعلق وانگ قبیلے سے ہوگا۔ وانگ قبیلے کے لوگ انھی کے لیے اب تک کرشنا کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ ثجل کے ذہن میں کچھ اور الجھنیں بھی ہوں گی۔ اسی لیے اُس نے اکیلے جانے کے بجائے لوگوں کو ساتھ لے چلنے کا فیصلہ کیا۔ اُسے ابا جان کے تبت کی طرف کوچ کرنے کا ایسا ہی مکمل یقین ہوگا۔

سردی کے باوجود میرا سارا جسم پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ اُس کی باتیں مجھے ایک خواب معلوم ہو رہی تھیں۔ میں نے کسی بات کی تردید نہیں کی۔ شکلا جی نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ پولیس والے نے ابا جان کو تنہا دیکھا تھا۔ اُن کے ساتھ کوئی اور نہیں تھا اور وہ ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ میری نظروں میں اُن سب کے چہرے گھوم رہے تھے۔ رہ رہ کے یہی خیال آ رہا تھا کہ ابا جان تنہا کیوں تھے۔ انھوں نے اُن سب کو کہاں رکھا؟ کہیں وہ بھی اُن سے جہانگیر اور فہمیدہ کی طرح جدا تو نہیں ہو گئے؟ ممکن ہے پولیس والے ہی کو غلط فہمی ہو گئی ہو۔ پولیس کو دیکھ کے لوگ یوں بھی گھبرا جاتے ہیں۔ اس لیے شاید اُس نے خواہ مخواہ فرض کر لیا ہو کہ یہی شخص صفدر زماں ہیں لیکن ثجل کا یہ کہنا بھی قرین قیاس تھا کہ بالآخر انھیں تبت جانا ہی تھا۔ اُن کا تنہا ہوٹل میں ٹھہرنا اور تبت کی سرحد سے قریب شیلانگ میں نظر آنا ثجل کے شبہے کی تائید کرتا تھا۔ ابا جان فرح، نادر میاں اور اکبر کو کسی محفوظ جگہ چھوڑ سکتے تھے۔ اتنی مدت میں اُن کو بمبئی کے مولوی اکرم جیسا کوئی اور قابل اعتماد دوست مل گیا ہوگا یا ہو سکتا ہے کہ وہ گیا واپس چلے گئے ہوں اور سب کو کسی عزیز کے حوالے کر آئے ہوں۔ وہ گیا سے کوئی جرم کر کے تو آئے نہیں تھے جو واپس نہ جا سکتے۔ فہمیدہ کے بارے میں لوگوں نے پوچھا ہوگا تو انھوں نے کہہ دیا ہوگا کہ اُس کی شادی ہو گئی یا وہ مر گئی اور جہانگیر بھی مر چکا ہے۔ وہ تبت میں تین لڑکیوں اور ایک لڑکے کے کنبے کو ساتھ لے کے کیسے جا سکتے تھے۔

ثجل مجھے ٹھوکا مار کے پوچھنے لگا "کہیں لیٹنے تو کچھ نہیں بولتا؟"

میں کیا بولتا؟ میرے کچھ کہنے کی گنجائش ہی کہاں تھی۔ مجھے اس خیال سے وحشت ہو رہی تھی کہ ابا جان ان علاقوں میں آ کے کسی بڑی مصیبت میں نہ گرفتار ہو گئے ہوں۔ اُن کے ساتھ اگر نوادرات ہیں تو

وہ کہاں کہاں اُنھیں چھپاتے پھر رہے ہوں گے۔ جانگ جیلے کے کسی آدمی کو ان کی ہوا لگ گئی تو۔۔۔ میرے جسم پر کپکپی سی طاری ہو گئی تھی۔ فجل میرے کان میں پھر بڑانے لگا۔

تیسرے دن ہم ڈیرو گروھ سے تن سکیا روانہ ہو گئے۔ راستے میں تن سکیا پہلے آتا تھا مگر فجل کو کلکتہ میں لوگوں نے مشورہ دیا تھا کہ وہ پہلے ڈیرو گروھ اُترے۔ وہاں سے اُسے ایسے آدمی مل سکتے ہیں جو پکے پوسٹ کے بجائے کسی اور راستے سے تبت کی سرحد پار کرا دیں گے۔ تبتی باشندے ادھر سے اُدھر منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ ہمارے چہرے اُن جیسے نہیں تھے نہ ہم اُن کی زبان سے واقف تھے۔ وہ دن تک سُولم ڈیرو گروھ میں کام کے آدمی ڈھونڈنے کی کوشش کرتا رہا۔ ہوٹل میں مختلف قسم کے چند لوگ ہم سے ملنے کے لیے بھی آئے۔ کچھ تاڑ بھانڈ لیتے آئے تھے اور کچھ کو سُولم اپنے ساتھ لایا تھا۔ انھوں نے میرا اور فجل سے علیحدہ علیحدہ بات کی۔ سب کی رائے یہی تھی کہ ہم آگے جانے کا ارادہ ترک کر کے اپنے سامان تجارت کا سودا یہیں کر لیں۔ یہاں بھی ہمیں خاصے اچھے پیسے مل جائیں گے۔ روانہ ہونے سے پہلے کلکتے میں فجل نے بہت سامان خریدا تھا۔ تھیلیاں، چمچے، بلیڈ، سگریٹ، تمباکو، شالیں، ریشمی کپڑا، گوٹا، کناری، مخمل، کمبل، پرانے کرٹ، شراب کی ترتلیں وغیرہ وغیرہ۔ سادق کو ٹھیک خبر نہیں تھی۔ ہیرو بھی اپنے ہمراہ تقریباً اتنا ہی سامان لایا تھا۔

فجل نے کئی وجوہ سے ہمیں دو ٹولیوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ اتنے زیادہ آدمی ایک ساتھ کہیں آتے جاتے دکھائی دیتے تو شک کا نشانہ بن سکتے تھے۔ نادھنیکہ ڈیرو گروھ میں کوئی بہتر صورتِ حال پیدا ہونے کی اُمید نہ تھی، ہمارا ایک دوسرے سے الگ ہی رہنا مناسب تھا۔ فجل کو بتایا گیا تھا کہ اگر اُسے آسانی سے پروانۂ راہداری نہ ملا تو بعض مخصوص مقامی باشندوں سے اُسے رابطہ قائم کرنا ہو گا۔ یہ لوگ تو واردوں کو خوب لوٹتے اور طرح طرح پریشان کرتے تھے۔ دو الگ الگ قافلوں کی صورت میں اُن کے ہتھکنڈوں سے بڑی حد تک محفوظ رہا جا سکتا تھا۔ اس طرح اُن سے سودے بازی کرنے میں بھی آسانی رہتی۔ ایک قافلہ مقامی باشندوں کی بڑے معاوضے کی پیشکش قبول کر لیتا تو دوسرا انکار کر دیتا۔ دوسرے کو بھی ساتھ لے جانے کے لیے مجبوراً انھیں کم پر آمادہ ہونا پڑتا۔ اس میں ہم اور بھی بہت سے تحفظات تھے۔ ایک قافلہ دوسرے کا نگراں رہتا۔ کوئی افتاد پڑنے کی صورت میں ایک دوسرے کے لیے ڈھال بن سکتا تھا۔ یہ دوسری بات تھی کہ دونوں قافلوں پر ایک ساتھ اُفتاد آتی۔ پھر کو پہلے ڈیرو گروھ بھیجنے میں فجل کی یہی مصلحت تھی۔ اس کے علاوہ اُسے اُمید تھی کہ وہ شاید معاملے کر کے ہی رکھیں اور ادھر فجل کو کلکتے میں سفر کے لیے معاون بعض اور لوگوں سے ملنے کا ایک دن مل جائے۔ وہ دن گزر گئے تھے۔ مسافروں اور ہوٹل والوں کی نظر میں ابھی ہم دونوں گروہوں کا تعلق رسمی تھا، محض مسافرانہ میل ملاپ جیسے ایک مقصد کے مسافر اچانک کہیں مل جاتے ہیں اور آپس میں دلچسپی لینا شروع کر دیتے ہیں مگر اس کا قربت سے ہمیں کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچا۔ ڈیرو گروھ میں ہمیں اپنے مطلب کے آدمی نہیں مل سکے۔ فجل کلکتے میں لوگوں کے دیے ہوئے بعض پتوں پر بھی گیا۔ سب تو قدم قدم پر سرحدی چیتوں اور پابندیوں کو گنوا کر رہتے تھے۔ بستی میں مسلمان کم تھے لیکن ہم نے احتیاطاً ان کے ٹھکانوں پر آنا جانا کے ایسے ہی بھی پوچھ کے کسی لیا کسی سے کوئی کام کی بات نہیں معلوم ہو سکی۔ ہم تقریباً تین میل پیچھے ہو کر تن سکیا آ گئے۔ تن سکیا اور ڈیرو گروھ کے راستے میں گھنے جنگلات تھے۔ کہیں کہیں ہمیں وہاں ہاتھی بھی دکھائی دیے۔ دونوں بستیوں کے درمیان دو میل لیے بر ہم پترا کی ایک بڑی شاخ ہے جسے اسٹیمر سے پار کرنا پڑتا ہے۔ تن سکیا سے ہم آدیر کی طرف آگے بڑھ گئے اور قصبہ ورکی ای میں آکے دم لیا۔ یہاں ہندوستان کے پولیٹکل ایجنٹ، انٹلی جنس افسر اور ٹریڈ ایجنٹ وغیرہ کے دفاتر تھے۔ ورکی ای میں بھی سُولم نے ناسی بگٹ دوڑ کی۔ فجل نے پاس کلکتے کے بڑے آدمیوں کے کئی سفارشی خطوط تھے۔ وہ خطوط دکھانے کی نوبت نہیں آئی۔ ہمیں پروانۂ راہداری میں پیش آنے والی دشواریوں کا ابتدا ہی میں علم ہو گیا تھا۔ پولیٹکل ایجنٹ کے پاس جا کے ہم خواہ مخواہ اُس کی نظروں میں آ جاتے۔ ورکی ای کے بعد ہم نے کچھ اور فاصلہ طے کر لیا اور ویبک آگ پہنچ گئے۔ ویبک آگ سے تھوڑا ال پانگ، وہاں سے سادیا تصبہ ملا، یا خاصا بڑا قصبہ تھا۔ یہاں بازار بھی تھے اور تبتی قلی بھی جگہ جگہ موجود تھے۔ ہم سادیا ہی میں ایک رات ٹھیرے۔ ہمیں لگے کہ قصبہ پوری یا کہ گزرتے ہوئے قصبہ نارا میں لگے۔

سادیات ناراسک کا راستہ ہم نے کرائے کی جیپ پر۔۔۔ طے کیا تھا اور یہ ہمارے اب تک کے سفر میں سب سے مشکل راستہ تھا۔ ہیں کچھ معقول تعداد میں بسے ہوئے تھے۔ ایک بڑا فوجی اڈا بھی تھا۔ سُولم شام کے وقت ہمیں ایک ایسی جگہ لے گیا جہاں جنگی ذخیرہ بھی تھا۔ یہاں ایک اسکول بھی تھا۔ آخری اسکول۔ جیسے جیسے ہم آگے بڑھ رہے تھے، سرحدی گرفت سخت ہوتی جاتی تھی۔ کسی مقام پر سستانے کے لیے بیٹھ جاتے تو ہم جلنے لگتے۔ ہم نے ابھی تک یہی ظاہر کیا تھا کہ ہم سرحدی چوکی والنگ پر اپنا سامان فروخت کرنے جا رہے ہیں اور یا اعموماً بچے ہوتے اس لیے قلیوں کو تو ہم اور گزرنے والی بستیوں کے باشندوں نے ہم پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ یہ ہندوستان تھا اور ہم آخری سرحدی چوکی والنگ تک کسی روک ٹوک کے بغیر جا سکتے تھے۔ نارا سے سات میل دور قصبہ چنگ وزق تھا۔

چنگ وزق پر آکے ہمیں گرفت جاتی تھیں کیونکہ آگے اُس کے لیے کوئی سڑک نہیں تھی۔ ٹچر اور گھوڑے ہی ان راستوں پر چل سکتے تھے۔ وہیں ہمیں متعدد قلی مل گئے۔ اُن کے ساتھ اُن کے خچر بھی تھے۔ سامان خچروں پر لاد دیا گیا۔ ہم نے گائیڈ اور قلیوں کی معیت میں پیدل پہاڑ پر چڑھنا شروع کیا۔ قلی ایک منزل سے دوسری منزل تک جاتے تھے چنانچہ ہم ہر منزل پر قلی بدلتے رہے۔ چنگ وزق کے بعد کا راستہ دشوار تھا۔ چاروں طرف بڑے پاٹ کے دریا، گھاٹیاں، اونچی چوٹیاں، کیچڑ، کھڑی چٹانیں اور دلدلیں۔ ہمیں قلیوں اور گائیڈوں کی مدد نہ ملتی تو شاید ہمارا بھٹک جانا ناگزیر ہو جاتا۔ یا تو ہم کسی قافلے کے انتظار میں پڑے رہتے یا بارش آتے۔ اور قافلوں کے ساتھ ہم اسی صورت میں ہو سکتے تھے جب ہمارے پاس اُن کی طرح اجازت نامہ ہوتا۔ ادھر سادق کو تیز بخار آگیا تھا۔ جہاں تک من پڑا، وہ چلتا رہا۔ قلیوں نے اُسے چند گولیاں کھلا دی تھیں۔ اس سے بخار کم ہونے کے بجائے اور بڑھ گیا۔ ہم نے اُسے الٹا خچر پر لٹا دیا اور کمر سے رسی باندھ دی اور چنگ وزق سے آٹھ میل کی دوری پر خور وگ اس سے گھری ہوئی بستی من زانگ میں آکے ایک تبتی طبیب کو دکھایا۔ سادق کی وجہ سے ہمیں ایک دن من زانگ میں قیام کرنا پڑا۔ اُس کی طبیعت کچھ سنبھلی تو ہم پھر آگے بڑھنے لگے۔ من زانگ کے کچھ ہی دور بعد وہ تُنگ اور سانی نامی دو بستیوں سے ہوتا گزرا۔ دونوں میں ذہری شہرت کے لوگ بستے ہیں۔ جو زندگی تبتی مجرد ہے نہ ہندوستانی۔ پیدل چلتے چلتے ہماری ٹانگیں اینٹھنے لگیں۔ پاؤں میں گٹے پڑ گئے تھے لیکن کوئی بھی واپس جانے کو آمادہ نہیں تھا۔ ایک منزل سے دوسری منزل کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا لیکن میدانی علاقوں کی نسبت پہاڑی علاقوں میں ایک میل کا فاصلہ کئی میل کے برابر ہوتا ہے۔ جب ہم تھک گئے تو اور تیز چلنے لگے۔ پہاڑوں پر رفتار پہاڑوں کی تابع ہوتی ہے آدمی کے نہیں۔ ڈیرو گروھ سے ۱۰ دن کی مسافت کے بعد ہم آخری سرحدی چوکی والنگ کے قریب پہنچ گئے۔ باقی سب دُور ٹھیرے رہے صرف میں اور فجل سُولم کے ساتھ بستی میں داخل ہوئے۔ والنگ ہندوستانی تہذیب و تمدن کا آخری دروازہ ہے۔ یہاں بہت سی چیزیں آخری ہوتی ہیں۔ آخری گھڑی جس سے وقت کا اندازہ ہوتا ہے۔ آخری ہندوستانی یا انگریزی اخبار۔ آخری چاکلیٹ۔ آخری ہندوستانی سکہ جو آگے نہیں چلتا۔ آخری کرسی اور میز۔ آخری تحریری قانون۔ آگے لاماؤں کے غیر تحریری قانون کی حکومت ہے۔ والنگ میں ہمیں کئی تبتی قافلے دکھائی دیے۔ خصوصاً بدھ بھکشوؤں کے۔ بھکشوؤں کے تبت میں داخلے پر کوئی پابندی نہیں ہوتی لیکن اُن کے ساتھ سامان مختصر ہوتا ہے۔ ایک آدمی کی ضروریات کی حد تک۔ میں نے فجل کو مشورہ دیا کہ کیوں نہ ہم بدھ بھکشوؤں کے لباس میں تبت میں داخل ہوں۔ سامان ہمیں یہیں چھوڑ دیں اور چند لوگوں کو ہمیں روک دیں جو اسے بیچتے رہیں اور واپس ڈیرو گروھ جا کے ہمارا انتظار کریں۔ فجل تیار نہیں ہوا۔ تین دن ہم والنگ کی خاص بستی کے نزدیک خیمہ لگائے پڑے رہے۔ پہاڑوں پر صرف ایک راستہ نہیں ہوتا۔ سُولم بھی اس کی تائید کرتا تھا کہ پہاڑوں سے اور راستے بھی نکلتے ہیں مگر سیلوں کا فرق پڑ جاتا ہے۔ انھیں مقامی قلیوں کے تعاون کے بغیر معلوم نہیں کیا جا سکتا۔ چونکہ وہ عام گزرگاہیں نہیں ہیں اس لیے قلی بھی شاذ و نادر ہی نیا دہ ہوتے ہیں۔ سادق کی طبیعت پوری طرح نہیں سنبھلی تھی۔ بستی میں بھی ادھ موا سا نظر آتا تھا۔ ہر منزل پر جسم کو زیادہ کپڑوں کی ضرورت پڑتی تھی۔ ۱۲۰ روز بعد والنگ میں ہمیں تین دن ٹھیرنے کو ملے تو اعصاب میں کسی قدر توانائی محسوس ہوئی۔

تیسرے دن سامان اور نقدی کی بڑی پیشکش اور ایک تیسرے دن کے عوض چند تبتی قلیوں کا ایک گروہ ہمیں دوسرے راستے سے آگے لے جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ یوں ہم ہندوستان کی سرحدی چوکی والنگ سے براہِ راست تبت میں داخل ہوئے تو تبت کی پہلی سرحدی چوکی سما سے فاصلہ بیس میل سے زیادہ نہ ہوتا۔ ان بیس میلوں کی مسافت میں دو دن صرف ہوتے ہیں۔ ہم نے ایک طویل اور دشوار گزار راستہ منتخب کیا تھا۔ درمیان میں تیز بہاؤ کے دریا بہتے تھے۔ ان دریاؤں کو عبور کرنے کا رسیوں کے پل کے سوا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا۔ بانس کی چھال رسیاں بٹ کے یہ بڑی درستی بنائی جاتی ہے اور اتنی مضبوط ہوتی ہے کہ قافلے اس پر سے گزر جاتے ہیں۔ دو رسیاں ایک ساتھ چلتی ہیں اور انھیں یکساں دُوری پر آپس میں باندھ دیتے ہیں اور درمیان میں تختے تاروں سے جکڑ دیتے ہیں۔ بعض پل صرف ایک رسی کے ہوتے ہیں۔ دو پہاڑوں کے بیچ میں تار کی طرح رسی تنی رہتی ہے۔ ان علاقوں میں بسنے والے انھیں پکڑ پکڑ کے آسانی سے درمیان کا فاصلہ عبور کر لیتے ہیں۔ خصوصاً عورتیں کمر سے بچے باندھ کے روانی سے گزر جاتی ہیں۔ انھیں نیچے بہتے ہوئے پُرشور دریا سے بھی خوف نہیں آتا۔ ہم نے ان رسیوں پر دریا کا پاٹ طے کرنے کا خطرہ مول نہیں لیا۔ ویسے بھی سامان کی وجہ سے ہم انھیں استعمال نہیں کر سکتے تھے۔

تبت کی پہلی چوکی سما کے نزدیک ہم نے قلیوں کو باقی آدھا معاوضہ دے کے رخصت کر دیا اور نئے قلی تلاش کیے۔ سما میں شدید سردی تھی۔ ہماری انگلیاں پھٹنے لگیں۔ ہونٹ پھٹے جاتے تھے۔ ہوا تیز ہوتی تو چہرے پر چاقو سے چلنے لگتے۔ کئی کئی مفلروں سے ہم نے اپنا سر اور گردن ڈھانپ رکھی تھی پھر بھی سردی کم نہیں ہوتی تھی۔ سما سے آگے رات کو سونا مشکل ہو جاتا تھا۔ رات کو قلی لکڑیاں توڑ کے الاؤ روشن کر دیتے۔ الاؤ سے جسم میں کچھ حرارت آتی۔ دن کے درمیانی حصے میں ہم کچھ دیر سونے پھر چلنے لگتے۔ ہیرو نے تجویز پیش کی کہ ہم میں سے بڈھے لوگ بھکشوؤں کا لباس پہن لیں اور آدھے تاجروں کا روپ اختیار کر لیں تو بہتر ہو گا۔ بھکشوؤں کے ساتھ ہونے کی وجہ سے تبتی ہر جگہ ہمارا لحاظ

کریں گے اور ہم اُن کے شک سے بھی محفوظ ہو جائیں گے۔ چو جھکشو دنیا بھر سے تبت آتے ہیں اُن کے لیے یہ لازم نہیں ہے کہ وہ تبتی زبان سے بھی واقف ہوں۔ سُولم کہتا تھا کہ قبائلیوں کے نزدیک جھکشو شاکیہ منی گوتم بدھ کا رُوپ سمجھے جاتے ہیں۔ چھل کو وزیر کی یہ تجویز پسند تو آئی لیکن اس نے عمل نہیں کیا۔

راستے میں تلی تبت کی کہانیاں سُنانے لگتے تھے۔ سُولم اُن کا ترجمہ کر دیتا یا تلی ہونے لگتے کبھی سلطان ، مارتی ، مقبل اور وزیر بھی اُن کی آواز سے اپنی آوازیں ملانے لگتے۔ سب بھر کے جیسے ہی دھوپ نرم پڑتی پہاڑوں پر رفتہ رفتہ دھیرے دھیرے دھند چھانے لگتی اور آگے کا راستہ دکھائی دینا مشکل ہو جاتا۔ دن میں تو کچھ نہیں ہوتا لیکن شام ہوتے ہی میرا جی گھبرانے لگتا۔ اندھیرے میں اُونچے پہاڑوں کے سائے دیکھ کے مجھے خوف سا لگتا تھا۔ جہاں تک ممکن ہوتا شام کو بھی ہم چلتے رہتے جب ناممکن ہو جاتا تو پڑاؤ ڈال دیتے۔ اب تک بستیاں قریب قریب آتی رہی تھیں۔ دانگ کے بعد غیر آباد پہاڑوں کی وجہ سے ہمارے کھانے پینے کا سامان کم ہونے لگا۔ ہر چند کہ ہم پہلے ہی خاصا ذخیرہ ساتھ لے کے چلے تھے۔ بہ حیثیت ہمیں اپنی بندوقیں نکالنی پڑیں۔ شکار کی وہاں کوئی کمی نہیں تھی۔ جو کچھ بھی ہم دن میں مارتے، رات کو الاؤ پر بھون لیتے۔ تبتی تلی بھی رغبت سے ہمارا شکار کیا ہوا بھنا گوشت کھا کے خوش خوش رہتے تھے۔

ہر تبتی تلی کھلی داڑھی اور تلوار سے ہر وقت مسلح ہوتا تھا۔ یاک یا بھیڑ کی اُون کا لباس ، چمڑے کا جوتا ، کانوں تک لمبی چوڑی اُونی ٹوپی اُن کا عام پہناوا تھا۔ بستیوں میں امیر لوگ فر کے کوٹ، سلک کی چادر اور اپنے مخصوص مفلروں میں ملبوس رہتے تھے۔ سالما کے بعد جن چھوٹی چھوٹی بستیوں میں ہم جاتے اور بستی کے لوگوں کو مہمانوں کی رسم کے مطابق تحائف پیش کرتے تو وہ اپنے گھر کے دروازے ہمارے لیے کھول دیتے۔ دروازہ کھلنے کے لیے تحائف ہی شرط نہیں تھے۔ مسافر جس دروازے پر چلا جائے مہمان سمجھا جاتا ہے۔ وہاں میزبان اور مہمان گلو بند تبدیل کر کے دوستی کا اظہار کرتے ہیں اور ہمارے پاس گلو بندوں کی ایک وافر تعداد موجود تھی۔ مہمانوں سے میزبانی کی کوئی قیمت طلب نہیں کی جاتی۔ سارے راستے ہمیں کوئی سرائے نظر نہیں آئی۔ گو ہم سالما کے بعد دو تین ہی گھروں میں بہت مختصر وقت کے لیے مہمان ہوئے لیکن میزبانوں نے اس مختصر وقت میں بھی ہماری تواضع میں یاک کا دودھ ، انڈے ، تبتی خراب بیئر کی لکھمی اور نمک ملی ہوئی چائے ہمیں پلائی۔ چائے کے بغیر وہ شاید زندہ نہیں رہ سکتے۔ سُولم کی وجہ سے اُن سے بات کرنے میں ہمیں زبان کی کوئی دقت نہیں تھی۔ وہ لوگ مہینوں منہ ہاتھ نہیں دھوتے۔ پانی سے اُن کا جسم کٹنے لگتا ہے۔ اُن

لوگوں کی طرح ہم نے بھی سالما میں اپنے جسموں پر روغن کی مالش کرلی تھی تلی عام طور پر ایک گیت سناتے تھے جس کا مفہوم کچھ اس طرح تھا: "تو اپنے باہر سے نہیں اندر سے ہے۔ تیرا ظاہر ایک دھوکہ ہے تیرا اصل تیرا باطن ہے۔ تیری اہمیت بس تیری اندرونی شخصیت سے ہے۔ سو اُسے پاک صاف رکھ۔"

ہر چند تبتی اسی پر عمل کرتے تھے باہر سے بہت گندے مگر اندر سے دُھلے ہوئے۔ ہم نے کسی تبتی کو روتے ہوئے نہیں دیکھا۔ سارے مختلف بستیوں میں ہوتے ہوئے تبت کے سب سے پہلے شہر زالیول میں داخل ہوتے ہی ہم نے چند معززین کے گھروں میں جا کے سب کو تحائف پیش کیے۔ زالیول دریائے رونگو اور دریائے سونگو کے سنگم پر واقع ایک گنجان شہر ہے۔ اس کا ایک دوسرا نام شیگا تھا مگر یہ بھی ہے۔ سُولم نے ہمیں بتایا تھا کہ یہاں تبت کا ایک نمبر ۲ افسر رہتا ہے جس کا لقب ہے زانگ پون (سول گورنر)۔ زالیول میں اگر ہم دو دن آرام نہ کرتے تو آگے نہیں چل سکتے تھے۔ چھڑ بھی اپنی ہمت سے چل رہا تھا اُسے لنگ لگ گئی تھی اور کئی بار تیز بخار آ چکا تھا۔ میرے، پیرو، چھل اور وزیر کے سوا سبھی باری باری بیمار پڑتے رہے۔ پیرو بھی کھانسنے لگا تھا۔ اُن کا مجھے کچھ پتہ نہیں لیکن ہر منزل پر مجھے اپنی رگوں میں خون جمتا محسوس ہوتا تھا۔ رات کو جب پہاڑوں پر دھند چھا جاتی اور ہیبت ناک ہونے لگتا تو میں الاؤ میں اور لکڑیاں ڈال دیتا۔ روشنی سے مجھے کچھ سکون ملتا تھا۔ کتنی ہی بار میں نے اُن سے کہا کہ واپس چلیں۔ یہ سنتے ہی وہ مجھے گھورنے لگتے اور مجھے لگنے لگتا۔ صاف اندازہ ہوتا تھا کہ وہ میرے ساتھ آنے پر پچھتا رہے ہیں۔

ہندوستانی سرحدی چوکی والنگ اور تبتی سرحدی چوکی کے سوا راستے میں پڑنے والی تمام بدھ خانقاہوں اور مندروں میں ہمارا جانا ایک معمول تھا۔ والنگ سے سالما تک ہم ایک طویل چکر کاٹ کے پہنچے تھے اس لیے وہاں کی خانقاہوں اور مندروں میں ہی نہیں جا سکے۔ زالیول میں بستی کے لوگوں نے ہماری بہت خاطر کی۔ زالیول سے آگے چھوٹی چھوٹی بستیاں تھیں جن میں انھوں نے اتنی ہی دیر وہاں قیام کیا جتنی دیر میں کھانے پینے کا سامان اکٹھا کر سکتے تھے اور نئے تلیوں کو ڈھونڈ سکتے تھے۔ زالیول کے بعد برف پوش پہاڑوں کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا۔ دن میں برف پر دھوپ کی چمک سے آنکھیں درد کرنے لگتیں اور ہماری صرف آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ باقی سارا چہرہ اونی ٹوپیوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ بات کرنے کے لیے ہمیں ٹوپیاں سر سے اوپر کرنی پڑتیں۔ بستی کی اس کا تنگ سے چند میل بعد دریائے برہم پتر پر واقع ایک بستی ژوڈا آگرما ہے۔ اس سے کچھ آگے قصبہ سارنی ہے۔ ہم وہاں پہنچے تو اتفاق سے سالانہ مقدس میلا لگا ہوا تھا۔ تبت کے دور دراز چھوٹے گاؤں کے لوگ وہاں موجود تھے اور بھکشوؤں کا ایک بڑا اجتماع تھا۔ بچے

وہیں سے ہم دو دن کے لیے وہاں رُک گئے اور ہم نے اپنا بیشتر وقت میلے ہی میں گزارا۔ راستے میں تلیوں کی مدد سے ہمیں چند تبتی الفاظ آ گئے تھے۔ باؤ گے پاک بوکی۔ ان گی یاؤ۔ ڈرو۔ خوب ہم تبتی زبان اچھی طرح جانتے ہو۔

- یاک: نہیں۔
- یاک بوخی گی مدہ: اچھی طرح نہیں۔
- لاکس سوترے چے: مہربانی، آپ کا شکریہ۔
- پاولا تنگ: اُٹھ جاؤ۔
- مرتری بار: آگ روشن کرو۔
- چا بونگ: چائے بناؤ۔

جو قبیلہ جتنی بلندی پر ہوتا تھا، اتنا ہی معزز سمجھا جاتا تھا جو جتنا نیچا اتنا ہی بے عزت۔ اس اعتبار سے ہم نیچے کی نسبت زیادہ عزت دار بستیوں سے گزر رہے تھے۔ سالای سے ہم چار راستوں کے سنگم گرٹسے لٹ سا کے مقدس مقام پر آ گئے۔ یہاں بھی ایک بڑا مندر تھا۔ گرٹسے لٹ سا سے ساکا جونگ تک ہمیں کوئی مکان نہیں ملا۔ تمام راستہ بلند ترین پہاڑوں، گھاٹیوں، گھاٹیوں اور چھوٹے بڑے دریاؤں سے ہو کے نکلتا تھا۔ قدم قدم پر قسمیں کئی جگہ صرف جانوروں کے لیے اور بعض مقاموں کے لیے مخصوص۔ مرشد نے شب کرنے کے سبب یہاں ہر قدم میں سیلاب آتے ہیں۔ گرٹسے لٹ سا اور ساکا جونگ کا سارا علاقہ جانے کتنا پُر اسرار جیسے تھا۔

ڈیڑھ مہینے کی مسافت کے بعد ایک دن جب تلیوں نے ہمیں بتایا کہ آگے چند میل کے فاصلے پر جانگ قبیلے کی بستی ہے تو کسی کو یقین نہیں آیا۔ اور تھکان کے باوجود ہماری رفتار تیز ہو گئی۔ جو کرداکا وطن تھا جانگ قبیلے کی سرزمین پر قدم رکھتے ہوئے میرے پیروں لگا جیسے میرے پاؤں دلدل میں دھنس رہے ہوں۔ دل کر رہا تھا کہ ان راستوں سے ہو کے گئی ہوگی۔ یہیں تو اس میں ایک بہت ہی پرانا مقام تھا۔

ہر بستی کے مانند جانگ قبیلے کے لوگوں نے ہماری آمد پر ہمیں مشتبہ نظروں سے دیکھا۔ ہم نے کہیں اور جانے کے بجائے سیدھے جانگ قبیلے کے سردار کے رُو برو ہو کے اُسے چند تحائف پیش کیے۔ سُولم نے ہماری ترجمانی کی۔ سردار نے ہمارے سفر کا مقصد تجارت جان کے سر ہلایا۔ گلو بند بدلا اور اس طرح ہم نے کچھ کہے اور اُس سے کچھ سُنے بغیر اپنا اتفاق اظہار میں چند دن رو کے بستی میں رہنے کی اجازت حاصل کر لی۔

جانگ قبیلے کے لوگ عام تبتیوں کے مقابلے میں سُرخ و سفید اور لمبے تڑنگے تھے۔ چھوٹے چھوٹے دانت، چمکتی ہوئی تیز آنکھیں اور بہت خوب صورت تھیں۔ اُن کے بال لمبے اور زیادہ تر گھنے ہوتے تھے۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہمیں معلوم ہوا کہ قبیلے کا موجودہ سردار عارضی ہے۔ ہر سردار کو مہلت دی جاتی ہے کہ وہ گیارہ مہینے کے عرصے میں کھوئے ہوئے جیرنگ کا تذہات حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ ناکامی کی صورت میں اُسے یا تو قبیلہ بدر کر دیا جاتا ہے یا مار دیا جاتا ہے۔ بستی کی پہاڑوں پر پھیلی ہوئی تھی۔ قبیلے کا ہر شخص غور و فکر میں ڈوبا ہوا، پریشان اور گھبرایا ہوا نظر آتا تھا۔ ہمیں ابتدا ہی میں محسوس ہو گیا تھا کہ وہ ہماری نقل و حرکت کی پوری نگرانی کر رہے ہیں۔ ہم نے جیرو، وزیر، پلپو، زدرا، سارے جیتی، مقبل خان اور ملا کو بستی سے دُور ایک فاصلے پر روک دیا تھا۔ چھل نے انھیں ہدایت کی تھی کہ وہ چار روز بعد بستی کا رُخ کریں۔ ہم صرف پانچ، چھل، میں، جانم، مارتی اور سلطان بستی میں داخل ہوئے تھے۔

ہم بھی ہر طرح محتاط تھے۔ نیچے ہم نے اپنے کپڑوں کی جیبوں میں رکھ لیے تھے۔ تین دن تک ہم بستی کے لوگوں سے میل جول بڑھانے کی کوشش کرتے رہے مگر ہمیں کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ قبیلے کے لوگ صبح و شام عبادت کرتے تھے جس شخص کے یہاں ہم مہمان تھے، اس نے چوتھی رات زبان کھولی اور ہمیں بتایا کہ قبیلے کے لوگ برسوں سے ایک عذاب میں مبتلا ہیں، وہ اُن جیرنگ کا تذہات کے اپنی جیں ہے جو اُن کے قبیلے کے لیے باعث افتخار تھے۔ ہم نے کوئی تبصرہ کیے بغیر صرف دُکھ کا اظہار کرنے پر قناعت کی۔

دوسرے دن جب ہم اِرد گرد کے پہاڑوں سے واپس بستی میں اپنے میزبان کے مکان پر پہنچے تو سامان پر ایک نظر ڈالتے ہی ہمیں اندازہ ہو گیا کہ اس کی تلاشی لی گئی ہے۔ انھوں نے کوئی چیز چوری نہیں کی تھی اور تمام چیزیں جوں کی توں ترتیب سے رکھ دی تھیں۔

بستی سے چند میل کی دُوری پر دھوں کی چٹانوں سے بنی ہوئی ایک بڑی خانقاہ تھی۔ ابھی پیرو اور دوسرے لوگ جو تھا دن گزر جانے کے باوجود بستی میں نہیں آئے تھے۔ یقیناً کوئی بیمار پڑ گیا ہو گا یا انھیں کوئی اور اُفتاد پیش آ گئی ہو گی۔ ہم اُن کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ پانچویں دن ہم نے خانقاہ کی طرف جانے کا فیصلہ کیا۔ جب ہم وہاں پہنچے تو راہب گوتم بدھ کی ایک بڑی مورتی کے سامنے عبادت کر رہے تھے۔ ہم بھی وہیں بیٹھ گئے۔ ہم سب کی نظریں اِدھر اُدھر بھٹک رہی تھیں۔ عبادت ختم ہونے کے بعد راہب منتشر ہو گئے اور مختلف جگہوں پر بیٹھ گئے۔ ہم وہاں سے واپس آ رہے تھے کہ ایک مندر کے نزدیک سے گزرتے ہوئے میری سانس سینے میں اٹکنے لگی۔ ایک بوڑھے راہب کی شکل مجھے کچھ جانی پہچانی محسوس ہوئی۔ اس کا چہرہ سپاٹ اور مرجھایا ہوا تھا۔ گالوں کی ہڈیاں نکلی ہوئی تھیں۔ وہ آنکھیں بند کیے ریاضت میں مصروف تھا۔ میں نے چھل کا بازو زور سے پکڑ لیا۔ میری سسکی نکل گئی۔ چھل نے مجھے سرزنش کی اور میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ میں انھیں اس ملیے میں بھی پہچان سکتا تھا۔ وہ بابا جان کے سوا کوئی نہیں ہو

سکتا تھا۔

وہی اُن کی لمبی ناک، پتلے پتلے ہونٹ، دھنسی ہوئی آنکھیں، بھاری چہرہ۔ اُن کا رنگ زرد پڑ گیا تھا، جو غالباً وہ تھکان سے۔ پلکیں بوجھل سے جھکے تھے لیکن اُن کی پیشانی پر سلوٹیں پڑی ہوئی تھیں۔ قنبل نے اپنے پنجے میں میرا ہاتھ جکڑ لیا تھا۔ میری کھلی ہوئی آنکھیں اُنھی پر مرکوز تھیں۔ وہ میرے ابا جان ہی تھے۔ سولہ سترہ سال تک صبح و شام، ہر ساعت میں نے انھیں دیکھا تھا۔ اُن کے چہرے کا ایک ایک نقش میرے ذہن میں محفوظ تھا۔ میں نے قنبل کے پنجے سے اپنا ہاتھ چھڑا کے اُن کی طرف بڑھنا چاہا لیکن قنبل نے میرا بازو کھینچ لیا۔

مندر کے اطراف ابا جان سے دُور و نزدیک پہاڑیوں پر انھی کی طرح دوسرے راہب اپنے آپ میں گم بیٹھے تھے۔ میرا سر چکرا رہا تھا۔ قنبل نے دبی ہوئی آواز میں مجھے ٹھیرے رہنے کی ہدایت کی اور ابا جان کو گھورتا رہا۔ میرے ہاتھ پیروں میں بالکل دم نہیں رہا تھا۔ قنبل کی سرگوشی کی بھنک شاید ابا جان کے کانوں تک بھی پہنچ گئی تھی کہ انھوں نے یکا یک پلکیں اُٹھا کے سرسری نظر سے ہماری جانب دیکھا۔ ہم سب اُن سے کچھ فاصلے پر سامنے ہی کھڑے تھے۔ دوسرے لمحے انھوں نے آنکھیں بند کر لیں مگر پھر فوراً کھول دیں۔ ہم سب نے قنبل کی پیروی میں اُن کے آگے سر جھکا دیے۔ ابا جان کے کپکپاتے ہونٹوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اُن کی نظر سیدھی مجھ پر آ تی۔ ایک لمحے کے لیے میرے سارے جسم پر رعشہ طاری ہو گیا اور مجھے اپنی آنکھوں کی دھند میں ایسا دکھائی دیا جیسے اُن کی پلکیں بھیگی ہیں اور اُن کا منہ کھل گیا ہے لیکن یہ میرا وہم تھا۔ انھوں نے بس نگاہ بھر کے ہم سب کو دیکھا ہوگا اور ہاتھ اُٹھا کے ہمیں جواب دیا ہوگا کہ پہلے کے مانند پتھر کی طرح منجمد ہو گئے۔ قنبل چند لمحے وہیں کھڑا رہا، پھر میرا ہاتھ تھامے ایک طرف چل دیا۔ میں نے مڑ کے پیچھے دیکھنے کا کئی بار ارادہ کیا لیکن قنبل کے خیال سے چپ، ڈھلانی پگڈنڈی پر اُس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ میری ٹانگیں لرز رہی تھیں اور دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ ہم زیادہ دُور نہیں گئے۔ قنبل قریب ہی ایک پہاڑی پر آ کے بیٹھ گیا۔ جامو، مارق، سلطان اور سومِلو کی مضطرب سوالیہ نظریں بار بار میری اور قنبل کی جانب اٹھتی تھیں۔ قنبل کا چہرہ متفکر دکھائی دے رہا تھا۔ "لاڈلے! تیری آنکھیں ٹھیک ہی بول رہی ہیں نا؟"

میری سسکیاں نکل پڑیں۔

قنبل نے پھر مجھ سے کچھ نہیں پوچھا۔ سر جھکا کے کچھ سوچتا رہا۔ "کیا بات ہے اُستاد؟ کچھ اپنے کو بھی بولو!" جامو نے بے چینی سے پوچھا۔

"کیا بولوں رے۔" قنبل نے گہری سانس بھر کے تھکے تھکے کہا۔

"کون ہے وہ؟"

"وہی ہے جس کے لیے اِدھر آئے ہیں۔"

"نہیں!" جامو حیرت سے اُچھل پڑا اور مرا کند جا جھنجوڑنے لگا … "اُستاد ٹھیک کہتے ہیں کیا؟" وہ سٹ پٹاتے ہوئے بولا۔

میں نے اپنا چہرہ چھپا لیا۔

"لاڈلے! لاڈلے! آ جا رے!" جامو مجھے زور زور سے دبوچنے لگا۔ مارق … سلطان اور سومِلو بھی مجھ سے چمٹ گئے اور مجھے پیار کرنے لگے۔

"پرے ہٹ، چھوڑو!" قنبل تندی سے بولا۔ "تو بھی جا … جامو! اِدھر! تیرا کام نہیں ہے رے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے پر قنبل بھائی! …" جامو کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"بیٹھا رہ۔" قنبل ناگواری سے بولا۔

"تم سے اپنے کو یقین نہیں آتا؟" قنبل نے جواب … تنک کے بولا۔ "اپنے منہ سے من کر کے مت پوچھو استاد!"

"تیری منشا ہے ناچنے لگوں کیا؟"

"تم تو فضول میں بگڑ رہے ہو۔" جامو منہ بنانے لگا۔

جامو کے ساتھ سلطان، مارق اور سومِلو بھی میرے پاس سے ہٹ گئے۔ دُور ابا جان گم صم بیٹھے تھے۔ گو اُن کے چہرے کے بدلتے ہوئے … ہم آسانی سے نہیں دیکھ سکتے تھے لیکن وہ کوئی جنبش کرتے … ہماری نظروں سے اوجھل نہ رہتی۔ دُور سے وہ کوئی بُت معلوم ہوتے … تھے۔ میرا خیال تھا شاید وہ ایک بار پلٹ کے دیکھیں مگر انھوں نے ایک ثانیے کے لیے بھی ہماری جانب نگاہ نہیں کی۔ جس بے اُس … میں اُن کے سامنے کھڑا ہوا تھا، اُن کے دماغ میں میرا خیال گزرا … کہیں یہ اُن کا بیٹا ابرار تو نہیں! مگر انھوں نے فوراً ہی دماغ سے … جھٹک دیا ہوگا۔ اتنی مدت بعد وہ اتنی دُور اُفتادہ جگہ میں … نظر آ سکتا ہوں۔ میرا چہرہ بھی پہلے سے بہت بدل گیا تھا۔ ابا جان … چہرہ یاد ہوگا جب میں گھر میں رہتا تھا۔ اُن کے خیال میں … رکھ چکا ہوں گا۔ عجب نہیں کہ حساب لگے کبھی یاد بھی نہ … ہوں۔ شروع شروع میں اگر کبھی میرا خیال آتا ہوگا تو اُن کا دل … ہوگا، اِس لیے انھوں نے میرا نام ہی جینے سے کھرچ کے پھینک … کبھی اُن کا کوئی بیٹا تھا۔ وہ اتنے ہی سخت اور ضدی تھے … کسی سے ناراض ہو جاتے تو عمر بھر منہ نہ دیکھتے اور جب سخاوت پر … گھر کا گھر لُٹا دیں۔ جانگ قبیلے میں آتے ہی انھیں معلوم ہو گیا ہوگا … ابھی تک قبیلے کے لوگوں کو نہیں ملی ہے۔ یہ جان کے انھیں … رہنے کا گمان ضرور ہوا ہوگا۔ ہم وہیں پہاڑی پر بیٹھے انھیں تکتے … وہاں کوئی ایک مندر نہیں تھا۔ چھوٹے بڑے بہت سے مندر … کوئی اُس پہاڑی پر، کوئی اِس پہاڑی پر۔ سارا علاقہ اونچے نیچے …

پھولوں اور پھلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ اب تک ہم جتنے علاقوں سے گزرے تھے، اُن میں یہ جگہ سب سے سرسبز تھی۔ بستی اور مندروں کے بیچ وسیع رقبے کے اطراف سارے پہاڑوں پر برف جمی ہوئی تھی۔ پھیلی بستی ودونگ اور مندروں کو برف نے نہ جانے کیوں چھوڑ دیا تھا۔ چاروں طرف برف پوش پہاڑیوں کے بیچ میں یہ سبزہ زار علاوہ سفید برفیلی پہاڑیوں کے ہوتے ایک گل دستے کے مانند تھا۔ ندی نالے آبشار، بھرنے پھولوں کے تختے، اونچے درختوں کے درمیان سطح پہاڑوں پر جا بجا پتھروں کی بلند و بالا عمارتیں تعمیر کی گئی تھیں۔ ہر سُو سکوت چھایا ہوا تھا۔ بھینی بھینی عجب خوشبو سے چمن چمن کے عماروں پر بکھری ہوئی تھی۔ ہر جگہ گوتم بدھ کی دیو ہیکل مورتیاں نصب تھیں۔ کہیں پہاڑوں میں تراشی ہوئی، کہیں جیسے زمین پر اُگی ہوئی۔ مندروں کی دیواروں اور ستونوں پر بھی ایسے ہی نقش تھے۔ دیواروں میں ہزاروں طاق تھے، اور ہر طاق میں ایک مورتی رکھی ہوئی تھی۔ سب سے بڑا مندر ایک اونچی پہاڑی پر واقع تھا۔ اُس کے ارد گرد چھوٹے بڑے مندر اور دوسری عمارتیں تھیں۔ سومِلو کی زبانی ہمیں معلوم ہوا تھا کہ یہیں بدھوں کی یونی ورسٹی جیسی ایک درس گاہ ہے۔ جہاں دنیا بھر سے بدھ یاتری اور طالب علم بدھ تعلیمات کے لیے آتے ہیں اور برسوں یہیں رہتے ہیں۔

دوپہر گزر گئی۔ ابا جان نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔ ذرا بھی اپنی جگہ سے ہٹے لیکن ہم وہاں کب تک یوں بیٹھے رہتے۔ بستی کے بدھ راہب اور خدمت گار پجاری ہمارے ارد گرد کی پگڈنڈیوں پر گزرتے ہوئے ہمیں چھپتی نظروں سے ضرور دیکھتے تھے۔ شام ہونے لگی تھی۔ قنبل وہاں سے نہیں اُٹھا۔ سورج کا سرخ گولا پہاڑوں میں آدھا چھپ گیا تھا۔ ابا جان کے جسم میں جنبش ہوئی، ہم سیدھے ہو گئے۔ ابا جان نے گردن موڑی، بلند جھٹک کے آنکھیں کھولیں، آسمان کی طرف دیکھا اور اپنے پاس رکھا ہوا کشکول نما برتن اُٹھا کے کھڑے ہو گئے۔ ہماری نگاہیں اُن کی ایک ایک حرکت کا جائزہ لے رہی تھیں۔ میرا جی چاہتا تھا کہ وہ سب اُن کی نظر بچیں لیکن یہ بات میں اُن سے کیسے کہہ دیتا۔ پہاڑی پر ٹہلتے ہوئے ابا جان نے بے ہنر نظر ڈالی۔ اُن کے ساتھ نزدیک و دُور بیٹھے ہوئے دوسرے راہب بھی اُٹھنے لگے۔ انھوں نے اپنے قریب ترین ساتھی کو سر ہلا کے تعظیم دی یا شاید اُس سے کچھ کہا۔ ہم اتنے فاصلے سے کچھ سُن نہیں سکتے تھے۔ وہ لوگ چپ چاپ خاموشی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ یقیناً ابا جان کو خبر نہیں کہ چند گز اُن سے پرے ایک دوسری پہاڑی پر بیٹھے ہوئے اُن کے نگراں ہیں۔ مندر کی طرف جانے سے پہلے انھوں نے سر گھما کے کسی کو پیچھے مڑ کے دیکھا۔ ہم پر اُن کی نظر نہیں پڑی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتے بڑھتے مندر کی عمارت میں گم ہو گئے۔

ہم اُن کے تعاقب میں مندر کے راستے پر نہیں گئے۔ قنبل دفعتاً پہاڑیوں کے چکر کاٹتا ہوا واپس بستی کے راستے پر چلنے لگا۔ بستی کسی قدر نشیب میں واقع تھی۔ مجھ میں قنبل سے یہ پوچھنے کی جرأت نہیں تھی کہ وہ ابا جان کے پاس جانے کے بجائے بستی کی طرف کیوں جا رہا ہے۔ میں خود بھی بہت سی باتوں کا اندازہ کر سکتا تھا۔ میرا بس چلتا تو تمام پہاڑیاں پھلانگ کے ابا جان کے پاس پہنچ جاتا اور اُن کے قدموں پر سر رکھ کے اپنے سینے میں […] لیتا۔ مجھ سے تو اُن کے سامنے یہ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ مجھے معاف کر دیں۔ انھوں نے اپنی جو حالت بنا رکھی تھی یہ سب کچھ نحوست کے سبب سے تھا۔ اُن کا جسم ڈھانچا بن گیا تھا۔ ساری پسلیاں اُبھری ہوئی تھیں۔ کھال جیسے ہڈیوں پر منڈھ دی گئی ہو۔ بس اُن کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک تھی، ایسی چمک جسے دیکھ کے ڈر لگے۔ ہم واپس بستی میں پہنچے تو اندھیرا ہو چکا تھا۔ ہمارا میزبان جن دیما ہمارا منتظر تھا۔ وہ لوگ رات کا کھانا جلدی کھا لیتے تھے اور رات جب تک نیند نہیں آ جاتی جاگتے بیٹھے رہتے تھے۔ اوس من باد یا دو کی ٹولیوں میں الاؤ کے گرد بیٹھے رات کا بیشتر حصہ گزار دیتے تھے۔ ان چار پانچ دنوں میں بستی کے بہت سے لوگ ہم سے واقف ہو چکے تھے۔ کل صبح اور دوپہر ہم نے بستی کی چند دکانوں کے نزدیک ایک کشادہ جگہ اپنا سامان صندوقوں سے نکال کے نمائش کے لیے سجایا تھا۔ دونوں دن ہمارے گرد ایک بھیڑ لگی رہی۔ لوگ خریدتے کم اور چیزیں حیرت سے دیکھتے زیادہ تھے۔ اُن کے لیے بہت سی چیزیں نئی تھیں۔ زنانہ ریشمی کپڑے عورتیں اور لڑکیاں بہت شوق سے دیکھتی تھیں۔ گاہکوں کے قیمت پوچھنے پر قنبل نے چیزوں کے دام بتانے شروع کیے تو ہم سب کو حیرت ہوئی۔ وہ دو گنی اور آٹھ گنی قیمتیں بتا رہا تھا۔ جامو اور قنبل سامان کے پاس ایسے بیٹھے تھے جیسے اُن کا پیشہ یہی رہا ہو۔ وہ مول تول کر رہے تھے۔ ہم نے کسی کو کم قیمت پر سامان نہیں بیچا۔ قیمتیں زیادہ ہونے کی وجہ سے سامان زیادہ نہیں بک سکا۔ قنبل کی خواہش بھی یہی تھی کہ سارا سامان ایک دم نہ بک جائے۔ ہمارے پاس ذخیرہ باقی رہے۔ سلطان نے لڑکیوں کے ہاتھوں میں چوڑیاں پہنائیں، اُن کے پیروں میں پازیب ڈال گھنگرو باندھے۔ وہ چل چل کے دیکھتیں، گھنگھروؤں کی آواز سن کے بہت خوش ہوتیں۔ جامو نے لڑکیوں کے بالوں میں کلپ اور پنیں لگائیں اور چٹیا گوندھنے کا طریقہ بتایا۔ جب تک ہم بازار لگائے بیٹھے رہے، بستی کی نوجوان لڑکیوں کا تانتا بندھا رہا۔ سومِلو، سلطان، جامو اور مارق اُن کی پتلی پتلی گلگوں ہاتھوں اور پیروں میں زیور سجاتے رہتے۔ جانگ قبیلے کی ہر لڑکی گوری، سرخ و سپید، ہاتھ نازک، آنکھیں چھوٹی چھوٹی، ناک ننھی، لمبی گردنیں اور بدن ریشم کے سے تھے۔ جامو اور سلطان زیور پہنا کے انھیں آئینہ دکھاتے تھے تو وہ شرما جاتی تھیں۔ اُن کے چہرے چھوٹے چھوٹے سفید طشت کمل

کھانے لگتے تھے۔ سہ پہر کو دھوپ ڈھلنے کے بعد ہم نے سامان خچروں پر واپس رکھنا شروع کیا تو سلطان وہاں سے اٹھنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ قبل نے اسے زبردستی اٹھایا۔ وہ بار بار یہی کہتا تھا: "استاد! سلطان واپس نہیں جائے گا۔ یہاں دھرتی کی لڑکیوں کے ہاتھوں میں چوڑیاں پہنتا، زیور سجاتا اور آئینہ دکھاتا اچھے لگو ہے۔"

اُس وقت بھی اسے بستی میں واپس چلنے کی جلدی تھی۔ جیسے ہی قبل نے بستی میں اترنے کے لیے قدم بڑھائے سلطان پگڈنڈی پر قلانچیں بھرنے لگا۔ اس تیزی میں ایک جگہ پھسلا، اُس کا پاؤں رپٹ گیا اور پیر میں موچ آگئی۔ قبل راستے بھر اسے جھنجھلاتا رہا۔ تکلیف کی وجہ سے سلطان سے چلا نہیں جا رہا تھا اسی لیے ہمیں بستی واپس پہنچنے میں دیر ہوگئی اور اندھیرا ہوگیا۔ لوگ اپنے اپنے گھروں میں جا چکے تھے۔ بند مکانوں کی درزوں سے کہیں کہیں مدھم روشنی چھن رہی تھی اور پہاڑوں میں ہوا سائیں سائیں کر رہی تھی۔ سردی اتنی زیادہ تھی کہ اگر ہم کچھ دیر اور پہاڑی پر بیٹھے رہتے تو پالے سے جسم اکڑ جاتے۔ آج یہ پہلا دن تھا کہ ہمیں اپنے آس پاس آگے پیچھے نگرانی کے لیے کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ پچھلے تمام دنوں وہ ہماری نقل و حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھے اور اپنے خیال میں یہ سمجھ رہے تھے جیسے ہم اس سے بے خبر ہیں۔ جہاں جہاں ہم جاتے اُن کی نگاہیں ہمارا پیچھا کرتی رہتیں۔ جدھر سے ہم گزرتے لوگ ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھتے۔ وہ ہم سے کچھ کہتے تو نہیں تھے لیکن اُن کی چبھتی ہوئی آنکھیں ہر لمحے ہمیں اپنے چہروں پر محسوس ہوتی تھیں۔ بستی کے مکانوں کے درمیان تنگ راستے سنسان پڑے تھے پھر بھی ہم تمام تر احتیاط سے پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے بستی میں داخل ہوئے۔ کسی وقت بھی کچھ ہو سکتا تھا۔ قبل نے سب کو منع کر دیا تھا کہ وہ تنہائی میں بھی غیر ضروری اشاروں اور جملوں سے اجتناب کریں۔ وہ خود بھی بس ضرورت کے وقت بولتا تھا۔ آگے جا کے ایک کھلی اور ہموار جگہ ہمیں اندھیرے میں چند سائے رینگتے نظر آئے۔ شاید ہمارے بستی میں جلد نہ پہنچنے کی وجہ سے انھیں تشویش ہوگئی تھی۔ قریب جانے پر پتہ چلا کہ وہاں کئی نوجوان اور ادھیڑ عمر آدمی موجود ہیں۔ ہماری آہٹ سن کے وہ چپ ہوگئے اور ہمیں گھورنے لگے۔ اندھیرے میں اُن کے چہرے دھندلے تھے۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا کہ وہ کیا سوچ رہے ہیں۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ہماری تلاش میں نکلنے والے تھے۔ اُن میں ہمارا میزبان چن وسا بھی تھا۔ کسی نے ہم سے کچھ پوچھا نہیں۔ چن وسا سب سے پہلے آگے بڑھا اور سلطان کی حالت دیکھ کے ٹھٹک گیا۔ پھر کچھ کہے سنے بغیر وہ ہمیں ایک طبیب کے پاس لے گیا۔ طبیب نے جڑی بوٹیوں کے تیل سے سلطان کے پیر کی مالش کر دی اور لیپ کر کے پٹی باندھ دی۔ درد سے سلطان کا برا حال تھا مگر دیکھتے دیکھتے اسے افاقہ ہونے لگا۔

چن وسا نے گھر آ کے اُسے گرم کپڑوں میں لپیٹ کے بستر پر لٹایا۔ کوئی ایسی نشہ آور چیز کھلا دی کہ سلطان گہری نیند سو گیا۔

مجھے اندیشہ تھا کہ سلطان کی چوٹ ہمارے کہیں آنے جانے میں پھر ایک رکاوٹ بن جائے گی۔ سفر میں بھی روز کوئی نہ کوئی ہماری ... اور ہماری رفتار میں فرق آ جاتا تھا۔ میری سمجھ میں اب تک یہ بات نہ آئی تھی کہ قبل کو اتنے لوگ ساتھ لانے کی کیا ضرورت تھی۔ ہم جتنے کم ہوتے رکاوٹیں آتی ہی کم ہوتیں اور پھر اُس نے سلطان کو کیوں ساتھ رکھ لیا تھا کہ مسلسل تنبیہ کے باوجود تین دن سے سلطان اوٹ پٹانگ حرکتیں کر رہا تھا۔ بالکل بچوں کی طرح ضد کرنے لگتا۔ بعض اوقات تو مجھے اس پر بہت غصہ آتا تھا۔ چن وسا کی فوری توجہ سے سلطان کی مشکل بہرحال دور ہوگئی اور دیر سے آنے کا جواز بھی پیدا ہو گیا۔ مجھے یقین تھا کہ بستی میں ... کے بعد قبل کے ذہن میں آباجان کے متعلق کوئی تدبیر ضرور ... جان کو دیکھ کے یوں وہاں سے لوٹ نہیں سکتا تھا لیکن ... ہر بار ہم وہاں سے مڑے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ ہمیں ... میں واپس آنا ہی تھا۔ ہم نہ آتے تو ہماری تلاش میں وہ اُدھر ... پیچھے ہمارا سامان بھی پڑا تھا اور ہمیں ابھی اور نہ جانے کب تک ... درمیان رہنا تھا۔ جاگنگ قبیلے کی ایک ہی بستی نہیں تھی جس میں ... ہوئے تھے۔ قریب قریب کے پہاڑوں پر قبیلے کی اور بھی بستیاں ... چن وسا نے ہمیں بتایا تھا کہ مندروں کے اس پار بھی قبیلے کی ایک ... مشرق، مغرب، جنوب تینوں سمتوں کے پہاڑوں پر جاگنگ قبیلے ... پھیلے ہوئے تھے۔ شمال کے پہاڑوں میں سال کے بیشتر حصے برف ... تھی اس لیے وہاں کسی انسانی بستی کا قیام ناممکن تھا۔ چن وسا نے ... باتوں میں ہمیں یہ بتا دینا بھی ضروری سمجھا تھا کہ بستیوں کے ... اور سردار کے اہم ... منتقل کرنے کے عمدہ انتظامات موجود ...

چن وسا نے غلط نہیں کہا ہوگا۔ جاگنگ قبیلہ دوسرے ... نسبت زیادہ خوشحال اور مہذب تھا۔ بستی میں چند دکانوں ... صاف ستھرا مختصر بازار تھا اور بازار کے مکانوں کے ساتھ ساتھ ... کے مکانات بھی بنے ہوئے تھے۔ ہر شخص ہر وقت مسلح رہتا تھا ... پاس ایک خنجر ہونا تو ازبس لازم تھا۔ اُن کی زبان چینی ... پر مبنی تھی۔ ہمارا قیام جس بستی میں تھا اُسے تمام بستیوں میں ... مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ ایک تو یہ کہ وہ مندروں کے قریب ... تھی۔ سردار اور اُس کے رفقا بھی یہیں رہتے تھے۔ یہاں ... اور اسی لیے راستے بھی پہاڑوں پر واقع دوسری بستیوں سے ... کشادہ تھے۔ بستی کے درمیان سے ایک تیز رو ندی گزرتی تھی ... کناروں پر قبیلے کے لوگ تھوڑی بہت کاشت کرتے تھے اور ... روایتیں دور دور تک مرکزی بستی کے متعلق مشہور تھیں۔ ہم ...

قبیلے کے رسم و رواج کے خلاف کوئی بات نہیں کی تھی۔ بازار میں سامان بیچتے ہوئے قبل نے اگرچہ گاہکوں سے سختی کی تھی لیکن قبیلے کے معزز اور بڑے لوگوں میں تحائف بھی تقسیم کیے تھے۔ تاہم ایک ذرا سی لغزش سے ساری احتیاط خاک میں مل سکتی تھی۔ ہم وہاں اجنبی تھے اور جاگنگ قبیلے کے لوگوں کے تیور سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اجنبیوں کے معاملے میں بے حد حساس ہیں۔ کبھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ایک دوسرے کو بھی شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

سلطان کو لٹا کر گھر سے باہر لوٹنے کے بعد چن وسا ہمیں اپنے مکان کے ایک دوسرے بڑے کمرے میں لے آیا اور ہم یہ دیکھ کے دنگ رہ گئے کہ وہاں پہلے سے چند آدمی موجود تھے۔ پانچ بوڑھے آدمی جن کے زرد شکن بھرے چہرے آتش دان کے شعلوں کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ اس وقت اُن کی موجودگی ہمارے لیے حیرت کا سبب تھی۔ حالانکہ فوراً ہی چن وسا نے یہ بتا کے ہماری الجھن دور کرنے کی کوشش کی کہ آج رات کے کھانے پر اُس نے بستی کے چند معزز لوگوں کو مدعو کیا ہے اور اُنھیں ہمارا انتظار تھا۔ ہم نے قبیلے کی روایت کے مطابق انھیں سلام کیا اور اُن کے ساتھ ہی فرش پر بیٹھ گئے۔ اُن میں سے تین آدمیوں سے ہم پہلے ہی مل چکے تھے اور انھیں تحائف دے چکے تھے۔ اُن کی وہاں موجودگی کی بات سمجھ میں آتی تھی لیکن اب یہ بات طے تھی کہ جب تک وہ موجود تھے ہم اُن کے پاس نہیں جا سکتے تھے۔ ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ یہ سوچ کے کہ اب ان لوگوں کے ساتھ بیٹھنا پڑے گا میرا دل ڈوبنے سا لگا۔

جب سے آباجان کو دیکھا تھا طرح طرح کے خیال آ رہے تھے۔ اتنی ... بار بار سامنے آ جاتا تھا۔ لگتا تھا جیسے سب کل کی بات ہے۔ تب ... گلیوں میں بھٹکتے گزارے تھے اور اُن سب کے چہرے فرخ، امل، نادر ہیں۔ اب کچھ پتہ نہیں کون کہاں تھا۔ آباجان انھیں کس کے پیچھے چھوڑ کے آئے تھے۔ شاید اب کوئی بھی اُن کے ساتھ نہیں رہا تھا ورنہ وہ ... سے یہاں کیسے بیٹھے رہتے۔ پر آباجان کا حوصلہ بہت بڑا تھا۔ ... کے گھر سے نکل گیا اور بعد میں نہ جانے کون ... آباجان کے حوصلے میں فرق نہیں آیا۔ انھیں یہ سب دیکھنے کی عادت پڑ گئی تھی۔

چن وسا ایک کم گو سیدھا آدمی تھا لیکن جسم کی مضبوط ساخت کی وجہ سے اس کی عمر کبھی بھی نظر نہ آتی اور سرخ نظر آتی تھی۔ قبیلے میں اُسے ... حاصل تھی۔ دوسرے امیر لوگوں کی طرح ایک ہموار جگہ پر اُس کے ... کا ایک پختہ مکان تھا جس کی دیواریں، چھت اور ستون پتھر کے تھے۔ صرف دروازہ لکڑی کا تھا۔ بستی میں کم ہی لوگوں کے پاس ایسے مکانات تھے۔ سردار نے اُسے ہماری مہمانی کے لیے خاص طور پر منتخب کیا تھا۔ پہلے دو دن تک تو وہ محتاط رہا پھر رفتہ رفتہ اُس کی پریشانی اور آنکھوں کا کھنچاؤ کم ہوا۔ اُس رات اُس نے خاصا اہتمام کیا تھا۔ بکرے کا بھنا ہوا گوشت، پہاڑوں پر کاشت کی ہوئی اعلیٰ ... پاک، نمکین مچھلی اور قسم قسم کی چیزیں موجود تھیں۔ ہم نے اپنی جانب سے اس کی خدمت میں ولایتی شراب کی بوتل پیش کی۔ بوتل دیکھ کے چن وسا اور اُس کے بوڑھے ساتھیوں کی آنکھوں میں چنگاریاں سی لپکنے لگیں۔ پہلے چن وسا نے یہ تحفہ قبول کر لیا تھا لیکن پھر کچھ سوچتے ہوئے واپس کر دیا کہ اتنی قیمتی چیز کا اصل حق دار قبیلے کا سردار ہے۔ قبل نے اسے یقین دلایا کہ سردار کے لیے اُس کے پاس اور بوتلیں ہیں جو آگے چلتے وقت اُسے پیش کرنے کے لیے علیحدہ رکھ لی ہیں۔ چن وسا نے بوتل شکریے کے ساتھ قبول کر لی اور ہمیں بتایا کہ قبیلے کے بزرگوں نے عرصہ ہوا کسی معاہدے کے بغیر خود ہی اپنے لیے شراب ممنوع قرار دے رکھی ہے لیکن قبل کے اصرار پر انھوں نے چند گھونٹ حلق سے اتارے۔ اندر سے چن وسا کی بیٹی جیسی آنکھوں والی گڑیا سی نوجوان خادمہ گرم گرم گوشت لا رہی تھی۔ ایک ادھیڑ عمر خادم دروازے کے پاس مستعد کھڑا تھا۔ وہ سب کھانا کھا رہے تھے اور شراب پی رہے تھے۔ قبل جیسے یاد نہیں رہا تھا کہ اسے کوئی اور بھی کام ہے۔ پہلی بار وہ اُن سے پرانے واقف کاروں کے مانند باتیں کر رہا تھا۔ مجھ سے نہ جانے کیا ہو گیا۔ میرے جی میں آیا تھا کہ تمنچا نکال کے اُن سب کو گولی مار دوں یا شراب کی بوتل اُن کے حلق میں الٹ دوں اور اپنا سر دیوار سے پھوڑ لوں۔

کمرہ گرم تھا۔ روشن دان بھی بند رکھے گئے تھے۔ ایک طرف کونے میں لکڑیاں جل رہی تھیں۔ کبھی کبھی کوئی لکڑی زور سے چٹخ اٹھتی تھی۔ چھت سے اوپر آگ کا دھواں نکلنے کا باقاعدہ انتظام تھا۔ کمرے کے درمیان دری پر ایک موٹا کپڑا بچھا ہوا تھا۔ سب لوگ کھانے کے اطراف دائرہ بنائے بیٹھے تھے اور ان سب کے جسموں کے کھلے ہوئے حصے آگ کی روشنی میں لال ہو رہے تھے۔ قبل چن وسا کی باتیں نہایت توجہ سے سن رہا تھا اور ہم کے ذریعے بیچ بیچ میں ترجمہ کیا جاتا تھا۔ چن وسا بہت سی باتیں ہمیں پہلے ہی بتا چکا تھا البتہ بعض ہمارے لیے نئی تھیں۔ میرے کان بھی کھڑے ہوگئے۔ چن وسا کے بیان کے مطابق قبیلے میں ایک بڑا سردار قبیلے کی تمام بستیوں کا ... جاتا تھا اور مہینے میں ایک بار جاگنگ قبیلے کی ہر بستی کے لوگ مندروں میں اکٹھے ہوتے تھے۔ ہر چار مہینے بعد ایک بستی دوسری بستی کو دعوت کے لیے مہمان کے طور پر مدعو کرتی تھی۔ یہ ایک طرح کا میلہ ہوتا تھا۔ قبیلے کے نوجوان لڑکیاں اور لڑکے زیادہ تعداد میں ان میلوں میں جاتے تھے اور وہیں رشتے طے ہوتے تھے۔ اگر کوئی لڑکی بہت سے لڑکوں کو مطلوب ہوتی تو قبیلے کے معزز لوگ اُن میں سے ایک دوسرے کے لیے اپنا مطالبہ ترک کر دینے کی درخواست کرتے بصورت دیگر قرعہ ڈال لیتے۔ قرعے کی بھی بات کے آمادہ نہ ہوتے تو اُن کے درمیان مختلف قسم کے مقابلے ہوتے۔

جو تھا وہ بہت بہتا۔ وہ بھی اپنی مطلوبہ کر لے۔ آیا یا پھر لڑکی سے پوچھا جاتا
کہ وہ اپنی طرف سے اپنے امیدواروں کے لیے شرطیں عائد کرے۔ لڑکیاں
عموماً ایسی نہیں تھیں مگر انھیں کوئی امیدوار ناپسند ہوتا تو وہ ہر ایک پر
مختلف قسم کی شرطیں عائد کرتیں۔ جو لڑکا انھیں سب سے زیادہ پسند ہوتا،
اُس کے لیے وہ شرطیں نرم رکھنے کا اختیار رکھتی تھیں۔ اُس وقت زیادہ
دقت پیش آتی جب ایک لڑکی کے بہت زیادہ امیدوار ہوتے اور
ایسا اکثر ہوتا تھا۔ اگر کوئی بیاہی ہوتی تو سارا قبیلہ اُس کا امیدوار ہوتا مگر
وہ تو ایک شہزادی تھی جانگ قبیلے کی ہونے والی ملکہ۔ میں نے پن وسا سے
نہیں پوچھا کہ کیا اُس کے لیے بھی اسی طرح امیدوار کھڑے ہوتے مگر
کوراان میں سے کسی کو پسند نہ کرتی۔ اُس کا رشتہ تو شروع ہی سے میرے
ساتھ طے ہو گیا تھا۔ وہ کہتی تھی کہ اُس نے میرے ملنے سے پہلے مجھے دیکھ
لیا تھا۔ کہتے ہیں جب ہم ایک ہوٹل میں ٹھیرے ہوئے تھے اور میرے
ماتھے پر اس کی انگلیاں سرسراتی تھیں اُس نے مجھ سے یہی کہا تھا اور
میں نے اُسے پہلی بار گیا اسٹیشن پر دیکھا تھا تو مجھے بھی اُس کا چہرہ جانا
پہچانا محسوس ہوا تھا جیسے وہ مجھ سے کبھی بچھڑ گئی تھی پھر مل گئی۔ جیسے ہم
دونوں ایک دوسرے کو ڈھونڈ رہے تھے۔ یہ ڈھنگ یا میں اپنے اتالیق
اُچین کے قتل ہونے کے بعد وہ کسی اور جگہ پناہ لینے کے لیے نہیں گئی
سیدھی میرے گھر آئی تھی۔

پن وسا کہہ رہا تھا کہ پہلے یہ رسم دھوم دھام سے منائی جاتی تھی مگر
اب مدت ہوئی وہ جوش و خروش نہیں رہا ہے۔ لوگ ملتے ہیں تو
حیرت کرتے ہیں۔ قبیلے کے بہترین لڑکے ہر سال اپنے متبرک کاغذات
کے حصول کے لیے بستی سے نکل جاتے ہیں، کبھی واپس آ جاتے ہیں کبھی
نہیں۔ قبیلہ جانگ کو اپنے محلِ وقوع، اپنے ماضی، مقدس مذہبی مقام، برتر
جسمی خصوصیات کے اعتبار سے دور دور تک برتری حاصل تھی۔ پن وسا
کے بقول اُن کا یہ اعزاز قائم نہیں رہ سکا کیونکہ وہ مقدس امانت کی حفاظت
نہیں کر سکے۔ اُن کی سرفرازی اُن سے چھن گئی اور وہ برسوں سے عذاب
میں مبتلا ہیں۔ جھل نے بوجھل لہجے میں پوچھا کہ آخر ایسا کیوں ہو گیا؟ اس
کے استفسار پر پن وسا کی آنکھوں میں ویرانی چھا گئی۔ اُس نے اضطراب آمیز
انداز میں اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ وہ گود میں جھکائے ٹھنڈی ٹھنڈی
سانسیں بھر رہے تھے۔ پن وسا کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے اور آواز
گلوگیر ہو گئی۔ اس کی زبان پر کورا کا نام آیا تو میرے کان سن سنانے لگے۔ پن وسا
بتا رہا تھا کہ خدا نے اُسے اپنے ہاتھ سے بنایا تھا، وہ آسمانوں سے اتری
ہوئی کوئی پری تھی وہ ایک نیک اور بہادر سردار کی بیٹی تھی۔ سردار بے وقت
مر گیا۔ قبیلے والوں نے اپنے محبوب سردار کی چہیتی اور اکلوتی بیٹی کی حفاظت
نہیں کی وہ اُسے کھو بیٹھے۔ اُسے اپنے باپ کی وصیت کے مطابق قبیلے کی
رانی بننا تھا لیکن ابھی اُس کی عمر کم تھی۔ اُس کے چچا نے اُس کے ساتھ ظلم کیا

اور قبیلے کی سربراہی کے لالچ میں اپنی بھتیجی کا حق غصب کرنا چاہا۔ کورا
یہاں رہتی تو وہ یقیناً اُسے زندہ نہ رہنے دیتا۔ اس لیے اُس کا اتالیق
اُچین اور بزرگ اتالیق اُسے قبیلے سے دور لے گیا اور اپنے ساتھ متبرک
دستاویزیں بھی لیتا گیا۔ مجھے یہ ساری باتیں خود کورا نے بتائی تھیں۔ جو کورا
میں ایک جھگتو نے میرے گھر میں کورا کی دی ہوئی مالا دیکھ کے مجھ
پر حملہ کیا تھا اور میں نے اُسے تیسے میں ختم کر دیا تھا تو اس نے کورا کو
پچھلے کہا تھا۔ مگر بارہ مہینے بعد سردار مرتے ہیں یا قبیلہ بدر کیے جاتے…
ہر سردار اپنا عہدہ سنبھالتے وقت قبیلے کے سامنے عہد کرتا ہے کہ وہ
متبرک دستاویزیں واپس لا کے قبیلے کو شرمندگی سے نجات دلائے گا…
ہو جائیں گی۔ ناکام ہونے پر وہ خودکشی کر لیتا ہے۔ قبیلے کے…
موت کی سزا سے بچتے ہیں۔ کوئی معزز آدمی ہو تو اُسے قبیلہ بدر…
کر دیا جاتا ہے۔ قبیلے والے متفق ہو کے اپنے نئے سردار کا انتخاب
کرتے ہیں یا پھر کوئی شخص خود سرداری کے لیے آگے آتا ہے۔…
لے جاتے ہیں۔ نذریں دعائیں مانگی جاتی ہیں۔ ہر سردار نئے…
اِدھر اُدھر دوڑتا ہے۔ قبیلے والوں کے فیصلے کے مطابق جو…
کامیاب ہو گا وہی ہمیشہ قبیلے کا سردار رہے گا وہ یا اُس کی اولاد…
پن وسا کی آواز یکایک چیخنے لگی۔ وہ کہنے لگا کہ اُس کے…
تھے۔ سالار کا قبیلے کے اور بہت سے نوجوانوں کی طرح یہ عہد کر کے
چلا گیا کہ وہ اپنی متبرک امانت کا کھوج لگا کے ہی لوٹے گا۔ وہ واپس نہ
آ سکا۔ سات آٹھ ماہ تک وہ مارا مارا پھرتا رہا۔ پھر ایک دن…
کسی نے مار دیا۔ میری رگوں میں خون جمنے لگا۔ مجھے ایسا…
جیسے پن وسا براہِ راست مجھ سے مخاطب ہے اور مجھی کو سنا رہا ہے۔…
یہ سب کچھ کہہ رہا ہے۔ میں نے اپنی ٹھوڑی ہوئی نظریں اُس کی طرف…
مجھ سے پن وسا کا بھیگا ہوا انگارا چہرہ دیکھا نہیں جا سکتا۔ اس کا ایک
لفظ میرا سینہ کاٹ رہا تھا۔ میں نے اُن کے درمیان سے اُٹھ کے
جانے کا ارادہ کیا لیکن میرا سارا جسم برف کا تودا بن گیا تھا…
میں نے خود کو اُن سب کی نظروں سے چھپانے کی کوشش کی…
بنا بیٹھا رہا۔ پن وسا کہہ رہا تھا کہ اس کے بیٹے کی اُٹھان بہت…
تھی۔ وہ ایک بے باک بے جگر آدمی تھا۔ یقیناً وہ اُس شخص کے…
ضرور پہنچ گیا ہو گا جس کی تحویل میں قبیلے کی امانت تھی۔…
کے بعد اُس کا دوسرا بیٹا سردار بنا دیا گیا اور اُس کا حشر بھی وہی ہوا…
سرداروں کا ہوتا رہا ہے۔ گیارہ مہینے اپنی مدت پوری کرنے کے…
اُس نے خودکشی کر لی۔ اُس کا تیسرا بیٹا اپنے بڑے بھائی کی…
ہندوستان چلا گیا۔ دو سال سے زیادہ ہو گئے ہیں، وہ واپس نہیں…
اُس کے تینوں بیٹے بہت بہادر اور جیالے تھے۔ انھیں اپنے قبیلے…
عزت کا بہت پاس تھا۔ اب اُس کے پاس صرف ایک بیٹی رہ گئی…

بیوی اپنے دونوں بیٹوں کا صدمہ برداشت نہ کر سکی۔ پھر تیسرا بھی چلا
گیا۔ وہ مر گئی۔ میں نے سوچا پن وسا سے کہوں کہ اُس کا بیٹا خود ہی میرے
آڑے آ گیا تھا۔ میں اُسے نہ مارتا تو وہ مجھے مار دیتا اور میرا اُسے مارنے
کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ مجھے تو یہ بھی خبر نہیں تھی کہ وہ کون ہے۔ میں تو
خود اس سے کورا کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا تھا اسی لیے میں نے
اپنی مالا کپڑوں سے باہر نکالی تھی۔ پن وسا کے دوسرے ساتھی بھی رو
رہے تھے اور پن وسا بتا رہا تھا کہ ان کے بیٹے بھی اسی طرح ان سے
جدا ہو گئے ہیں۔ انھیں کون بتاتا کہ اور بھی لوگ ہیں جن کے گھر اجڑے
ہیں۔ کاش کورا وہ کاغذات اپنے ساتھ نہ لاتی، انھیں وہیں چھوڑ کے آ
جاتی۔ پھر نہ لوگ اس کی تلاش کرتے، نہ آباجان یوں گھر سے بیگانہ
ہوتے، نہ امی زندگی بھر گھلتیں۔ ہم دونوں گھر سے نکل جاتے تب بھی
گھر تو موجود رہتا۔

جھل، جامو، مارتی اور سولم اُن کی صورتیں تک رہے تھے۔ میرا دم
گھٹ رہا تھا۔ جھل نے سولم کے ذریعے ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں اُن
سے اپنی ہمدردی کا اظہار کیا۔ پن وسا نے کاغذات میں خزانے سے
متعلق کسی بات کا ذکر نہیں کیا تھا مگر اُس نے اشارۃً بتایا کہ اگر وہ کسی سمجھ
بوجھ کے آدمی کی تحویل میں آ گئے ہیں تو وہ شاید کبھی اس طرف ضرور آئے
گا۔ میری توقع کے خلاف جھل نے اُس سے اس کا سبب نہیں پوچھا۔
پن وسا نے خود ہی کہا کہ اس رات بدھ گیا میں اُچین کے قتل کے بعد
کورا یہ کاغذات لے کے فرار ہو گئی تھی۔ اُسے ان کی اہمیت و افادیت،
ان کے تقدس اور حرمت کا پورا اندازہ ہو گا اور وہ زندہ ہو گی تو کاغذات
بھی محفوظ ہوں گے۔ ممکن ہے وہ کسی شخص کو یہاں بھیجے یا کوئی شخص خود
ہی یہاں آئے۔ ہم اسی شخص کے انتظار میں ہیں۔ سالوں گزرے یہاں سے
سوداگروں کا ایک قافلہ گزرا تھا۔ قبیلے والوں کو شک ہوا تھا۔ انھیں افسوس
ہے شک میں وہ سارے سوداگر مارے گئے۔ اُن کے پاس سے کچھ
برآمد نہیں ہوا۔ پن وسا کو اس ماحول میں ہمیں یہ نہیں بتانا چاہیے تھا
مگر غالباً یہی سب بتانے کے لیے اُس نے آج کی رات منتخب کی تھی۔
پن وسا کے نرم لفظوں کے پیچھے تنبیہ و تاکید کی سختی صاف محسوس کی
جا سکتی تھی۔ جھل کے کان سرخ نہیں ہوئے۔ وہ تجسس آمیز انداز میں پن وسا
کی باتیں سنتا رہا۔ وہ جانے خواب میں سامان کی تلاش لے ہی چکے
پن وسا ساری بھری باتیں کر چکا تو بولا کہ قبیلہ ان کاغذات کے عوض
زر و جواہر کے انبار دینے کے لیے تیار ہے۔ جو کچھ ان کے تصرف میں
ہے سب نثار کر دیں گے۔ قبیلہ بہت سی شرطیں پوری کر سکتا ہے۔ صرف
ایک اس شرط پر کہ کاغذات انھیں واپس کر دیے جائیں۔ مقدس
دستاویزات جانگ قبیلے کا اعزاز ہیں۔ وہ اُن کے پاس آ جائیں گی
تو قبیلے سے یہ نحوستیں خود بخود ختم ہو جائیں گی جو کچھ وہ اُن کے عوض

صرف کریں گے اُن کے طفیل دوبارہ جلد ہی حاصل کر لیں گے۔ مقدس
دستاویزات جانگ قبیلے کی نجات ہیں، یہی کی نجات ہے۔ وہ
اُس کے عوض جو کچھ بھی چاہیے۔ معلوم نہیں جھل، جامو، مارتی اور سولم نے
کیا سمجھا ہو۔ میں نے اپنے طور پر یہی سمجھا کہ پن وسا کی یہ
پیشکش ہمارے لیے ہے اور کھلے لفظوں میں یہ نہیں ہے کہ
انھیں ہم پر کاغذات کے امانت دار ہونے کا شک یقینی نہیں ہے
اور یہ پانچوں جہاں دیدہ بزرگ آج رات بے سبب ہمارے سامنے
اکٹھے نہیں ہوئے ہیں۔ ان کا مقصد کچھ اور ہے۔ کوئی نتیجہ اخذ کرنا
کوئی رائے قائم کرنا، اپنے سردار کو ہمارے بارے میں کسی قسم کی سند دینا۔
اُن کی آنکھیں [illegible] ہیں اور انھوں نے یہ باتیں دانستہ
چھیڑی ہیں۔ اُن کا لہجہ معنی نہیں تھا۔ اس میں عاجزی بھی تھی، فریاد
بھی تھی اور ایک بیزاری بھی جھلکتی تھی۔ اب میرے دماغ کے
ہیولے تھے اور کچھ بھی نہیں تھا۔

رات گئے تک وہ نہیں اُٹھے۔ آتش دان میں لکڑیاں کم ہو جاتیں
تو کوئی بھی نئی لکڑیاں آگ میں جھونک دیتا۔ انھوں نے بہت کم شراب
پی تھی۔ اتنی دیر میں صرف آدھی بوتل خالی ہوئی تھی۔ کاغذات کے ذکر
پر پن وسا کی آواز کبھی تمتمانے لگتی، کبھی اُس پر ہیبت غالب آ جاتی۔
آباجان یہیں قریب تھے۔ اچھا ہوتا وہ بھی اس وقت ہمارے درمیان
ہوتے اور اپنے کانوں سے پن وسا اور اس کے ساتھیوں کی باتیں سن
لیتے۔ میرے مساموں سے ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ پھوٹ رہا تھا۔ آباجان کی
صورت ایک لمحے کے لیے میری نظروں سے اوجھل نہیں ہو رہی تھی۔ مجھے
یقین تھا کہ جھل کے پاس ایسی کوئی ضمانت نہیں ہے کہ آج رات قبیلے
کے لوگ اُن تک نہیں پہنچ جائیں گے اور رات آباجان یہاں سے
کہیں دور کسی اور طرف نہیں نکل جائیں گے۔ ہو سکتا ہے انھوں نے
اپنا مقصد حاصل کر لیا ہو اور جانگ قبیلے میں ان کا آخری دن ہو۔ جھل
کے پاس ایسی بھی کوئی ضمانت نہیں تھی کہ ان دنوں میں کسی نے ہمیں
آباجان کے سامنے چوکتے ہوئے نہیں دیکھا ہے، جانگ قبیلے سے
متعلق جو جستجو مستقل یہاں رہتے ہیں وہ بھی ہماری طرف نظر رکھتے ہوں
گے لیکن ہم میں سے کوئی بھی یہاں سے کہیں اُڑ سکتا تھا کوئی بھی نہیں۔
جامو نے کئی بار جماہیاں لے کے اپنی تھکن اور اکتاہٹ کا اظہار کرنا
چاہا، انھوں نے توجہ نہیں دی۔

پھر رات کو کسی وقت پن وسا کے پانچوں بوڑھے ساتھی
ڈولوں اور کمبلوں سے اپنے جسم ڈھانپ کے کھانستے ہوئے اچانک
اٹھ کھڑے ہوئے۔ شاید اب اُن کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں رہ
گیا تھا۔ انھوں نے رسمی انداز میں ہم سے معذرت چاہی اور باہر
نکل گئے۔ جھل ہونٹ سکیڑنے لگا۔ اُن کے جاتے ہی جامو نے پوچھا کیا

چاہا مگر تجمل نے اشارے سے آگے روک دیا۔ "تیرے ساتھ ایسا ہوتا ہے جا ماسٹر استاد!" وہ تھکی ہوئی آواز میں بولا۔ "ان لوگوں نے ہم پر بھروسا کیا ہے۔ سویرے گڑبڑ کریں گے لینا ابھی رات باقی ہے۔"

اور اس وقت تجمل کے لہجے اور اشارے سے مجھ پر یہ خدشہ کسی حقیقت کی طرح آشکار ہوا کہ ان میں سے کوئی ہندوستانی سے واقف ہو سکتا ہے۔ جا ماسٹر نہیں سمجھا، اس نے حجت کی تو تجمل نے اسے ڈانٹ دیا۔ جاتے ہوئے چین وسا نے ہم سے کچھ نہیں کہا تھا اس لیے ہم اُسی کوٹھری نما کمرے میں لیٹ گئے۔ بہت دیر بعد جب مکان میں ہر آہٹ معدوم ہو گئی تو تجمل میرے قریب کھسک آیا اور میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔ "شہزادے! ہلنا مت، بیچ میں ہی رکھنا۔"

"نہ جانے مجھے کیا ہو رہا ہے۔" میں نے ہانپتے ہوئے کہا۔

اس نے مجھے اپنے بازوؤں میں کھینچ لیا۔ "کمونے پر بندھا رہ لاڈلے!"

"میرا جی اُڑ رہا ہے۔"

"جی کو میاں میں ہی رہنے دے۔"

"یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" میں نے ڈوبتی آواز میں کہا۔

"ٹھیک ہی ہو رہا ہے جانی!" وہ مسکراتے لہجے میں بولا۔

"میرا دماغ پھٹ جائے گا۔"

"تو اتنا بوجھ کیوں اٹھاتا ہے، بس آنکھیں کھلی رکھ۔"

"کاش میری آنکھیں بند ہو جائیں!"

وہ مجھے تھپکنے لگا۔ "اپنا نہیں تو دوسروں کے واقعے پیر کی گتھیاں کھلے۔"

"ہم یہاں بیٹھے ہیں۔" میں نے وحشت سے کہا۔

"یہ چھت کے نیچے ہیں۔"

"فرض کرو، اگر آج ہی وہ وہاں سے نکل گئے تو؟..."

"اس سے بھلا اور کیا ہو گا لاڈلے!"

"لیکن پھر... پھر...!"

"پھر بہت سامنا نہ ہو جائے گا، برا ایسا کچھ نہیں ہے۔"

"مگر تم نے سوچا کیا ہے؟"

اس نے آنکھیں میچ لیں اور چپ رہا۔

"مجھے بتانے میں کوئی حرج ہے؟"

"کوئی حرج نہیں۔"

"تو پھر زبان کیوں نہیں کھولتے؟"

"زبان سالی اینٹھ رہی ہے۔"

"مجھے معلوم تھا، تمہارا جواب یہی ہوگا!"

"منہ کو کیوں مارتا ہے؟" وہ درشتی سے بولا۔

"ایک بات کہوں؟" میں نے کچھ توقف کے بعد کہا۔

"بولو...!"

"باقی سب لوگ گو واپس کر دو۔"

"تیرا گھڑیال شہزادے نہیں چل رہا ہے۔" اس نے زور سے میرے بال پکڑ لیے۔

"تمہارا تو ٹھیک چل رہا ہے۔"

"چل لے پھر،" وہ ٹھنک کے بولا۔

میں نے پھر اس سے بات نہیں کی لیکن مجھے نیند آئی نہ اُسے۔ ہم دونوں چپ پڑے رہے تھے۔ جا ماسٹر مارتی اور سوتم تھوڑی دیر بعد ہی سو گئے تھے اور ہلکے خراٹے لے رہے تھے۔ شاید دس پندرہ منٹ اور گزرے ہوں گے کہ دفعتہً تجمل اٹھ کے بیٹھ گیا اور میرا بازو ہلا کے کہنے لگا: "لاڈلے! ذرا گھڑی دیکھ۔"

ہم میں سے صرف مارتی کے پاس گھڑی تھی۔ میں نے جلدی سے اس کے بغل میں ہاتھ ڈال کے جیب ٹٹولنی چاہی۔ مارتی ہڑبڑا اٹھا۔

"ٹائم بتائیے، مارتی!" میں نے آہستگی سے کہا۔

مارتی گھبرا گیا۔ میرا ہاتھ اس کے منہ کے قریب ہی تھا تاکہ اگر وہ زور سے بات کرے تو اس کا منہ بند کر دوں۔ مارتی کا ہاتھ سیدھا میری گردن پر آیا تھا لیکن دوسرے لمحے وہ ٹھہر گیا۔ "کیا بات ہے راجا استاد؟" وہ حیرانی سے بولا۔

"بات مت کر، ٹائم بتائیے۔"

مارتی کی گھڑی میں تین بجے تھے۔ میں نے تجمل کو بتایا تو وہ تیزی سے کھڑا ہو گیا۔ مارتی کو اس نے اٹھنے نہیں دیا۔ چین وسا باہر جاتے ہوئے دروازہ بھیڑ گیا تھا اور ہم نے معمول کے مطابق اندر سے کنڈی نہیں لگائی تھی۔ تجمل پنجوں کے بل چلتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا اور چند لمحے وہیں ٹھٹکا کھڑا رہا۔ دروازے کے پار کوئی آہٹ نہیں تھی۔ تجمل نے آہستگی سے کنڈی پکڑی پھر آہستہ آہستہ کواڑوں کو اندر کی طرف کھینچا۔ میں نے آگے بڑھنے کی کوشش کی تھی مگر اس نے میرے سینے پر ہاتھ مار کے مجھے پیچھے ہی رہنے دیا اور خود کواڑ کھولے رہا۔ اس کی تاخیر سے مجھے الجھن ہو رہی تھی۔ دروازہ ذرا سا کھلا ہو گا کہ ایک ہلکی چرچراہٹ کی آواز ابھری اور سرد ہوا کا ایک تھپیڑا میرے گالوں سے ٹکرایا۔ مجھے جھرجھری آ گئی۔ تجمل بھی رک گیا۔ دروازے کے کھلے ہوئے حصے سے اس نے آنکھیں لگا کے باہر دیکھا۔ باہر گہرا اندھیرا تھا۔ نہ جانے تجمل کو کیا ہوا کہ اس نے ارادہ بدل دیا اور کواڑ کھینچنے کے بجائے انھیں ایک دم کھول دیا۔

ہم کسی ضرورت کے تحت بھی رات کو اپنے کمرے سے نکل سکتے تھے، یہ قید خانہ نہیں تھا، ایک مکان تھا جہاں ہم مہمان تھے مگر تجمل گھر کے کسی مکین کو اپنے کمرے سے باہر نکلنے کی خبر کرنا نہیں چاہتا تھا مگر

بھاری دروازہ آواز کے بغیر نہیں کھل سکتا تھا ورنہ دیر بہت ہو جاتی۔ چین وسا کے گھر کی ساخت سے ہم اچھی طرح واقف ہو چکے تھے۔ وہ کوئی پیچیدہ اور بڑا مکان نہیں تھا۔ قبیلے کے عام مکانوں کے لحاظ سے بڑا، شہروں کے مکانوں کی نسبت سادہ۔ ایک طرف دو کمرے بنے ہوئے تھے جن میں سے ایک میں ہم تھے، دوسرے میں سلطان، ان کے آگے پختہ چھت کا ایک مختصر سائبان۔ سائبان بائیں طرف بھی انگریزی حرف ایل کی طرح چار دیواری تک چلا جاتا تھا، جہاں کوٹھریوں جیسے چھوٹے چھوٹے کمرے بنے ہوئے تھے۔ چین وسا، اس کی بیٹی اور ملازم انھی میں رہتے تھے۔ سائبان کے بعد ایک کشادہ صحن تھا۔ ہمارے کمروں کے پچھواڑے بھی ایک تنگ سائبان کے ساتھ تھوڑا سا صحن تھا۔ ہر طرف درخت اور مختلف پودے لگے ہوئے تھے۔ پتھر کی ایک چھوٹی موٹی اور اونچی نیچی دیوار سارے مکان کا احاطہ کرتی تھی۔ زمین نسبتاً ہموار تھی۔ ہمیں غسل خانے وغیرہ کے لیے سامنے صحن کی طرف کھلنے والے دروازے سے نکل کے پیچھے جانا پڑتا تھا۔ کمروں میں صرف ایک ہی دروازہ تھا اور عقبی دیوار پر روشن دان کے مانند ایک کھڑکی سی جو عموماً بند رہتی تھی۔ چھت کے ساتھ دیواروں پر بھی ایسے ہی سوکھے بنے ہوئے تھے جنھیں درختوں کی چھال یا کسی اور قسم کے کپڑوں سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔

تجمل نے مارتی کو ہاتھ کے اشارے سے جاگتے رہنے کی ہدایت کی اور باہر نکل آیا۔ باہر قبرستان جیسی خاموشی اور قبر جیسا اندھیرا تھا۔ قریب و دور کی کوئی چیز نظر نہیں آتی تھی۔ باہر آ کے اندازہ ہوا کہ ہوا اچھی خاصی تیز ہے۔ میری آنکھیں ٹھٹھرنے لگیں۔ پیروں میں ہم اونی جرابیں پہنے ہوئے تھے۔ میں نے تجمل کا ہاتھ تھام لیا۔ ہم اندھوں کی طرح ہاتھ پھیلائے ٹٹول ٹٹول کے سائبان کے فرش پر قدم رکھ رہے تھے۔ پہلے رات کو کسی وقت باہر نکلنے کا اتفاق ہوتا تو ہم مشعل ساتھ رکھتے تھے۔ ساری رات سائبان کے ایک کونے میں کوئی مشعل جلتی رہتی تھی، آج وہ بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ چین وسا کے ساتھی جاتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لے گئے ہوں گے۔ تجمل کی جیب میں بیٹری بھی ہوگی لیکن بیٹری اُسے استعمال نہیں کرنی چاہیے تھی۔ ہم نے قدموں کے اندازے سے سائبان کا فاصلہ طے کیا اور ٹھوکریں کھاتے ہی کامیاب ہو گئے۔ صحن میں اترنے کے لیے سیڑھیاں تھیں۔ ہم تھم تھم کے ساتھ چلتے ہوئے نیچے اتر گئے۔ پہلے تجمل پھر میں۔ پیروں کے باوجود صحن میں قدم رکھتے ہی ایسا محسوس ہوا جیسے ہم ٹھنڈے پانی میں اتر گئے ہیں۔ سردی سے میرے ہونٹ چپکنے لگے تھے۔ چند لمحوں میں کتنی ہی بار میں نے سر کو جھٹکا دیا۔ گہرا اندھیرا گھر کی وجہ سے تھا، بچ بچ کے چلتے ہیں، وہ چار قدموں میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ باقی فاصلہ طے کرنا آسان نہیں ہے۔ میں تجمل سے

ٹوکنے کے لیے کتنا ہی چاہتا تھا کہ وہ اور آگے چل پڑا۔ بیٹری کی روشنی اب بھی روشن نہیں کی تھی۔ ہم تقریباً ایک ایک دو دو انچ کھسکتے ہوئے چار دیواری کی طرف بڑھتے گئے۔ ہم دونوں نے اپنے چہرے پوری طرح ڈھانپ لیے تھے۔ صحن کے درختوں سے بچتے ہوئے ہم کسی طرح دروازے تک پہنچ گئے۔ دیوار پتھروں کی تھی اور زیادہ اونچی نہیں تھی۔ ہم گرد کے بھی مکان کے باہر دیکھ سکتے تھے۔ میں ایک موہوم امید کے سہارے ہی تجمل کا ساتھ دے رہا تھا کہ شاید دیوار کے پاس ایسا اندھیرا نہ ہو۔ تجمل نہ جانے کس دھن میں چپ تھا، غالباً مجھے یہ باور کرانے کے لیے کہ میں سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں اور بعد میں کچھ کہنے کے لیے میرا منہ بند رہے۔ مکان میں کوئی شخص نہیں جاگ رہا تھا۔ ہماری چاپیں صرف ہمیں تک محدود رہی تھیں۔ کھردرے پتھروں پر پیر رکھ کے ہم دونوں نے ایک ساتھ اپنے سر اوپر کیے۔ تجمل دیوار پر چڑھ گیا تھا کہ میں نے اس کے پیر پکڑ لیے۔ ہم نے آپس میں بات کرنے سے پرہیز کیا۔ چار دیواری کے باہر تاحدِ نظر صرف ایک چیز نظر آتی تھی، بس یوں جیسے برف سے سیاہ دھواں اٹھ رہا ہو اور ساری فضا پر چھا گیا ہو۔ آگے اونچی پہاڑیاں تھیں اور آڑی ترچھی پگ ڈنڈیاں ہمارے پیروں سے نامانوس۔ ذرا سے ہم کسی طرف بھٹک جاتے تو صبح تک کبھی واپس نہ پہنچتے۔ بستی سے مندروں کا علاقہ اتنی دور نہیں تھا، پھر بھی چند میل سے کم نہیں تھا اور ساری کی ساری چڑھائی تھی۔ بیٹری بھی ساتھ نہ دیتی۔

سائبان تک ہم رینگتے ہوئے واپس آئے لیکن سائبان میں آ کے ہم نے اپنی رفتار معمول کے مطابق کر لی۔ تجمل نے بیٹری جلا دی۔ جیسے اپنی آنکھیں واپس مل گئیں۔ سائبان میں بھی دھند تھی اور بیٹری کی روشنی بھی کسی قدر دھندلا گئی تھی۔ بہر حال اب گھر کا کوئی مکین جاگ جاتا تو ہمیں اتنی فکر نہیں تھی۔ ہمارا کمرہ سامنے تھا۔ تجمل اندر جانے کے بجائے سلطان کے کمرے کی طرف مڑ گیا۔ اس کا خیال ہوگا کہ باہر نکلے ہیں تو ایک نظر سلطان کو بھی دیکھ لیں۔ اسی کمرے میں ہمارا سامان رکھا جاتا تھا۔ دروازہ بند تھا، ظاہر ہے اندر سے کنڈی نہیں لگی ہوگی۔ تجمل نے دروازے پر ہاتھ رکھ کے اسے جھٹکا دیا تو وہ ایک ہلکی آواز کے ساتھ کھل گیا۔ کمرے میں مدھم روشنی تھی لیکن اندر کا منظر دیکھ کے ہماری آنکھیں پھٹ گئیں۔ کمرے میں ایک اونچی جگہ سلطان لیٹا ہوا تھا اور کوئی اس کے سینے پر خم ہو رہا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی ایک گھٹی ہوئی سسکی بلند ہوئی اور وہ بجلی کی طرح سلطان کے سینے سے اٹھ کے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہمیں دیکھنے لگی۔ تجمل نے بیٹری کی روشنی اس کے چہرے پر پھینکی تو اس نے منہ پھیر لیا اور دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا۔ ہمیں اسے پہچاننے میں دیر نہیں لگی۔ وہ چین وسا کی لڑکی تھی۔ گھر میں آتے جاتے بارہا ہمارا اس کا آمنا سامنا ہوا تھا۔ ایک لمحے کے تذبذب کے بعد تجمل نے بیٹری بجھ

دی اور دروازہ بھیڑ کے اپنے کمرے کی طرف چل پڑا۔

سلطان کی آنکھیں دیکھ نہیں تھی۔ چن دسا کی نوجوان لڑکی کا تمام کا تمام اس کے سینے پر لکھا ہوا تھا۔ مجھے اپنی بنائی پوسٹ ہوا۔ قبل کی بھی یہی حالت ہوگی۔ نہ جانے ہم نے کیا دیکھا تھا۔ روشنی میں تمام کو رنگ چمک رہا تھا۔ میں نے اُسے دن میں بھی دیکھا تھا۔ وہ ایک شرمیلی اور نازک سی لڑکی تھی۔ اس کے بال کسی کے بالوں کی طرح اتنے لمبے تھے کہ کولھوں تک آتے تھے۔ چہرے کا سنہرا رنگ دمکتا تھا۔ کوئی بھی ایک بار اُسے دیکھ لے تو بار بار دیکھنے کو جی چاہتا ہوگا۔ اس کی آنکھیں بڑی بڑی اور شربتی تھیں۔ قبل نے اُسے چند سکے دیے تھے تو اس کے گالوں پر سرخی چھا گئی تھی۔ اُس وقت سلطان نے اپنے ہاتھ سے اُسے چوڑیاں پہنائی تھیں مگر یہ چار ہی دن پہلے کی بات تھی۔

کون کھٹا تو ہماری نظریں سب سے پہلے مارلی پر پڑی۔ وہ دروازے کے پاس ہی کھڑا تھا۔ ہاتھ میں کھلا چاقو تھا۔ قبل نے اس کے گال اور کان تھپ تھپائے اور آئش دان کی جو جل رہی تھیں، مارنے لگا۔ مارلی نے اس میں کچھ اور لکڑیاں ڈال دیں۔ قبل کچھ دیر تک ہاتھ تاپتا رہا، پھر آ کے چپ چاپ بیٹھ گیا۔ اس نے مجھ سے کچھ کہا نہیں، میں نے اس سے، مگر مجھے معلوم تھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔

مجھے توقع تھی کہ صبح ہوتے ہی قبل باہر نکلنے میں جلدی کرے گا لیکن ایک تو وہ دیر میں بستر سے اُٹھا، پھر لیں ہی خاموش بیٹھا وقت گزارتا رہا۔ آج پہلا دن تھا کہ خلاف معمول چن دسا ناشتے کے دوران ہمارے درمیان موجود نہیں تھا۔ اس کے خادم نے بتایا کہ وہ سویرے سے ہی کسی کام سے باہر چلا گیا تھا اور اُسے ہدایت کر گیا تھا کہ مہمانوں کا خیال رکھنا۔ روز کی طرح منہ ہاتھ دھونے کے لیے گرم پانی تیار تھا۔ چن دسا کی خادمہ دودھ اور مکھن میں گندھے ہوئے جوار کے آٹے کی گرم روٹیاں، اچار اور جانگ قبیلے کا مخصوص ساگ لا رہی تھی۔ ہم سب نے کئی کئی پیالیاں چائے پی۔ خلاف معمول چن دسا کی بیٹی بھی ہمارے سامنے نہیں آئی تھی۔ ناشتے کے بعد خاصا وقت گزار کے قبل سلطان کے کمرے میں گیا۔ سلطان بستر میں دبکا ہوا چائے پی رہا تھا۔ اس کے چہرے پر تازگی تھی اور بالکل ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ رات اُسے گہری چوٹ لگی ہے۔ بیٹھک میں بُوئی تھی، بیٹھک کے ایک کونے میں آگ دہک رہی تھی اور سلطان اپنا پیر سینک رہا تھا۔ قبل نے اس سے رات کے متعلق کوئی بات نہیں کی، نہ ہی زخم کے بارے میں پوچھا۔ جب ہم اُسے چھوڑ کے جانے لگے تو سلطان بے چینی سے بولا "اب میں چل سکتا ہوں اُستاد!"

قبل نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا۔ پلٹ کے اُسے دیکھا اور ٹھہری ہوئی آواز میں بولا "ایک دن اور آرام کر لے۔ تیسرے دن ہم بھی تجھے گھر جائی دیتے ہیں۔"

سلطان بالکیں جھپکانے لگا "کم کیا..... کیا؟" وہ ہکلانے لگا۔

"ٹھیک ہی تو بول رہا ہوں سلطانے شاہ!"

"تم مجھ سے کچھ خفا لگتے ہو" وہ منگرواڑ ہوا کھڑا ہو گیا۔

"خفا تو تم سے کچھ ہو گیا ہے سائیں" قبل نرم لہجے میں بولا۔

"مجھ کو بتاؤ" سلطان چیخ کر بولا لیکن پھر اس کی آواز خود بخود ماند پڑ گئی اور وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا "سلطانے کو غلطی کہاں ہوئی استاد؟"

قبل کے ہونٹ کچھ کہنے کے لیے کھلے اور بند ہو گئے۔ وہ صرف سر ہلا کے رہ گیا اور مجھے چلنے کا اشارہ کیا۔ ہم ہٹ کر تو سلطان اور مارلی حیرت سے ان دونوں کو تک رہے تھے۔ باہر سویرے میں روک گیا۔ دروازے سے گزرتے ہوئے قبل مڑ کے بولا "جا سوا سلطانے استاد کے دل میں جھگڑ کچھ بیریں بڑھی ہوئی گٹی ہیں۔ ہو سکے تو ان کو بچا دے۔ استاد کو شاید پھر رنگ دکھائی دینے لگے۔"

"اُستاد.. قبل بھائی!" سلطان بدحواس انداز میں بولا۔

قبل اس کے کمرے سے چلا آیا اور مجھے باہر آ کے معلوم ہوا کہ اس نے سامان کے لیے خادم کو قلی بلانے بھیجا ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ آج پھر قبل کا بازار لگانے کا ارادہ ہے۔ بازار سے واپس آتے آتے دوپہر ہو جائے گی۔ چند گھنٹے تو وہاں گزارنا ہی پڑیں گے۔ اس نے صرف دو رنگ سامان اٹھوایا تھا۔ ہم قلیوں کے پیچھے چلنے لگے تو جا مرسی اندر سے آگیا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ اُسے دیکھ کے قبل کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تیرنے لگی۔ سارے راستے جا مو نظریں جھکائے چلتا رہا اور دلیوں کی طرح بازار میں خوب چہل پہل تھی۔ ہم نے سامان نکالا تو دیکھتے دیکھتے بھیڑ جمع ہو گئی۔ قبل نے آج بھی کوئی رعایت نہیں کی۔ وہ بے حاجر چیزوں کے دام بتا رہا تھا لیکن اس کے لہجے میں تیزی اور سختی نہیں تھی۔ کبھی دام اتنے الٹ پلٹ بتا دیتا کہ بعد میں تردید کرنی پڑتی۔ میں اُس سے الگ تھلگ ایک گوشے میں اپنے آپ کو سمیٹے بیٹھا تھا۔ میں نے نہ کسی گاہک سے بات کی، نہ سامان کو ہاتھ لگایا۔ تھوڑی سی چیزیں بکی ہوں گی کہ اس نے یکایک سامان پھر سے زنگوں میں بھرنے کو کہا اور قلیوں کو اُسے گھر پہنچانے کی ہدایت کی۔ میری رگوں میں سنسناہٹ ہونے لگی۔ اب ضرور قبل کا اوپر جانے کا ارادہ ہو گا۔ اور میرا آ جان موجود ہیں مگر کیسے؟ میں جتنا سوچتا اتنا ہی میرے دماغ میں اندھیرا ہونے لگتا۔ آج ہم میں کوئی غیر معمولی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ آج کا دن بھی کل کی طرح تھا لیکن قبل کے اچانک اُٹھ جانے کا سبب اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا تھا کہ اس کے ذہن میں کوئی بات ضرور آئی ہے۔

آج چھٹا دن تھا۔ چرنی زور اسا تھے، مشن میاں، ملّو، ملا کر بھیجی اور وزیر میں سے کوئی بھی نہیں آیا تھا۔ ان سب کو ایک ساتھ ہی آنا تھا۔ قبل نے اُن سے اپنے جانے کے چار روز بعد بستی کا رُخ کرنے کو کہا

تھا۔ وہ بستی سے زیادہ دور نہیں تھے مگر وہ جگہ جانگ قبیلے کی حدود میں نہیں آتی تھی جہاں ہم اُن سے جدا ہوئے تھے۔ وہ اگر راستہ گھوم کے نہ آتے تو زیادہ سے زیادہ دو پہر لگتے۔ کوئی ایسی ہی بات ہو گئی ہوگی۔ کوئی بھی بات ہو سکتی تھی۔ اُدھر جنگل بیابان تھا۔ قریب کوئی بستی بھی نہیں تھی۔ ہم نے جان بوجھ کے اُن کے پڑاؤ کے لیے ایک سنسان جگہ منتخب کی تھی۔ یہاں آنے کے بعد ہمارا اُن سے کوئی رابطہ نہیں ہو سکتا تھا۔ نہ یہاں سے کوئی جا کے اُن کی خبر لے سکتا تھا اور نہ وہاں سے کوئی آ کے ہمیں اُن کے نہ آنے کا سبب بتا سکتا تھا۔ ایک دن کی دیر ہو سکتی تھی مگر اب دو دن گزر گئے تھے۔ انھیں خود جلد سے جلد ہم تک پہنچنے کی فکر ہوگی کہ کہیں قبیلے میں ہم پر کوئی افتاد نہ پڑ گئی ہو۔ انھیں اس حقیقت کا بخوبی احساس ہوگا کہ بستی میں ہمارا قیام بستی کے باشندوں کی مرضی پر منحصر ہے۔ ہم اپنے قیام کو طول دینے کا کوئی نہ کوئی معقول عذر انھیں ضرور پیش کریں گے لیکن اُسے قبول کرنے نہ کرنے کا سارا دار و مدار قبیلے کے لوگوں اور اس کے سردار پر ہے اور انھیں یہ بھی احساس ہوگا کہ ہم کس مقصد کے لیے آئے ہیں۔ قبیلے میں جا کے فی الفور ہمارا اس سے سامنا پڑ سکتا ہے۔ قبل نے سامان بچا بچا کے رکھا تھا تا ہم قبیلے کے لوگوں کے خیال میں یہاں ہمارا قیام تجارتی اعتبار سے سود مند ثابت نہیں ہو رہا تھا تو ہمیں جلد ہی آگے کہیں اور چلے جانا چاہیے تھا۔ ہم بھی نہ اب نہیں تھا کہ آگے سفر کرنا ناممکن ہو۔

ہیڑ کے نہ آنے سے اب تک اُس کی کوئی کمی محسوس نہیں ہوئی تھی بلکہ ایک لحاظ سے یہ اچھا ہی ہوا تھا ہم وقفے وقفے سے یکے بعد دیگرے دو تجارتی قافلوں کی آمد کو قبیلے کے لوگ اتفاق سمجھنے میں اکراہ کرتے۔ گو ہماری پوری کوشش ہوتی کہ ہم یہ اکراہ دور کریں۔ جدا ہونے سے پہلے بستی میں دوبارہ ملنے کے متعلق ہمارے سامنے قبل نے چرنی سے یہ بات صاف کر لی تھی۔ اس وقت کچھ لوگوں کو دور روک دینا ہی مناسب تھا۔ ایک ساتھ اتنے لوگوں کا بستی میں داخل ہونا موجودہ صورت کے مقابلے میں کسی طرح بھی بہتر نہیں معلوم ہوتا تھا۔ ہم آگے کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہوئے بھی کچھ نہیں جانتے تھے۔ ایسی صورت میں کچھ لوگوں کو پیچھے آنے کے لیے باقی رہنا اور پیچھے رہ جانے والوں کے لیے آگے چند لوگوں کا پیش قدمی کرنا ہی ٹھیک تھا۔ جانگ قبیلے کی مختلف بستیوں میں چار دیواریاں کھنچی ہوئی نہیں تھیں۔ کوئی بھی شخص یہاں آ جا سکتا تھا۔ چنانچہ بستی کے لوگ پہلے پہنچنے والے اجنبیوں سے فوراً ہی کوئی عداوت نہ رکھتے۔ انھیں اُن کی آمد کا مقصد پہچاننے میں کچھ وقت ضرور لگتا کہ اتنی دیر میں دوسرے لوگ پہنچ جاتے۔

آخری منزل میں ہم نے قبل ہی ایسے منتخب کیے تھے جو آگے جانے کے بجائے پیچھے واپس ہو جاتیں۔ جھیر ہیڑ سے الگ ہو کے جانگ قبیلے میں داخل ہونے سے پیشتر ہم نے ایک اور منزل پر پڑاؤ کیا تھا اور وہاں بھی قتل بدل دیے تھے۔ سارے سفر میں ہم قلیوں سے یہ کہتے آئے تھے کہ ہم دو قافلے ہیں۔ دونوں کی منزلیں مختلف ہیں۔ چونکہ منزلیں یکساں ہیں، دونوں کا ساتھ ہے اور بڑھ کے آ جانے کے بعد ہم قبل کے قبیلے والوں سے یہ اعتراف کر سکتے تھے کہ ہم ایک دوسرے کے لیے اجنبی نہیں ہیں۔ ہم نے سفر کا ایک رشتہ اظہار ساتھ کا تھا ہے۔ بعد میں انھیں کسی ذریعے سے ہمارے سفری رفاقت کے سلسلے میں خبر مل جاتی تو آپس میں شناسائی کے اس اعتراف کے بعد اس خبر کی حیثیت اُن کے لیے انکشاف کی نہ ہوتی اور جیڑ بستی میں آ کے انھیں یہ کہہ کر مطمئن کر سکتا تھا کہ اُس کا بیشتر سامان دوسری بستیوں میں فروخت ہو چکا ہے۔ باقی کے لیے اُس نے جانگ قبیلے میں اپنی قسمت آزمانے کا فیصلہ کیا ہے جبکہ اس نے دوسری بستیوں میں بہت شہرہ سنا تھا اور اُسے معلوم تھا کہ ایک اور قافلہ بھی اس طرف سامان لے کے گیا ہے، غزیزی نہیں تھا کہ قبیلے میں سب سے پہلے اُن کی مڈ بھیڑ ہی سے ہوا اور ہمیں یہ بتانے کا موقع مل جاتا کہ وہ کس قسم کی بات کریں۔ قبیلے والوں کے سامنے ہم دونوں کے روبرو ہونے پر جیڑ کا رد عمل قبل کے طرز عمل سے مشروط ہوتا کہ وہ ایک دوسرے سے کس حد تک واقفیت کا اظہار کریں، یہ جانچنے کے لیے جیڑ کو چند ہی لمحوں کی مہلت درکار ہوتی۔

انھیں بہر صورت اب آ جانا چاہیے تھا۔ چلتے چلتے مارلی اور جامو کی نظریں اپنے اردگرد پہاڑیوں پر منڈلانے لگتی تھیں۔ ابھی چند لمحے ہوئے ہمارے پیچھے بستی میں اچانک شور اُٹھا تھا۔ سب بے چین ہو کے دوڑ گئے تھے لیکن پتہ چلا کہ ایک برفانی ریچھ بستی میں گھس آیا ہے اور کہیں چھپ کے بیٹھ گیا ہے۔ بستی والے اس کی تلاش میں سرگرداں ہیں، اندیشہ ہے کہ وہ قبیلے کی کسی عورت یا بچے کو پکڑ کے نہ لے جائے۔ جتنا وقت بیت رہا تھا، طرح طرح کے وہم آ رہے تھے۔ مشن میاں کی حالت ویسے بھی ٹھیک نہیں تھی۔ وزیر بھی کئی بار بیمار پڑ چکا تھا۔ وہ راستے میں بھٹک سکتے تھے۔ ممکن ہے انھیں تُل زل گئے ہوں۔ ان کے ساتھ تھوڑی تعداد میں سامان تھا۔ قبائلی قزاق بھی اُن کے آڑے آ سکتے ہیں، یہ بھی ممکن تھا۔

ابھی ہم بستی میں تھے کہ راستے میں قبل نے ایک بوڑھے آدمی کو روک کے چن دسا کے متعلق دریافت کیا۔ تھوڑی سی پوچھ گچھ کے بعد چن دسا سردار کے مکان کے قریب ایک عمارت سے برآمد ہوتے ہوئے ہمیں مل گیا۔ سُرلم نے قبل کی ترجمانی کی۔ قبل نے کہا تھا کہ وہ اپنے معزز مہمان کی وساطت سے قبیلے کے سردار سے ملنا چاہتا ہے۔ یہ سن کے چن دسا کچھ متذبذب سا ہو گیا اور کوئی جواب دیے بغیر مکان کے اندر چلا گیا۔ ہم باہر ہی ٹھہرے رہے۔ چن دسا واپس آیا تو اکیلا نہیں تھا۔ ایک معمر شخص بھی اس کے ہمراہ تھا۔ دونوں نے جواب طلب نظروں سے ہمیں دیکھا لیکن کوئی سوال نہیں کیا اور کسی قدر تیز رفتاری سے ایک سمت چل پڑے۔

جتنا ہم آگے بڑھتے گئے، رنگ زندگی کشادہ ہوتی گئی۔ اونچائی کا ایک مختصر فاصلہ عبور کرنے کے بعد ہم سردار کے مکان کے سامنے موجود تھے۔

پہلے دن جب ہم سردار سے ملے تھے اور نوواردوں کی روایت کے مطابق ہم نے اُسے تحائف پیش کیے تھے تو وہ جگہ اور تھی۔ کچھ نیچے اسی غار کے نزدیک، جہاں وہ خود رہتا تھا۔ پتھر کی اونچی اونچی دیواریں ایک بڑے رقبے کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ باہر دروازے پر کوئی خاص پہرا نہیں تھا۔ آس پاس اور بھی کئی لوگ اُدھر سے گزرتے ہوئے ہمیں نظر آئے۔ ہم فصیل نما چار دیواری کے باہر انتظار کرتے رہے۔ ہمیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ تھوڑی دیر میں ایک مستعد نوجوان بلند دروازے پر ظاہر ہوا۔ اس کے حکم پر پہرے دار ایک طرف ہو گئے۔ دروازے میں قدم رکھتے ہوئے میرے پیر ڈگمگانے لگے۔

سامنے کوئی سو گز کی دوری پر چھوٹی بڑی کئی عمارتوں کے بیچ میں ایک بلند و بالا دو منزلہ عمارت کھڑی تھی۔ سب سے پہلے اسی پر نظر جاتی تھی کیونکہ وہی ان میں سب سے نمایاں تھی اور کسی قدیم چینی محل کا ایک حصہ معلوم ہوتی تھی۔ ڈھلواں چھت اوپری منزل پر ان گنت دروازے نیچے سے پھیلی ہوئی اوپر جاتے جاتے ایک گول دائرے میں سمٹتی گئی تھی۔ ہر قسم کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ باغیچے میں بھی مختلف رنگوں کے پتھر کی لاٹیں ایستادہ تھیں۔ چار دیواری کے ساتھ ساتھ نیچے گھنے درخت تھے اور ان کے درمیان کہیں کہیں کیاریاں بنی ہوئی تھیں۔ اندر دروازے کے پاس ہی ایک اونچی پہاڑی پر چشمہ پھوٹ رہا تھا اور اس کے گرتے ہوئے پانی پر کسی آبشار کا گمان ہوتا تھا۔ کبھی یہ کوزا کا گھر تھا۔ اس دالان سے گزر کے وہ بستی میں جاتی ہوگی۔ اس جگہ کے چپے چپے نے اسے دیکھا ہوگا اور چپے چپے پر اس کے قدموں کے نقش ثبت ہو گئے ہیں۔ کوزا کے گھر میں تھا، جہاں اس نے آنکھ کھولی تھی اور سارا بچپن لڑکپن گزارا تھا۔ یہ سب کچھ مجھے ایسا لگتا تھا جیسے میں پہلے بھی یہاں آ چکا ہوں۔ کبھی کوزا مل گئی تو میں اسے بتاؤں گا کہ میں وردنگ بستی کی سب سے اونچی پہاڑی پر واقع اس کے گھر گیا تھا تو اسے یقین نہیں آئے گا۔ میں سوچ رہا تھا کہ ثبوت کے لیے یہاں کی کچھ مٹی جیب میں رکھ لوں گا۔ کہتے ہیں مٹی میں خوشبو ہوتی ہے۔ کوزا یہ خوشبو پہچان لے گی۔ وہ بہت حیرت زدہ ہوگی اور تب اسے یقین آ جائے گا کہ میں کہاں کہاں گیا۔ کاش وہ اندر ہی موجود ہوتی۔ مجھے یہاں دیکھتی تو اسے سکتہ سا ہو جاتا۔ سمجھتی کہ خواب دیکھ رہی ہے۔ آج سورج مشرق کے بجائے مغرب سے کیسے طلوع ہو گیا۔

میری آنکھیں سُن ہو گئی تھیں، جیسے میں چلتے چلتے سو گیا تھا۔ تجمل نے ٹہوکا مار کے مجھے چونکا دیا۔ ہم بڑی عمارت کے بیرونی ستون سے گزر رہے تھے۔ چین وسا اور اس کا ساتھی ہمیں عمارت کے باہر کھڑے ہوئے ملے۔ ان کے ساتھ اور لوگ بھی تھے۔ ان سب کی معیت میں ہم عمارت میں داخل ہوئے۔ سامنے سے عمارت خاصی سجی ہوئی تھی مگر کوئی غیر معمولی سرگرمی نظر نہیں آ رہی تھی۔ عمارت کے مختلف حصوں سے گزرتے ہوئے ہمیں ایک بڑے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ کمرے کے وسط میں دیوار سے لگے ہوئے تخت پر قبیلے کا کسرتی جسم اور درمیانے قد کا سردار اشی گو بیٹھا تھا۔ اس کا رنگ شہابی تھا، مونچھوں اور سر کے بالوں کا رنگ بھورا۔ دانت چھوٹے چھوٹے، پیشانی چوڑی، سینہ اُٹھا ہوا اور ہونٹ چپٹے چپٹے تھے۔ ہم پانچوں نے قبیلے کی رسم کے مطابق اُسے تعظیم دی اور جب تک اس نے بیٹھنے کا حکم نہیں دیا، کھڑے رہے۔ سردار کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں کسی جگنو کے مانند چمک رہی تھیں۔ تجمل نے آگے بڑھ کر دستے کا ایک قیمتی خنجر پیش کیا۔ سردار نے اسے تین چار بار الٹ پلٹ کے دیکھا اور اس کے ہونٹوں پر ایک ثانیے کے لیے مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ پھر وہ پہلو بدل کے ہماری جانب متوجہ ہو گیا۔ پچھلے دن کی طرح آج بھی اس کا چہرہ اس کے اندرونی اضطراب کی صاف غمازی کر رہا تھا۔ وہ جلد سے جلد ہماری زبان سے کچھ سننے کے لیے بے تاب تھا۔ تجمل نے کچھ کہنے سے پہلے وہاں موجود دوسرے لوگوں کی طرف متردد انداز میں نگاہ ڈالی۔ سردار فوراً سمجھ گیا اور اس نے اُن سب کو باہر جانے کا حکم دے دیا۔ چین وسا بھی چلا گیا مگر تخت کے پاس کھڑا ہوا ایک شخص موجود رہا۔

"معزز سردار سے بولو کہ اِدھر قبیلے میں ہم اس کی خاطر داری سے بہت خوش ہیں۔" تجمل کی بھاری آواز گونجی۔ "اور بولو کہ اپنے پاس اس کا بدل دینے کے لیے کچھ نہیں ہے۔"

سولو نے تجمل کی کہی ہوئی بات تبتی زبان میں سردار سے دہرا دی۔ سردار نے سر ہلایا اور خاموش رہا۔

"بولو کہ ہم کو رات چین وسا کی زبانی ساری بات کا پتہ چلا ہے۔ ابھی ہم اس بارے میں قبیلے یا سردار کے لیے کوئی بھی کام کر سکتے ہیں۔ تم ہم کو بولو اور ہم پر بھروسا کرو۔ ذرا ٹھیک ٹھیک بولو۔"

ہم سب چونک پڑے۔ سردار بھی اپنی نشست پر جما نہ رہ سکا اور متحیر نظروں سے تجمل کو گھورنے لگا۔ "مگر تم لوگ کیا کر سکتے ہو؟" وہ اضطراری لہجے میں بولا۔

"ہم لوگ سوداگر ہیں۔ سودا کرتے پھرتے ہیں۔ چین وسا نے بولا ہے کہ اِدھر قبیلے کے لوگ بہت دنوں سے پریشان ہیں۔ اگر کاغذات قبیلے کو مل گئے تو قبیلہ اپنا سب کچھ، جو کچھ بھی اس کے پاس ہے اور اپنے سے الگ کر سکتا ہے، حوالے کر دے گا۔ ایسا ہے کہ نہیں ہے؟"

"ایسا ہی ہے۔" سردار کی آواز لپکنے لگی۔ "کیا تم ... تم اس سلسلے میں کچھ جانتے ہو؟"

"سودا اچھا ہے تو ایک بازی ہم بھی کھیلیں گے۔"

"کیا تم کچھ جانتے ہو؟" اس نے دوبارہ پوچھا۔

"ابھی کچھ نہیں، مگر جب جاننے کا جتن کریں گے تو جان بھی لیں گے۔" تجمل نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

سردار کی چمکتی ہوئی آنکھیں بجھ گئیں۔ "بہت دن ہو گئے۔" وہ مایوسی سے بولا۔ "بہت دن ہو گئے ہیں۔"

"ہم کو پتہ ہے دن بہت ہو گئے ہیں۔" تجمل اونچی آواز میں بولا۔ "پر تم لوگوں نے دن بیت جانے سے امید نہیں کھو دی ہے۔"

"قبیلے کا آخری آدمی اپنی آخری سانس تک انھیں دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہے گا۔" سردار نے جوش میں کہا۔

"تو پھر اب ہم کو بھی اپنے ساتھ شامل سمجھو۔ ہم کو ساری بات بول دو۔ کاغذات کدھر رکھے تھے؟ لڑکی کیسی اور کس عمر کی تھی؟ اس کا رنگ روپ ....."

"وہ ہندوستان میں ہے۔" سردار تیزی سے بولا۔ "اور ہندوستان کوئی چھوٹا ملک نہیں ہے۔ قبیلے کے بہترین آدمی نو سال سے اُسے ڈھونڈ رہے ہیں۔ تم کہاں کہاں جاؤ گے۔ تم ہر گھر میں گھس کے اُسے نہیں دیکھ سکتے۔"

"کوئی بھی ایسا نہیں کر سکتا۔ پر ہم ہندوستانی لوگ ہیں۔ تمھارے مقابلے میں ہم اُدھر زیادہ کھوج کر سکتے ہیں اور کام کے لیے بہت سے آدمی اکٹھے کر سکتے ہیں۔ منظور ہو تو بولو۔"

"منظور!" سردار تلخی سے بولا۔ "قبیلے میں کس کو یہ نامنظور ہو سکتا ہے۔"

"پھر یہ جو بات چین وسا سے ہم نے سنا تھا۔ تم سمجھیں وہ ٹھیک ہے۔ ہماری ایک شرط اور بھی ہے کہ کامیاب واپسی پر ہمارا ایک قبیلہ سدا کے لیے مرت جائے اور جانے بھیجے ہوئے قافلے کو راہداری دے گا، کسی اور کو نہیں۔"

"سب ہم کو منظور ہے۔" سردار کے لہجے میں اکتاہٹ آ گئی۔

"اچھا سنو سردار! بولنے سے پہلے سوچ لو۔"

"پہلے کاغذات لے آؤ، پھر بات پکی کرو۔"

"پہلے بات پکی کرو۔" تجمل نے زور دے کر کہا۔

سردار اچھل کے تخت سے اتر آیا اور سیدھا تجمل کے پاس گیا۔ تجمل بیٹھا رہا۔ سردار چند لمحوں تک خشمگیں نظروں سے اُسے دیکھتا رہا۔ پھر اُس کے پاس سے ہٹ کے کمرے میں ٹہلنے لگا اور اچانک غیر متوقع درشتی سے بولا۔ "تم قبیلے کے سردار کے سامنے ہو۔"

"ہم جانتے ہیں۔" تجمل نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔ "پر سردار ایک ضرورت مند ہے اور ہم سوداگر۔ یہ سودا عام سودا نہیں، الگ قسم کا ہے۔ چیزوں کا نہیں، جان کا ہے۔ ہم سے اس معاملے پر بات کرنا ہے تو ایک سردار کی طرح نہیں، دکان دار اور گاہک کی طرح بات کرو۔ ویسے ہم تمھاری جگہ میں ہیں۔ ہم کو اس کی پوری جانکاری ہے۔"

"تم آگے بات کرو۔" وہ تلملا کے بولا۔

"ابھی تمھاری سرداری کی مدت کتنی رہ جاتی ہے؟"

"سات مہینے۔" اس نے جھجکتے ہوئے جواب دیا۔

"بہت ہے۔" تجمل نے آہستگی سے کہا۔ "شاید ہم کو اتنا ٹائم نہیں لگے۔ ہم کو چار مہینے کا ٹائم بہت ہوگا۔"

"چار مہینے... ایک چار مہینے؟"

"چار مہینے میں ہم یا تو تمھاری امانت تم کو لا دیں گے یا پھر کبھی لوٹ کے نہیں آئیں گے۔"

"مگر تم ... تم اتنے اعتماد سے کیسے کہہ رہے ہو؟" سردار کی آواز میں ایک خفیف سی لرزش پیدا ہو گئی تھی۔

"یہ مرحلہ تمھارا کھٹ راگ نہیں ہے۔ تم ہم پر بھروسا رکھو۔"

"تم کیا چاہتے ہو؟"

"دیکھو سردار!" تجمل اپنی نشست سے اٹھ کے اس کے تخت کے قریب آ گیا اور دھیمے لہجے میں بولا۔ "ہم زیادہ بات نہیں کرتے۔ تم اپنے ہر نو سال سے ترلے ہو گئے ہیں۔ تم نے ہر جتن کر کے دیکھ لیا ہے۔ تم کیا ملا؟ جو اب ہم کو کچھ نہیں ملا تو تم کو کوئی گھاٹا نہیں ہونی چاہیے۔ تمھارا اتنا بڑا گھاٹا نہیں ہے جتنا اپنا ہے۔ خوار ہم ہوں گے، تم ادھر ہی رہو گے۔ پر کام شروع کرنے سے پہلے ہم کو تم سے ہر بات صاف کر دینا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ سر جھٹک کے بولا۔ "ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ بس ہماری چیز مل جائے۔ جو چین وسا نے تم سے کہا ہے، سب درست ہے۔ ہم تم سے وعدہ کرتے ہیں۔"

"ہم تمھارے وعدے پر بھروسا کرتے ہیں۔ پر کاغذ ہم کو مل گئے تو ہم اپنی جگہ ان کو تمھارے حوالے کریں گے اور تم ہماری چیز ہمارے حوالے کرنا۔"

"تم جہاں بھی کہو۔" سردار کی زبان ایک دم لپک رہی تھی۔ "ہمارا وعدہ ہے۔"

"ایک بات اور سن لو۔ تم بولتے ہو کاغذ دوسرے لوگوں کے لیے بے کار ہیں، پر ایسا نہیں ہوگا۔ ان کی اور لوگوں کو بھی ضرورت ہوگی۔ نہیں ہوگی تو پیدا کی جا سکتی ہے۔ آگے والوں کو بھی ان کی قدر معلوم ہوگی۔ ہم نے تم کو زبان دی ہے۔ چار مہینے تک تم ہم سے کچھ نہیں پوچھو گے۔ ہم ادھر ہیں یا نہیں اور ہم اپنے کچھ آدمی بھی ادھر چھوڑے ہیں۔ ہو سکتا ہے کچھ بستی یا اور پرندوں کے علاقے میں آنے جانے والے لوگوں کی خبر رکھتے ہیں۔ ضرورت پڑی تو ہم ادھر تمھارے آدمیوں سے بھی پوچھ گچھ کریں گے۔ پر یہ سب بعد کی بات ہے۔ ہم نے یا تمھارے قبیلے کے کسی آدمی نے ہمارے درمیان دخل دینے کی کوشش کی تو تم کبھی کچھ نہیں پا سکو گے۔ ہم

کو رتے وقت اکیلے جانا نہیں بتایا گیا۔ کوئی بُری بات ہوئی تو پچھتانا تمھارا کام ہوگا۔ اپنا نہیں ہم کو اور تمھاری جگہ پر اتنا نہیں جاتا ہے اور ہمارا تمھارا کوئی بُرا نا برہی نہیں ہے اور نہ ہم تم سے کوئی پیشگی وکو مانگ رہے ہیں بس یہ جاننا ہے ہو سردار! اچھی طرح سوچ لو ابھی ہم ادھر تمھارے مہمان ہیں۔"

"تمھاری باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ تم ضرور کچھ جانتے ہو؟"

"ہم نے بول دیا ہے ابھی ہم نہیں جانتے۔ پر اگر جانتے بھی تو جب تک ہم نہ چاہتے تم کچھ نہیں جان سکتے تھے۔ اتنی باتیں بولنے کا مطلب یہ ہے کہ تم سے کچھ اُلٹ نہ ہو جائے۔"

سردار کے جسم کا تمام خون اس کے چہرے پر سمٹ آیا تھا اور وہ بیٹھے بیٹھے یوں اچکنے لگا تھا جیسے اس کے کپڑوں میں کوئی بچھو گھس گیا ہے۔ سولم نے یکساں اور رواں زبان میں جمل کی تمام باتیں اسے نقل کی تھیں۔ جمل کے چپ ہو جانے پر سردار گردن جھکائے اپنی انگلیاں مروڑتا رہا۔ ہم سب اپنی جگہوں پر ساکت بیٹھے ہوئے تھے۔ سردار اسی کا کو سوچنے کا تاثر دے رہا تھا۔ جمل نے سولم سے کہا۔ اس کا جملہ ابھی مکمل نہیں ہوا تھا کہ یک لخت سردار تخت سے اٹھ کر دوبارہ جمل کے سامنے آ کے کھڑا ہو گیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے گھورنے لگا۔ اس کا سر جمل کے کندھے تک آ رہا تھا۔ جمل کی پلکوں میں جنبش نہیں ہوئی مگر اس کی آنکھیں سردار کی آنکھوں کی طرح سرخ نہیں تھیں۔ تھکی اور بجھی ہوئی سی تھیں۔ یکایک سردار نے اس کو گریبان سے پکڑ لیا۔ جابر نے ادھر چاقو نکال لیا تھا۔ ادھر تخت کے پہلو میں کھڑے ہوئے سردار کے آدمی نے بھی خنجر نکال لیا تھا۔ جمل کا جسم بے حرکت رہا۔ پھر سردار نے اپنے ہاتھ ڈھیلے کیے تو جمل کے ہاتھ بھی ڈھیلے ہو گئے۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ زور سے پکڑ لیے۔

"تمھارے تالے تھیلے میں مجھ کو سب سے اچھے لگتے ہیں۔"

سردار کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا ہوگا کیونکہ سولم خاموش کھڑا عجیب نظروں سے ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ سردار کے چپ ہو جانے پر اس کا آدمی بھاگتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔

⁂

جب ہم سردار کے مکان سے باہر آئے تو دھوپ اتر رہی تھی۔ دوپہر کا کھانا ہم نے سردار کے ساتھ ہی کھایا تھا۔ اس کے کمرے میں کئی خادم اور خادمائیں جمع ہو گئے تھے جنھوں نے ہمارے آگے چاول، بستی میں بنی ہوئی مٹھائیوں اور سردار کے لیے خاص طور پر پکائے ہوئے کھانوں کا ڈھیر لگا دیا تھا۔ چین سے آئی ہوئی خوشبودار چائے سب سے خوش ذائقہ تھی۔ ہم نے ایسی چائے پہلے کبھی نہیں پی تھی۔ مسلسل وہی پیتے رہے۔ جمل اور سولم وہیں رہ گئے تھے۔ میں، مارتی اور جابر تو انھیں وہاں چھوڑ کے اُٹھنا نہیں چاہتے تھے مگر خود جمل ہی نے ہمیں باہر جانے کو کہہ دیا تھا۔ اِدھر اُدھر بے کار گھومنے اور گھر جانے کے بجائے ہم وہیں ایک پہاڑی پر بیٹھ کے ان کا انتظار کرتے رہے۔ آج کا دن بھی گزرا جا رہا تھا۔ اب اُوپر مندروں کے علاقے میں جانے اور اندھیرا ہونے سے پہلے واپس آنے کا کوئی امکان ہی نہیں تھا۔ دھوپ پہاڑوں پر چڑھ رہی تھی۔ ہم تینوں کی نگاہیں سردار کے مکان کے اونچے دروازے پر لگی ہوئی تھیں اور شاید ہم ایک ہی بات سوچ رہے تھے کہ اگر جمل اور سولم کچھ دیر اور نہ آئے تو ...... لیکن سورج غروب نہیں ہوا تھا کہ دروازے پر ایک ساتھ کئی آدمی باہر نکلتے دکھائی دیے۔ اُن میں وہ دونوں بھی تھے، چن وسا اور قبیلے کے کئی لوگوں کے درمیان۔ ہم نے تقریباً بھاگتے ہوئے بستی کی طرف جانے والے راستے پر انھیں جا لیا اور جمل کا چہرہ دیکھ کے ہماری پھولی ہوئی سانسیں ٹھیرنے لگیں۔

بستی کے مرکزی مقام پر باقی تمام لوگ منتشر ہو گئے۔ صرف چن وسا ہمارے ساتھ رہ گیا۔ راستے میں نہ جانے کیوں جمل بار بار آسمان کی طرف دیکھتا تھا۔ اُسے بھی دن نکل جانے کا احساس ہوگا۔ مجھے معلوم تھا، اب ہم اور کہاں جا سکتے ہیں۔ دروازہ چن وسا کی لڑکی تشا نم نے کھولا مگر جمل پر نگاہ پڑتے ہی اس کا سراپا کانپ سا گیا۔ وہ جلدی سے دروازے کی آڑ میں سمٹ گئی تھی کہ جمل نے جھپٹ کر ہاتھ بڑھا کے اسے اپنے بازو میں گھسیٹ لیا اور دوسرے ہاتھ سے اس کی ٹھوڑی اٹھا کے، ماتھے کو بوسہ دیا۔ وہ اور سکڑ گئی۔ چن وسا مسکرانے لگا اور اپنی زبان میں پتہ نہیں کیا کیا کہتا رہا۔ "ہم پہلے ہی پہچان لی۔" جمل اس کا سر تھپکتے ہوئے بولا۔ سولم نے فوراً ترجمہ کر دیا۔ تشا نم نے ایک پل کے لیے بھی اپنی تھرتھراتی پلکیں نہیں اٹھائیں۔ اس کے نتھنے بُری طرح پھڑک رہے تھے اور رخساروں کا سرخ رنگ جھلملانے سا لگا تھا۔ جمل سے ہاتھ چھڑا کے وہ سرپٹ بھاگتی ہوئی اندر کہیں اوجھل ہو گئی۔ "بالکل لڑکی کو بیٹی بغیر جانے کی۔" جمل نے ہنس کے کہا اور مارتی کی گردن پکڑ کے جھٹکے دینے لگا جو مبہوت سا کھڑا تھا۔ ہم سب سیدھے سلطان کے کمرے میں آ گئے۔ وہ آنکھیں موندے بستر پر آرام کر رہا تھا۔ ہماری آہٹ پر وہ اٹھ کے بیٹھ گیا۔ جمل نے تین چار بار اس کا چہرہ جھنجھوڑا اور مڑ کے دیکھا۔ اب اُسے کوئی خاص تکلیف نہیں معلوم ہوتی تھی لیکن اس کے پپوٹے سوجے ہوئے تھے۔ جیسے دن بھر روتا رہا ہو۔ وہ گردن ڈالے ہوئے ہماری باتوں میں جمل کو جواب دیتا رہا۔ جمل اس کے پاس چند منٹ سے زیادہ نہیں ٹھیرا ہوگا کہ جابر اور مارتی کو اپنے واپس آنے تک گھر میں رہنے کی ہدایت کر کے پھر سائبان میں آ گیا اور چن وسا کو بلا کے اس نے مندروں کے علاقے میں جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ میں سمجھا کہ جمل چن وسا کی ڈور لینے کے لیے ایسا کہہ رہا ہے۔

شام ہو رہی تھی اور ابر چھا گیا تھا۔ چن وسا نے دبے لہجے میں وقت زیادہ ہو جانے کا عذر کر کے روکنے کی کوشش کی لیکن جمل اس کی بات سنی ان سنی کرتا ہوا دروازہ کھول کے باہر نکل آیا۔ سولم کو بھی اس نے ساتھ رکھا تھا۔

اُوپر جانے کے خیال سے میرا دل ایک دم دھڑ دھڑانے لگا تھا۔ میں نے سوچا جمل کو منع کر دوں۔ مجھ سے آباجان کے سامنے نہیں جایا جائے گا۔ میں تو ان کے سامنے کھڑا بھی نہ رہ سکوں گا۔ میں اُن سے کیا کہوں گا، میری زبان سے ایک لفظ نہیں نکلے گا اور انھوں نے اگر کچھ کہا تو مجھ سے سُنا نہیں جائے گا۔ مجھے ان کی آنکھوں سے شروع ہی سے ڈر لگتا ہے۔ اسی لیے میں کروا کو لے کے گھر سے نکل گیا تھا۔ میں نے پہلے ہی اندازہ کر لیا تھا کہ وہ وہاں رہنے لگی تو مجھے اور اُسے ہر وقت اُن کی نگاہوں کا سامنا کرنا پڑے گا اور اگر اُن کے منہ سے کوئی ایسی ویسی بات نکل گئی، وہ کچھ خیال ہی نہیں کرتے تھے۔ جو دل میں ہوتا تھا، فوراً کہہ دیتے تھے اور انھوں نے ترک بھی کر دیا تھا۔ اگر میں جلدی نہ کرتا اور تین چار دن گھر میں اور رک جاتا تو اُن کی خوشامد کر لیتا کہ وہ کروا کو پولیس کے حوالے نہ کریں تو ممکن تھا۔ اس دوران وہ کروا کے لائے ہوئے کاغذات پر نظر ڈال لیتے اور شاید کروا سے اُن کا رویہ بدل جاتا۔ وہ اُسے محفوظ کر کے رکھتے مگر پھر وہ اس سے جلد سے جلد چھٹکارا بھی حاصل کرنے کی کوشش کر سکتے تھے کیونکہ کروا کا گھر میں ہونا ایک مسلسل خطرہ تھا۔ میں نے ٹھیک ہی کیا تھا۔ میرے پاس اس کے سوا کوئی صورت نہیں تھی کہ میں اُسے لے کے دُور نکل جاؤں۔ میرے سینے میں شور سا ہو رہا تھا۔ ایک ایک بات یاد آ رہی تھی۔ جمل اُوپر چڑھتا رہا۔ ہم تینوں میں کہیں نہیں رُکے تھے مگر راستہ طے کیا ہوگا کہ بوندا باندی ہونے لگی اور پھر ہر طرف دبی دبی اندھیرا چھانے لگا۔ بس سے مجھے بہت وحشت ہوتی تھی۔ شام ہوتے ہی پہاڑوں پر ہو کا سا عالم طاری ہو جاتا جیسے دنیا میں سب مر گئے ہوں اور پہاڑ ان کے سوگ میں خاموش کھڑے ہوں۔ کچھ دیر تک اندھیرا سرمئی سرمئی سا رہا۔ مگر ڈنڈیاں نظر آتی نہیں۔ اوپر پہنچتے پہنچتے ہر سو دھند پھیل ہوئی تھی۔ ابر کی وجہ سے چاندنی پھیکا ہوا تھا۔ ہوا تیز نہیں تھی اور دھند بھی ابھی بہت کم تھی۔ ہماری آنکھوں میں اتنا اندھیرا نہیں تھا اور جمل نے ٹارچ بھی روشن کر دی تھی۔ ایک دوسرے کو پکڑتے ہوئے ہم سنبھل سنبھل کے قدم اور پھسلواں زمین پر پیر رکھ رہے تھے۔ ہمارے پیچھے کسی کی چاپ نہیں تھی۔ پیچھے دُور ہی سے مندروں کے علاقے میں جلتی ہوئی مشعلوں کی روشنی دکھائی دینے لگی تھی۔ لگتا تھا کہ فاصلہ بہت کم رہ گیا ہے لیکن پتھروں کا دھکا آہت ہوتا تھا۔ بارش تیز ہو جاتی تو سارے کپڑے بھیگ جاتے۔ یہاں کوئی سایہ بھی نہیں تھا جہاں اندر مندروں کے درمیان ایک بڑا علاقہ تھا اور اس لیے خالی رکھا گیا تھا کہ مندر چھپ سکیں رہیں۔ اُوپر جانے کے لیے کہیں کہیں پہاڑوں پر سیڑھیاں سی بنی ہوئی تھیں۔ ہم نے اپنی ڈگر نہیں چھوڑی اور اس احتیاط کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم بہت جلد مندروں کے علاقے میں پہنچ گئے۔ اُوپر زمین لگ بھگ سیدھی تھی۔

تمام بڑے اور چھوٹے مندروں میں مشعلیں روشن تھیں۔ کھلے آسمان کے نیچے گوتم بدھ کی دیوقامت مورتی کے سامنے ایک بڑا الاؤ دہک رہا تھا اور مختلف تعداد میں راہب گوتم بیٹھے ہوئے تھے۔ سب سے بڑی عمارت کے اندر بھی دھیمی دھیمی روشنی ہو رہی تھی اور راہداری میں راہبوں کی چہل پہل تھی۔ گزرتے ہوئے چند ہی راہبوں نے مُڑ کر پلٹ کے ہم کو دیکھا ہوگا۔ ہمارے کپڑے خاصے بھیگ گئے تھے۔ ٹھنڈ سے جسم ٹھٹھر رہے تھے۔ سولم تو دانت کٹکٹا رہا تھا اس لیے ہم مورتی کے سامنے راہبوں کے ساتھ الاؤ کے گرد بیٹھ گئے۔ آگ کی تپش سے جسم کو کسی قدر حرارت محسوس ہوئی مگر میرے ہاتھ پیروں کی کپکپی دُور نہیں ہوئی۔ ہم کن انکھیوں سے وہاں موجود راہبوں کے چہرے غور سے دیکھتے رہے۔ ان میں آباجان نہیں تھے۔ آباجان ہمیں اور کسی مندر میں بھی نظر نہیں آئے۔ مندروں میں کسی نے ہماری موجودگی پر اعتراض نہیں کیا تھا۔ جس وقت ہم بڑے مندر کی سیڑھیاں طے کر کے وہیں ایک خشک جگہ پر بیٹھے تو کھانا تقسیم ہو رہا تھا۔ یہ ایک بڑی عمارت تھی۔ بڑے بڑے ہالوں اور کمروں کے اطراف چوڑے اور لمبے ستونوں پر بنی ہوئی راہداری تھی۔ اندر ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لیے ایسی ہی تنگ اور کشادہ گلیاں تھیں۔ مشعلیں بڑی کثرت سے نصب تھیں لیکن روشنی اتنی زیادہ نہیں تھی۔ کھانا تقسیم کرتے ہوئے پجاری جب ہماری جانب آئے تو ہم سے پوچھے بغیر ایک نے ہمارے آگے مٹی کا پیالہ رکھ دیا، دوسرے نے اس میں پتلی دال اور سبزی کا ایک ایک چمچا ڈال دیا، تیسرے نے موٹی روٹیاں چٹائی پر رکھ دیں۔ راہداری میں ہر طرف راہب قطار سے بیٹھے ہوئے تھے۔ جہاں تک ہماری نظر پڑتی تھی، آباجان نہیں تھے۔ جمل اور سولم نے سیر ہو کے کھانا کھایا۔ میرے حلق سے ایک لقمہ بھی نہیں اُتر رہا تھا۔ کھانے کے بعد راہب منتشر ہونے لگے۔ ہم نے عمارت کے گرد پوری راہداری کا چکر لگا کے دیکھ لیا لیکن مندروں میں رہنے والے تمام راہب صرف یہیں نہیں تھے اور بھی عمارتیں فاصلے فاصلے پر بنی ہوئی تھیں۔ جیسا کہ ہم یہاں آنے سے پہلے ہی دیکھتے آئے تھے۔ ہمارا یوں ہر عمارت میں رُکنا اور کچھ دیر ٹھیر کے واپس آ جانا مناسب نہیں تھا پھر بھی ہم مختلف مندروں میں جاتے رہے۔ باہر کھلی ہوئی جگہوں پر الاؤ دہکا کر راہب دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے آپ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ انھیں سردی بھی نہیں لگ رہی تھی۔ اندھیرے میں ان کے خدوخال صاف نظر نہیں آتے تھے مگر ان میں آباجان ہوتے تو ان کا جسم علیحدہ سے

یاں سکتے تھے اور وہ ایسی مشقت کے عادی نہیں ہوں گے۔ انھیں
ں آتے ہوئے وقت بھی زیادہ نہیں ہوا تھا یا شاید وہ عادی ہوں بھی۔
ں کہہ سکتا تھا کہ اتنے عرصے انھوں نے کہاں کہاں وقت گزارا ہے۔
چلتے چلتے ہماری ٹانگیں اکڑنے لگی تھیں۔ کئی عمارتوں میں اُن کا
ئی نشان نہ ملا تو ہم دوبارہ بڑے مندر میں آ گئے۔ اب ایک ہی صورت
ہ گئی تھی کہ راہبوں کے آشرم کا رخ کریں جہاں اَن گنت کٹیائیں بنی
وئی تھیں۔ ہم نے اب تک سرائے یا آشرم میں جانے سے اسی سبب
ریز کیا تھا کہ ابھی رات زیادہ نہیں ہوئی تھی۔ راہبوں کی ایک بڑی
عداد مندر میں موجود تھی۔ بڑے مندر کی عمارت میں دبی دبی سرگوشیاں
ونج رہی تھیں اور ابّا جان کا دُور دُور پتہ نہیں تھا۔ کہیں وہ چلے نہ گئے
وں۔ مجھے بار بار یہی خیال آ رہا تھا حالانکہ یہ عجیب سی بات تھی۔ جس دن
ہم نے انھیں دیکھا تھا، انھیں اسی دن یا اس کے دوسرے ہی دن روانہ
ہو جانا تھا۔ اچھا ہے کہ وہ چلے ہی گئے ہوں۔ مجھے چاہیے وہ دلّی
پھر سے کہیں کھو جائیں مگر کسی طرح یہاں سے دُور ہو جائیں۔ میرا دل ان
کے لیے ہی دعا کر رہا تھا۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے ہوں گے۔
دعا کرے وہ کامیاب ہی لوٹے ہوں ورنہ پھر زندہ نہیں رہیں گے۔
تنے عرصے کوئی بھی اپنی امیدیں ناکام ہونے پر زندہ نہیں رہتا۔ ایک
یں ہی بے بس تھا۔
تجمل اور سُولم ابھی واپس نہیں لوٹے تھے۔ راہبوں سے مندر خالی
ہونے لگا۔ شعلیں کم ہوتی گئیں یا وہ ایک سوگوار سکوت عمارت کے
در و دیوار پر مسلط ہو گیا تو ہمیں روک کے تجمل خود عمارت میں گھومنے چلا
گیا۔ وہ چھپتا چھپاتا گیا تھا اور خاصی دیر بعد واپس آیا۔ واپسی میں اس
کی چال ہی سے مجھے اس کی ناکامی کا اندازہ ہو گیا تھا۔ مندر میں چند راہب
رہ گئے تھے اور وہ سب کے سب مراقبوں میں کھوئے ہوئے تھے۔ کئی
پجاری ہمیں وہاں بیٹھا ہوا دیکھ کے جھجکتے ہوئے گزر گئے تھے۔ ان کا تعلق
یقیناً مندر کے انتظام سے ہوگا۔ پھر ایک معمر پجاری نے آ کے نرم لہجے میں
ہم سے پوچھا کہ ہمیں کوئی تکلیف تو نہیں ہے۔ تجمل کے بجائے سُولم نے
جواب دیا کہ ہم ایک رات گزارنا چاہتے ہیں۔ سردی سے اس کی آواز ٹھٹھر
رہی تھی۔ پجاری نے ہم تینوں کو ترحم آمیز نگاہوں سے دیکھا اور مشورہ دیا
کہ ہم سرائے چلے جائیں، وہاں ہم رات آرام سے گزار سکیں گے لیکن
تجمل سرائے جانا نہیں چاہتا تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ ابّا جان اپنی کٹیا سے
باہر ہوں۔ ہم کٹیا میں جا کے بھی انھیں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ تاہم
ہمیں مندر سے اٹھنا ہی پڑا۔ ویسے بھی ہم وہاں ساری رات گزارنے کا
کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ دھند بڑھتی جا رہی تھی۔ اس سے ہمیں عماروں
کے درمیان آنے جانے میں آسانی ہو گئی کیونکہ نقل و حرکت چند گز کے فاصلے
ہی تک دیکھی جا سکتی تھی۔ یہاں سے وہاں اس جگہ سے اس جگہ ایک مسلسل

چلتے پھرتے میں رات کا بڑا حصہ بیت گیا تھا۔ سُولم اور تجمل کی رفتار میں
پہلے جیسی تیزی نہیں رہی تھی۔ میری ٹانگیں تو پہلے ہی شل تھیں۔ ناچار
ہم سرائے میں آ گئے۔ یہاں جنگل سناٹا چھایا ہوا تھا۔ پتھروں کی کٹیاؤں کے
بیشتر دروازے بند تھے۔ پہلے ہم دو رویہ کٹیاؤں کے درمیان تو جھلکتے بجھتے
راستوں کے چکر لگاتے رہے۔ وہاں بھی اُن کی کوئی سن گن نہیں ملی تو سرائے
کے ایک وسیع و عریض ہال میں چلے آئے۔ سالانہ میلوں کے دنوں میں اس
ہال میں گہما گہمی رہتی ہوگی اب ویران پڑا تھا۔ اندر کسی حد تک گرمی تھی
لیکن ابھی یہی نہیں کہ ہم کسی ٹھور ٹھکانے کے رات گزار دیں۔ بڑے
مندر کے پروہت نے کہا تھا کہ سرائے میں ہمیں بستر مل جائیں گے۔
یہاں کوئی شخص جاگا ہوا نہیں تھا۔ کسی متعلق آدمی کو ڈھونڈنے کی کوشش
میں سُولم کو ہال کے ایک تاریک گوشے میں ایک شخص سوتا ہوا مل گیا۔ سُولم
کسی جھجک کے بغیر اُسے جھنجوڑنے لگا۔ وہ ہڑبڑا کے اٹھا اور ہمیں دیکھ
کے ہکلا سا گیا۔ حواس بجا ہوتے ہی اُس نے ہال میں ایک جانب بنی
ہوئی کوٹھریوں کی طرف بدمزاجی انداز میں اشارہ کیا۔ وہاں بستروں کا ڈھیر
لگا ہوا تھا۔ اسی شخص نے ہمیں کھلی ہوئی کٹیاؤں میں جانے کی صلاح
دی تھی مگر ہم ہال کے کنارے دروازے کے قریب بستر لگا کے لیٹ گئے۔
رات ہی جیسے سردی سے کانپ رہی تھی اور ٹھٹھرتی ہوئی بیت
رہی تھی۔ تجمل اپنا جسم سکیڑے لمبی لمبی سانسیں کھینچ رہا تھا۔ سُولم بھی
کروٹیں بدل رہا تھا۔ بستر سرد تھے۔ رفتہ رفتہ وہ ہمارے جسم کی حرارت
سے گرم ہوئے اور ان میں سیلن کی ایک بو بھی بسی ہوئی تھی لیکن ہم کسی طور
انھیں اپنے جسم سے جدا کرنے کے لیے تیار نہیں تھے بلکہ ہمارا بس
چلتا تو انھیں اپنے اندر جذب کر لیتے۔ اگر ہم ہال میں کچھ اندر بستر لگاتے
تو شاید اتنی ٹھنڈ محسوس نہ ہوتی۔ کنارے پر ہونے کی وجہ سے یخ بستہ ہوا
ہمارے گالوں پر طمانچے مارتی گزر رہی تھی۔ ہم تینوں میں سے کسی کو بھی نیند
نہیں آئی۔
رات کا آخری حصہ ہوگا کہ ہم نے کسی کی آہٹ سنی۔ سب سے پہلے
تجمل چونک کے اٹھ بیٹھا۔ کھلے دروازے کے ستونوں میں ہمیں
کوئی سایہ سا رینگتا ہوا نظر آیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ دور چلا جاتا اور دھند
میں اوجھل ہو جاتا، تجمل بستر سے اچھل کے پنجوں کے بل جانے لگا۔ میں
نے اور سُولم نے بھی بستر چھوڑ دیے۔ قریب جا کے تجمل ٹھٹک کے رک
گیا۔ وہ کوئی راہب تھا۔ تمام جسم کمبل کے سے لبادے میں لپٹا ہوا سر اور
منہ مفلروں میں چھپے ہوئے۔ اس نے بھی ہماری چاپ سن لی تھی کہ
کے ہماری طرف دیکھا۔ تجمل فوراً اس کے آگے آ گیا اور اس سے پہلے
کہ راہب اس سے کچھ پوچھتا، تجمل نے اس کے منہ پر ہاتھ مار کے مفلر
نیچے کھینچ لیا اور ٹارچ کی روشنی اس کے چہرے پر پھینکی۔ میرے دل کی
حرکت بند ہونے لگی۔ وہ ابّا جان ہی تھے۔ روشنی سے اُن کی آنکھیں چندھیا

گئیں اور انھوں نے اپنا منہ پھیر کے ہذیانی انداز میں پوچھا: "کیا ہے؟"
انھوں نے تبتی زبان میں کہا تھا۔
"ذرا ہمارے ساتھ آؤ بڑے صاحب!" تجمل نے بڑی بجھا کے
سرگوشی کی۔
ابّا جان نے پھر تبتی زبان ہی میں سراسیمگی سے کچھ کہا۔
"بڑے صاحب! ہم کو پتہ ہے آپ ہندوستانی سمجھتے ہو۔ جیسا
میں بول رہا ہوں ویسا ہی کرو۔" تجمل نے نرمی سے کہا۔ "ہم کو آپ سے
کچھ بات کرنا ہے۔"
"میں.... میں ہندوستانی سمجھتا ہوں۔" ابّا جان نے لرزیدہ لہجے
میں کہا۔ "مگر آپ کو مجھ سے کیا کام ہے؟"
"کچھ کام ہی ہے پر یہ جگہ بولنے کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔"
"آپ کون لوگ ہیں؟"
"اپنے ہی ہیں۔ میں بولتا ہوں۔ گھبراؤ نہیں بڑے صاحب!"
"مگر آپ۔ آپ کیا چاہتے ہیں؟"
"آپ کا بھلا ہی چاہتے ہیں؟"
"کیسا بھلا! میں.... میں ایک۔"
"ادھر نہیں بڑے صاحب!" تجمل نے تحمّل سے کہا۔
"پھر کہاں؟" ابّا جان نے کسی قدر ناگواری سے پوچھا۔
"جہاں آپ اچھا سمجھو۔ کسی کٹیا میں چلو۔"
ابّا جان کی آواز دبی دبی تھی گو وہ سرگوشی میں بات کر رہے تھے
لیکن ان کے لہجے میں وہی بھاری بھرکم پن تھا۔ وہی گونج تھی۔ مجھے
بہت ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں تجمل کی زبان سے کچھ نکل نہ جائے۔ انھیں
غصہ آنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگتی تھی۔ تجمل نے جب اُن کے چہرے
سے مفلر کھینچا تھا تو وہ بہت گھبرا گئے تھے۔ ان کا سارا وجود لرز کے رہ
گیا مگر انھوں نے بہت جلد اپنی آواز پر قابو پا لیا اور تبتی زبان میں
بات کرنے کی جرأت بھی نہیں کی۔ میرا حلق خشک ہو گیا تھا۔ آنے والے
لمحوں کے خیال سے میرا دم گھٹا جا رہا تھا۔
"آپ کو کوئی غلط فہمی ہو رہی ہے۔" ابّا جان نے ملائمت سے کہا۔
"ہو سکتا ہے بڑے صاحب! پر اسے دور کرنے کے لیے ہی اپنے ساتھ چلو۔"
ابّا جان نے زیادہ تامّل نہیں کیا اور خود ہی کٹیاؤں کی طرف بڑھ
گئے۔ زمین میرے پیر کھینچے لے رہی تھی۔ تجمل نے پشت سے میرا کوٹ
پکڑ لیا۔ ہم آہستہ قدموں سے چلتے ہوئے کھلی ہوئی کٹیاؤں کے وسط کی
ایک کٹیا میں آ گئے۔ وہ زیادہ لمبی چوڑی نہیں تھی۔ زمین پر خشک گھاس
بچھی ہوئی تھی اور اندھیرا ادھیڑ رہا تھا۔ سُولم کو باہر رہنے کی ہدایت کر کے تجمل نے
دروازہ بند کر لیا۔ پتھروں کی ان مرطوب دیواروں سے ہماری آواز باہر نہیں جا
سکتی تھی۔ ابّا جان بالکل ساکت بیٹھے تھے۔ تجمل نے ماچس جلا کے چراغ

روشن کر دیا۔ کٹیا میں لرزتی ہوئی روشنی پھیل گئی۔ "بڑے صاحب! زیادہ
بات کرنے کا وقت نہیں ہے۔ ہم آپ کی تلاش میں بہت دور سے
آئے ہیں۔"
"میری تلاش میں؟" ابّا جان نے تعجب سے کہا۔
"ہاں جی! آپ کی تلاش میں اور ہم کو سب پتہ ہے۔ آپ ہم
سے کچھ چھپانا مت ورنہ تمام برباد ہو گا۔ پہلے میں بول دوں کہ ہم لوگ
آپ کے مخبر نہیں ہیں۔ اپنے دل سے ایسے تمام خیال نکال دو۔"
"میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔" ابّا جان کی آواز ڈوبی ہوئی تھی۔
"آپ کی سمجھ میں سب آ جائے گا۔ کل ہی ہم نے آپ کو دیکھا
تھا پر آپ سے اتنے لوگوں کے سامنے بات کرنا ٹھیک نہیں تھا۔"
"آپ اپنا مقصد.... آگے بات کریں۔"
"کیا بات کریں بڑے صاحب سوچتے ہیں کدھر سے" تجمل
کسمساتے ہوئے بولا۔ "آپ سن بھی سکو گے یا نہیں۔"
"میں سب سن رہا ہوں۔" ابّا جان نے بےچینی سے کہا۔ "مگر میں
آپ سے پھر کہتا ہوں آپ کو کوئی بڑی غلط فہمی ہو رہی ہے۔"
"آپ صفدر خاں صاحب نہیں ہو!"
اپنا نام سن کے ابّا جان کے ہونٹ پھڑکنے لگے۔ "نہیں۔ میرا
نام۔ میں ایک بھکشو ہوں اور میرا نام صفدر خاں نہیں ہے۔" انھوں نے
تیزی سے کہا۔
"اب تو کچھ بھی نہیں پر پہلے کبھی تھا۔" تجمل کی آواز بھی دبی دبی تھی۔
"میں گیا شہر میں آپ کا پتہ بھی لے لوں کیا؟ بڑے صاحب آپ اپنا
حلیہ بدل سکتے ہو، نام تو نہیں۔ نام ایک ہی رہتا ہے۔"
"مگر میں آپ سے کیا کہہ رہا ہوں!"
"میں جان رہا ہوں بڑے صاحب! تمہارا نام کا فیصلہ ہو لیا۔ ادھر
دیکھو یہ کون بیٹھا ہے۔ یہ کون بیٹھا ہے اس جوان کا نام یاد ہے۔ یاد ہے
آپ کو ایسا کوئی نام!"
"ب۔ بابر۔" ابّا جان کی آواز گھٹ گئی۔
مجھے یقین ہو چلا تھا کہ ابّا جان مجھے بھی پہچاننے سے انکار کر دیں
گے۔ تین اور جوان تیرہ کے جدا ہو جانے پر انھوں نے پیچھے مڑ کے نہیں
دیکھا تھا۔ تجمل کی زبانی میرا نام سن کے ان پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ وہ
پھٹی ہوئی آنکھوں سے مجھے تکنے لگے۔ تجمل نے میری ٹھوڑی پر آتی
کے بجھتی کی روشنی دکھائی۔ "کچھ پہچان پڑتا ہے بڑے صاحب؟"
ابّا جان کی پتلیاں پھیل گئی تھیں اور ان کے چہرے کا رنگ فق
پڑ گیا تھا۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں لیکن میری سسکیاں نکل پڑیں۔
"نہیں۔ نہیں۔" ابّا جان کی دلتی ہوئی آواز ابھری۔
"روشنی اور کروں بڑے صاحب؟"

اباجان کے کچھ کہنے سے پہلے ہی میں نے اُن کے قدموں پر سر رکھ دیا اور پھر مجھے نہیں معلوم کیا ہوا۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ نہ جانے کب اُن کی کانپتی ہوئی سرد انگلیاں مجھے اپنے بالوں میں سرسراتی محسوس ہوئیں۔ میری ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں۔ جب اباجان نے میرا چہرہ اپنے اختیاری ہاتھوں سے سامنے کیا تب میں انھیں دیکھ سکا۔ اُن کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ انھوں نے جھپٹ کے میرا چہرہ اپنی گود میں دبوچ لیا۔ "بابر!" اُن کی دھڑکتی ہوئی آواز جیسے کہیں دور سے آ رہی تھی: "یہ تو ہی ہے، بابر!"

میری زبان پر فالج گر گیا تھا۔

"تو کہاں چلا گیا تھا؟"

"اس سے کچھ مت پوچھو بڑے صاحب! ہاتھ پیر دیکھو اور ٹھیک سلامت ہیں۔" جمیل نے کہا۔

"شاید میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ میرے دماغ میں نہ جانے کیا کیا۔۔۔" اُن کا گلا رندھنے لگا۔ "لیکن میرا دل کہتا تھا، میرا بابر کبھی مجھ سے ضرور ملے گا۔"

وہ منہ ہی منہ میں نہ معلوم کیا کیا کہتے رہے۔

"اور اس کا دل بھی ایسا ہی بولتا تھا۔"

"او میرے خدا۔ میرے خدا!" وہ میری پیشانی اور انگلیاں تھام تھام کر چومنے لگے۔ اُن کے ہاتھوں کو قرار نہیں تھا۔ کبھی وہ میرا چہرہ ٹٹولتے، کبھی بازو، کبھی میری پیشانی کو بوسہ دیتے، کبھی آنکھوں کو۔ انھیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں اُن کے سامنے ہوں اور مجھے بھی یہ سب ایک تصور سا لگ رہا تھا۔ دیر ہو گئی۔ وہ مجھے اپنے سینے میں بھینچے آہیں بھرتے رہے۔ "مگر تو۔۔۔ تو یہاں تک کیسے آ گیا؟" انھیں ایک دم خیال آیا۔

"بس آ گیا بڑے صاحب!" جمیل نے کہا۔ "ہم نے سوچا، آپ جس چیز کی تلاش میں ادھر آئے ہو، ہم راستے میں ہی جا کے آپ کو اس سے بڑی خبر دے دیں۔"

"آپ۔۔۔ آپ کو؟" اباجان خفقانی انداز میں بولے۔ "کس چیز کی تلاش؟"

"بڑے صاحب! ایسے وقت میں مجھ کو آپ سے کچھ بولنا نہیں چاہیے تھا، پر رات جاگ رہی ہے۔ سویرا ہونے سے پہلے ہم کو اِدھر سے دفع ہو جانا چاہیے۔ ایک تو ہم کو اس کو روکنا تھا، پھر ایک بات اور بولنی تھی۔"

"کہیے کہیے۔" اباجان بے قراری سے بولے۔

"آپ بہت بڑے خطرے میں ہو۔"

"آپ کا کیا مطلب ہے؟"

"میری بات پہلے پوری طرح سن لو بڑے صاحب! یہ قبیلے کے لوگ نو سال میں کٹ کٹنے ہو گئے ہیں۔ ان کے سر کا کوئی بھروسا نہیں ہے۔ کس وقت الٹ ہو جائے۔ اپنے آپ کو بھی تنگ کرتے ہیں۔ آپ سمجھتے ہو کہ آپ یہاں محفوظ ہو۔ ادھر بھی ان کے لوگ آپ جیسے بہروپ میں ہوں گے۔ ادھر آپ اکیلے ہو۔ ہم بھی اب آ گئے ہیں۔ پر جنگ اٹھی کی ہے اور راستے بھی سب سے تنہیں ہیں۔ ان کی آنکھ میں کوئی دانہ پڑ گیا اور کسی دن زیادہ دیکھنے لگا کہ ادھر ایسا کوئی ہے جو ان کی امانت اپنے پلے رکھتا ہے تو جنگل میں رہنے والے یہ لوگ جنگل کی بولی بولیں گے۔ ابھی ٹھیک طرح بات کرتے ہیں تو ٹھیک ہے۔" اباجان نے بیچ میں دخل دینے کے لیے لب کھولے۔ جمیل نے انہیں روک دیا۔ "آپ سنتے رہو۔ غور کرو۔ ہے آپ کیا جواب دو گے پر بڑے صاحب! سوچ سمجھ کے بولنا۔ الٹے جواب سے کام الٹا ہو جائے گا۔ آپ یہاں سے فوراً لوٹ چلو۔ ابھی آپ کو یہ خبر پر سینہ زہر مل گیا ہے۔ یہی آپ کے لیے دولت ہے۔"

"آپ کس امانت کی بات کر رہے ہیں؟" اباجان وحشت سے بولے۔

"وہی جو اس رات لڑکی آپ کے پاس چھوڑ گئی تھی۔ بڑے صاحب! ہم کو سب پتہ ہے۔ ہم کو توں کے نام اکارت مت کرو۔ وہ اپنے کاغذوں کے لیے سینگ نکالے پھر رہے ہیں۔ میں نے ان سے بولا ہے کہ وہ میں ان کو دے دوں گا اور اس کے بدلے وہ ہمیں دولت دیں گے۔ آپ وہ ساری دولت لے لینا۔ پہلے لے لینا، بعد کو کاغذ ان کے متھے مارنا۔ وہ بھی کچھ کم نہیں ہوگی۔"

"میرے پاس ایسے کوئی کاغذات نہیں ہیں۔" اباجان نے تلخی سے کہا۔

"بڑے صاحب! ہم پہ بھروسا کرو۔ ہم کو کچھ نہیں چاہیے۔ ابھی دیکھو ادھر بابر بھائی سامنے ہے۔ ادھر بچہ جہاں گیر بھی ہم کو مل گیا ہے۔"

"جہاں گیر! منا! وہ کہاں ہے؟"

"وہ بھی بابر کے ساتھ ہے۔" جمیل نے تنی کا ذکر نہیں کیا۔ میرے منہ پر اس کا نام آتے آتے رہ گیا۔ لیکن میں تنی کے بارے میں اُن سے کہتا بھی کیا؟ کیا یہ بتاتا کہ وہ مجھے کہاں نظر آئی تھی اور کتنی دیر کے لیے؟

"ادھر آپ کے دو بیٹے ہیں۔ اس کے پاس بھی بہت پیسہ ہے۔ نقدی، حویلی، جاگیر، پیڑھیاں کھائیں پھر بھی بچ جائے اور یہ سب تو بھی جوتا تو ہاتھ پیر کا کھلا ہوا ہے۔ بہ تو اس کو نہیں ہے۔ پر یہ سارا سونے کا ہے۔"

"منا کیسا ہے؟" اباجان وحشت زدہ آواز میں بولے۔

"منا ایک دم ٹھیک ہے، پڑھتا ہے۔"

"وہ کہاں سے ملا؟"

"اچھی جگہ ملا۔" جمیل نے تند لہجے میں کہا۔ "آپ میری بات کا جواب دو۔ یہ سب بعد میں، وقت ملے تو پوچھنا۔"

"آپ کیا پوچھ رہے تھے؟"

"میں کاغذ کی بات بول رہا تھا۔"

"مگر میرے پاس کوئی کاغذات نہیں ہیں۔"

"بڑے صاحب! نو سال سے آپ رات دن کیا کھوج رہے تھے؟ آپ یہاں کیوں بیٹھے ہو؟ ٹھیک ہے آپ کے پاس وہ نہیں ہیں تو آپ ہمارے ساتھ واپس چلو۔ ابھی ہم ادھر سے نکل سکتے ہیں۔"

"میں۔۔۔ میں ابھی یہاں سے نہیں جا سکتا۔"

"آپ کو چلے جانا چاہیے بڑے صاحب!"

"مجھے یہاں سے جانے میں کچھ عرصہ اور لگے گا۔"

"وہی میں بول رہا ہوں۔ آپ اس عرصے کو جوتی میں ڈال، سب چھوڑ کے ہمارے ساتھ چلے چلو۔ ہماری بات مان لو۔ نہیں تو لاڈلے سے پوچھ لو۔ میرا نہیں تو اس کا ہی بھروسا کر لو۔ اس کا خون سچا ہے تو یہ آپ سے بیر نہیں کرے گا۔"

"میں نے آپ سے کیا کہا ہے؟ میں ابھی واپس نہیں جا سکتا۔"

"کوئی بھی اتنی مدت دوڑ دھوپ کرنے اور ادھر دور آنے کے بعد واپسی کو تیار نہیں ہوگا۔ مجھ کو پتہ ہے آپ بھی انکار کرتے رہو گے۔ بڑے صاحب! میں نہیں بولتا کہ آپ کے کاغذ میں جو کچھ ہے وہ سب اس سے قیمتی نہیں ہے، اس سے بہت قیمتی ہو سکتا ہے۔ پر یہ سب چکر ہے۔ آپ کو کام پکڑنے میں اتنا وقت لگا ہے۔ لگام اب بھی چھوٹ سکتی ہے۔ آگے راستہ اتنا صاف نہیں ہوگا۔ اب تک آپ دیواروں میں بیٹھے ہوئے تھے۔ پر ادھر کوئی دیوار نہیں ہے۔ واپسی کا راستہ مشکل ہے۔ کہیں پر الٹا ہو گیا تو دوبارہ نکلنے کا موقع نہیں ملے گا اور اٹھانے والا بھی ادھر کوئی نہیں ہوگا۔ تھوڑے کہے کو بہت جانو۔"

"جناب! میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ ازراہِ کرم اس سلسلے میں کوئی دخل مت دیجیے۔ آپ کے بقول میں نے اتنی تگ و دو کی ہے تو یوں ہی نہیں کی ہوگی۔ میں یہاں تک آ کے پیچھے نہیں جا سکتا۔ ازراہِ مہربانی مجھے معذور سمجھیے۔"

"لیکن بڑے صاحب! ہم تو معذور نہیں ہیں۔"

"میں نے درخواست کی ہے۔"

"وہ دوڑ دھوپ اور تھی بڑے صاحب، یہ اور ہے۔ مجھ کو بیچ میں بولنا نہیں چاہیے، پر ساری زندگی اپنا کام ہی رہا ہے۔"

"دیکھیے مجھے میرے حال پر چھوڑ دیجیے۔"

"آپ ہم کو نہیں جانتے ہو۔ آپ کو ہمارے نکلنے پر شک ہے نا۔ بابر کے کھلاڑ ہے۔ اس کے پاس جیا تو بھی ہے تو شنیا بھی۔ دونوں کو چلانا بھی آتا ہے۔ میں اس کو دکھا کے آپ سے کچھ مانگنے نہیں آیا جمیل۔ پیسہ اپنے کو بھی اچھا لگتا ہے، پر اپنے سے زیادہ نہیں۔ آپ کے پاس پیسہ ہوگا اپنا کچھ نہیں بگڑے گا۔ پر ہم کو یقین ہو کہ آپ کا بھی کچھ نہیں بگڑے گا تو ہم ادھر سے چپکے واپس جائیں گے۔"

"میرے ذہن میں بدگمانی نہیں ہے۔ بلاشبہ آپ کی مرضی پر منحصر ہے۔" اباجان نے ترش روئی سے کہا۔ "آپ کا یہاں آنے سے صرف ایک ہی مقصد تھا تو مجھے افسوس ہے اور میرے پاس لفظ نہیں کہ بابر کے سلسلے میں آپ سے کچھ کہہ سکوں۔ بہر حال یہ کسی معجزے سے کم نہیں ہے۔ میں مجبور ہوں، لوٹ نہیں سکتا۔ جتنا آپ اصرار کریں گے مجھے شرمندگی ہوگی۔ میرا یہاں کچھ بگڑ جائے گا تو اس کا سزاوار میں خود ہوں گا۔ اگر اب بھی آپ کے دل میں ہے کہ میرے پاس کوئی کاغذات ہیں تو ایسا نہیں ہے۔ میں اتنی ناعقلی نہیں کر سکتا تھا کہ انھیں اپنے ساتھ لاتا۔"

"مجھ کو ایسا ہی لگتا ہے۔ ایسا ہے تو بہت اچھا ہے بڑے صاحب۔"

"جی سمجھیے۔"

"آپ بولتے ہو تو ہم بھی سمجھ لیتے ہیں۔ پر آپ سے ایک بات اور پوچھنا ہے کہ آپ یہاں آ کے کتنا آگے آئے ہو؟"

"میں اس بارے میں کچھ نہیں بتا سکتا۔"

"بڑے صاحب! ہم ادھر آ کے اور جان بوجھ کے آپ کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتے۔ ہم کو کچھ نہیں، صرف آپ کی فکر ہے۔ ہم کو بولو کہ آپ کے راستے میں ابھی کیا روڑا ہے۔ آپ کو راستہ بنانا چاہیے۔"

"کچھ نہیں۔ کچھ نہیں۔" اباجان جھنجھلاتے ہوئے بولے۔ "اگر آپ کی مراد میری مدد سے ہے تو مجھے کسی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔"

"آپ پوری بات نہیں سمجھتے ہو بڑے صاحب! اتنی اونچی سن کے بھی اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہو۔ ہم بولتے ہیں کہ ہم حصہ لینے نہیں آئے ہیں، بتانے کا مقصد۔ ہو رہا ہے آپ نہیں روک سکتے ہو نہ اس کا بھید چھپا سکتے ہو۔ وہ خود ہی آپ سے کچھ نہیں بول رہا ہے۔ معاملے کی بات ہو تو لڑائی ہو جاتی ہے۔ آپ کے پاس کاغذ نہیں ہیں۔ پر آپ تو ادھر ہو اور آپ ہی بتاؤ، یہ جانتے ہوئے کہ کوئی اور بھی ادھر آ گیا ہے۔ آپ آگے کیا کام کر سکتے ہو؟ وہ چاہے تو آپ۔۔۔ آپ۔۔۔"

"جمیل بھائی!" میں نے پہلی بار زبان کھولی۔ جمیل کی آواز میں لکنت آ گئی تھی۔ مجھے اس کی آواز کی خوب پہچان تھی۔

"لاڈلے! تو چپ رہ، مجھ کو بولنے دے۔"

"اباجان!" میں نے اُن کے ہاتھ پکڑ لیے۔ "جمیل بھائی کے متعلق غلط مت سمجھیے۔"

اباجان کے چہرے اس سردی میں پسینے سے بھیگے ہوئے تھے۔

"لیکن کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ مجھ سے کچھ حاصل ہو جائے گا؟" وہ بھینچے

ے لہجے میں بولے۔
"پر آپ کو بھی کچھ نہیں حاصل ہوگا، کسی کو بھی نہیں ہوگا۔"
"تو آپ کوئی معاملہ کرنا چاہتے ہیں؟" ابا جان نے زہر خند سے کہا۔
"نہیں بڑے صاحب! ہم نے پہلے منع کر دیا ہے۔"
"یعنی آپ صرف......"
"جی بڑے صاحب! اپنے کرائے میں کل کی فکر نہیں ہوتی۔"
"میں آپ کو نہیں جانتا۔"
"باہر کے ہوتے ہوئے ایسا مت بولو، سب جانتا ہے۔"
"لیکن میں... میں..." ابا جان کی زبان لڑکھڑانے لگی۔
"جھبل بھائی سب آپ کی بہتری کے لیے کر رہے ہیں" میں نے ہاتھ جوڑ کے ان سے فریاد کی۔ "آپ ہمارے ساتھ لوٹ چلیے۔ یہاں ہر قدم پر خطرہ ہے۔ آپ کو اب کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ میں اب کبھی آپ کے پاس سے نہیں جاؤں گا۔"
"ہیرو!" ابا جان میرے سر پہ اضطراری انداز میں ہاتھ پھیرنے لگے۔ "ہیرو! میں جلد ہی واپس آ جاؤں گا۔ تجھے دیکھنے اور مٹنے کی خبر سننے کے بعد ایک لمحے کے لیے میرا دل یہاں نہیں لگے گا مگر تو سمجھتا نہیں ہے بیٹا۔ میں تجھ سے کیا کہوں، بس اتنا جان لے کہ واپسی میرے اختیار میں نہیں ہے۔ آدمی دور تک آ کے میں اب واپس نہیں ہو سکتا۔ میری منزل قریب ہے، بہت قریب اور کوئی تصور نہیں کر سکتا کہ وہ سب کیا ہے۔"
"لاڈلے! تو ادھر سے چلا جا۔ میں خود ہی بڑے صاحب سے بات کر لوں گا۔ ابھی ذرا وقت ہے۔ باہر رک کے میرا انتظار کر۔ ادھر سومو بھی کھلے میں کھڑے کھڑے جم گیا ہوگا۔"
"جھبل بھائی!" میں نے ان سے التجا کی۔
"جا لاڈلے! تو جا، بڑے صاحب تیرے ہی بارے میں مجھ کو بولتے تھے۔ ان سے اتنی ہی باتیں بولنی پڑیں گی اور بار بار۔ ایک بار وہ سمجھ لے۔ بڑے صاحب نے دل ٹھنڈا نہیں کیا ہم پہ، لوٹ رہے ہیں۔ ... وہ ادھر جا کے جلا دیں۔ جا، میں آتا ہوں۔"
میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کیا کروں۔ جھبل کی بات مان لوں یا ان کے پاس بیٹھا رہوں۔ میں بیٹھا رہا ... جھبل نے میرا کندھا پکڑ کے مجھے ابا جان کے پاس سے جدا کر دیا۔ پھر میں نے مڑ کے نہیں دیکھا۔
سومو باہر سردی سے کپکپا رہا تھا۔

صبح ہونے میں بس کچھ دیر باقی تھی کہ جھبل جس کٹیا کے دروازے پہ نکلا ہوا دکھائی دیا۔ ہم تینوں چلتے ہوئے ہال میں اپنے بستروں پر آ کے دراز ہو گئے۔ مجھے اس سے ابا جان کے متعلق پوچھنے کی بے کلی تھی لیکن جرأت نہیں پڑتی تھی۔ جھبل کا چہرہ بھی اس طرح اندھیرے میں چھپا ہوا تھا کہ کوئی اندازہ نہیں ہو سکتا تھا۔ "سب ٹھیک ہے لاڈلے۔" ذرا سے توقف کے بعد جب بستر میں کچھ تازگی ہو گئی تو اس نے میری گردن میں ہاتھ ڈال کے کہا۔
"کیا وہ تیار ہو گئے؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔
"کیا بولوں لاڈلے؟" وہ پژمردگی سے بولا۔
"بتاؤ نا مجھے۔"
"دلوں کے آگے اپنا پاؤں بھی سالا کچھ نہیں لگتا ہے۔"
"کیا کہہ رہے ہو؟"
"وہ بھی تو ایک دیوی کے جال تانے میں ہے۔"
"کیسی دیوی؟"
"تیری طرح ایک دیوی کے۔"
میں سمجھ گیا کہ اس کی مراد کیا ہے۔ "یعنی وہ تیار نہیں ہوئے؟"
"ہو بھی گئے، نہیں بھی۔"
"کیا مطلب؟"
"ابھی کل دیکھیں گے۔"
"مگر ہم روز تو یہاں نہیں آ سکتے۔"
"آنا ہی ہوگا لاڈلے!" وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔
تھوڑی ہی دیر میں اندھیرا چھٹنے لگا۔ ہم بے نیند ہی پڑے رہے۔ سرائے میں لوگوں کی آمد و رفت کی گونج ہمارے کانوں میں پڑنے لگی تو ہم نے بستر چھوڑ دیا۔ بہت سے بھکشو ہال میں موجود تھے اور کچھ لوگ انھیں چائے پلا رہے تھے۔ ہم بھی چائے کے انھی میں شامل ہو گئے۔ ہلکا پھلکا ناشتہ چائے کے ساتھ تھا۔ ہم نے بھنے ہوئے گندم کی چند پھنکیاں لی ہوں گی کہ ابا جان ہال میں آتے نظر آئے اور ہمیں دیکھ کے کچھ رک سے گئے مگر کسی تاثر کے بغیر آگے بڑھ کے بھکشوؤں کی قطار میں بیٹھ گئے۔ انھوں نے اپنا سر جھکا لیا تھا۔ چائے پیتے ہی جھبل نے وہاں سے چلنے میں جلدی کی۔ ابا جان وہیں بیٹھے رہے۔ مندروں کے علاقے سے نیچے بستی میں آتے ہوئے دھوپ کے چمکتے پہاڑیوں پر پڑنے لگے تھے۔ رات کے مقابلے میں ہماری رفتار تیز تھی اور ہیجانی بھی تھی۔
جاسو نے ہم سے کوئی سوال نہیں کیا۔ اسے معلوم ہوگا کہ کل شام جس وقت ہم اوپر جا رہے تھے، رات کو ہماری واپسی ممکن نہیں تھی لیکن جاسو اور مارٹی بے چینی سے ہمارے منتظر تھے۔ سلطان بھی اپنے چہرے پر سب کچھ لکھا ہوا لیے اور چپ چاپ سا تھا۔ اس دن بھی دوپہر تک ہم سب بازار میں مال جانے بیچتے رہے اور جھبل نے یہاں بستی کے بعض دکان داروں سے اپنی لائی ہوئی چیزیں انھیں دکھا کے ہندوستان سے ان کی مستقل رسد کے متعلق بات چیت کی۔ اسی اثنا میں سردار کے مکان سے ہمارا بلاوا آ گیا۔

اپنے خاص کمرے کے بجائے سردار مکان کے باہر ہی ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ ذرا اندر لے گیا۔ سامان بھی ہمارے ساتھ تھا۔ کل کی نسبت سردار آج کچھ زیادہ مضطرب نظر آ رہا تھا۔ آج بھی اس نے ہمارے آگے پھلوں اور کشمش سے بھری ہوئی چینی کی پلیٹوں کا انبار لگا دیا لیکن اس کا مقصد بہت واضح تھا۔ وہ جھبل کی زبان سے کچھ اور سننے کچھ اور جاننے کی جستجو میں تھا۔ لوٹ پھیر کے وہ اس سے کاغذات ہی کا ذکر کرنے لگتا جیسے کل کی جھبل کی کہی ہوئی باتوں سے اس کا اعتبار اٹھ گیا ہو اور وہ دوبارہ اپنے سننے کی توثیق چاہتا ہو۔ جھبل نے کوئی تردید نہیں کی، اضافہ کیا۔ اس نے بھی گزشتہ روز کی گفتگو کے اعادے کے سوا کچھ نہیں کہا لیکن شاید جھبل کا لہجہ آج اتنا بے ساختہ اور برجستہ نہیں تھا کہ سردار کی تسلی ہو سکے۔ وہ کچھ اور مضطرب سا ہو گیا۔ جھبل سے تعلق کی باتیں سن کے اس کی تیوریاں الجھی ہو گئی تھیں۔ تاہم اب اس نے ہمیں اپنے مکان سے جانے نہیں دیا۔
ایک دن اور گزر رہا تھا۔ جیرو اور دوسرے لوگوں کا اب تک کوئی پتہ نہ تھا۔ جھبل کو بھی الجھن ہوگی اسی لیے وہ سردار سے ٹھیک طرح بات نہیں کر سکا۔ سورج غروب ہونے پر جب اس نے جاسو، سلطان اور مارٹی کو وہیں چھوڑ کے پھر اوپر جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو جاسو بہت مشکل سے آمادہ ہوا۔ ان کو بھی ساتھ لے جانے پر ٹنگ ... جاسو کے ساتھ مارٹی بھی ہچکنے لگا۔
"دو تین راتیں اور کاٹ لے ماسٹر!"
"تم لوگ تو ہزار راتیں کاٹ لو گے!" مارٹی نے سینے پہ ہاتھ رکھ کے کہا۔ "ہم ایسر سالا ایک شام تھر کے ... آگر بھی نہیں لیتا۔ راجا جانی کو بھی چھوڑ دو ..." اس نے جھبل سے التجائیہ لہجے میں کہا۔
"راجا کا اوپر کا کام ہے نہ!" جھبل اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔ "تیرا نقشہ پہلے ہی چل جائے تو اچھا ہے ماسٹر! کال تیرے ایک اور رات۔"
مارٹی ہنسنے لگا۔ "اوپر چڑھے چڑھے پا تو بھی گھل ہو جائیں گا اپن سوچتا ہے ان کو سردی مار گیا تو......"
"جا تو دوسرے دن جائیں گے ماسٹر! ہاتھ گھل مت ہونے دینا۔"
"ہاتھوں میں اب گھل ہو جی ہے استاد!" جاسو ہنسا کے بولا۔
"اچھا ہی شگون ہے لے بڑھتے لے۔"
ہم نے کئی مفلر گلے میں ڈال لیے تھے اور اوور کوٹ بھی پہن لیے تھے۔ تینوں کے پاس چھڑیاں اور بھرے ہوئے تھیلے تھے۔ چلتے وقت بڑھیا ہمیں رسا بالکل خاموش رہا تھا۔ جھبل نے بھی اس سے زیادہ بات نہیں کی، پیچھے ہی اندھیرا ہو چلا تھا۔ اب ہمیں کل کے مقابلے میں زیادہ مشکل پیش آئی مگر آج بارش نہیں تھی، آسمان بھی صاف تھا۔ ہم نامی دیر سے اوپر پہنچے اور جیسے ہی ہم نے گوتم بدھ کی بڑی مورتی کے اطراف ہموار زمین پہ قدم رکھے، ہمیں شعلوں کی روشنی میں بستی کے چند باشندے وہاں گھومتے نظر آئے۔ بڑے مندر میں بھی وہ موجود تھے۔ رات کو کھانا ہم نے بڑے مندر ہی میں کھایا۔ ہم نے اچھی طرح اطمینان کر لیا تھا کہ ہمارے آگے پیچھے پروہت بیٹھے ہیں لیکن ابا جان کچھ ہی فاصلے پر موجود تھے۔ بڑے مندر سے قریب دو تین مندروں میں ہم جا کے ہمیں اندازہ ہو گیا کہ ان کی تعداد کم نہیں ہے۔ اس کے باوجود کسی طرح ہم ایک مندر سے دوسرے مندر میں جاتے رہے۔ ہم نے بعض مندروں میں دانستہ دیر بھی لگائی اور گوتم بدھ کی مورتی کے سامنے ساکت ہو کے بیٹھے رہے لیکن جیسے ہی ہم عمارت سے باہر نکلے، ایک دو آدمی کہیں نہ کہیں نظر آ جاتے۔ ایک مندر سے دوسرے مندر کے درمیان حیلہ فاصلہ زیادہ تھا اور جہاں وسط میں شعلوں کی روشنی نہیں پہنچ پا رہی تھی، وہاں گہرا اندھیرا تھا۔ انھیں آزمانے کے لیے ہم ایک ایسی ہی جگہ اندھیرے میں چھپ کے خاموش کھڑے رہے مگر جلد ہی آہٹیں ہمیں اپنے قریب آتی سنائی دینے لگیں۔ نتیجتاً ہم آگے بڑھ کے روشنی میں آ گئے۔ وہ خاموشی سے علاقے میں بکھرے ہوئے تھے اور وہ کوئی ایک گروہ نہیں تھا بلکہ ان کے طور طریق گلیوں میں گشت کرنے والے ہی جیسے تھے۔ ہم دوبارہ قریب آئے، انھوں نے ہم سے کوئی بات نہیں کی۔ جب تک دو ایک گروہ انھیں نظر آ جاتا، پہلا ہم سے دور دور ہو جاتا۔ سرائے تک جانا مشکل نہیں تھا لیکن اس صورت میں ابا جان سے ملنا ممکن نہیں تھا۔ سرائے میں بھی وہ موجود ہوں گے۔ جھبل بڑے مندر میں ہم کو لے کے بیٹھ گیا۔ ہمیں گزشتہ روز کا تجربہ تھا کہ رات گہرے گہرے مندر میں جلنے والی مشعلوں کی روشنیاں کم ہونے لگتی ہیں، اس وقت سردی بھی بڑھ جاتی ہے اور غصہ بھی بڑھ جاتی ہے۔ یہ دوسری بات تھی کہ وہ اپنے ساتھ روشنی لے کے چلیں مگر ایسا ہوتا تو ہمارے لیے آسانی تھی کہ ان کی نقل و حرکت ہماری نظروں میں آتی رہتی۔ میری توقع کے خلاف جھبل مندر میں زیادہ دیر نہیں بیٹھا۔ اچانک ہی وہ چل پڑا۔ مندر کے باہر کچھ دور دھند میں ان کے سائے رینگ رہے تھے لیکن ایک حد تک ہمیں نظر آ رہے تھے، ہمیں بھی وہ اسی حد تک دیکھ سکتے تھے۔ جھبل نے ان کی موجودگی کا خیال نہیں کیا اور ان کے پاس سے گزرتا ہوا ایک طرف نکل گیا۔ وہ سرائے سے بھی آگے نکل گیا۔ راستے میں کئی ایسی جھاڑیاں اور جھنڈ پڑتے تھے جہاں ہم چھپ کے کسی مناسب وقت پر ابھر جاتے مگر جھبل چلتا رہا اور کسی قدر نشیب میں جھاڑیوں اور درختوں کے درمیان واقع ایک بوسیدہ عمارت کے سامنے آ کے رک گیا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا تھا، ہم اس طرف پہلے نہیں آئے تھے۔ یہ جگہ بڑے مندر سے دور تھی لیکن مندروں کے دور دراز کے پھیلے ہوئے سلسلے ہی سے تعلق رکھتی تھی اور ہموار نہیں تھی۔ گھنے درخت، تنگ پگ ڈنڈیاں اور ادھر ادھر اونچی نیچی زمین پر نئے اور پرانی جھاڑیاں۔ وہ ایک قدیم عمارت تھی۔ مجھے حیرت تھی کہ وہاں کیوں نہیں ہیں ... عمارت کے بیرونی حصے میں سیڑھیوں کے پاس ایک مختصر الاؤ روشن کیے

روک لیا۔ "ایک بات سن لو سردار، ہم سے جھوٹ مت کرنا۔" وہ سپاٹ آواز میں بولا۔ "ان سے کاغذ کی کوئی بات مت بولنا۔"

سردار کی بھویں سکڑ گئیں۔ جھبل کی تاکید اُس کے لیے تعجب انگیز تھی۔

"پتہ نہیں وہ ادھر کس بات کی کھوج میں آئے ہیں۔" جھبل نے ترشی سے کہا۔ "سمجھ گئے؟"

"کیا مطلب؟" سردار سنجیدگی سے بولا۔

"مطلب صاف ہے سردار۔"

"لیکن وہ۔ کیا تمھارے خیال میں وہ بھی اُن کے بارے میں کچھ جانتے ہوں گے؟" سردار کی آواز پر حیرت چھائی ہوئی تھی۔

"ہم نہیں بول سکتے، پر وہ جان سکتے ہیں۔"

"مگر کیسے؟"

"کیسے ویسے ہم سے مت پوچھو، ہم احتیاطاً کو بول رہے ہیں۔ وہ بھی سوداگر ہیں۔ تمھارے آدمی نو سال سے ہندوستان میں سرگرداں ہیں۔ یہ بھی ساری دُنیا گھومتے رہتے ہیں۔ ان کو بھی پتہ چل سکتا ہے۔"

"لیکن وہ یہاں کیسے آئیں گے؟" سردار اُلجھتے ہوئے بولا۔ "متبرک دستاویزیں ہندوستان سے گئی ہیں، وہ ہندوستان ہی میں ہوں گی۔ یا تو دستاویزیں وہاں نہیں ہیں جہاں ہیں یا پھر وہ انھیں لے کے آئے ہیں اور تمھاری طرح اُن کا سودا کرنا چاہتے ہیں یا انھیں ہندوستان میں کسی ایسی جگہ کا پتہ ہے جہاں دستاویزیں موجود ہیں اور وہ تعین کرنا چاہتے ہیں کہ ہم انھیں اس کے عوض کیا کچھ دے سکتے ہیں تاکہ وہ کوئی نفع بخش تگ و دو کر سکیں۔"

سردار کو قبیلے کا سردار یونہی نہیں بنایا ہوگا۔ اس میں سو میں سے زیادہ سوجھ بوجھ ہوگی۔ جھبل کے کہنے کے مطابق اگر نئے آنے والوں کو بھی کاغذات کا کوئی علم ہو سکتا ہے تو سردار کے ذہن میں اُٹھنے والے تمام سوال جائز تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ جھبل ان کو کیا جواب دے گا۔ "ہم نہیں جانتے کہ کون سی بات ٹھیک ہے۔ پر ایک بات تم نہیں بول رہے ہو۔" جھبل نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ "وہ کسی اور وجہ سے بھی ادھر آ سکتے ہیں۔ کاغذ کے بارے میں ان کو کچھ جان چاہو تو کوئی ان کو [illegible] سے پہلے ہی ادھر آ گیا ہو۔ اور کاغذ میں کچھ اور بھی لکھا ہو۔" جھبل نے وضاحت نہیں کی کہ کاغذات میں اور کیا رمز ہو سکتی ہے۔ سردار نے اُن کا ذکر کرتے ہوئے خود بھی اس سے پہلو تہی کی تھی۔ کوران نے مجھے بتایا تھا کہ قبیلے میں چند ہی بزرگ لوگوں کو کاغذات کی متبرک حیثیت کے سوا دوسری خوبی کا علم ہے۔ اُن کا اتالیق اتین اسے جانتا تھا۔ "ہم ابھی کچھ نہیں بول سکتے۔" سردار کو متذبذب دیکھ کے جھبل نے کہا۔ "یہ ہمارا خیال ہے۔ وہ ویسے بھی ادھر آ سکتے ہیں۔ اِدھر کوئی دروازہ تو نہیں ہے۔ اسی لیے ہم احتیاط کو کر رہے ہیں۔ اُن کو کچھ پتہ نہیں ہے اور پتہ چلا تو ہمارے کام میں ہرجا ہو سکتا ہے۔"

"اور اگر انھوں نے خود ذکر کیا؟"

"تو اگر وہ کاغذ اپنے ساتھ لائے ہیں اُن سے لے لینا۔ ہم اپنا مال اُٹھا کے چلے جائیں گے اور اگر انھوں نے ہماری طرح کی بات بولی تو جس سے سودا پہلے ہوا ہے اس کا تم کو دھیان رکھنا ہوگا۔ تم اُن سے [illegible] مت بتانا۔ شاید تمھارا کام پھر کچھ جلدی ہو جائے۔ اس کے بعد میں اگر وہ کاغذ ہم سے پہلے لے کے تمھارے پاس آ گئے تو ہم کچھ نہیں بولیں گے۔ تمھیں سلام کر کے اپنا منہ کالا کر لیں گے۔ ہم اُن سے نہیں بولیں گے کہ ہم سے بھی بات ہوئی ہے۔ تم نے ہم کو دیکھ لیا ہے۔" ابھی [illegible] معلوم ہوتا تھا سردار کی سمجھ میں کچھ آیا ہے کچھ نہیں۔ وہ [illegible] میں گردن ہلا رہا تھا۔ جھبل نے اُس کی پشت پر ہاتھ رکھ کے آگے بڑھنے کی تلقین کی تو جیسے قدمی کرتے ہوئے اُس کے پیر جھکنے لگے۔ ہم [illegible] حصے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ دالان میں پہنچتے ہی ہماری نظر اُن پر پڑی۔ پیرو کے ساتھ صرف وزیر تھا اور ان کے گرد قبیلے کے آدمی۔ ان دونوں کی حالت نہایت خستہ تھی۔ داڑھیاں بڑھی ہوئی، کپڑے گندے اور چہروں پر دھول سی جمی ہوئی۔ ہم نے انھیں اور انھوں نے ہمیں دُور سے دیکھ لیا تھا۔ دونوں کی آنکھیں ٹمٹمانے لگیں۔ [illegible] اُن کے قریب جاتے ہوئے جھبل نے سردار کا ہاتھ پکڑ کے [illegible] کیا اور تیز قدموں سے پیرو کی طرف بڑھ گیا۔ دونوں ایک دوسرے کے گلے لگ گئے۔ "تم ..... تم ادھر کیسے آ گئے؟" جھبل نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

پیرو کو سمجھنے میں دشواری نہیں ہوئی کہ اُسے کیا کہنا چاہیے۔ "[illegible] زیادہ آگے نہیں جا سکے استاد۔" وہ تھکی ہوئی آواز میں بولا۔ "اپن کے کئی آدمی راستے میں ہی مرنے ترسنے لگے۔ ادھر سالا [illegible] ایک رات اپن سے [illegible] مار دی۔ ان کو تو اپن نے کچھ دیا [illegible] کو کیسے سمجھا۔ اب آگے پیچھے ایک ہم ایک گیا۔ ابھی اپن کیا بولے۔" پیرو کے گلے میں کوئی پھانس سی چبھی ہوئی تھی۔ "اپن ادھر آ گیا۔" [illegible] سر جھکا کے کہا۔

"ٹھیک کیا، ٹھیک کیا۔" جھبل اُس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے بولا۔ "ادھر قبیلے کے لوگوں کے پاس گرمی بہت ہے۔ یہ تمھارے سامنے قبیلے کا سردار اشی کا ہے۔"

پیرو نے گردن خم کر کے اُسے تعظیم دی۔ "اپن لوگ ابھی ادھر [illegible] رہنا مانگتے ہیں سردار۔ اپن کا کوئی آدمی [illegible] نہیں ہے۔"

شولم نے پیرو کی ترجمانی کے فرائض انجام دیے۔

سردار نے انکار نہیں کیا اور مزید کوئی بات پوچھے بغیر [illegible] ایک شہزادی کو بلا کے پیرو اور اس کے ساتھیوں کی دیکھ بھال [illegible]

گیا۔ وہ شخص میں وسا نہیں تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ہمارے ساتھ نہیں رہیں گے، رہ بھی نہیں سکتے تھے۔ وہ اپنے اپن وسا کا [illegible] نہیں تھا۔ پیرو نے سردار کی اس مہربانی کے عوض اُسے کچھ سامان کی پیشکش کرنی چاہی۔ سردار نے توجہ نہیں دی۔ وہ گہری نظروں سے مسلسل ہمیں دیکھتا رہا۔

"باقی سب کدھر ہیں؟" جھبل نے [illegible] پیرو سے پوچھا۔

"ایک گم ہو گیا ہے استاد۔" پیرو نے دبی زبان سے کہا۔

ایسا لگا جیسے کوئی بہت زور سے میرے کانوں میں چیخا ہو یا جیسے کسی نے بہت اُوپر سے مجھے دھکا دے دیا ہو۔ جھبل کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ "ایک گم ہو گیا ہے۔" وہ گھٹی ہوئی آواز میں بولا۔ "نہیں .... نہیں .... کیا بولتے ہو دادا؟"

"اپن نے بہت روکا، پر اُس نے نہیں سنا، چلا گیا۔"

"کون .... کون؟" جھبل نے وحشت سے پوچھا۔

پیرو کے ہونٹ ہلنے لگے۔ "اپن کا متقی میاں۔"

"متقی میاں!" جامو ہانپتے ہوئے بولا۔ "نہیں دادا!"

"ہاں۔" پیرو کی آواز بھرا گئی۔

جامو نے اپنا سر پکڑ لیا۔ جھبل، مارو، سلیم، سلطان سبھی کی آنکھیں پتھرا سی گئی تھیں۔ چند لمحوں تک ہمیں بالکل احساس نہیں رہا کہ ہم سردار کے سامنے کھڑے ہیں اور قبیلے کے دوسرے لوگ بھی یہاں موجود ہیں۔ پیرو اور وزیر نگاہیں نیچی کیے کھڑے تھے اور ہم انھیں کو تک رہے تھے جیسے پیرو نے ہم سے مذاق کیا ہے اور ابھی اس کا اقرار کر لے گا۔ پیرو نے ایسا کوئی اقرار نہیں کیا لیکن اُسے جلد ہی اپنی غلطی کا اندازہ ہو گیا کہ سردار اور قبیلے کے لوگوں کے سامنے اُسے ہم سے کچھ نہیں کہنا چاہیے تھا۔ وہ پھیکی مسکراہٹ لبوں پر بکھیرتے ہوئے سردار سے بولا کہ وہ اور اس کے ساتھی بہت تھکے ہوئے اور بیمار ہیں، انھیں آرام اور علاج کی ضرورت ہے۔ اور کسی طبیب کا انتظام کر دیا جائے اور اس کے مرے ہوئے آدمی کو بستی میں کہیں جگہ دفن کرنے کی اجازت دی جائے۔

ہم سب ساتھ ساتھ ہی باہر نکلے۔ مکان کی باڑی سے نیچے [illegible] فاصلے پر ایک جگہ وہ سامان کے سامنے پڑے ہوئے تھے۔ جیلو اور زورا [illegible] ابھی آدھے نظر آ رہے تھے، جیسی بُری طرح کا نپ رہا تھا۔ جیلو کو اس وقت بھی تیز بخار تھا۔ متقی میاں کی میت اُن کے بیچ میں رکھی ہوئی تھی۔ جھبل کو ابھی کچھ ہوش سا آ گیا تھا۔ اس نے متقی میاں کے چہرے سے کپڑا ہٹایا اور [illegible] لگا۔ متقی میاں کے چہرے پر سفیدی چھائی ہوئی تھی۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں جیسے گہری نیند سو رہا ہو اور کوئی خواب دیکھ رہا ہو یا کسی بات پہ مسکرا رہا ہو۔ اس کے بند ہونٹوں میں کوئی شرارت سی چھپی ہوئی تھی۔ وہ مرا ہوا نہیں معلوم ہوتا تھا۔ لگتا تھا، ابھی آنکھیں کھول کے اُٹھ جائے گا اور سب کو ڈرانے لگے گا۔ جامو اس کی لاش سے لپٹنے کے لیے بیتاب تھا۔ جھبل نے اُسے میت سے دُور رکھنے کے لیے سلطان کو اشارہ کر دیا تھا۔ قبیلے کے کئی آدمی بھی سردار کے مکان سے ہمارے ہمراہ آئے تھے۔ زورا، جمیعتی اور وغیرہ ہم سے دُور دُور ہی تھے۔ اس لیے کہ جھبل نے اسی طرح پہ اُن کی خیریت دریافت کی تھی لیکن ہمیں دیکھنے کے بعد اُن کے گالوں پہ خون جھلکنے لگا تھا۔

جامو متقی میاں کا چہرہ بھی اچھی طرح نہیں دیکھ سکا۔ جھبل نے اُسے دُور دُور ہی رکھا۔ بچپن سے متقی میاں جامو کے ساتھ رہا تھا۔ جامو [illegible] گیا تو وہ اُس کے جانی بھوری کی نگرانی میں فیض آباد کے اڈے کی دیکھ بھال کرنے لگا۔ اُس کی عمر بھی زیادہ نہیں تھی۔ نہ شادی ہوئی تھی اور ایک خالہ کے سوا دُنیا میں اس کا کوئی نہیں تھا۔ جامو اپنے جانی بھوری کی طرح اس کا خیال رکھتا تھا۔ شروع شروع میں جامو نے اُسے اڈے سے دُور رکھنا چاہا تھا اور تعلیم دلانے کی کوشش کی تھی مگر متقی میاں چل نہیں سکا۔ جامو نے پھر اُسے باقاعدہ اڈے ہی پر رکھ لیا۔ ابھی چند مہینے پہلے متقی میاں نے فیض آباد کے اڈے میں [illegible] جاتا تو ان یاتا تھا سب [illegible] لیکن وہ محض مذاق تھا۔ ہر وقت کسی نہ کسی کو چھیڑنا، مذاق کرنا اور ہنستے رہنا اس کی عادت تھی۔ [illegible] پہ اس کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ جامو ہی نے اُسے سب کچھ سکھایا تھا۔ [illegible] اس کا ہاتھ دوسروں کی نسبت زیادہ رواں ہو گیا تھا۔ جھبل اسی لیے اُسے فیض آباد سے نکلتے ہوئے ساتھ لایا تھا کہ وہ ہاتھ کا بھی اور نظر کا تیز تھا۔ اس کے جسم میں بہت لچک تھی۔ درمیانہ قد، ستا ہوا کھنچا ہوا بدن۔ وہ بندر جیسی بجلی دوڑتی تھی۔ اب اُسے اپنی خبر نہیں تھی۔ کون کیا کر رہا ہے، کیا ہو رہا ہے۔ نہیں رہا ہے کون اُسے دیکھ رہا ہے۔ پہلے ذرا سی بات پر کھٹکا ہوتے ہی اس کے کان کھڑے ہو جاتے تھے۔

قبیلے کے بہت سے آدمی ہمارے اطراف اکٹھے ہو گئے۔ جب ہم متقی میاں کی میت کندھوں پہ اُٹھائے بستی کے چوک میں آئے۔ جہاں پیرو کے قبیلے کا انتظام کیا گیا تھا۔ وہیں متقی میاں کو غسل دیا گیا۔ کفن کے بجائے اُسے چادروں سے لپیٹ دیا گیا۔ قبیلے کے آدمیوں کی رائے تھی کہ اُسے اسی طرح دفن کر دیا جائے مگر جھبل نے غسل کے لیے اصرار کیا۔ میں تو باہر ہی بیٹھا رہا تھا۔ جامو کو بھی کسی نے ادھر نہیں آنے دیا تھا۔ بانس کی ایک چارپائی پر متقی میاں کو لٹا دیا گیا تھا۔ انھوں نے بستی سے بہت دُور ایک جگہ کی نشاندہی کی تھی۔ وہاں پہنچتے پہنچتے اندھیرا پھیل گیا تھا۔ ہمارے ساتھ مشعلیں بھی نہیں تھیں۔ اندھیرے ہی میں جھبل، پیرو، سلطان، مارو، شولم، جلا کر اور زورا گڑھا کھودتے رہے۔ جیلو اور [illegible] کو بیماری کی وجہ سے وہیں چھوڑ دیا گیا تھا۔ زمین نرم تھی مگر پتھریلی ہوئی تھی۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے کی کوشش میں انھوں نے قبر جیسا ایک گڑھا کھود لیا۔ متقی میاں کو لٹانے سے پہلے جھبل نے اُس کے منہ سے چادر کھول کے ٹارچ کی روشنی پھینکی۔ یہ

ہوئے ایک طویل راستہ کاٹ کے اسی نشیب میں آ گئے جہاں اُونچے درختوں اور جھاڑیوں میں گھرا ہوا قدیم مندر واقع تھا۔ مندر کی چھت نظر آتے ہی ہم نے اپنی رفتار سے مدھم کر دی تھی۔ پنچھیوں اور ابابیلوں کے بل تھر تھرا رہے تھے۔ ہم عمارت کے عقب میں پہنچ گئے۔ سُومَلو اور ہتی کے آدمیوں کی دبی دبی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ قجل نے سُومَلو کو ہدایت کی تھی کہ وہ سیڑھیوں پر موجود آدمیوں کو کسی طرح روک کے رکھے۔ روکنے سے اُس کی مراد یہ تھی کہ اُن کا دھیان بٹائے رکھے۔ سُومَلو اُن کی زبان جانتا تھا۔ وہ اُن سے چائے طلب کر سکتا تھا۔ الاؤ کے گرد کچھ دیر بیٹھنے کی اجازت حاصل کر سکتا تھا۔ اپنے کسی آدمی کی طبیعت اچانک خراب ہونے کا عذر کر سکتا تھا۔ وہ کسی طرح بھی انھیں باتوں میں لگا سکتا تھا اور اس اثنا میں ہم پیچھے سے جدھر سیڑھیاں نہیں تھیں، عمارت میں داخل ہو سکتے تھے۔ پچھلی رات جب ہم یہاں آئے تھے تو سامنے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ قجل نے سُومَلو کو یہ ہدایت بھی دی تھی کہ پہلے وہ مندر میں جا کے پچھلا دروازہ اگر بند ہو تو کھول دے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو کسی طور انھیں سیڑھیوں سے دُور لے جائے۔ سیڑھیوں سے انھیں دُور لے جانا کچھ ایسا مشکل نہیں تھا۔ مندر سے واپس ہو کے کچھ دُور جانے کے بعد کوئی بھی دوڑتا ہوا چیخنے چلانے لگتا۔ یقیناً وہ صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے اُس طرف بھاگتے اور اس دوران ہم مندر میں داخل ہو جاتے۔ یوں ہم اُن سب پر پیچھے سے وار کر کے انھیں بے بس بھی کر سکتے تھے۔ اُس رات اور کل دن میں ہم نے اچھی طرح اطمینان کر لیا تھا کہ سیڑھیوں پر اُن کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ تین یا چار آدمی ہوں گے۔ سُومَلو کے جانے کے بعد ہم (اندازاً) آدھ گھنٹے کے وقفے سے اُس کے پیچھے روانہ ہوئے تھے۔ سُومَلو کو اندازاً آدھ گھنٹے بعد اُن سے رجوع ہونا چاہیے تھا۔ اُس نے یہی کیا۔ سیڑھیوں کی جانب سے اُن کی آوازیں آنے سے ظاہر تھا کہ پچھلا دروازہ کھول دیا گیا ہے۔ ہم نے اپنی چاپ میں گھٹنے کی پوری کوشش کی تھی۔ پچھلا دروازہ سامنے کے دروازے سے قریب نہیں تھا۔ ایک بڑی عمارت دونوں کے بیچ میں کھڑی تھی۔

دروازہ کھلا ہوا ہی تھا۔ سب سے پہلے قجل اندر گیا۔ ہم سب دیوار کے ساتھ چپکے کھڑے رہے۔ چند ہی ثانیوں بعد قجل نے واپس آ کے جانو سلطان اور وزیر کو وہیں روک دیا۔ مجھے اور ریڈو کو ساتھ لے کے عمارت کے وسطی حصے میں پہنچا۔ بلند ستونوں کے گول کمرے میں آ گیا۔ وہاں صرف تین بھکشو ایک چھوٹی سی مشعل کی ڈگمگاتی روشنی میں مراقبے میں غرق تھے اور اُن میں آباجان بھی تھے۔ قجل کھسکتا ہوا اُن کے پاس جا کے اور اُن کے زانو پر ہاتھ رکھ کے بیٹھ گیا۔ آباجان کے بند ہونٹوں میں ایک ہلکی سی لرزش ہوئی۔ انھوں نے گردن کے خم سے تینوں کو غور سے دیکھا، پھر کچھ کہے بغیر اُٹھ کھڑے ہوئے اور عمارت کے تاریک حصے میں آ گئے۔ اسی طرف پچھلے دروازے کی راہداری میں جانو سلطان اور وزیر چھپے کھڑے تھے۔ قجل نے اُن کو اشارہ کر کے انھیں بھی بُلا لیا۔

اِس رات عمارت کے اِس حصے میں گھومنے کی سکونت کا ہمیں کچھ اندازہ ہو ہی گیا تھا۔ مرکزی ہال سے دیواروں تک پھیلے ہوئے ستونوں کی قطاریں تھیں اور اندر آنے جانے کے لیے سامنے اور پیچھے کے راستوں کے علاوہ دائیں بائیں دو اور راستے تھے۔ ہر راستہ یکساں تھا لیکن ایک راستے کو اس اعتبار سے فوقیت حاصل تھی کہ اس کے آگے سیڑھیاں تھیں۔ باقی راستوں کے سامنے صرف چبوترا تھا۔ اس لیے سامنے کا دروازہ کہا جا سکتا تھا۔ اسی کی نسبت سے آباجان دائیں طرف کے راستے کے قریب پہنچے تھے کہ اُدھر تاریکی تھی اور وہ ہمیں آسانی سے نظر آ سکتے تھے۔ وہ بائیں طرف کا راستہ تھا جہاں آباجان ٹھہر گئے تھے۔ مڑتے ہی انھوں نے ایک دروازے پر آہستگی سے ہتھیلی کا دباؤ ڈالا تو کواڑ کھل گئے۔ اندر گھپ اندھیرا تھا مگر وہ بھی کوئی کمرہ ہی تھا۔ پتھر کے فرش اور دیواروں پر اُبھرے ہوئے نقش و نگار سے یہی معلوم ہوتا تھا۔ دیوار سے لگتے ہوئے چند قدم چل کے آباجان ایک اور دروازے پر آ گئے تھے۔ احتیاط سے انھوں نے گزرتے ہی کواڑ بند کر دیے۔

نیچے تنگ سیڑھیاں جاتی تھیں۔ آباجان بے آواز قدموں سے نیچے اُترنے لگے۔ ایک وقت میں دو آدمی ایک ساتھ نہیں گزر سکتے تھے۔ ذرا بھاری آدمی ہو تو دیواریں شانوں سے چھلنے لگیں اور اُسے ترچھا ہونا پڑے۔ آباجان ہم سب سے آگے تھے۔ پیچھے قجل پھر میں اور سب سے پیچھے جانو سلطان اور وزیر۔ ہم سب نے کمرے کے ایک اور سے گزر کے پیچھے [illegible] برابر اُترتے گئے۔ سیڑھیاں گھومتی گئیں۔ آباجان کے پاس بھی ایک چھوٹی بیٹری تھی جسے انھوں نے کچھ آگے جا کے روشن کر لیا اور ہم دیواریں، چھت اور زینے دیکھنے کے قابل ہو گئے۔ وہ سیڑھیوں کی کوئی سرنگ تھی۔ شاید پتھروں کا رنگ بھی سیاہ تھا۔ کوئی سو زینے اُترنے کے بعد سیڑھیاں کئی سمتوں میں بٹ جاتی تھیں۔ ہر سمت ایک عجیب قسم کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ کیلا دھواں سا چھایا ہوا تھا لیکن سانس لینے میں ایسی دشواری نہیں ہو رہی تھی۔ یقیناً کہیں سے ہوا آنے کا کوئی انتظام تھا جس سے وہ گھٹن دُور کرتا تھا۔ ہوا وہیں سے آتی ہوگی جہاں سیڑھیاں بٹ جانے کا راستہ ہوتی تھیں۔ آباجان اس طرح بے جھجک آگے بڑھ رہے تھے جیسے انھوں نے ساری زندگی انھی راستوں پر کاٹی ہو۔ کوئی بھی اُوپر سے عمارت دیکھ کے قیاس نہیں کر سکتا تھا کہ اس کے نیچے زیر زمین ایسے راستے بنے ہیں۔ پتہ نہیں اُن کا کیا مقصد تھا، کہاں تک وہ جاتے تھے اور اب ایک ہی گنجائش کے نظر ہو جاتے تھے۔ جہاں آباجان ہمیں لے جا رہے تھے شاید اسی جگہ ہم پہنچ کر ہر شخص خاموش تھا۔ آباجان نے بھی اُوپر کمرے میں خاموشی کی تلقین کرنے کے سوا کوئی اور بات نہیں کی تھی۔ وزیر کی سانس پھول رہی تھی اور اپنی کھانسی روکنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ قجل اگر آباجان کے

ساتھ اپنی بیٹری بھی جلا لیتا تو روشنی کچھ زیادہ ہو جاتی اور ہم بار بار کھردری دیواروں سے نہ ٹکراتے لیکن قجل نے بیٹری جیب سے نہیں نکالی۔

ہم نہ جانے کتنے نیچے آ گئے ہوں گے کہ ایک کوٹھڑی پر آ کے سیڑھیاں ختم ہو گئیں۔ آباجان نے بیٹری کی روشنی اُس کے اطراف میں ڈالی۔ اِدھر کوئی گپھا تھی یا غار تھا۔ کسی بڑے تنور کے منہ جیسا راستہ اندر جانے کے لیے بنا ہوا تھا۔ ہم سب سر جھکائے ہوئے آسانی سے اُس میں داخل ہو گئے۔ کوٹھڑی میں ہوا اور روشنی کے لیے کوئی روزن نہیں تھا۔ فضا گرم تھی۔ ایک طرف دیا یہی گرم بدبو کی شدت سے متلی سی ہو رہی تھی۔ آباجان نے بیٹری بجھا دی، کوٹھڑی اندھیرے میں ڈوب گئی۔ ہم سب اپنی جگہوں پر دم بخود کھڑے تھے۔ یکایک کہیں ایک گڑگڑاہٹ سنائی دی جیسے کہیں زمین دہل گئی ہو یا کوئی چٹان اپنی جگہ سے ہل رہی ہو۔ آباجان نے جب بیٹری روشن کی تو ہماری آنکھوں کے سامنے ایک ناقابل یقین منظر تھا۔ آباجان دو جسیم مورتی کے پہلو سے ناتواں جسم کے زور سے دھکیل رہے تھے اور مورتی اپنی جگہ سے کھسک رہی تھی۔

"میں آؤں بڑے صاحب؟" قجل کی آواز کمرے میں گونجی۔

"آؤ۔" آباجان کھنکتے لہجے میں بولے۔

قجل نے اُن کے قریب جا کے ایک جانب سے مورتی پر زور لگایا۔ وہ اُس سے نہیں ہلی تو ریڈو اُس کی مدد کو پہنچ گیا۔ پھر ہم سب لیکن ہم مورتی کی وہ چٹان ایک انچ نہیں کھسکا سکے۔

"ہٹ جاؤ۔" آباجان نے کسی حد تک جھنجھلانے کے انداز میں ہم سے کہا۔ ہم نے اُن کے حکم کی تعمیل کی۔ پھر وہ خود ہی مورتی پر زور ڈالنے لگے اور ہلکے ہلکے اُن ہی گڑگڑاہٹ گونجنے لگی۔ مورتی کا ایک حصہ پیچھے دب رہا تھا اور دوسری جانب سے ایک حصہ اُبھر رہا تھا۔ سب حیران تھے۔ آباجان کی وہ سانس پھولی ہوئی تھی، نہ اُن کے تیور سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی طاقت صرف کر رہے ہیں۔ "اسے کوئی نہیں ہٹا سکتا۔" مورتی ترچھی ہونے سے اندر ایک راستہ نظر آنے لگا تو آباجان دھیمی آواز میں بولے۔

"اس میں کوئی گُر ہے بڑے صاحب!" قجل نے نرم لہجے میں کہا۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔" آباجان نے جواب دیا۔ قجل نے تکرار نہیں کی تو وہ خود ہی بولے، "تمام زینے انھی کوٹھڑیوں پر ختم ہو جاتے ہیں۔ جب راہب اپنے نفس کو کڑی آزمائش میں ڈالنے کے لیے یہاں منتقل ہو جاتے ہیں تو پھر انھیں دنیا کی کوئی آواز نہیں ستاتی۔"

"یہ تو راستہ کھوجنا مشکل ہے۔ ہر جگہ ایک جیسی سیڑھی ہے۔ آدمی کا بھٹک جانا آسان ہوگا۔ یہ تو ایک بھول بھلیاں ہیں بڑے صاحب۔"

آباجان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مورتی کے ہٹنے سے جو راستہ بن گیا تھا، ہم کوئی توقف کیے بغیر اُس کے اندر چلے گئے اور جب ہم سب دوسری طرف پہنچ گئے تو انھوں نے مورتی دوبارہ دیوار کے برابر قائم کر دی۔ وہ

آگے نہیں بڑھے۔ آگے کوئی زینہ نہیں تھا۔ غار کے اس حصے ایک تنگ گلی تھی۔ چاروں طرف سے بند کسی تابوت کی طرح۔ تابوت کی لمبائی چوڑائی محدود ہوتی ہے۔ اس کی چوڑائی محدود تھی اور لمبائی لامحدود۔ زینے کے مانند اس میں بھی صرف ایک آدمی کے گزرنے کی گنجائش تھی۔ کچھ دُور چل کے ہمیں ایک اور گلی کا موڑ نظر آیا۔ پھر ان گلیوں کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ ایک موڑ کے بعد دوسرا موڑ۔ ہر سمت وہ راستے سر اُٹھائے۔ دائیں بائیں قدم قدم پر چھوٹے راستے پھوٹتے تھے۔ آباجان جیسے آنکھیں بند کر کے ہر موڑ پر اُسی طرف جا رہے تھے۔ ایک گلی چھوڑ کے دوسری گلی میں۔ تمام راستے تیرہ و تار تھے۔ وہ کہیں رُکتے نہ انھیں کسی گلی کی شناخت میں کوئی دقت پیش آتی۔ ہر قدم پر میرا دل اُچھلنے لگتا تھا کہ اگر پیچھے غار والی مورتی دوبارہ نہ کھلی اور اگر آباجان راستہ ہی بھول جائیں تو ہم کبھی یہاں سے نہیں نکل سکتے تھے۔ گلیوں کی ہوا مسموم تھی اور دم گھٹنے سا لگتا تھا۔ آباجان جانے کن کن راستوں پر ہمیں گھماتے رہے۔ وزیر کی طبیعت پہلے ہی خراب تھی، کسی لمحے کسی کے بھی اعصاب جواب دے سکتے تھے۔ سیٹ نہ جانا تھا، بری طرح سبھی کے حلق میں کانٹے پھوٹ رہے ہوں گے۔ سب کے برے بیٹھے ہوئے تھے ورنہ بار بار دیواروں سے رگڑیں کھاتے ہوئے ہتھیلیاں چھل جاتیں۔ ذرا کہیں ہوا کا گزر ہو جاتا تو دیواریں دھکا دیتی تھیں۔ زمین پر پھونک پھونک کر قدم رکھنے سے ٹانگوں میں درد اُٹھنے لگا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ گلیاں کبھی ختم نہیں ہوں گی۔ شاید آباجان بھی راستہ بھول گئے ہیں لیکن آخر وہ اچانک ایک جگہ ٹھٹک کے رُک گئے۔ دیوار پہ روشنی پڑی تو ہم دیکھ سکے۔ ہر طرف نیلی نیلی ہری لال روشنیوں کے شرارے ناچ رہے تھے۔ ہم ایک اوسط رقبے کے ہال میں موجود تھے۔ اسے ہال ہی کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ آباجان نے دیاسلائی جلا کے دیوار پر نصب ایک مشعل روشن کر دی تو چھت اور دیواریں جگمگانے لگیں۔ جیسے ہر طرف رنگ برنگے شعلے جل رہے ہوں یا چھوٹے چھوٹے بلب۔ دیر سے اندھیرے میں رہنے کے بعد یک بارگی اتنی روشنیوں میں آ جانے سے ہماری آنکھیں خیرہ ہو گئی تھیں۔ مشعل کی روشنی کے زیر و بم کے ساتھ ستارے بھی جھلملا رہے تھے۔ کبھی سرخ کبھی سبز، فرش پر رنگوں کی لہریں سی جیسے بہہ رہی تھیں۔ وہاں ایک بدبو سی تھی، نہ کسی اور کمرے کی ہوا بھی اتنی پراگندہ نہیں تھی۔ تعفن گھٹن کی تھی۔ ہم حیرت زدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھتے رہے۔ میں نے کتابوں میں کہیں ایسے کمروں کا ذکر پڑھا تھا۔ چھت اور دیواروں میں جا بجا چھوٹے چھوٹے شیشے اور پتھر جڑے ہوئے تھے جو روشنی منعکس کرتے تھے۔ ہو سکتا ہے وہ شیشے ہیرے اور قیمتی پتھر ہوں۔ روشنی کی جھلملاہٹ سے نیند کی کیفیت طاری ہونے لگتی تھی۔ کمرے میں کوئی منفذ نہیں تھا۔ ہر طرف دیواروں میں محراب نما در بنے ہوئے تھے جو سب کے سب بند تھے اور صرف وہیں پر شیشے اور پتھر لگے ہوئے نہیں تھے۔

تھی کہ ہم پیچھے سے ان کا مسالا نہیں چھیڑ سکے تھے۔ اسی کے بل پر مسالا بھی
کہیں اٹکے ہوئے تھے اور اپنی جگہ قائم تھے مگر مسالا ہٹنے سے بیچ میں جو خلا
پیدا ہو گئے تھے ان میں بڑی کیلیں ڈالنے گاڑنے اور حرکت دینے کی گنجائش
بہرحال نکل آئی تھی۔ ہمارے پاس کدال ہوتی تو اتنا وقت بھی نہ لگتا جتنی سے
کدالیں فراہم ہو سکتی تھیں لیکن انھیں ساتھ کیسے لایا جا سکتا تھا۔

ہمیں کوئی سا پہلا پتھر نکال دینا چاہیے تھا اس لیے ہم نے اپنا
سارا زور ایک ہی پتھر پر صرف کر رکھا تھا۔ پیچھے لگا ہوا مسالا ان مسلسل کوششوں
کی تاب نہ لا سکا۔ اکھڑنے لگا۔ پہلے پتھر کے پیچھے جڑا ہوا ہی نکلے وہ
پیچھے کے پتھر پر اگرا۔ ہمارے ہاتھ اور بے قرار ہو گئے۔ ایک کے نکلنے کے
بعد دوسروں کے پیچھے لگے ہوئے مسالے پر ہماری کیلیں آسانی پہنچ سکتی تھیں
لیکن اسے اپنی طرف کھسکانا اور دوسروں سے جدا کرنا ہی کچھ کم دشوار نہ تھا۔
ہم نے اپنی کیلوں سے ہلایا۔ انگلیاں چھلنے لگیں۔ پھر ہم نے انھیں ایک
جانب اس کے زور لگوایا۔ اس کا ایک کونا سا گرنا ہی باہر نکل آتا تو وہ ہماری
گرفت میں آ جاتا۔

اسی پکڑ دھکڑ میں سلطان کی انگلی پر بری چوٹ لگی اور وہ
بلک پڑا۔ آقا جان فرش پر بیٹھے ہوئے فضل اور ہیرے سے باتیں کر رہے تھے
وہ تیزی سے اُٹھ کے ہمارے پاس آ گئے۔ سلطان نے اپنے ہاتھ کو جھٹکا
کا پورا انگوٹھی سے کچل گیا تھا۔ میں نے جھٹ اس کی انگلی اپنے منہ
میں لے لی۔ مجھے اسکول کے موتی استاد نے بتایا تھا کہ منہ کی گرمی سے
خون نہیں بہتا اور لعاب دہن اکسیر کا کام کرتا ہے مگر سلطان کو اس سے
افاقہ نہیں ہوا۔ اسے بخار آ گیا۔ فضل ہولے ہولے اس کا سر دبا رہا۔
کام رک گیا۔ مجھے اس سے بہت ندامت ہو رہی تھی حالانکہ سلطان کام جاری
رکھنے پر آمادہ تھا بلکہ اصرار کر رہا تھا۔ فضل نے ہم تینوں کو دیوار سے ہٹا دیا
اور آقا جان کی ہدایت پر بڑی کیلیں ڈھیلے ہونے والے پتھر کے پیچھے اُڑا
دیں۔ کیلیں پوری طرح بیٹھ گئیں تو اس نے انھیں زور لگا دیا تھا کہ پتھر کو
جھنجھوڑا اور اس وقت بے اختیار سب کی چیخیں نکل گئیں جب پتھر کا ایک
کونا باہر نکل آیا۔ پھر اسے سوچا باہر نکالنا دشوار نہیں تھا۔ اس کی جگہ اندر
ایک فٹ گہرا خلا ہو گیا تھا۔ دوسرے پتھروں کے پیچھے جڑوں کے مسالے
پر ضربیں لگانے کے لیے اب کوئی بڑی رکاوٹ نہیں تھی۔

دوسرا پتھر جلد ہی ہٹ گیا۔ پھر تیسرا اور چوتھا۔ تھے تو بڑے وزنی اور
فضل نکال پھینکے تھے کہ میں نے اور ہیرے نے ان کے ہاتھوں سے اوزار
لے لیے۔ سلطان نے بہت ضد کی مگر ہم نے اُسے بیٹھے رہنے دیا۔ باقی آدھے
پتھر ہم دونوں نے جتنی جلدی ممکن ہو سکتا تھا نکال باہر کیے۔ اندر کی
ادھڑی سی دیوار اب صاف نظر آنے لگی تھی۔ مجھے ٹوٹے پتھر کاٹ کر
مٹی چونا اور ریت جو چیز بھی سامنے پڑی تھی انھوں نے شاید وہ سب ملا
کے مسالا تیار کیا تھا اور اُسے پاٹ دیا تھا۔ ہم نے مختلف جگہوں پر ضربیں

مار کے اس کی پختگی کا کسی حد تک تخمینہ لگا لیا تھا۔ مسالا مضبوط تھا پھر بھی
ٹکڑوں میں جڑے ہوئے تھے لیکن اس کی کھدائی میں آگے زیادہ
وقت پیش آنے کا امکان نظر نہیں آتا تھا۔

تھکن ہماری ہڈیوں تک پہنچ گئی تھی۔ سب کی سانسیں اکھڑی ہوئی
تھیں۔ کپڑوں میں گرد و غبار جمع ہو گیا تھا اور روشنیاں بھی اس پر جم
گئی تھیں۔ نہ جانے کتنی بار پتھروں کا ریزہ ہماری آنکھوں میں پڑا تھا اسے
نکالتے نکالتے آنکھیں لال ہو گئی تھیں۔ ناک اور منہ میں بھی گرد بھری ہوئی
تھی۔ شدید پیاس لگ رہی تھی اور پانی کی وہاں کوئی صورت ہی نہیں تھی۔
ہیرا اور وزیر مسلسل کھانس رہے تھے۔ دھول نے سب کے چہروں کا
رنگ بدل رکھا تھا۔ انگلیاں جگہ جگہ سے چھل گئی تھیں اور ابھی ایک
دیوار سامنے تھی اور کوئی بھروسا نہیں تھا کہ آقا جان نے [illegible]
ہے ممکن ہے ساری محنت ہی اکارت چلی جائے۔ اس کے باوجود ہم
دیوار کی کھدائی کے لیے تیار تھے۔ چلتے وقت فضل نے مارش سے گھڑی
لی تھی۔ اس نے ہمیں وقت بتایا اور باقی کھدائی ملتوی کرنے کا اعلان
کر دیا۔ آقا جان نے اعتراض نہیں کیا۔ چار بج رہے تھے۔ [illegible]
تھا۔ ہم نے اپنے اوزار وہیں رکھ دیے۔

راستے میں ہم ایک چشمے پر منہ ہاتھ دھونے کے لیے کچھ دیر ٹھہرے
آنا تھا تاکہ ہاتھ چلتے جاتے تھے لیکن سرائے میں جانے سے پہلے
ٹھیک ہی رہنا چاہیے تھا۔ چند نظروں سے علیحدہ کر کے [illegible]
سولہ کے ساتھ وہ سب وہاں موجود تھے۔ بستر پر لیٹتے ہی [illegible]
گئیں۔ تجاویز میں دروازہ کھلا ہوا تھا۔ [illegible]
بغیر ہمارا مفر نہ تھا ممکن معلوم ہوتا تھا۔ اس وقت تک [illegible]
جب تک سرائے میں چائے کا انتظام نہ ہوگا۔ اس کے بعد [illegible]
پیچھے بستی میں آ گئے۔

ہیرے نے فضل کو بتایا تھا کہ کل [illegible]
اس سے اس کی کیا گفتگو ہوئی ہے۔ اس کے قول [illegible]
کا ذکر چھیڑا [illegible]
سوالات کیے جو فضل سے کیے تھے اور ہیرے نے تقریباً وہی جوابات [illegible]
نے سردار کو دیے تھے۔ اس نے بھی فضل کی طرح سرائے [illegible]
لیا [illegible] ان کے لیے [illegible]
سوار کی [illegible] کم وقت [illegible]
کر جب یہ سب سنا رہا تھا مجھے خیال آیا کہ اس نے [illegible]
کیوں کر کی [illegible] سولہ جیسا کوئی آدمی اس کے ساتھ [illegible]
گیا ہے اور [illegible]
ظاہر ہے سردار نے ترجمانی کے لیے ہندوستانی جاننے والے
آدمی کو ضرور طلب کیا ہوگا اور قبیلے میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں تھی

ہندوستانی سے خوب واقفیت رکھتے ہوں۔ کافی دنوں کی گمشدگی کے بعد
ہندوستان آنا جانا ان کا معمول تھا۔ سیکڑوں آدمیوں نے ہندوستان کا رخ
کیا ہوگا اور پھر نشام میرے ذہن میں یہ بات آئی ہی نہیں تھی کہ سلطان
نشام سے کون سی زبان میں بات کرتا تھا۔ سلطان پشتو نہیں جانتا تھا۔
وہ نشام کو صرف دیکھتا ہی نہیں رہا ہوگا۔ اس نے اس سے بہت سی باتیں
کی ہوں گی۔ عجیب عجیب باتیں۔ جیسے میں کون ہے اور کوئی مجھ سے کوئی
بات کرتا۔ اگر کبھی ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی آتی تھی۔ میں اسی وقت سلطان سے
پوچھنا چاہتا تھا لیکن بے فرصتی کی بات تھی۔ ہم جو تھے منہ سے آقا جان
کے پاس جا بیٹھے تھے۔ آواز تو کیا ہم نے اپنی چاپیں بھی معدوم کر رکھی
تھیں۔ بہرحال اگر نشام ہندوستانی جانتی تھی تو اس کا مطلب ہے چونٹا سا
بھی جانتا ہوگا۔ اس کے دو بیٹے ہندوستان جا چکے تھے۔ ہو سکتا ہے وہ
بھی وہاں گیا ہو اور نشام بھی گئی ہو اور کیا عجب سردار نے اسی سبب سے
جی وسا کو ہماری میزبانی کے لیے مقرر کیا ہو کہ وہ اپنے مکان میں ہمارے
درمیان ہونے والی گفتگو کی سن گن لے سکے۔ ایسا ہی ہوگا۔ فضل نے اسی
وقت ہم سب کو خبردار کرنے کے باوجود آپس میں گفتگو کرتے وقت احتیاط کی
تلقین کی تھی۔ مری ہوئی باتیں مجھ سے اوجھل ہو جاتی تھیں۔ میرا ذہن ہی
ٹھیک کام نہیں کر رہا تھا۔ جب سے آقا جان کو دیکھا تھا میرے لیے کسی کو
خیال رکھنا تھا یا کوئی دھیان ہی مجھے نہیں تھا۔ ہر وقت دل دماغ
خالی خالی۔

اسی دن ہیرے نے بھی بستی کے چوک میں دوسرے کنارے پر اپنا
سامان لگایا۔ مرد، عورتیں، لڑکیاں اور بچے جو اسی کی طرف دیکھنے لگے۔ ہمارا
سامان وہ کئی بار دیکھ چکے تھے۔ ہیرے کے پاس ہم سے مختلف سامان تھا اور
قیمتیں بھی کم لگائی۔ زردا اور وزیر جیسے ہیں بتانے کے لیے صدائیں
لگا رہے تھے۔ ادھر مارش اور سلطان نے بھی آوازیں لگانی شروع کر دیں۔
دکانوں کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ بستی کے چوک میں اچھی خاصی بھیڑ
لگ گئی تھی۔ فضل نے کل کے مقابلے میں قیمتیں اور کم کر دیں۔ ہمارے دونوں
حلقے نڈھال ہو گئے۔ اس دن بھی جی وسا کے مکان سے ہم دو ہی منٹ تک
نکلے۔ ہیرے نے خاصا سامان بیچ دیا۔ ہم نے احتیاطاً اپنے ٹھکانے نہیں
بدلے تھے۔ نہایا ہماری جھیل جیسی آنکھیں ہر اُن کی نظر پڑ جاتے۔ بازار چل جانے
کے بعد ہم اور سلطان نے بستی کے دکان داروں سے نظروں کے حلقے
پر نشانہ باندھ کر سردی سے بچنے کے لیے روغن اور کھانے پینے کی چیزیں
خریدیں اور فرمائشی خریداریاں۔ اتنی ہی چیزیں کہ انھیں گنا جا سکے۔ ہیرے نے بھی
گنگا بازار سے جی وسا کے مکان میں آ کے ہم نے اپنے ساتھ لائے
ہوئے سامان اور سکے کی اور کونوں میں چھپا لیے تھے۔ سورج غروب ہوتے
ہی چلے گئے، رات کو وہ بھی مقررہ جگہ پر مل گئے۔ جیسی
ساب بھی اُن کے ساتھ نہیں تھے لیکن وہ بتا رہے تھے کہ اُن کی

حالت پہلے سے بہت بہتر ہے۔ فضل نے ایک تبدیلی کی۔ سلطان کی زخمی
چھنگلیا کی وجہ سے اُسے سولہ کے ساتھ باہر بیٹھنے دیا۔ اس دوسرا سولہ کے
متعلق مندر کی سیڑھیوں پر بیٹھے ہوئے آدمیوں کی توجہ اپنی جانب اپنی
جانب مبذول کر رہا تھا جتنی دیر میں ہم مندر میں داخل ہوتے۔ بعض جب
انھیں اطمینان سے یقین ہو جاتا تھا کہ ہم اندر پہنچ گئے ہوں گے تو وہ اٹھ
جاتے تھے اور سرائے میں جا کے لیٹ جاتے تھے۔ سلطان اس تبدیلی پر
بہت جھلایا۔ فضل نے اس کی بات نہیں سنی۔ اس کے بجائے اس نے
زور کر ساتھ رکھ لیا۔ زور اسلطان کا ہم پلہ تھا مگر جب فضل سلطان کو
لے جانے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا تو اسے کچھ چھوڑنے میں کیا ہرج تھا۔
سولہ کے ساتھ آج ایک آدمی کم ہوتا تو سیڑھیوں پر موجود آدمی اسے پہچان
جاتے۔ سلطان نے دلیل بھی دی کہ زور آئی تھی کہ اس کی تبدیلی وہ آدمی محسوس
کر لیں گے۔ یہ دلیل بھی فضل کو متاثر نہ کر سکی۔ سالاوی جھڑکتی روشنی میں بروں
اور ٹوپیوں سے چھپتے ہوئے چہروں پر وہ اتنی نگاہ کہاں رکھتے ہوں گے۔ وہ
بستی کے عام باشندے تھے اور صرف دو تین بستی کے نہیں تھے جن میں ہم رہ رہے
تھے۔ ممکن ہے قبیلے کی دوسری بستیوں سے بھی انھیں بلایا گیا ہو گا بھی
وہ ہمیں اتنا نہیں پہچانتے ہوں گے کہ چہروں میں امتیاز کرتے۔ فضل اور یہ
لازم نہیں تھا کہ آج بھی وہی لوگ سیڑھیوں پر ہوں جو کل یا پرسوں یہاں
تعینات تھے۔

آقا جان نے کوئی دیر نہیں کی۔ اندر پہنچتے ہی ہم نے اپنا ادھورا
کام نمٹانا شروع کر دیا اور باریاں تبدیل کرتے رہے۔ دھول مٹی کی شدت آج
زیادہ اڑ رہی تھی۔ مسالے میں مٹی کی آمیزش تھی۔ مٹی ہی ہٹنے سے سب
کھدائی میں آج وقت نہیں ہو رہی تھی۔ کبھی طرح کے چھوٹے چھوٹے پتھر
مسالے میں ڈال دیے گئے تھے وہی تنگ کر رہے تھے۔ انھیں چھوڑ
کے ہم اُن کے اردگرد جمے ہوئے مسالے ہی پر ضربیں لگاتے تھے۔ اس سے
وہ خود جگہ چھوڑنے لگتے تھے۔ ہیرے کے بھائی کے باوجود زور لگا رہا تھا
ہم میں سب سے تیز بڑا ہی تھی۔ کل بلکہ ہاتھ دکھنے لگے تھے۔ آج
عجیب قسم کے بودار مسالے نے سانس لینی مشکل کر دی تھی۔

جب میری باری ختم ہوتی تھی اور میں آقا جان کے پاس آ کے بیٹھ
جاتا تھا تو میرا جسم سکڑنے اور کھنچنے لگتا تھا۔ ہر لمحے یہ دھڑکا رہتا تھا کہ
وہ کچھ پوچھ لیں گے۔ میں انھیں کیا کیا جواب دوں گا مگر آقا جان مجھے بس
دیکھتے ہی رہتے تھے۔ زبان سے کچھ نہیں کہتے تھے۔ کل بھی یہی ہوا۔ جو ادا
سلطان کی باری بھی میرے ساتھ ختم ہوتی تھی۔ شاید اسی کی موجودگی کی وجہ
سے وہ بات نہیں کرتے تھے۔ میری نظریں تو اُن کی طرف اٹھتی ہی نہیں
تھیں۔ بس ایک بار انھوں نے میرے ہاتھ ٹٹول کے دیکھے تھے۔ میرے سر
پر ہاتھ رکھا تھا۔ اُن کا دل چاہتا ہوگا کہ وہ مجھے اپنے سینے میں بھینچ لیں۔
مجھے اُن کی عادت معلوم تھی۔ جو اُن کے دل میں ہوتا تھا کسی کو اس کا پتہ نہیں

چلنے دیتے تھے۔ گھر میں ہر وقت ہم سب کا خیال رکھتے تھے لیکن جتنا پیار کرتا تھا جیسے وہ ہم سب سے ناراض ہوں۔ صرف تھی ایسی تھی جو اُن سے بیر ہے سزا لیتی تھی۔ جو اُس کا کہا کبھی نہیں ٹالتے تھے۔ تھی اُن پر ایک طرح سے حکم چلاتی تھی۔ ہمیں اگر کوئی فرمائش کرنی ہوتی تو ہم تھی ہی کے ذریعے اباجان سے کہلواتے تھے۔ گیارہ تک صبح سویرے میں اُن کے ساتھ ٹہلنے نکلتے جاتا تھا تو مجھ سے بس پڑھائی وغیرہ کے متعلق پوچھتے تھے مگر ایک دفعہ جب جہاں گیر کوٹھے سے گر گیا تھا اور بے ہوش ہو گیا تھا تو اباجان تین تین حکیم ڈاکٹر بلا لائے تھے۔ مسلسل دو راتیں اُس کے سرہانے بیٹھے رہے تھے۔ جب تک جہاں گیر کو ہوش نہیں آ گیا، وہ اُس کے پاس سے نہیں اُٹھے۔ اُن کے قریب بیٹھ کے مجھے گھر یاد آنے لگا تھا اور کبھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے میں گھر ہی میں بیٹھا ہوں اور میں بہت چھوٹا ہو گیا ہوں۔ بیچ کی دالان کے کمرے میں اماں جان پان لگا رہی ہیں۔ اباجان ٹہل رہے ہیں اور اماں انھیں سامنے جہاں کی باتیں سنا رہی ہیں۔ اب وہ گھر رہا تھا، نہ اماں تھیں۔ وہ سب خواب کی طرح گزر گیا تھا۔ شمس نے مجھے دیکھ کے اباجان بھی یہی سوچ رہے ہوں۔ کاش میں اُن کا دل پڑھ سکتا۔

کتنی گھنٹے گزر چکے ہوں گے۔ ہم نے کوئی دو وقت اندر کی دیوار کھود لی تھی۔ ابھی تک اُس میں سے کوئی چیز برآمد نہیں ہوئی تھی۔ اباجان ہی کو معلوم تھا کہ ابھی اور کتنی کھدائی کرنی پڑے گی اور ہم نے اُن سے پوچھنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی کیونکہ وہ دیکھ ہی رہے تھے۔ جب تک وہ منع نہ کریں، ہمیں کھودنا ہی تھا۔ پانی ساتھ لانے سے بہت فائدہ ہوا۔ مٹی میں گرد زیادہ ہو جاتی تھی تو ہم کلیاں کر کے منہ صاف کر لیتے تھے۔ ہم سے غلطی ہو گئی۔ کسی طرح ایک کیتلی لے آتے تو چائے بھی بن جاتی۔ خشخاش جیب میں آسانی سے چھپائے جا سکتے تھے اور چائے کی پتی بھی خشک کر کے راستے ہی میں پی جا سکتی تھیں۔ کیتلی لانا البتہ مسئلہ ہوتا لیکن اس کا بھی کوئی حل نکالا جا سکتا تھا۔ آدھی ختم ہونے پر ہم خشک میوہ لو نگلنے لگے تھے۔ ہم نے کوئی آدھ منٹ کھدائی اور کی ہو گی کہ اباجان ہمیں روک کے دیوار کا خود جائزہ لینے لگے اور اُنھوں نے چھینی ہتھوڑی اپنے ہاتھ میں لے کے فوراً آہستہ آہستہ ضربیں لگانا شروع کیں۔ وہ اتنی احتیاط سے ہاتھ چلا رہے تھے جیسے پتھر تراش رہے ہوں، کسی مورتی کے خد و خال اُبھار کر رہے ہوں یا کسی تصویر کے پرت اتار رہے ہوں۔ ہم چند منٹ تک پوری توجہ سے انھیں دیکھتے رہے پھر ہم نے انھیں بٹھا دیا اور اُن کے بتائے ہوئے طریقے پر چھینیاں چلانے لگے۔ اُن کی بات کچھ کچھ سمجھ میں آ رہی تھی۔ اباجان کو اندر کچھ نظر آ گیا تھا۔ اس خیال سے بھی کے ہاتھ پھر چھوڑ لے جاتے تھے کہ ہماری محنت رائیگاں نہیں جائے گی۔ اباجان نے صحیح دور پر نشان لگایا ہے۔ اندازہ وہیں میں یہ دوسرا دور ہے جہاں کچھ چھپا ہوا ہے۔ ہم مٹی کھرچتے، مسالا کریدتے اور پتھروں کو ہاتھ ہی سے نکالنے کی کوشش کرتے رہے۔ وہ دیوار کا نچلا حصہ تھا فرش سے کچھ اُوپر۔ بیچ جا سو اور دو دیوار پر تھے کہ زورا یکایک اُچھل پڑا۔ اباجان، بیرو، وزیر اور تجمل سب اُس کی طرف دوڑ پڑے۔ زورا کی لگائی ہوئی چھینی اندر تک چلی گئی تھی۔ یقیناً اُدھر کوئی خول تھا۔ اباجان کے کہنے پر ہم نے اُسی جگہ آہستہ آہستہ ہتھوڑیاں ماریں اور ایک سوراخ سا بن گیا۔ سوراخ میں ایک جڑی سیخ ڈال کے اباجان نے اُسے دھرا دو گھما کے دیکھا۔ سیخ کسی چیز سے ٹکرائی تھی۔ ہم نے سوراخ اور چوڑا کر دیا تاکہ ہم اندر جھانک کے دیکھ سکیں۔ پہلے اباجان ہی نے اپنی چھوٹی بیٹری کی روشنی میں جھانک کے دیکھا۔ جب وہ ہٹے تو اُن کے ہونٹ بھنچ رہے تھے اور آنکھوں میں جیسے قمقمے روشن ہو گئے تھے۔ انھوں نے بیٹری تجمل کے ہاتھ میں تھما دی۔ ہم سب نے اُسے دیکھ لیا تھا اور بیچ والے کی گنجائش کا اندازہ بھی کر لیا تھا۔ زورا نے سوراخ اور بڑا کر دیا اور اُس میں سیخ ڈال کے دیوار کو اپنی جانب زور سے جھٹکا دیا۔ کھدائی کے سبب دیوار کا ایک حصہ بہت ہلا اور کمزور ہو گیا تھا۔ زورا کے ایک ہی جھٹکے میں گر گیا اور خول میں رکھا ہوا مٹی کا ایک بڑا برتن نمایاں ہو گیا۔

سب کی سانسیں ایک دم بند سی ہو گئی تھیں۔ ایک دو سیکنڈ پہلے سے جھٹکے ہوتے لمحوں تک ہم اُسے حیرت کی نظروں سے دیکھتے رہے۔ وہ بالکل ٹھیک حالت میں تھا جیسے اُسے رکھے ہوئے چند ہی دن ہوئے ہوں۔ اُس کی شکل عجیب و غریب تھی۔ اُسے دیگچہ کہا جا سکتا تھا، نہ جار۔ گھڑے کے مانند چوڑا ہوتا ہوا وہ درمیان سے کچھ پچک جاتا تھا جیسے کسی گھڑے کا درمیانی حصہ کھینچ دیا جائے۔ اُس کی لمبائی کوئی ڈیڑھ دو فٹ کے قریب ہو اور گولائی کوئی سوا فٹ کے قریب۔ برتنوں پر بیل بوٹے اور نگ وغیرہ چسپاں کر دیے جاتے ہیں، اُس پر بھی گول شیشے اور نگینے پیوست تھے۔ جلد سفید رنگ کی تھی۔ ایسی شکل کو کسی نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ایک چپٹی تنگ ڈھکنی سے وہ بند تھا۔ کوئی نہیں بڑھا۔ سب اباجان کے منتظر تھے۔ اباجان ہی نے سب سے پہلے انگلی میں چادر لپیٹ کے اُس کی جلد پر ہاتھ پھیرا اور اُس پر اُبھرے نگینوں کو ٹٹولا۔ اُن کی انگلیاں لرز رہی تھیں۔ پھر انھوں نے ... غالباً وہ اُس کی مضبوطی کی پیمائش کرنا چاہتے تھے۔ ... احتیاط ... اُن کی تھرائی ہوئی آواز اُبھری: "ٹوٹ نہ جائے۔"

زورا نے اُسے گویا بھرنے کے انداز میں اٹھا لیا تھا۔ میں نے اُس کی مدد کی۔ ہم آہستہ سے اُسے اٹھا کے فرش پر لے آئے۔ اباجان نے نیچے چادر بچھا دی تھی تاکہ فرش کی ضرب سے اس کا کوئی کونا ٹوٹ نہ جائے۔ "ڈھکنی ہٹا کے دیکھو۔" اباجان نے حکم ...

تجمل کھڑا اور بلاد زورا نے بڑھنے کی کوشش کی۔ اُس نے ... دیا۔ میں نے کہا "ڈھکنی ہٹا کے دیکھو۔" اباجان تذبذب سے بولے
"نہیں بڑے صاحب!" تجمل نے لب ... ہیں کہ ہم کو ... کے کیا کرنا ہے۔ اس کو دیکھنا آپ کا کام ہے، ہم کو دوسرا دور بولو۔"

"دیکھیے تو اس میں کیا ہے، کیا ہے؟"

"ابھی اِدھر کیا ہوگا بڑے صاحب!"

"یقیناً ضرورت سے سوا ہوگا۔ میں اس دور سے کچھ اور توقع کر رہا تھا۔" اباجان کی آواز دھک دھک کر رہی تھی۔ "ذرا دیکھیے تو کتنا بھرا ہے۔"

تجمل نے مزید وقت ضائع نہیں کیا۔ مجھے حیرت تھی کہ اباجان اُس کا ڈھکنا خود ہی کیوں نہیں اُٹھا دیتے لیکن وہ انکسار میں پیش قدمی نہیں کرنا چاہتے ہوں گے۔ جن لوگوں نے اُسے نکالا تھا وہ اُنھی کو موقع دینا چاہتے ہوں گے۔ تجمل نے ڈھکن ہٹا کے بیٹری کی روشنی ڈالی۔ اندر سے کرنیں پھوٹنے لگیں۔ تجمل کی آنکھیں خیرہ ہو گئی تھیں۔ اُس نے فوراً بیٹری بجھا دی۔ تجمل کو بہت اندر ہاتھ نہیں ڈالنا پڑا، وہ لبالب تھا۔ ہاتھ نکال کے تجمل نے مٹھی کھولی تو اُس کی ہتھیلی پر بہت سے پتھر جگمگا رہے تھے۔ تجمل نے اپنا ہاتھ اباجان کے آگے پھیلا دیا۔ ہم سب اُنھیں دیکھنے اُس کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ تجمل کی ہتھیلی پر ستارے سے اُگ آئے تھے۔ اباجان مختلف دانے اُٹھا اُٹھا کے آنکھوں میں ڈالتے اور سر ہلاتے رہے۔

"مبارک ہو بڑے صاحب!" تجمل مسکراتے ہوئے بولا۔ اُس کے ساتھ ہم سب نے یک زبان ہو کے انھیں مبارک باد دی۔ مگر وہ چپ کھڑے رہے۔ اباجان نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ تجمل کا بازو پکڑ کے ایک نظر اُسے دیکھا اور بولے "آپ نے اسے دیکھا؟"

"ہاں بڑے صاحب!" تجمل نے متانت سے کہا۔

"اندازہ کر سکتے ہیں کہ حاکم سیاگ کے پاس کتنا بڑا ذخیرہ تھا۔ بے شک بھاگتے وقت بھی کچھ ذخیرہ اپنے ساتھ لائے تھے مگر ...... مگر وہ اتنا نہیں ہوگا۔ اس محل کی بناوٹ، اس کمرے کی سجاوٹ سے اُس زمانے میں جاگیر چھپانے کی کوشش حال کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس میں جتنے حاکم سیاگ کو جمع کیا ہوا ہوگا۔"

تجمل نے ہیرے دوبارہ برتن میں لوٹ دیے۔ "ابھی وقت ہے بڑے صاحب! اگلا دور لے لو۔"

"اگلا دور ... اگلا دور!" اباجان کہیں کھوئے ہوئے تھے۔ تجمل کی آواز پر چونک پڑے۔ "میں اسی کے بارے میں سوچ رہا ہوں اور ذہن میں کچھ تازہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ دور کے بارے میں کاغذات میں کوئی خاص وضاحت نہیں تھی یا شاید میں اُسے اخذ نہیں کر پایا ہوں۔ ایک جگہ کچھ اشارہ ملتا تھا، اُسی کی بنیاد پر میں نے ان دوروں کی کھدائی کی تھی۔ ہمارا وقت ضائع نہیں ہوا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب ہمیں ایک چھوڑ کے بعد کا دور آزمانا چاہیے لیکن آپ لوگ تھک گئے ہوں گے۔ میرا خیال ہے باقی کل پر چھوڑ دیا جائے۔"

"ابھی دم باقی ہے بڑے صاحب! ان لوگوں کا اُدھر کا پلستر ایک دم اکھڑ سکتا ہے۔ پیر لو لو!" تجمل جلدی ہو رہا تھا۔

ہم نے احتیاط سے برتن ایک کونے میں رکھ دیا تھا۔ اُسے دوبارہ نہیں دیکھا گیا۔ اباجان کی خواہش ہی معلوم ہوتی تھی کہ وہ اُسے لوٹ کے ایک بار تمام کا تمام دیکھیں لیکن تجمل اور بیرو ... نے ارادہ دبا لیا۔ پہلے دور کا تجربہ ہمیں خوب ہو چکا تھا۔ ہم نے اِدھر اُدھر چھینیاں لگانے کے بجائے ترتیب سے دیوار میں زیب ترتیب چھید کر پلستر توڑ بیٹھے ... تھا اور اندر کے پتھر ڈھلنے لگے تھے کہ تجمل نے چارپائی جانے کی اطلاع دی۔ ہم نے کام چھوڑ دیا۔ سارے دن ہم نے دیوار کے پتھر نکال لیے۔ اُس رات ہم دیر سے پہنچے۔ ... اندر کی دیوار کے پتھر نکالنے کے بعد پایا ہوا مسالا ڈیڑھ فٹ کے بیچ کھود کے اور وقت ختم ہو گیا۔ تیسرے دن ہماری محنت کامیاب ہو گئی۔ اباجان نے پھر صحیح دور پر نشان لگایا تھا۔ اندر سے دھاتوں کے کڑوں اور زیورات کا ایک بڑا ذخیرہ برآمد ہوا تھا۔ وہ سب ... کے ایک چھوٹے صندوق نما بکس میں رکھا ہوا تھا۔ سب ان زیورات کو دیکھنے لگے۔ ان میں طرح طرح کے گہنے تھے۔ ہار کے سوا ... اور بناوٹ کے زیور اس زمانے میں کہیں نہ پہنتے ہوں گے۔ مختلف ... کے ٹکڑے الگ تھے۔ اباجان نے پتھروں سے اُن کے انھیں رکھا۔ وہ سب قیمتی دھاتیں تھیں۔ پیلا دورا اباجان نے کھولا تھا۔ وہ ہم نے پہلے دور کے متعلق ہمیں کچھ نہیں معلوم ہو سکا کہ اُس میں کیا نکلا تھا لیکن دوسرے دو دوروں سے جو چیزیں نکلی تھیں وہی کچھ کم نہ تھیں۔ میں اباجان سے کہتے کہتے رُک جاتا تھا کہ یہی دو کافی ہیں لیکن کوئی اور مجھے اپنا ہم نوا نظر نہیں آتا تھا۔ دوسرے دور کے بعد انھوں نے ذرا تیسرے دور کے پلستر پر ہتھوڑیاں چلانی شروع کر دی تھیں۔ آخر انھیں اس کام میں مزہ آنے لگا تھا۔ باقی راتیں ہمیں تختے تختے ہیلیاں اور ترانے ... ہمارے ہاتھوں میں گٹھے پڑ گئے تھے مگر کوئی بھی اپنی تھکن کا دوسرے پر اظہار نہیں کرتا تھا بلکہ تقریباً ہر ایک کی یہ خواہش ہوتی کہ اس کی باری ختم نہ ہو۔ دوسرا دور کھلتے وقت ان کے چہرے خوشی سے کھل اُٹھے تھے، جیسے وہ کوئی بازی جیت گئے ہوں۔ جیسے ہی خول نظر آیا، وہ چیخ چیخ کر اباجان کو بلانے لگے۔ اباجان کے مشورے کے بغیر اب وہ ایک ہتھوڑی بھی زائد نہیں چلاتے تھے۔ سلطان کی ضد پر دوسری رات تجمل نے اُسے ساتھ لے لیا تھا۔ اب وہ بھی ... چار آدمی ہو گئے تھے۔ جمیل اور سارے ہی چلنے پھرنے کے قابل ہو گئے تھے لیکن ابھی رات تمام کو اوپر جانے اور صبح بستی میں واپس آنے کی قوت نہیں رکھتے تھے۔

اس دوران تجمل اور میر نے الگ الگ سواری کی بوری پر ایک مرتبہ اور حاضری دی تھی۔ انھوں نے اُسے منتقل کرنے کی کوئی بھی کوشش کی ہو گی مگر وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ اُسے زیادہ دیر تک نہیں

پھر ہمارے سامنے موجود تھے۔ وہ نہیں تھے تو پھر اور کون لوگ تھے۔
اگر تشام نے اپنے باپ چن رسا کو بتایا تھا کہ سلطان نے چار دن بعد اس سے بستی کی سرحدوں پر متقدس بگوڑا کے علاقے میں ملنے کو کہا ہے تو انھوں نے مزید دو دن کیوں توقف کیا۔ جہاں تشام ہمیں ملی تھی، وہیں وہ ہمارے راستے کی دیوار کیوں نہ بن گئے۔ اور انھوں نے تشام کو ہمارے ہاتھوں میں کیوں جانے دیا۔ سولم بادئی وغیرہ کے دوبارہ ہمارے ساتھ شامل ہو جانے کے بعد انھیں چوبیس گھنٹوں کا انتظار تھا۔ بستی کے قریب ہی انھوں نے ہمارے اطراف اس طرح اپنے آدمی کیوں نہیں کھڑے کر دیے۔ جامو کی طرح مجھی کو انھیں دیکھ کے فوراً ہی گمان ہوا تھا کہ تشام نے انھیں ہماری خبر دی ہوگی لیکن جلد ہی سب کو احساس ہو گیا کہ یہ محض بدگمانی ہے، ایک بے جواز شبہ ہے۔ تشام دو دن سے ہمارے ساتھ سفر کر رہی تھی، سب اس کی باتیں اس کا چہرہ جیسے بھول گئے تھے۔ اس کے چہرے پر پھولوں کی سی معصومیت اور اس کی باتوں میں بچوں کی سی سادگی تھی۔ جب کوئی اس کے سامنے سلطان کا نام لے کے چھیڑتا تو وہ بُری طرح شرما جاتی۔ دو دن سے ہم اُسے چھیڑتے رہے تھے۔ جب اس نے پہلی بار ہمارے جانے اپنی ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی میں بات کی تو سب کو حیرت ہوئی حالانکہ سبھی کو معلوم تھا کہ وہ سلطان سے اسی زبان میں بات کرتی ہوگی۔ کورا کو بھی ایسی ہی ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی آتی تھی۔ کورا کے مانند سوچ سوچ کے کوشش کر کر کے بولنا، پلکیں پٹ پٹانا، کوئی لفظ سمجھ میں نہ آنے پر گھبرانا، بے چارگی سے مسکرانا اور شرمانا۔ اباجان کو بھی اُسے دیکھ کے کورا کی یاد آ گئی ہوگی۔ سلطان نے اُسے اشارہ کیا ہوگا، بھی وہ زیادہ تر اباجان کے ساتھ رہتی تھی۔ اُن کے پہلو بہ پہلو وہ ان سے وہی ہمارے لیے شکار کیے ہوئے گوشت کا کوئی ٹکڑا پکا رہی تھی۔ تشام اپنے گھر سے ہمیشہ کے لیے وداع ہو کے آئی تھی جیسے کورا ایک رات ہمارے گھر آئی تھی۔ اباجان نے نہیں سمجھا کہ وہ واپس جانے کے لیے نہیں آئی۔ وہ تو ان کی بیٹی بننے کے لیے آئی ہے۔ وہ اُس کے سر پہ ہاتھ رکھ دیتے تو وہ اُن کی اپنی بیٹیوں سے زیادہ اُن کی خدمت کرتی۔

کمانوں اور نیزوں سے مسلح ان لوگوں کو کسی اور ذریعے سے خبر ہوئی تھی، سولم کے ساتھ آنے والے قلیوں کو ہماری منزل کا پتہ نہیں تھا کیونکہ بچل کی ہدایت کے مطابق دوسری منزل پہ انھیں بدلتے ہوئے سولم نے اُن سے ہندوستان کی طرف جانے کے لیے طے کیا تھا لیکن کچھ دور آ کے اس نے انھیں جانگ قبیلے کی طرف چلنے کا حکم دے دیا۔ سفر کی اس اچانک تبدیلی سے یہی مراد تھی کہ

قلی چلتے وقت اپنی بستی کے لوگوں کو سولم کی منزل کی غلط نشان دہی کر کے آئیں۔ بس ایک ہی بات ممکن تھی کہ بڑے مندر کے تہہ خانے سے ہمارے نکلنے کے دوسرے دن جب انھیں وہاں موجود پہرے دار نظر نہیں آئے ہوں گے تو انھوں نے ان کی تلاش کی ہوگی اور بڑے مندر کے نشیب میں اُن کی لاشیں پڑی ہوئی مل گئی ہوں گی۔ لاشیں بول نہیں سکتی تھیں لیکن اُن کی ناگفتنی صاف غمازی کرتی ہوگی کہ ہم گزشتہ رات وہاں موجود تھے۔ ہمارے سوا اُن کی موت کا کوئی اور سبب نہیں ہو سکتا چنانچہ انھوں نے ہمارا پیچھا کرنے کے بجائے سیدھے ہندوستان کے راستے کی سمت کوچ کیا۔ وہ پہاڑوں کے درمیان راستے ہم سے بہتر جانتے تھے اور گھوم کے ہم سے پہلے ہماری منزل پہ پہنچ سکتے تھے۔

بچل نے کسی کو کوئی ہدایت نہیں دی تھی لیکن ہم سب نے خود ہی اپنی اپنی جگہیں متعین کر لی تھیں۔ اگرچہ وادی کے اطراف پہاڑوں پہ ایک دائرے کی صورت میں بٹتے ہوئے ہمارے گرد گھیرا تنگ کر رہے تھے تو ہمارے نیزوں اور بندوقوں کا رخ بھی انھی کی جانب تھا۔ ہر ایک کا رخ کسی اور سمت تھا تو دوسرا کسی اور سمت۔ ہر ایک کی نگاہ اوپر اٹھی ہوئی تھی اور سب نے غیر ارادی طور پہ سمتیں اپنی اپنی نگاہوں کے حصے میں تقسیم کر لی تھیں۔ اباجان، تشام اور قلی درمیان میں تھے اور ان میں سے کسی کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ بچل نے بھی اپنے کندھے پہ لٹکی ہوئی بندوق ابھی تک نہیں اتاری تھی اور نہ اپنا تمنچا جیب سے باہر نکالا تھا۔ وادی کے نشیب کی زمین سطح نہیں تھی۔ درمیان میں ایک تیز ندی گزرتی تھی جس کے کناروں کی زمین کہیں کہیں اتنی اوپر اٹھی ہوئی تھی کہ ایک گھاٹی سی بن جاتی تھی۔ ہم نے فاصلہ کم کرنے کی غرض سے ندی کے کنارے کنارے چلنے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ منظر بھی بہت دل کش تھا۔ دھوپ نکل رہی تھی اور ندی کا چاندی جیسا پانی شور مچا رہا تھا۔ اسی شور کے سبب ہمیں اپنے پیچھے ان کی نقل و حرکت کا پتہ نہیں چلا۔ ہمارے وادی میں اترنے سے پہلے وہ اوپر کسی ایک سمت چھپے ہوئے تھے۔ جیسے ہی ہم نے وادی میں اترنا شروع کیا، وہ اطراف کے پہاڑوں پہ پھیلتے گئے اور انھوں نے اس وقت پہلا تیر پھینکا اور صدائیں بلند کر کے ہمیں اپنی جانب متوجہ کیا جب ہم وادی کے عین بیچ میں پہنچ گئے۔ نصف اُس مقام پر جہاں نشیب گہرا تھا اور ہمارے فرار کا امکان اور مقاموں کی نسبت کم ہو جاتا تھا۔ وہ ایک گھاٹی کی شکل کا راستہ تھا مگر ندی کے دونوں طرف اٹھی ہوئی زمین ڈھلوان تھی۔ اسی ڈھلوان کی وجہ سے ہم اوپر پہاڑوں طرف دیکھنے پہ قادر تھے اور وہ ہمیں دیکھ سکتے تھے۔

وادی میں کسی جگہ ندی کے دونوں کناروں پہ اٹھی ہوئی زمین ہموار ہوتی تو ہمارے بجائے وہ اُسی جگہ کا انتخاب کرتے مگر ایسا کوئی مقام وادی میں شاید کہیں نہیں تھا۔ نشیب کا یہ گھاٹی نما حصہ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ انھیں ذرا سی دیر ہو جاتی تو ہم آگے نکل چکے ہوتے۔ سب کو چند لمحوں اور چند قدموں کے اسی ایک موقع کی تلاش تھی۔ سب بچوں کے مانند ٹکٹکی باندھے بچل کی طرف سے کسی اشارے کے منتظر تھے۔ بچل تبھی کوئی اشارہ کرتا جب اُسے کسی سے کوئی رعایت یا گنجائش نظر آتی۔ ہمارے کسی بھی غلط فیصلے کی تلافی ممکن نہیں تھی۔ بچل سر اٹھائے گھوم گھوم کے انھیں دیکھتا رہا۔

یکایک ماسٹر ماسٹی کی گھٹی ہوئی چیخ پہ سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ماسٹی اباجان کو روک رہا تھا جو ہم سے کچھ کہے بغیر اچانک درمیان سے نکل کے قریب کے ایک ٹیلے کی طرف بڑھ گئے تھے۔ ان کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ اباجان کا یہ اقدام اتنا غیر متوقع اور ناقابل فہم تھا کہ سب ایک لمحے کے لیے جیسے اپنے حواس کھو بیٹھے۔ جامو، سلطان اور میں نے انھیں روکنے کے لیے بیک وقت بھاگنے کا ارادہ کیا مگر بچل کی آواز نے ہمارے قدم جامد کر دیے۔ اباجان کی رفتار میں تیزی نہیں تھی۔ ہم سے کچھ دور ایک ٹیلے پہ پہنچ کے وہ ٹھیر گئے۔ میرا دم آنکھوں میں اٹکا ہوا تھا۔ اوپر جا کے انھوں نے اپنے دونوں ہاتھ بلند کر لیے اور پہاڑوں سے اترتے ہوئے لوگوں سے اشاروں اشاروں میں کچھ کہنا چاہا اور ہمیں یہ جان کے حیرت ہوئی کہ ان کے اشاروں کے جواب میں وہ لوگ رک گئے ہیں۔ جب انھوں نے اپنے سر جھکا کے اباجان کو تعظیم دی تو ہم سب کی سمجھ میں آیا کہ اباجان نے یوں آگے بڑھ جانے کی جرأت کس اعتبار میں کی ہے۔ وہ بھکشوؤں کے لباس میں تھے۔ اپنے مخصوص حلیے کے سبب دور ہی سے وہ ہم میں سب سے الگ نظر آتے تھے۔ کھڑے کھڑے میں ہانپنے لگا تھا۔ جامو نے میرا بازو پکڑ لیا۔ "لاڈلے! ادھر جنگل سے ہو گا، نظر کو کسی ہی رکھنا۔"

"جامو بھائی! میری آواز حلق میں گھٹ کے رہ گئی۔

"لاڈلے بھائی!" اس نے میرے بازو میں اپنی انگلیاں گڑو دیں۔ "کبھی تو نے نہیں پوچھا کہ تیرے جامو بھائی نے کیسی کوئی چوٹ" میں نے پلٹ کے اُسے دیکھا۔ جامو اپنی آنکھیں جھپکانے لگا۔ اس کے ہونٹوں پہ لرزتی ہوئی مسکراہٹ رقصاں تھی۔ میرا جی چاہا کہ اس کے گلے سے لپٹ جاؤں۔ جامو نے کوہنا مار کے مجھے چونکایا اور سامنے دیکھتے رہنے کی تلقین کی۔

اباجان کے ہاتھ ابھی تک اٹھے ہوئے تھے۔ نیچے کے کھٹکے

پہ میری انگلی بھی بے حرکت تھی اور میری نگاہ سب نے اُن کے گرد ایک ہالہ سا بنا رکھا تھا اور وہ ہر لگ بھیڑ سے اِدھر سلطان نے ٹھکنے لہجے میں بچل کو مخاطب کیا: "استاد! یہ زرد پوش ہے ادھر اس کا مطلب سفید مجشتہ ہی ہے۔"

"ہتھیار چڑھا دو!" بچل نے پُرمحبل آواز میں کہا۔ "سلطان تُو آگ لگا دے۔" یہ کہہ کے وہ نیچے تلوں سے اباجان کے پاس اوپر ٹیلے پہ چڑھ گیا۔ باقی سب آگے بڑھے ہی تھے، سلطان نے قلیوں اور تشام کی مدد سے ایک مشعل میں آگ لگا دی۔ دھوپ میں اس کے شعلے مرجھائے تھے۔ تمام اوپر والوں نے اُسے دیکھ لیا ہوگا۔ صرف مشعل جلانے پہ اکتفا نہیں کیا گیا۔ اترتے وقت کے لیے بانس پہ خشک لکڑیوں کا بوجھ ہر مزدور اٹھاتا تھا۔ اُسے اتار کے اس میں بھی آگ بھڑکا دی گئی۔ اس طرح اوپر سے گھیرے آنے والوں کو ہماری طرف سے یہ پیغام نقل کر دیا گیا کہ ہم جرأت کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ سب نے بچل کی ہدایت پہ ہتھیار نیچے کر لیے تھے۔ جاتے جاتے وہ اشارہ کر گیا تھا کہ سامان نیچے چھوڑ کے ہم سب اوپر آنے کی کوشش کریں۔ ہم توقع کے مطابق منتظر تھے۔ اس کی آہستہ بدھ چلی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ اباجان کی اپیل پہ نظرثانی کرتے ارادے بدل بیٹھتے ہم نے ایک دوسرے کو نگاہوں سے ٹٹولتے مانے۔ آگ جلانے کے بعد ہم نے چند لمحوں کی تاخیر کی ہوگی کہ ایک ساتھ سب اِدھر اُدھر منتشر ہوتے ہوئے ٹیلے پہ چڑھ گئے۔ ہم نے رفتار میں کسی عجلت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ جہاں ہم زیادہ بہتر طریقے سے انھیں دیکھ سکتے اور زیادہ محفوظ انداز میں اپنا دفاع کر سکتے تھے۔ وہاں جگہ خاصی کشادہ تھی۔ پتھریلی چٹانوں میں آڑ لینے کے لیے کتنی گوشے موجود تھے۔ ہم نے دوبارہ اپنے ہتھیار اوپر نہیں کیے۔ "ابھی ان کو اور نیچے آنا چاہیے، صاحب!" بچل ٹکٹکی لیے ہیں، اباجان سے بولا۔

"اُن کی تعداد بہت زیادہ ہے۔" اباجان نے مایوسی سے کہا۔
"بچان کا ابھی اوپر آنا ٹھیک تھا۔"
"میرا خیال ہے ہمیں اُن سے بات کر کے دیکھنی چاہیے۔"
"وہ جو بولیں گے؟ وہ آپ بھی جانتے ہیں بڑے صاحب!"
"لیکن ہمارے پاس اُن کی بات سننے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔"
"ہاں بڑے صاحب!" بچل نے گہری سانس لے کے کہا۔
"شاید اپنے کو بھی بعد میں یہی کرنا پڑتا۔ یہ قدرا پہلے اُن کو نزدیک سے دیکھ لینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔"
"اُن کے پاس کثیر تعداد میں ہتھیار ہیں اور ہماری نسبت وہ زیادہ بہتر جگہ پہ ہیں۔ ایسی صورت میں ہمیں کوئی خطرہ مول نہیں لینا

چاہیے۔ بہر صورت مال مجھ لینی چاہیے۔" اباجان نے تذبذب سے کہا۔

"آپ اِدھر آرام سے بیٹھے رہیں۔ ابھی ہم لوگ اُدھر جا کے اُن سے بات کرتے ہیں۔" فیصل نے سولم، پیرو اور مجھ سے آگے بڑھنے کے لیے کہا۔

"نہیں!" اباجان تندی سے بولے۔ "اگر میری رائے آپ لوگوں کی نظر میں کوئی حیثیت رکھتی ہے تو میں آپ کو اُن کے پاس جانے کا مشورہ نہیں دوں گا۔ میں خود جا کے بات کرتا ہوں۔ آپ سے زیادہ یہ سب کچھ دیکھنے کا صدمہ مجھے ہوگا لیکن اس کا امکان ہر وقت موجود تھا۔ ہماری ذرا سی بے احتیاطی ہمارے لیے نقصان دہ ہو سکتی ہے۔ دو میں سے ایک بات کا فیصلہ ہمیں ابھی کر لینا چاہیے کہ ہم زیادہ قیمتی ہیں یا ہمارا مال و اسباب۔"

"آپ کیا بول رہے ہو بڑے صاحب!" فیصل نے بے چینی سے کہا۔

"میں درست ہی کہہ رہا ہوں۔ میری رائے میں کسی قسم کی الجھن میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ سامنے جانے میں اندیشے زیادہ منفعت کم ہیں۔ سب کچھ اُن کے حوالے کرنے کے لیے ذہن آمادہ کر لیجیے۔ اس آمادگی کے سوا کوئی اور تدبیر ہو تو مجھے بتائیے۔"

"آپ جو سوچ رہے ہیں صرف اتنا نہیں ہے۔"

"پھر کیا ہے؟"

"وہ نہیں جانتے کہ اپنے پاس کیسا سامان ہے۔ اُن کو اس کا ابھی کچھ پتہ نہیں ہے۔ وہ تو ہم کو لینے آئے ہیں۔"

"لیکن ہمارے پاس ادا کیا ہے۔ یہ سب اُن کے اطمینان کے لیے کافی ہوگا۔" اباجان نے جھلائے لہجے میں کہا۔

"بہت تھوڑا ہے بڑے صاحب! اتنے سے اُن کا بھلا نہیں ہوگا۔ ہم نے اُدھر جا کے اُن سے بولا تھا کہ ہم اُن کے کھوئے ہوئے کاغذ واپس لانے کا جتن کریں گے۔ اُن کو یہ بولے بغیر ہم ادھر اُدھر پیچھے آ جا نہیں سکتے تھے۔ مجھ کو یاد پڑتا ہے میں نے پہلی بار آپ کو سب بول دیا تھا۔ ان چھوروں کی نہیں، اُن کو کاغذ کی ضرورت ہے۔"

"لیکن وہ کاغذات ہمارے پاس نہیں ہیں۔ مجھے یاد ہے آپ نے مجھ سے یہ کہا تھا مگر آپ نے فیصل آپ کے کوئی حتمی وعدہ نہیں کیا تھا۔ بہتر ہے انھیں ہمارے سامان کی تلاشی لینے دیجیے۔"

"وہ ہم کو واپس لینے نہیں آئے ہیں۔ ہم نے اُن سے پورا وعدہ نہیں کیا تھا۔ پچھلے نو سال تک کسی نے اِدھر آ کے اُن سے ایسا بولا تھا۔ نو سال سے وہ سارے ہندوستان میں سر مارتے رہے ہیں۔ سمجھنے کی کوشش کرو بڑے صاحب!"

"میں سمجھ رہا ہوں لیکن کاغذ یہاں نہیں ہیں۔"

"یہ بات آپ مجھ سے بول رہے ہو۔ اُن کو کیسے بولا جائے؟"

"آپ اُن سے کہہ دیجیے کہ ہمارا وعدہ ابھی تک قائم ہے۔ ہم کاغذات انھیں واپس کر دیں گے۔ اگر انھیں حاصل کرنا مقصود ہے تو ہماری بات کا یقین کرنا ہوگا۔"

"آپ اُن کو اپنے ساتھ لے چلو گے؟"

"جی؟" اباجان ہچکچا کے بولے۔

"میں بولتا ہوں وعدہ پورا کرنے کے لیے آپ اُن کو اپنے ساتھ لے چلیں گے؟ وہ ایسا بولیں تو آپ کیا جواب دو گے؟"

"نہیں۔ میں ایسا نہیں چاہوں گا۔"

"بڑے صاحب!" فیصل نے نرم لہجے میں کہا۔ "آپ نے ان کو روک دیا ہے۔ ابھی آپ ادھر ٹھہرو۔ ہم جا کے اُن کو دیکھتے ہیں۔ آپ سے وہ کچھ بولیں تو ہم سے آپ اپنے کو الگ بولنا۔"

"آپ سمجھتے ہیں کہ یہ آپ کے لیے سود مند ہے تو بہتر ہے میں اُن سے یہی اظہار کروں گا لیکن آپ خود اُوپر جا کے اُن سے کیا بات کریں گے؟"

"ابھی اُدھر جا کے دیکھتے ہیں بڑے صاحب!"

"میں سمجھتا ہوں میری بات شاید وہ مان جائیں۔"

"پر آپ ایسی بات ہی کیوں بولو جس کے ماننے سے آپ کا بھرم بھی جاتا ہے۔"

"ہمیں احساس ہونا چاہیے کہ ہم سخت خطرے میں ہیں۔"

"اپن لوگ سب خطرے کی گھڑی میں ہی جنم لیے تھے۔" پیرو آگے آ کے تیزی سے بولا۔ "بڑا اپن کے راجا کے بارے آپ ٹھیک جانتے ہو گے بابا!" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرانے لگا۔ "پر اپن کو ایک دم یقین ہے راجا بھی ایسی گھڑی میں ادھر آیا ہوگا۔ آپ بالکل ٹھکانے سے بیٹھو۔ اپن نے آپ سے بولا تھا، بولا تھا کہ اُدھر سے سارا حساب چکتا کر کے آئے ہے۔"

"مگر، مگر......" اباجان نے آنکھیں بند کر لیں۔

"بڑے صاحب! آپ ادھر ہمارے ساتھ ہی رہو۔" جابر نے لجاجت سے کہا۔

"درست ہے، درست ہے۔" اباجان اُکھڑی ہوئی سانسوں سے بولے۔

دیر ہو رہی تھی۔ وہ دور کھڑے ہم لوگوں کو آپس میں باتیں کرتے ہوئے دیکھ رہے تھے لیکن ہماری آواز اُن تک نہیں پہنچ رہی ہوگی۔ ہماری جانب سے وہ جلد از جلد کسی اقدام کے منتظر ہوں گے۔ فیصل نے اباجان کی طرح چاروں طرف گھورتے ہوئے اپنے

ہاتھ اٹھا دیے۔ سولم، پیرو اور میں نے اُس کی تقلید کی۔ کچھ توقف کے بعد ایک طرف سے جواب میں ہاتھ بلند کیے گئے۔ فیصل نے پھر پہل کی۔ باقی لوگوں کو وہیں ٹھہرے رہنے کی تاکید کر کے وہ اونچی نیچی ڈنڈی پر چلنے لگا۔ جس جانب سے جواب آیا تھا وہاں سے چند آدمی بھی ہماری طرف بڑھنے لگے۔ راستے میں فیصل نے ہم سے کوئی بات نہیں کی۔ ہم تیز تیز قدموں سے درمیان کا فاصلہ کم کر رہے تھے۔ کبھی راستے درختوں اور چٹانوں کی وجہ سے کہیں کہیں وہ ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے تھے۔ ہم نے ہتھیار ہاتھوں میں نہیں اٹھائے تھے۔ آدھ گھنٹے کے وقفے میں ہم اُن تک پہنچ گئے تھے۔ اُن میں سے آگے آنے والے آدمی پیچھے رہ جانے والوں سے اتنی دور نہیں آئے تھے جتنے ہم اپنے لوگوں سے دور ہو گئے تھے۔ جو لوگ سامنے آئے تھے وہ دو ایک جیسے ہی کے آدمی تھے۔ گنتی میں پانچ۔ عمروں میں مختلف تھے مگر یکساں۔ انھوں نے کسا ہوا لباس پہن رکھا تھا اور اُن کے چہروں پر سفر کی تھکن کے آثار نہیں تھے بلکہ تازگی کھلی ہوئی تھی۔ پوری طرح چاق و چوبند اور مستعد۔ ایک جنگی سپاہی کے پاس میدانِ جنگ میں جتنے ہتھیار ہو سکتے ہیں اُن کے جسم اُن سب سے مزین تھے۔ ایک ادھیڑ عمر کا نسبتاً بلند اور تن درست و توانا شخص اُن سب سے نمایاں تھا اور ہمارا صورت آشنا تھا۔ اُس کی کمر سے ایک تلوار بھی لٹک رہی تھی۔ ہم نے اُسے قبیلے کے سردار کے خاص لوگوں میں کئی بار دیکھا تھا۔ دوسرے آدمیوں کے ملنے اور دیکھنے کا اتفاق ہمیں شاید نہیں ہوا تھا۔ صورت شکل میں تمام تقریباً ایک جیسے لگتے ہیں۔ ممکن ہے انھیں بھی ہم نے سردار کے مکان یا بستی میں کہیں دیکھا ہو۔ سب کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں چمک رہی تھیں اور ہم ہی پر مرکوز تھیں۔ اُن کے چہرے انگارا ہو رہے تھے۔ کچھ دیر تک ہم ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر فیصل نے کسی تمہید کے بغیر نرم لہجے میں پوچھا: "سردار نے بھیجا ہے؟"

سولم نے فوراً اسی کے لہجے میں ترجمانی کر دی۔

"ہاں!" ادھیڑ عمر شخص نے سپاٹ آواز میں جواب دیا۔

"سردار کدھر ہے؟"

"بستی میں ہے۔"

"ہم کو ساتھ لے جانے کو آئے ہو؟"

"ہاں!" اس نے مختصر جواب دیا۔

"اتنے بہت سے آدمی بلانے بھیجے ہیں؟"

"پیچھے اور بھی ہیں۔"

"اچھا!" فیصل نے سکون سے کہا۔ "پر کیوں؟"

"یہ ہم نہیں جانتے۔" وہ نخوت سے بولا۔

"سردار سے بولو کہ ہم اُدھر واپس آئیں گے۔ ابھی ہمارا بہت سا سامان اِدھر پڑا ہے۔ ہم نے اپنی طرف سے سردار کو جو بات بولی تھی وہ ہم کو یاد ہے۔ اُس کو پورا کرنے کی ہم کوشش کریں گے۔" فیصل نے متانت سے کہا۔

"سردار نے ہمیں ایک ہی حکم دیا ہے۔ تمھیں واپس لایا جائے۔"

فیصل مسکرانے لگا۔ "تم کو پتہ ہے، ہم نے سردار سے کیا بولا تھا؟"

"تھوڑا بہت۔" اُس نے سر جھکا کے کہا۔

"ابھی ہم کو کچھ نہیں ملا ہے۔"

"یہ سردار کو ہی جا کے بتانا۔"

"سردار سے تو ہم نے ساری بات صاف کر لی تھی۔ ہم نے بول دیا تھا کہ چار مہینے تک کدھر بھی آئیں یا کدھر بھی جائیں۔ وہ بیچ میں پڑا نہیں ڈالے گا۔ چار مہینے بعد اگر کچھ ہاتھ نہیں لگا تو اپنا کالا منہ لے کے اُس کے پاس نہیں آئیں گے۔ تم لوگوں نے نو برس میں [illegible] ہے۔ ابھی اپن ایک مہینے کے لیے کیوں اتنا سا دھا کرتے ہو؟"

"ہم سے کوئی صفائی مت کرو۔ جو کچھ کہنا ہے، جو سردار سے جا کے اُس کی وضاحت کر دو۔"

"اُدھر جانے سے نہ سردار کا بھلا ہے نہ اپنا۔ تمھارے پاس اچھا من ہے، سمجھا بھی اچھا ہوگا۔ ابھی ہمارے پاس کچھ نہیں ہے تو جا کے سردار کو کیا دیں گے۔ ہمارا راستہ کیوں کھوٹا کرتے ہو؟"

"ہم نے سردار کا حکم تمھیں بتا دیا ہے۔"

"اور ہم تم سے یہ نہیں بولیں گے کہ یہ سردار کا علاقہ نہیں ہے۔"

"تم یہ ذکر کے اچھا ہی کرو گے اور ہماری بات مان کے اور اچھا، سردار سے جا کے خود بات کر لو۔ ابھی بستی زیادہ دور نہیں ہے۔"

"چار آدمی بھیج کے سردار ہی کو ادھر بلا لو۔ ہم اُس کا انتظار کر لیں گے۔" یہ کہنے سے نہ جانے فیصل کا کیا مقصد تھا۔

اُس نے منہ بنایا۔ "ہمارے لیے سردار کا ایک ہی فرمان ہے۔"

"کوئی دوسرا نہیں؟" فیصل نے سرد لہجے میں کہا۔

"دوسرا بھی ہے۔"

"اُس کو بھی بولو۔"

"اُس کے بتانے کا وقت ابھی نہیں آیا۔" اُس نے ناگواری سے کہا۔

"تم ادھر کب سے ہو؟" غالباً فیصل کو یہ جاننے کی جستجو تھی کہ وہ پڑے منڈ کے علاقے میں اپنے چار آدمیوں کی موت کی اطلاع سُن کے آئے ہیں یا پہلے سے موجود ہیں۔ اُن کے تیور کو ترازو کرنے کے لیے یہ جاننا ضروری تھا۔

"تمھیں اِس سے کوئی غرض نہیں۔"

"خوش کیوں نہیں ہے سورماتیاں؟" معلوم نہیں سولم نے تیل کا کیا ترجمہ کیا ہو گا۔ اس شخص کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔

"تمھاری طرف سے کیا جواب ہے؟" اس کی آواز بگڑنے لگی۔

"کیا جواب دیں پیرو دادا!" قجل نے پیرو کی طرف دیکھ کے کہا۔

"ابھی کیا بولیں استاد!" پیرو کڑواہٹ سے بولا: "سالا ڈپ بے منڈ کو گام مانگتا ہے۔ اپن اتنی بات نہیں سمجھتا۔"

قجل چند لمحے چپ کھڑا رہا۔ ہمارے چاروں طرف پھیلے ہوئے آدمیوں کے ہاتھوں میں کمانیں تنی تھیں۔ ہماری ایک ایک جنبش ان کی نگاہوں کی زد میں تھی۔ وادی میں ندی کی آواز کے سوا کوئی آواز نہیں تھی۔ "اپنے لیے واپس چلنے میں فائدہ ہی لگتا ہے۔" قجل نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"ہم اپنا گھاٹا برداشت کرنے کو تیار ہیں۔ ہم تو ایک زمانے سے گھاٹے میں ہیں۔" سردار کے پیغام بر کی آواز تیکھی ہوتی سی تھی۔

"بولو پیرو دادا!"

پیرو نے قجل کو جواب دینے کے بجائے سولم سے کہا: "اس سے بولو سولم سالا سردار کو اپن کچھ جاستی پسند آ گیا ہے کیا۔ اور اپن کے بیسے ارجی مال جن کو سامنے کریں گا یا خود لپٹے گا!... اس سے بولو کا بھی اپنا کچھ آدمی اپن کے ساتھ باندھ دے۔ پھر اپن دونوں ساتھ ساتھ ہندوستان کا سیر کریں گا اور گھوم گھوم کے ردی کا کاغذ ڈھونڈیں گا۔"

ہم نے پیرو کا ہاتھ دبا کے اسے روکا۔ پیرو کے ہونٹ بھنچ کے رہ گئے۔

سولم نے اپنی طرف سے قطع و برید کر کے پیرو کی پیش کش دہرائی۔

"اس کا فیصلہ بھی سردار کرے گا۔"

"یہ پڑھی بات تو اپن کو ایک دم حکم کا غلام لگتا ہے۔"

"بالکل ہے دادا!"

"اپن اصیل بولنے کو تھا۔" پیرو چمک کے بولا۔

"تمھارے سردار کو کاغذات چاہییں یا ہم؟" قجل تھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

وہ جواب دیتے دیتے ہچکچانے لگا: "کاغذات۔"

"تو ابھی اپن اُدھر جا کے سردار سے منع بول دے تو کیا ہوئیں گا؟" پیرو نے قجل کے کچھ کہنے سے پہلے درمیان میں دخل دیا۔ "تم بھی قبیلے کا آدمی ہے۔ ایدر ہمارے ساتھ اور سب لوگ قبیلے کا ہے سب سرکا کے آگے پیچھے کی سکوت کر لو اور سمجھو کا بھی اپن کیا بولا مانتا ہے۔ کاغذ ایدر نہیں ہے۔ اپنا سامان تلاشی کرو۔ اپن اس کی جگاڑ میں اودر جا رہا ہے بابا! اپن کو بھی مال بنانے کی جلدی ہے۔" پیرو برابر اسی سے کہنے لگا: "اپن سے گھاٹا مت کرو۔ نو سال کیا، سالا نو ہزار سال تک جائیں گا سب ایک ایک کر کے سو جائیں گا۔ رہنے والا بھی

"نہیں ہونے گا۔ سولم! اس کو بولو کہ ایدر بھی تمھارا لوگ کم نہیں ہے۔ برابر ایدر بول رہا ہے اودر بھی جا کے اتنا بولے گا۔" پیرو کی زبان میں لکنت آ گئی تھی۔ "سولم! اس کو بولو کہ تھوڑی سی بھی عقل ہو تو اپنے آدمیوں سے سوچ بچار کر لو۔ اپن ایدر ہی ہیں۔ بولو کہ اپن کا فیصلہ نہیں بدلتا۔"

مجھے حیرت تھی کہ قجل اور پیرو ایسی اور اتنی باتیں کیوں کر رہے ہیں؟ بالکل فضول۔ انھیں ابتدا ہی میں اندازہ لگا لینا چاہیے تھا کہ وہ کوئی اور بات سننا نہیں چاہتے۔ مگر سولم نے احتیاط برتی تھی۔ ترجمانی کرتے ہوئے پیرو کا لہجہ منتقل نہیں کیا تھا۔ وہ رواں اور ستھرے انداز میں انھیں اس کی کہی ہوئی باتیں منتقل کرتا رہا تھا لیکن وہ سب اگر ہندوستانی نہیں جانتے تھے تو پیرو کا لہجہ ان سے چھپا ہوا نہیں تھا۔ انھوں نے ایک دوسرے کی طرف شعلہ بار آنکھوں سے دیکھا اور ان میں سے ایک معمر شخص سرگوشی کے بولا: "ہم سمجھیں تم انکار کر رہے ہو!"

"اپن سمجھیں تم انکار کر رہے ہو؟" پیرو بھڑک کے بولا۔

"دونوں کا انکار برا ہے دادا!" یکایک قجل نے دھیرے سے کہا۔

"پھر کیا... کیا ہے قجل بھائی؟" پیرو چونک پڑا۔

"سردار کی عزت تم سے بڑی ہے۔"

"مطلب تم... تم واپس جانے کو بولتے ہو کیا؟" وہ تعجب سے بولا۔

"ہاں دادا!" قجل نے مسکرا کے کہا۔

پیرو کو جیسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ وہ قجل کو مشتبہ نظروں سے گھورنے لگا جیسے اس نے جو سنا ہے وہ قجل نے نہیں کہا ہے مگر وہ قجل ہی نے کہا تھا۔ پیرو کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

جب قجل نے سولم سے کہا: "بولو کہ چلیے۔ یہ اب کاغذ کا دھیان چھوڑ دو۔ اب تمھارا باپ ان تک نہیں پہنچ سکتا۔ بولو کہ سالے نے کاغذ تیج میں ڈال کے اپنا وعدہ توڑ دیا ہے۔ ہم بھی اب اس کے پابند نہیں ہیں کہ کاغذ کو بھول جاؤ۔ اُدھر سردار نے اس کا نام تم میں سے بہت سے بھول گئے جب اس نے ہم کو توڑنے کے لیے اپنے آدمیوں کو انگوٹھا دکھا کے بیٹھک کرائی تھی اور ہم نے اس کو بولا تھا کہ اپنے کو اکیلے جانا ٹھیک نہیں لگتا جتنی تمھاری زیادہ رہے گی۔ ہم تو اُدھر اپنے ٹھکانے سے سرکا کے اُدھار جان کے چلے تھے۔"

سردار کا پیغام بر فوراً کوئی جواب نہیں دے سکا۔ وہ نہ اس کا کوئی ساتھی۔ انھیں بھی پیرو کی طرح جیسے قجل کی بات پر اعتبار نہیں تھا۔ کئی لمحے گزر گئے۔ وہ چپ کھڑے اضطراری نگاہوں سے ہمیں تکتے رہے۔ پھر سردار کے پیغام بر نے سٹ پٹاتے ہوئے کہا: "تم نے

ٹھیک فیصلہ کیا ہے۔"

"تو بھی کیا ہے تم سے اس نے نمٹا نہیں لگتا ہے۔"

"اپنے ہتھیار اتار دو۔"

"تھوڑی دیر میں بولنا 'اپنے کپڑے اتار دو۔'"

"سردست ہتھیار ہی اتار دو۔"

"ہاں ہاں" قجل کے نتھنے پھولنے لگے۔ "ہتھیار بھی اتار دیں گے بلا! اپنے لیے پھر کیا چوڑیاں لائے ہو۔ بولو گے تو ان کو بھی پہن لیں گے پر تمھارے پہننے کے بعد۔"

"ہم کہتے ہیں اپنے سارے ہتھیار ہمارے حوالے کر دو۔"

"تم بھی ایسا کرو گے تو اپنے کو کیا اعتراض جاتا ہے۔"

"ہم... ہم ایسا نہیں کر سکتے۔"

"اُدھر تمھارے ساتھ یہ سب ہتھیار کے جتنے ہیں کیا! ایک بار ہم سے کرا دو تو سالا پھر کبھی نہیں لائے گا۔ دادا! سنا! ہتھیار اتارنے کو بولتے ہیں۔"

"اپنے کو سالے الّو کا پٹھا سمجھتے ہیں۔" پیرو پھنکارتے ہوئے بولا۔

"تمھارے ہتھیار ہمارے پاس محفوظ رہیں گے۔ سردار کے پاس جا کے یہ تمھیں واپس مل جائیں گے۔" ان میں سے ایک نوجوان تیزی سے بولا۔

"اور تمھارے اپنے پاس؟"

"اس کا مطلب ہے تم انکار کر رہے ہو۔ تم چلنا نہیں چاہتے۔"

"ہم نے جو بول دیا ہے اتنا ہی ٹھیک ہے۔"

"چھوڑو قجل بھائی! یہ سالا گدھے کی دم ہے۔" پیرو نے تلملا کے کہا۔ "سولم! ابھی اس کو بولو کہ فیصلہ کرے۔ اپنے کو جانا مانگتا ہے تو ہتھیار کے سنگ۔ اپن سالا قبیلے سے سردار کی ماں بھگا کے نہیں لایا ہے۔ ایدر ایک چھوکری اودر کی اپنی مرضی سے آئی ہے۔ مرضی بدلے تو لوٹ جائے۔ اپن نہ ایدر کا آدمی ہے نہ سردار کا۔ کھاتا ہے۔ سالا ایک کے بدلے ڈن ڈن بھرے ہے۔ پھر بولتا ہے ہتھیار نکال دو، پھر بولیں گا آنکھ الگ کرو، کان الگ کرو۔" پیرو منہ چڑا کے بولا۔ "سوری بولتا ہے۔ قسم سے ابھی استاد بادشاہ کا خیال ہے۔ اپن کا خون بہت گرم ہے۔"

وہ تنافس کے ذکر پر ایکدم سے کے لیے چونکے تھے۔ شاید ان کے لیے یہ اطلاع نئی تھی مگر انھوں نے پلٹ کے نہیں پوچھا کہ قبیلے کی کون سی لڑکی ہمارے ساتھ آئی تھی۔ تاہم ان کے چونکنے سے اندازہ ہوتا تھا کہ بڑے منڈ کے تہہ خانے سے ہمارے نکلنے اور تنافس کے ساتھ ہونے سے پہلے انھوں نے یہاں پڑاؤ ڈال دیا تھا۔ انھیں یقین ہو گا کہ اگر ہمیں ہندوستان کی طرف جانا ہے تو ہم اس جگہ

سے ضرور گزریں گے۔ پیرو نے کہا تھا کہ وہ چاہیں تو ہمارے سامان کی تلاشی لے لیں۔ انھوں نے اس پر توجہ نہیں دی۔ وہ مطمئن ہو کے آئے تھے کہ ہمیں بستی واپس لے کے جائیں گے اور سارا سامان بچشم خود کھنگال ڈالیں گے۔ یہ کام وہ بستی میں جا کے بھی کر سکتے تھے۔ پیرو کہہ رہا تھا کہ ہم کوئی مجرم نہیں ہیں جو ہتھیار اتار کے چلیں۔ انھوں نے بحث نہیں کی کہ وہ کہہ سکتے تھے کہ پھر بستی سے کوئی اطلاع دیے کسی سے کچھ کہے بغیر ہمیں لیل غائب ہو جانے کی کیا ضرورت تھی۔ اطلاع دینے میں کیا عذر تھا؟ یہ کوئی منظم پروگرام ہی ہو گا۔ دوسرا قافلہ بھی ہمارے ساتھ تھا جسے ہم نے اپنے جانے سے تین دن پہلے بستی سے روانہ کیا تھا۔ پیرو اور قجل نے سردار کے سامنے خود کو دو قافلوں کے محافظ پیش کیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے آگے پیچھے تھے۔ اب وہ دونوں ساتھ تھے۔ ہزار قسم کے وہمے ان کے ذہن میں گردش کرنے لگے۔ کاغذ کی متبرک حیثیت کے علاوہ ان کے بارے میں اور بھی بے شمار روایتیں مشہور تھیں۔ ہر چند کوئی بات واضح نہیں تھی۔ اس سلسلے میں ان کا علم سنی سنائی باتوں سے زیادہ نہیں۔ فدائی بھی خزانے کی روایت بھی ان میں سے ایک ہوگی۔ اشاروں کنایوں میں انھوں نے اس کا تذکرہ بھی کیا تھا مگر وہ یقیناً بڑے منڈ کے تہہ خانے میں چھپے ہوئے عظیم الشان خزانے کے متعلق کچھ نہیں جانتے تھے۔ کبھی انھوں نے ان کاغذات کی تحقیق کی باقاعدہ کوشش ہی نہیں کی تھی یا ایک تو وہ انھیں چھوتے ہوئے ڈرتے تھے! پھر وہ ان کے رموز جاننے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے۔ ممکن ہے کبھی کسی نے ان کی تحقیق کی جرات کی ہو اور قبیلے میں فساد کے خوف سے خاموش رہا ہو۔ اگر کبھی ایسی کوئی کوشش کی گئی تھی تو اس کا علم چند لوگوں تک محدود رہا ہوگا جن کے ہاتھوں میں قبیلے کو سردار کہا جاتا تھا۔ اس زمانے میں ان کے آبا نے ہو سکتا ہے کوئی رمز دریافت کر لی ہو جس کا علم کرنے کے بجائے بھی ہو گیا ہو اور اس نے محض اسی سبب سے اپنے بڑے بھائی کو راستے سے ہٹا دیا ہو اور تہہ خانے کاغذات اور کرنے کے اس کی دسترس سے دور ہو گیا۔ بہرحال کاغذات سے متعلق ان گنت روایتیں قبیلے میں ہماری آمد اور ہمارے متضاد طرز عمل کے پیش نظر وہ ہمارے بارے میں ان گنت قیاس آرائیاں کرنے میں حق بجانب تھے مگر وہ شخص جو ادھر اُدھر الجھنے کے بجائے بس اپنا مقصد سامنے رکھتا تھا کہ وہ کسی طور ہمیں سردار کے سامنے زندہ پیش کر دیں۔

پیرو اور قجل کی زبانی ہتھیار اتارنے سے صریحاً انکار سن کے وہ آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔ ادھیڑ عمر شخص جو ان میں سب سے سمجھ دار تھا ہمارے ہتھیار ہمارے ساتھ رکھنے پر آمادہ نہیں تھا مگر اس کے دوسرے

ساتھی اُس کے ہم نوا نظر نہیں آتے تھے۔ اِس دوران پیرو بڑبڑاتا رہا۔ جُھل نے اس کی گرم جھپک کے آگے کسی طرح چُپ کیا اور ہم سب اُن کے فیصلے کا انتظار کرنے لگے۔ اب کوئی اور انتخاب باقی نہیں رہ گیا تھا۔ ہتھیار چھن جانے سے ہماری تعداد نہ ہونے کی برابر رہ جاتی۔ جُھل، پیرو، سولم اور میں چاروں اُن کی آمادگی کی صورت میں اپنے تمنچے اور چاقو نکالنے کے لیے مستعد تھے اور ہمیں اندازہ تھا کہ ہماری کسی بھی حرکت پر ایک لمحے میں چاروں طرف سے تیر برسنا شروع ہو جائیں گے۔ تیر چلنے کی نوبت آئی تو ہم میں سے کوئی بھی زیادہ دیر تک نہیں ٹھیر سکتا تھا۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ ایک ہاتھ میں تمنچا، دوسرے میں چاقو لے کے جھپٹ اُن کے غول میں گھس جاؤں گا۔ وہ اپنے آدمیوں کو اشارہ کرنے سے پہلے ہمارے جواب کا انتظار ضرور کریں گے۔ اسی مہلت میں ہم اُن پر جھپٹ سکتے تھے۔ جُھل، پیرو، سولم نے بھی یہی سوچ رکھا ہوگا۔ اس موقع پر تمنچے سے کارگر کوئی اور ہتھیار نہیں ہوگا۔ پیچھے ابّا جان کے ساتھ کھڑے ہوئے ہمارے سارے آدمیوں کی نظر ہم پر ہوگی۔ وہ اب ایک ٹیلے پر تھے اور اُن کی بندوقیں اوپر کھڑے ہوئے لوگوں کا نشانہ لے سکتی تھیں۔ وہ آخر دم تک نشانے لگاتے رہیں گے اور کسی کو بھی کسی حیران کن نتیجے کی توقع نہیں ہوگی۔ ہم کتنی گولیاں چلا سکیں گے۔ ہمارے پاس کارتوس یقیناً اُن کی تعداد سے بہت زیادہ تھے مگر انھیں استعمال کرنے کا موقع مناسب نہ تھا۔ یوں بھی اُن کے ساتھ جانا تھا لیکن ہتھیاروں کے بغیر زندہ جانا بھی مُردوں کے مانند جانا تھا۔

ہتھیار اُن کے حوالے کرنے تھے تو چہرے ہونے ہی کیوں، بندوقیں اور کارتوس خالی کر کے اور خنجروں چاقوؤں کی دھار کند کر کے ہی کیوں نہیں۔ ایک پل دو پل کی دیر تھی۔ میں نے پیچھے مڑ کے پیچھے کھڑے ہوئے ابّا جان کی طرف دیکھا۔ اُن کا سر جھکا ہوا تھا۔ میرے لیے دعا کر رہے ہوں گے۔ کچھ پتہ نہیں تھا کہ پھر اُن کا چہرہ دیکھنے کو وقت ملے گا یا نہیں۔ آنے والی گھڑی کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اگر مجھے ابّا جان سے دو باتیں کرنے کا موقع مل جاتا تو میں اُن سے زرّین نیساں شہر لانے کے لیے کہتا اور اپنی بنڈی میں رکھی ہوئی چیک بک اُن کے حوالے کر دیتا۔ مجھے امید تھی کہ وہ ابّا جان پر ہاتھ نہیں اُٹھائیں گے لیکن اُن کی موجودگی میں ابّا جان میری لاش کو بھی اپنے سینے سے نہیں لگا سکیں گے۔ اُن چند لمحوں میں نہ جانے کیسے کیسے خیال آئے کہ میرا سارا وجود لرز گیا۔ کچھ دیر پہلے پیرو نے ابّا جان سے کہا تھا کہ میں خطرے کی کسی گھڑی میں پیدا ہوا ہوں گا۔ خطرے کی نہیں تو وہ نحوست کی گھڑی ضرور تھی۔ میرا وجود ہی نحس تھا۔ سب ایک آدمی کے سبب سے تھا۔ وہ نہ ہوتا تو اتنے لوگ اِس دور افتادہ اجنبی جگہ پر یوں زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا نہ ہوتے۔ کاش عدالت میں تین آدمیوں کے قتل پر ابتدا ہی میں موت کی سزا مل جاتی۔ کتنے ہی تیر اُس کے جسم کے لیے کھلے تھے۔ کوئی ایک اُن میں سے لگ جاتا تو یہ وقت نہ آتا۔ معلوم نہیں وہ چند آدمی دنیا سے کیوں نہیں اُٹھ جاتے جو خود بھی زندہ نہیں رہتے، دوسروں کو بھی چین سے نہیں رہنے دیتے۔ قریب جُھل پُرسکون انداز میں کھڑا تھا۔ پیرو بھی بظاہر مطمئن نظر آتا تھا۔ اندر ایک طوفان بپا ہوگا۔ اُس کی بیٹی گیتا اور بیوی کی پرچھائیاں آنکھوں میں لرز رہی ہوں گی۔ کاش وہ سب مل کے پہلے مجھے مار دیتے۔

ادھیڑ عمر شخص اپنے ساتھیوں سے مشورہ کر کے جیسے ہی ہماری طرف متوجہ ہوا، پیرو کے ہاتھ تیزی سے اپنی جیبوں کی طرف لپکے لیکن ہتھیار باہر نکالنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ ایک لمحہ جاتا تھا کہ پیرو کے تمنچے کی گولی اُس کے سینے میں پیوست تھی۔ اُس نے سر کی جنبش سے اپنے اقرار کا اظہار کر دیا تھا۔ کسی تاخیر کے بغیر پھر اُس نے اونچی آواز میں یہی حکم دیا۔

جُھل اور پیرو پھر ایک پل کے لیے بھی اُن کے سامنے نہیں ٹھیرے۔ چپ چاپ ٹیلے پر آ گئے جہاں سب ہمارے منتظر تھے اور یہ جاننے کے لیے مضطرب کہ ہم کیا طے کر کے آئے ہیں۔ شاید وہ کسی معجزے کی توقع کر رہے تھے۔ جُھل نے اُن سے سامان اُٹھانے اور چلنے کے لیے کہا تو اُن کی گردنیں ڈھلکنے سی لگیں مگر انھوں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ کوچ کا رُخ فوراً موڑ دیا گیا۔ جانگ قبیلے کے سارے آدمی اوپر ہی رہے اور اطراف سے ایک جانب سمٹنے لگے۔ وادی سے نکلتے ہی وہ ہمارے ارد گرد ہو گئے۔ انھوں نے خود کو مختلف گروہوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ کچھ لوگ ہمارے آگے تھے، کچھ پیچھے، کچھ دائیں بائیں۔ کچھ ہم سے قریب تھے لیکن وہ جو قریب تھے اُن کے ہاتھوں میں تیر تھے۔ دور چلنے والوں کے ہاتھوں میں کمانیں تھیں۔ ابّا جان اور تشام ہمارے ساتھ ہی تھے۔ ایک بزرگ شخص نے ابّا جان کے پاس آ کے انھیں الگ ہو جانے کی پیش کش کی تھی۔ ابّا جان نے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا کہ ایسے حالات میں وہ اُن لوگوں سے جدا ہونا مناسب نہیں سمجھتے جن کی رفاقت میں انھوں نے سفر کا آغاز کیا تھا۔ ہمارے ہمراہ اُن کی واپسی کا جواز موجود تھا۔ اِن دشوار گزار راستوں میں تنہا سفر کرنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔ ہمارے لوٹنے کے بعد ابّا جان اکیلے سفر نہیں کر سکتے تھے۔ انھیں راستے میں کسی دوسرے قافلے کی ہم رکابی کے منتظر بھی ہمارے ساتھ واپس چلنا تھا۔ بھکشو یا

تاجروں کے قافلوں کی سفری رفاقت کوئی نئی بات نہیں تھی۔ سفر کی دشواریاں کم کرنے کے لیے کبھی تاجر بھکشوؤں کے قافلے کے ساتھ ہو جاتے تھے، کبھی بھکشو تاجروں کے ساتھ۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے ہمارے ہمراہ ابّا جان کی موجودگی پر کسی شبہے کا اظہار نہیں کیا تھا۔ قریب آ کے انھوں نے تشام کا چہرہ بھی دیکھ لیا تھا۔ وہ تو اسے بُرا بھلا کہا، نہ ابّا جان کی طرح اُسے ہم سے جدا ہونے کی پیش کش کی۔ جب سب بستی ہی کی طرف جا رہے تھے تو تشام اِدھر سے یا اُدھر، بات ایک ہی تھی۔

اتنے بہت سے مردوں کے درمیان تشام صرف ایک لڑکی تھی۔ واپسی کا سُن کے اُس کے سُرخ و سفید چہرے پر زردی سی چھا گئی تھی۔ لگ رہا تھا جیسے اُس کا خون سوکھ رہا ہو۔ جُھل نے اُسے ایک یاک پر بٹھا دیا تھا مگر اُس کے بدن کی لرزش کم نہ ہوئی۔ سلطان اُس کے قریب ہی تھا اور سرگوشیوں میں اُسے بار بار جانے کیا تسلّیاں دلا رہا تھا۔ پھر جُھل بھی اُس کے پاس پہنچ گیا اور اُس نے تشام کا ہاتھ تھام کے اُس کے بدن کو ہلکے ہلکے جھٹکے دیے۔ مسکراتے ہوئے بولا "یہ رنگ کہاں چلتی ہے۔ وہ لال رنگ ہی تیرے کو اچھا لگتا ہے۔"

تشام کے ہونٹ لرزنے لگے۔

"نا، نا" جُھل اُس کی ہتھیلیاں چومتے ہوئے بولا "تیرا کیا ہے، تو تو اِدھر ہی ہے۔ بستی تک ساتھ جانا۔"

تشام نے اُسے ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھا۔ دو دنوں سے وہ گُم صُم تھی۔ جُھل نے اُسے پہلی بار مخاطب کیا تھا "تُو تو بہادر ہے اور گھر سے بچھڑ کے رستہ بھی چھوٹا نہیں تھا۔ جب [illegible] نہیں، دیا اب کاہے کو دھواں ہے۔ سمجھی؟ ایسے رُت بُری کبھی نہیں گئی" وہ ہنس کے بولا "یہ رُت پھیر تو ساری زندگی اچھے سے گزار لے گی۔ جیسا لے کے آئی تھی دیا۔ سمجھی جا؟"

پتہ نہیں تشام کی کچھ سمجھ میں آیا یا نہیں مگر دیکھتے دیکھتے اُس کا اُڑا ہوا رنگ واپس آنے لگا۔ اُس کا مرجھایا ہوا بدن جیسے پھر سے کھلنے لگا۔ سہ پہر ہو گئی تھی۔ ابھی ہمیں وادی سے چند میل آگے نکلے ہوئے کیا ہوگا۔ اندھیرا گہرا نہیں ہوا تھا کہ انھوں نے اچانک سفر ملتوی کر دیا۔ وہ ایک کشادہ اور ہموار جگہ تھی۔ قریب ہی پڑاؤ کے لیے کوئی جگہ ملنی مشکل ہوگی اسی لیے انھوں نے یہیں ڈیرہ ڈال دیا۔ اُن کے ساتھ باربرداری کے لیے بیس کے لگ بھگ یاک تھے۔ باقی سامان بڑے بڑے تھیلوں میں اُن کی پیٹھ پر لدا ہوا تھا۔ وہ فاصلے فاصلے سے ہمارے ارد گرد مختلف مقامات پر جم گئے تھے۔ اندھیرا ہوتے ہی انھوں نے مشعلیں روشن کر دیں اور الاؤ جلا دیے۔ اُن میں سے چند لوگ ہماری پہرے داری چھوڑ کر کھانا تیار کرنے کے کام میں مصروف ہو گئے۔ جامو اور پیرو نے صبح صبح کئی پرندوں کا شکار کیا تھا لیکن انھیں ہم نے محفوظ رہنے دیا۔ سولم نے اُن سے پوچھ لیا تھا کہ وہ ہمارے لیے بھی کھانا تیار کر رہے ہیں یا نہیں۔ وہ منع نہیں کر سکے۔ ہم تینوں خیمے نصب کر کے اور بستر لگا کے لیٹے رہے۔ سردی بڑھتی جا رہی تھی۔ انھوں نے اِدھر اُدھر کئی چھوٹی بڑی چھولداریاں کھڑی کر لی تھیں اور ہمارے خیموں کے باہر متعدد آدمی پھیلا دیے تھے۔ جب تک انھوں نے کھانے کے لیے آواز نہیں دی، ہم باہر نہیں نکلے۔ سارا جسم ٹوٹ رہا تھا اور بخار سا محسوس ہو رہا تھا۔ انھوں نے وافر کھانا بھیجا تھا۔ کسی کو بھوک ہی نہیں تھی۔ سب نے ایک دوسرے کے خیال سے تھوڑا بہت حلق سے اُتار لیا۔ ابھی رات کا ابتدائی پہر تھا۔ کھانا کھا کے ہم کچھ دیر ہی باہر ٹھیرے، پھر اپنے اپنے خیموں میں آ کے پڑ گئے۔ جُھل نے سب کو تاکید کی تھی کہ پوری رات آرام سے سوئیں مگر سب آنکھیں کھولے کروٹیں بدلتے رہے۔ کسی کے پاس دوسرے سے کہنے کے لیے شاید کچھ نہیں تھا۔ باہر الاؤ کے گرد بیٹھے ہوئے لوگوں کے گانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ جُھل، ابّا جان، تشام اور سولم الگ خیمے میں تھے۔ میں، جامو، مادی، زدوا اور جینی دوسرے میں۔ تیسرے میں پیرو، سلطان، چلنو، جلاکو اور دو قلی تھے۔ تیسرا قلی جُھل کے خیمے میں تھا۔ سب قریب قریب تھے۔ کوئی زور سے بات کرتا تو دوسرے خیمے کے لوگ سُن سکتے تھے۔ رات گزرنے پر ہم سب نے باری باری خیمے کی جھریوں سے جھانک کے دیکھا۔ اتنی سخت سردی میں وہ باہر ہی موجود تھے۔ نہ جانے انھوں نے چھولداریاں کیوں نصب کی تھیں۔ کھانے کے دوران ایک شخص نے آ کے ہمیں متنبہ کرنا ضروری سمجھا تھا کہ فرار کی کوشش ہمارے لیے انتہائی عبرت ناک ہوگی۔ آگے کی منزلوں پر بھی اُن کے قبیلے جانگ قبیلے کے گروہ موجود تھے۔ سب سُن کے خاموش رہے۔

جیسے جیسے رات بڑھتی گئی، سردی میں اضافہ ہوتا گیا۔ میرا خیال تھا کہ سردی سے گھبرا کے وہ آخر کار چھولداریوں میں پناہ لیں گے لیکن جُھل کے ذہن میں ہو کہ اُس لیے باہر نکلنے کی ہم کوئی کوشش کر سکتے ہیں اور بارش ہو گئی تو لازماً انھیں اندر گھسنا پڑے گا۔ الاؤ بھی بجھ جائیں گے، مشعلیں بھی گُل ہو جائیں گی۔ آسمان صاف تھا۔ کہیں کہیں بادلوں کی ٹکڑیاں ستاروں اور چاند پر چھا جاتی تھیں۔ بارش کا امکان نہیں تھا مگر کسی وقت بھی بارش ہو سکتی تھی۔ یہاں ایسا ہی ہوتا تھا۔ اچانک بادل گھر کے آ جاتے اور موسلا دھار پانی برسنے لگتا لیکن جس طرح وہ بارش میں باہر

کا سالا کوشش کرتا رہا۔ کچھ وکیل کے زور مارنے سے جامنی بائی کو
صرف ۵ برس کا حکم ہوا۔ پانچ برس میں ابھی چار برس کا تھا کہ جیل
سے چھوٹ کے پھر داور آگیا اور طوفان داوا کے باڑے پر آ کے ہی
جم گیا۔ سالا کی عمر بھی کم تھا۔ چار برس بندی کے بعد بھی چھوکرا ہی
لگتا تھا جیسے اُودر سالا ابھی شیشے کے سامنے بیٹھا رہا ہو۔ جیل سے
جلن کو لپا تیر کمان بنائے ہوئے نکلا تھا۔" پیرو کی آواز بہکنے لگی اور
وہ بولتے بولتے گم سا ہو گیا۔ سب انتظار کرتے رہے۔ چند ثانیوں
کی خاموشی کے بعد پیرو خود ہی بولا۔" کیسا شکیلا سے بولے تو جوان
تھا سالا بھی۔ اتنا تھا کہ باڑے کے سارے آدمی کو تھرتھری لگ جاتا۔
کسی نے اونچا بوم مارا۔ اُس کو سالا کے لیے بٹھا دیا۔ گیرے اور
نیلے رنگ کے سوا دوسرا کلر کا ساڑی نہیں پہنتا تھا۔ ایک دن داور کے
آزو بازو باڑوں کے داداؤں کو موت مانگتا تھا تو وہ اُودر جامنی
بائی کے باڑے کو اُن کا منہ پھیر دیتا تھا جس نے جامنی بائی سے
محل کیا اپنے آپ سے قتل کیا۔ جامنی بائی بھی خود سے کسی باڑے
میں نہیں گیا۔ وہ اُودر اپنے کو بند رکھتا تھا۔ پر دادا لوگ ایک عورت
کا ٹسن کے اپنی خواری سمجھتا تھا۔ اُس ٹیم داور کے بازو میں جانگڑی
دادا کا بہت مشہوری تھا۔ اُس کو لوگ بلڈ آگ بھی بولتے تھے۔ جامنی
بائی نے کچھ نہیں بولا تھا کہ جانگڑی نے آدمی بھیج کے بولا" اپن سے
شادی بنا لو۔ تم رانی اپن راجا۔ دونوں کا باڑا مل جائیں گا۔ جامنی
بائی جانگڑی کے آدمی کی بات سنتا رہا پھر اپنے ہاتھ کی چوڑی
اُتار کے بھیج دیا۔ جانگڑی سمجھ گیا کہ ابھی جامنی بائی کا کیا مطلب
ہے۔ چاقو اُس کے ہاتھ میں پڑا تھا۔ آنکھ کا گرم اور دل کا جوان تھا
بولا" اپن آتا ہے تیار رہو۔ ابھی لال کلر کا ساڑی پہننا۔ جامنی نے
جواب بولا۔ کبھی آؤ اپن ایدھر ہی ہے۔ دوسرے دن جانگڑی ہار پھول
لے کے گیا تھا۔ جامنی نے لال کلر کا ساڑی پہن رکھا تھا۔ ہار پھول
لے کے ایک طرف رکھا۔ جانگڑی کے آگے چاقو پھینکا اور سامنے
آگیا۔ جانگڑی نے چاقو اٹھا لیا۔ پیچھا اور دس بارہ ہاتھ سے جاسکتی
نہیں چلایا تھا کہ بازو پر نشان ڈال کے گر گیا۔ جامنی بائی کھڑا رہا۔
اُودر جانگڑی کا سارا آدمی بھی یہ تماشا دیکھتا تھا۔ جانگڑی نے پیچھے
چاقو اٹھایا۔ سب سمجھے کہ جامنی بائی پر پھینکے گا۔ پر جانگڑی نے
اُس کو اپنی چھاتی میں اُتار لیا۔"

پیرو کہہ رہا تھا کہ جامنی بائی نے جانگڑی کی آخری خواہش
کے طور پر لال رنگ کی ساڑی پہنی تھی۔ سب کی آنکھیں پیرو کی
طرف مرکوز تھیں۔ پیرو چپ ہو جاتا تو وہ مچلنے لگتے۔ پیرو کو اس
کی بہت سی باتیں یاد تھیں۔ ناقابل یقین باتیں۔ وہ اس کے چاقو
چلانے اور داؤ پیچ کے انداز بتا رہا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ بظاہر وہ ایک
سیدھی سادی سی عورت لگتی تھی مگر جب چاقو اٹھاتی یا سامنے کوئی
آتا تو بالکل بدل جاتی۔ آنکھوں میں انگارے سے دہکنے لگتے۔ چہرے کا
جامنی رنگ سرخ ہو جاتا اور بدن پھڑکنے لگتا۔ پیرو کہتا تھا کہ اُس کے
داؤ تو اُس کی آنکھوں کے تھے جسے نظر بھر کے دیکھ لیتی اپنی چال
بھول جاتا۔ ہاتھ اٹھاتی کہیں تھی مارتی کہیں تھی کوئی اُس کے داؤ کو
پہلے سے تعین نہیں کر سکتا تھا۔ سامنے آتے ہی ہرن کی طرح چوکڑی
بھرتی۔ اُسے بجلی سے بدلتے اور جھپٹ کے وار کرنے کا ہنر حاصل
تھا۔ سب سمجھتے تھے کہ وہ کوئی جادو کرتی ہے لیکن اُسے تقریباً تمام
داؤ آتے تھے۔ تیز، بلم، چاقو وغیرہ اور خالی ہاتھ کے داؤ۔ اتنی کم عمری میں
اُس نے نہ جانے یہ سب کچھ کہاں اور کیسے سیکھا تھا۔ عمر تو اُودھیڑ پنے
تک محدود رہتی تھی۔ نہ اُسے اپنا باڑا بڑھانے کی خواہش تھی۔ جتنے
اڈّے اُس کی تحویل میں آئے اُن سب کے اُستادوں نے خود اُس
سے چھٹکارا حاصل کر کے اُس کی گود میں ڈال دیے تھے۔ جن میں کئی کو تو
اُس نے یوں ہی چھوڑ دیا کہ کسی کو اپنے آدمی بٹھا دیے۔ خود اُس نے
اپنے باڑے میں تمام الابلا آدمی نکال کے منتخب آدمی رکھے تھے۔
اپنی دو نوکرانیوں کے سوا وہ سارے باڑے میں تنہا رہتی تھی۔ پولیس
سے بھی اُس کے تعلقات ٹھیک ٹھاک تھے۔ علاقے سے اُس کے
کسی آدمی کی شکایت آتی تو وہ اُسے سدھرنے کا صرف ایک موقع
دیتی تھی۔ دوسری شکایت پر اُسے باڑے سے نکال دیتی۔ جنتر منتر
کی کہانیاں اُس کے بارے میں مشہور ہو گئی تھیں مگر وہ اُن سب سے
جیسے بے خبر تھی۔ اُس کے باڑے کے آدمیوں کا کہنا تھا کہ اُس نے
کبھی کسی مرد کو قریب نہیں پھٹکنے دیا۔ باڑے کے کسی آدمی سے
زیادہ بات نہیں کی۔ علاقے کے لوگ اُسے جامنی دیوی کہنے لگے تھے۔
کہتے تھے کہ وہ کالی دیوی کا کوئی روپ ہے۔ باڑے میں کوئی ضرورت مند
جاتا تو خالی ہاتھ واپس نہیں آتا تھا مگر اُس کے ساتھ کسی نے
زیادتی کی ہوتی تو وہ اُس کے ساتھ خود باہر آجاتی اور زیادتی کرنے
والے سے باز پرس کرتی۔ داور کے لوگ اپنے بعض فیصلے بھی
اُس سے کرانے لگے تھے۔ جانگڑی کی موت کے بعد ممبئی کے کسی
دادا نے پھر جامنی بائی کے علاقے کا رُخ نہیں کیا۔ سب نے سمجھ
لیا تھا کہ جامنی کو چھیڑنا اپنی موت کے مترادف ہے۔ جامنی بائی
کو ایک ہی شوق تھا۔ گانے اور ناچ دیکھنے کا شوق۔ اُسے کسی
نے گاتے ہوئے دیکھا نہیں تھا مگر رات کو کبھی باڑے کی اوپری
منزل سے جہاں وہ رہتی تھی کبھی کبھی اُس کے گانے کی آواز
آنے لگتی۔ اور وہ صرف رات کو گاتی تھی۔ پیرو کہتا تھا کہ اُس کی آواز
سننے کے لیے اُس کے باڑے کے آدمی کان لگائے رہتے تھے لیکن
رات کو گانا اُس کا معمول نہیں تھا۔ ایسا کبھی کبھی ہوتا تھا اور جب وہ

ناچ دیکھنا ہوتا تو کسی طوائف کو بلا کے کمرہ بند کر لیتی اور تنہا اُس کا
ناچ دیکھتی رہتی۔ مہینے میں دو ایک بار وہ ضرور کسی طوائف کو بلاتی تھی
اور رات کا کھانا اُس کے ساتھ کھاتی تھی۔ وہ اُسے ایک جوڑا بنارسی
اور نچھے ٹیٹنے کے بجائے سونے کا کنگن یا جھمکا دیا کرتی تھی۔

"ابھی تم نے کبھی کالا گلاب دیکھا ہے؟" پیرو نے اچانک
جامو سے پوچھا۔

"دیکھا ہے دادا!" جامو نے جواب دیا۔

"بس سمجھو جامنی بائی بھی ایک کالا گلاب تھا۔" پیرو خود ہی
تھوڑی دیر میں بولا: "گلاب کی پتی جیسا پر شخصی پہ کانٹا بہت تھا۔"

جھل سر جھکائے پیرو کی باتیں سن رہا تھا اور بڑی دیر سے
کسمسا رہا تھا۔ "آواز کیوں اٹک رہی ہے دلوا؟" وہ سر اٹھا کے
بلا ترے درمیان میں بولا۔ "ابھی آگے زبان کھولو۔"

"آگے آگے کیا زبان کھولے۔" پیرو سٹ پٹا سا گیا۔ "ابھی
یہ رات بھی جانے کو ہے۔ جامنی بائی ایک رات سے بہت
زیادہ تھا اپن کتنا جھیلن کے لیے۔"

"اودھر جامنی بائی نے تم کو کب دیکھی؟"

"تم کچھ جانتا ہے اُستاد!" پیرو چونک پڑا۔

"آگے بولو دادا!"

"قسم سے جھل بھائی! اپنے کو بولو تم جامنی بائی کو جانتا ہے؟
کبھی نام سنا تھا؟"

"صرف نام! دیکھنے کی چیز تھا۔ اودھر بمبئی میں اپن نے تم
کو پہلی بار دیکھا تو جامنی بائی بہت یاد آیا۔ تم اُس ٹیم ہوتا۔"

"اب وہ کہاں ہے دادا؟" جلا کرنے بے چینی سے پوچھا۔

چہرے دار بھالے قریب آتے اور کئی آنکھیں بیت جاتے
سے گزر جاتے۔ کل کی طرح اپنے خیموں میں سونے کے بجائے
سارا الاؤ کے گرد بیٹھے رہنا اُن کے لیے حیرانی کا باعث ہوگا۔
رات آہستہ آہستہ بیت رہی تھی۔ الاؤ کے شعلوں نے کم از کم
باہر کی طرف کی سردی دور کر دی تھی۔ تاہم ہوا کا کوئی تیز جھونکا
آتا تو آگ بھی تھرتھرانے سی لگتی۔ سرلم نے دیر ہوئی چائے کی
کیتلی انگاروں پر رکھ دی تھی۔ پانی کھولتے کھولتے سوکھ گیا کسی کو چائے
بنانے کا خیال نہیں آیا۔ جامو، جلترو اور مارٹی پیرو کو تکے جا رہے تھے
باتیں باقی تھیں۔ پیرو کہہ رہا تھا کہ اُس وقت جب جامنی بائی داور
کے علاقے میں آ کے جلنے لگی تھی اور بے تاج کی رانی تھی پیرو کا
باہم کے علاقے میں ایک اڈا تھا۔ زیادہ بڑا تو نہیں مگر آمدنی
کے حساب سے بڑے اڈوں سے کم نہیں تھا۔ کچھ جوئے خانے اور
شراب کی کئی بھٹیاں چلتی تھیں۔ ادھر اُدھر کے باڑوں
کے آدمی آ کے پیرو کو جامنی بائی کے قصے سناتے تھے۔ پیرو جوان
کا بچہ تھا۔ تاہم کاؤ اُس نے اپنے ہاتھ ہی سے کیا پر حاصل کیا
تھا۔ بمبئی کے اور داداؤں کی طرح پیرو کے دل میں کبھی یہ خیال
آتا تھا کہ وہ جامنی بائی کے ہاتھ سے چاقو چھین لے لیکن پیرو اُس
کے بہت سے واقعات سن چکا تھا اور جب جامنی نے کبھی اُس کے
علاقے کو نہیں چھیڑا تھا تو اُسے خواہ مخواہ اُس سے بیر کرنے کی کیا
ضرورت تھی۔ دوسرے دادا جامنی بائی کو داور کے علاقے سے بے دخل
کرنے میں ناکام ہو گئے تھے۔ شاید اسی لیے انھوں نے مشہور کر دیا
تھا کہ وہ کالا جادو کرتی ہے۔ پیرو کو ان روایتوں پر یقین نہیں تھا
لیکن اگر اس میں ایک فی صد بھی سچائی تھی تو اُسے محتاط رہنا چاہیے
تھا۔ پیرو کسی کے اُکسانے میں نہیں آیا۔

اُدھر چند دنوں سے پیرو کے آدمی اُس کے پاس شکایت
لے کے آ رہے تھے کہ جامنی بائی کے آدمی اُس کے علاقے میں
گھس کے دھندا بناتے ہیں اور بھی باڑوں کے داداؤں کو بھی شکایت
تھی۔ جامنی بائی کی شہرت کی وجہ سے اُس کے آدمی بے مہار
ہوتے جا رہے تھے۔ داور کے علاقے میں جامنی بائی کے ڈر سے
وہ کچھ نہیں کر پاتے تو دوسرے علاقوں میں جا کے لوگوں کو تنگ
کرتے۔ انھیں معلوم تھا کہ اب کوئی بھی جامنی بائی کے اڈے سے
ٹکرانے کی کوشش نہیں کرے گا۔ سب اُس سے دور دور الگ رہنا
ہی مناسب سمجھتے ہیں۔ سو کسی کو اُن کی شکایت کی جرأت بھی نہیں
ہوگی۔ ہوتا ابھی یہی تھا کہ جامنی بائی کی وجہ سے لوگ انھیں درگزر
کر دیتے تھے لیکن رفتہ رفتہ اُن کا کھٹکا بڑھتا گیا۔ بہت سے
لوگوں کا خیال تھا کہ جامنی بائی خود اپنے آدمیوں کو دوسرے
باڑوں سے چھیڑ چھاڑ کے لیے بھیجتی ہے۔ پیرو کے لیے یہ بات
خاصی تشویش کی تھی کہ وہ اُس کے علاقے تک پہنچ گئے ہیں مگر
پیرو نے جلدی نہیں کی۔ خود علاقے میں گیا۔ انھیں سمجھایا کہ مان
جاؤ۔ وہ پیرو کے منہ لگنے لگے۔ پیرو نے پھر تحمل کیا اور اسی دن
شام کو داور کے علاقے میں پہنچا اور جامنی بائی کو کہلوایا کہ باہم کا
پیرو دادا ملنا چاہتا ہے۔ جامنی نے فوراً بلوایا۔ پیرو اکیلا باڑے
میں داخل ہوا تو وہ ایک تخت پر بیٹھی تھی۔ پیرو نے اُسے پہلی بار
دیکھا تھا۔ پیرو کہہ رہا تھا کہ تخت پر وہ کوئی ملکہ معلوم ہوتی تھی کچھ
دیر کے لیے تو وہ بھول گیا کہ وہ یہاں کیوں آیا ہے۔ اُسے دیکھتا
ہی رہا۔ اُس کا بدن ترشا ہوا تھا۔ سانچے میں ڈھلا ہوا اور گردن اونچی
سر اٹھا ہوا۔ قد بڑا۔ بال کھلے ہوئے۔ گیروے رنگ کی ساڑی سے
اُس نے اپنا سارا بدن ڈھانپ رکھا تھا۔ کانوں میں تازہ پھولوں
کے گجرے، ناک میں لونگ اور کلائیوں میں چوڑیاں چڑھی ہوئی تھیں

سوا ملن پہ کوئی زیور نہیں تھا۔ چمکتا ہوا جامنی رنگ۔ پیرو کے کہنے کے مطابق جیسے کوئی پکی ہوئی جامن شاخ سے توڑی جائے، زمین سے نہ اٹھائی گئی ہو۔ عمر میں وہ بالکل لڑکی نظر آتی تھی۔ اس لڑکی کے مانند جس کا شوہر شادی کے فوراً بعد چھن گیا ہو۔ سب سے نمایاں اس کی آنکھیں تھیں، نیلاہٹ لیے ہوئے سیاہ آنکھیں جو گہری گہری ڈوبی ڈوبی اور بڑی بڑی تھیں۔ ان میں چنگاریاں سی لپکتی محسوس ہوتی تھیں۔ وہ بھی پیرو کو دیکھ کے چپ رہی پھر پیرو ہی کو کچھ ہڑبڑا کے احساس آیا، سنبھل کے بولا: "جامنی بائی! اپن تم سے کچھ بولنا مانگتا ہے۔"

جامنی مجسمے کے مانند ساکت بیٹھی رہی۔ پیرو نے تلخی سے کہا کہ وہ اپنے آدمیوں کو روک لے۔ جامنی بائی کی آنکھیں کھلی رہیں۔ اس نے جواب نہیں دیا۔ پیرو کو عجیب سا لگا: "اپن پھر اپنے آدمی ادھر بھیجے کیا؟ ان کو روک لو جامنی بائی! اپن بھی ان سے اوور نمٹ سکتا تھا، پر سوچا پہلے تم کو بول دے۔" پیرو نے استقلال میں کہا۔

جامنی بائی پیرو کی آواز پر جیسے خواب سے جاگی اور اپنی لانبی لانبی پلکیں پٹ پٹاتے ہوئے آہستگی سے بولی: "دادا! ابھی آرام سے بیٹھو۔" پیرو کہتا تھا کہ اس کی آواز کھنکھنا رہی تھی۔

پیرو جھجکتے ہوئے ایک طرف بیٹھ گیا۔ جامنی بائی نے ایک آدمی کو اشارہ کیا۔ پیرو کے سامنے اسی وقت صراحی اور گلاس رکھ دیے گئے۔ پہلی مرتبہ جامنی بائی نے کسی کو اس طرح شراب پیش کرنے کا حکم دیا تھا۔ پیرو نے ایک گلاس پی لیا اور بولا: "ابھی تمھارا کیا جواب ہے جامنی؟"

جامنی نے اپنے پاڑے کے سارے آدمیوں کو اندر بلا لیا اور پیرو سے پوچھا: "ان میں سے کون تھا دادا!"

پیرو نے تین آدمیوں کی طرف انگلی اٹھائی: "ابھی اپن ان کو پہچانتا ہے اور لوگوں کا اپن کو پتہ نہیں۔"

پیرو نے جن آدمیوں کی نشان دہی کی تھی ان کے سوا کسی نے واویلا نہیں کیا۔ وہ پیرو کے آدمیوں کو الزام دینے لگے۔ "چپ رہو۔" جامنی نے ہاتھ اٹھا کے کہا: "اور وہ تم کو کھینچ لے گئے تھے کیا؟ تم ان سے کیوں نہ لڑے؟"

انھوں نے کچھ کہنا چاہا لیکن جامنی بائی کی آنکھوں میں آگ اور ہاتھ میں خنجر دیکھ کے کپکپانے لگے۔ پلک جھپکنے کی دیر تھی کہ جامنی کا خنجر اٹھے اور ان میں سے کسی ایک کے سینے میں پیوست ہو۔ خنجر اس نے اٹھا بھی لیا تھا مگر کچھ سوچ کے رک گئی، بولی: "ابھی تمھارا فیصلہ خود کرو۔" تینوں آدمی چند لمحے تو اس کا چہرہ تکا کیے پھر ایک دم تیزی سے آگے بڑھے اور کتوں کی طرح پیرو کے قدموں سے لپٹ گئے۔

پیرو کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے: "ٹھیک ہے جامنی بائی!" وہ اٹھتے ہوئے بولا: "اپن اب جاتا ہے۔" پیرو نے کہنے کو تو کہہ دیا مگر اس کا جی وہاں سے جانے کو نہیں چاہتا تھا۔

"بیٹھو دادا! کوئی اور کام ہو تو بولو؟"

"اپن کو اتنا ہی کام تھا۔" پیرو نے مدھم لہجے میں کہا۔

"ابھی اپن ان کا فیصلہ بعد میں کریں گے۔ اپن کا فیصلہ رہ گیا ہے۔" جامنی بائی سرد آواز میں بولی۔

"ابھی اتنا ٹھیک ہے جامنی بائی!"

پیرو کہہ رہا تھا کہ اس نے اپنے سب آدمیوں کو باہر جانے کا حکم دیا، صرف وہ اور پیرو اس بڑے کمرے میں اکیلے رہ گئے۔ پیرو اس کے قریب ایک مونڈھے پر بیٹھا ہوا تھا۔ لوگوں کے جانے کے بعد وہ تادیر کچھ نہیں بولی۔ پیرو بھی خاموش رہا مگر اسے اس خاموشی سے جلد ہی اکتاہٹ سی ہونے لگی۔ اس کا جی چاہا کہ جامنی بائی سے اس کے بارے میں کچھ پوچھے۔ بے شمار سوال اس کے دماغ میں اٹھ رہے تھے لیکن پیرو زبان بند کیے رہا۔ جامنی ہی نے پہل کی اور اس سے ماہم کے علاقے کے متعلق پوچھنے لگی۔ پیرو کو فکر ہوا کہ کہیں جامنی کی نظر اس کے علاقے پر تو نہیں ہے مگر اس نے کسی جھجک کے بغیر جواب دیا: "علاقہ چھوٹا پر بھلا ہے۔" پھر اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا: "کبھی ادھر اپنی طرف آؤ جامنی بائی!"

"تم بولتے ہو تو ضرور آئیں گے دادا!" وہ شگفتگی سے بولی۔

پیرو اس سے کچھ اور نہیں کہہ سکا۔ وہ یہاں پہلی بار آیا تھا۔ نہ جانے جامنی بائی کیا سمجھتی اور خود اسے اچھا نہیں لگتا تھا کہ ایک علاقے کا دادا ہو کے اس پر اپنا تجسس ظاہر کرے۔ چنانچہ اس نے اختصار برتا اور رسمی طور پر جامنی بائی کا شکریہ ادا کرکے چلا آیا۔ پیرو بتا رہا تھا کہ وہ وہاں سے چلا آیا لیکن اپنے پاڑے آنے کے بعد اسے ایسا محسوس ہوا جیسے جامنی بائی کی آنکھیں اس کے ساتھ آگئی ہیں اور اسے گھور رہی ہیں۔ ابھی ایک رات نہیں گزری تھی کہ صبح اسے اطلاع ملی۔ جامنی بائی کے پاڑے کے قریب کوڑے کے ڈھیر پر تین آدمیوں کی لاشیں پڑی ملی ہیں۔ پولیس نے جامنی بائی اور اس کے پاڑے کے کئی آدمیوں کو گرفتار کر لیا ہے۔ پیرو کو اس خبر سے دکھ ہوا۔ یقیناً یہ وہی تین آدمی ہوں گے جن کے بارے میں کل شام جامنی بائی نے کہا تھا کہ ابھی ان کا فیصلہ باقی ہے۔ پیرو دن بھر بے چین رہا۔ وہ تیار رہتا تھا کہ پولیس اسے بھی بلائے گی۔ پولیس کا کوئی آدمی اسے بلانے نہیں آیا اور دوسرے دن شام

اسے خبر ملی کہ جامنی بائی اپنے ساتھیوں سمیت تھانے سے پاڑے واپس آگئی ہے۔ اس کے تین دن بعد سر شام وہ پاڑے میں بیٹھا تھا کہ ایک آدمی نے آکے اطلاع دی: "دادا! جامنی بائی پاڑے کی طرف آرہی ہے۔"

پیرو بہت حیران ہوا، خود دوڑا ہوا پاڑے کے باہر گیا۔ جامنی بائی تنہا دروازے پر موجود تھی۔ "دادا! اپن آگئے۔" اس نے ہنس کے کہا۔

"تم جامنی بائی!" پیرو وحشت سے بولا: "آؤ، آؤ، اندر آؤ۔ ابھی اپن کوئی سپنا دیکھتا ہے کہ ادھر کھوپڑی کا کوئی کل الٹ ہو گیا ہے۔"

جامنی بائی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ سی کھل گئی۔ وہ پیرو کے پیچھے پیچھے اندر آنے لگی۔ پاڑے کے تمام لوگ اسے دیکھ کے حیرت میں پڑ گئے اور اس کی آمد کا مقصد جاننے کے لیے بے تاب۔ اس سے پہلے جامنی بائی کے بارے میں کبھی نہیں سنا گیا تھا کہ وہ کسی پاڑے میں خود آئی ہو۔ وہ کہیں آتی جاتی نہیں تھی۔ پیرو اسے ایک کشادہ اور صاف کمرے میں لے آیا اور پوچھا کہ وہ اس کی کیا خاطر کرے۔ جامنی بائی نے کہا کہ اسے کوئی چیز چاہیے نہیں ہے۔ پیرو نے پہلے تمام آدمیوں کو باہر نکال دیا: "تم نے بلایا تھا، اپن ادھر آگئے۔" وہ دھیمے سے بولی۔

"تم نے ادھر آکے اپن کو بہت بہت خوش کیا۔" پیرو کو مناسب الفاظ نہیں مل رہے تھے: "ابھی بولو اپن کیا... کیا کرے؟"

"بیٹھے رہو دادا!"

"بیٹھا تو اپن ادھر ہی ہے، پر اپنے کو...."

جامنی نے نظریں اٹھا کے دیکھا تو پیرو بوکھلا گیا: "اپن تم سے ملنے، تم کو دیکھنے آیا ہے۔" وہ ڈوبتی آواز میں بولی۔

"بولو بولو۔" پیرو بڑبڑانے لگا: "اپن تمھارے جانتے ہے۔"

"تم ادھر دادا کیسے ہو گئے؟"

"کیوں؟ کیوں؟" پیرو کا خون بھڑکنے لگا: "تمھارا مطلب؟"

"لکھ پڑھ سب باپ مرتے ٹیم نہیں لکھ گیا تھا جامنی بائی!"

"جانتے ہیں دادا!"

"پھر تم تم کیا بولنا چاہتا ہے؟"

"کچھ نہیں دادا!" وہ کسی قدر اداسی سے بولی۔

"نہیں تم کچھ بولنا چاہتا ہے؟" پیرو نے تندی سے کہا۔

اس نے اپنی نظریں جھکا لیں اور بیٹھی جیسے کچھ سوچتی رہی۔ پھر یہ بات وہیں چھوڑ دی لیکن اس کا اضطراب ہوا ہو تھا، اسے کچھ بولنے میں اس لیے دشواری پیش آ رہی تھی کہ ابھی تک وہ جامنی بائی کی اچانک آمد کا سبب طے نہیں کر سکا تھا۔ دادر سے چلتے وقت اس نے رسماً جامنی بائی سے آنے کو کہا اور اس کا خیال تھا کہ رسماً ہی جامنی بائی نے ہامی بھری تھی مگر اب وہ سامنے بیٹھی تھی اور اس کے بدن سے اٹھتی ہوئی بھینی بھینی آنچ جیسی خوشبو کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ پیرو کا تذبذب بے جا نہیں تھا۔ اسے اس کے آنے سے ایک خوشی تو تھی تو کئی اندیشے بھی لاحق تھے۔ ممکن ہے اس کا کوئی اور ارادہ ہو اور پیرو کو اپنی قوت کے اظہار پر بعد میں پشیمانی ہو۔ وہ خواہ مخواہ جامنی بائی سے کوئی کد نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ اس چیز کا کوئی جواز ہوتا تو ٹھیک تھا۔ بمبئی میں بہت سے علاقے تھے جہاں جامنی بائی کی طرح دادا پاڑا چلاتے تھے اور بے دلیل ایک دوسرے کے معاملے میں دخل دینا پسند نہیں کرتے تھے مگر کوئی دلیل پیدا ہونے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ بدتمیزی بھی ایک دلیل ہے اور وہ کسی وقت بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ چاقو اور زندگی ایک دلیل ہے۔ پاڑوں کی یہی ایک دلیل چلتی ہے۔ پیرو کو گوارا نہیں تھا کہ وہ جامنی بائی کو ایک مہمان سے مختلف درجہ دے اور اس کی خوشنودی کے لیے اپنی حیثیت کے خلاف کوئی بات کرے اور جامنی بائی پر کوئی ایسا تاثر قائم ہو جیسے وہ کسی دفاعی حالت میں ہے۔ اپنے بارے میں وہ جامنی بائی کے منہ سے کوئی ایسی ویسی بات سننے کے لیے آمادہ نہیں تھا۔ جامنی بائی کے بجائے کوئی اور ہوتا تو پیرو کو اتنی الجھن پیش نہ آتی مگر وہ جامنی بائی تھی۔ پیرو کو خود اپنی جانب سے خدشہ تھا۔ اپنے خون کی گرمی سے وہ اسے بڑی عزیز بھی بہت تھی۔ وہ جامنی بائی کا ارادہ سمجھنے کی جستجو میں تھا اور جامنی بائی تھی کہ آ کے گم صم سی بیٹھ گئی تھی۔

پیرو موضوع بدل کے اس سے پوچھے یا اپنے علاقے کے بارے میں بتانے لگا۔ اسے کچھ جاننا تھا تو اس کی یہی ایک صورت سمجھ میں آتی تھی۔ وہ بتا رہا تھا کہ اس کا علاقہ کتنا زرخیز ہے۔ یہاں کے لوگ، کالونیاں، کارخانے، بازار، گلیاں، یہاں کی جھگیاں، کارخانے اور چھپے ہوئے گودام، بیئر بار وغیرہ۔ کوئی دادا کسی دوسرے دادا کو اپنے علاقے سے متعلق ایسی باتیں نہیں بتایا کرتا جو پیرو نے اس سے کہی تھیں۔ پیرو نے اس سے کچھ نہیں چھپایا، نہ مبالغہ کیا۔ وہ اپنی کشمکش سے جلد از جلد نجات حاصل کرنا چاہتا تھا اور اس دوران وہ پوری طرح کسی بھی بدلی ہوئی صورت حال کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ ہر قسم کی صورت حال کے لیے۔ کوئی ایسی مفاہمت نہیں جس میں سنبھلنے کا کوئی پہلو نکلتا۔ پیرو کو اپنے اس رویے سے طمانیت محسوس ہوئی۔ وہ پیرو تھا، پیرو کی جگہ کوئی دوسرا دادا ہوتا تو شاید یہ

فیصلہ نہ کر پاتا۔ جامنی بائی اُس کے علاقے کا حال سنتی رہی۔ نہ اُس نے اشتیاق کا اظہار کیا نہ سرد مہری کا۔ سو بیرو کا تجسس کم نہیں ہوا۔ پھر اُس نے اُن تین آدمیوں کا ذکر چھیڑ دیا جو دو دن پہلے ختم کر دیے گئے تھے۔ بیرو نے کہا کہ وہ ایسا نہیں چاہتا تھا۔

"اُن کو جانے دو دادا!" جامنی بائی بے دلی سے بولی۔

"پھا اپن نے اُن کو معاف کر دیا تھا۔"

"اپن نے نہیں۔" جامنی نے زیرِ لب کہا۔ "ابھی اُن کی بات چھوڑ دو۔ وہ چلے گئے ہیں۔"

"چھوڑ دو۔" بیرو نے جھٹک کے بولا۔

"ابھی اِدھر کی، زِدھر کی بات کرو۔"

"جو بولے کرے۔" بیرو نے تیزی سے کہا۔

"ابھی تم سالے کے لیے اِدھر باڑے میں رہنا چاہتے ہو؟"

"ابھی اپن کے ہاتھ پاؤں ایک دم ٹھیک ہیں۔"

اُس نے نظر بھر کے بیرو کو دیکھا اور کہنے لگی: "اِدھر تمہارا بہت من لگتا ہے کیا؟"

"لگتا کیا ہے، بس بیٹھا ہے۔"

"تم اِس کو چھوڑ جانا چاہتے ہو کیا؟"

"ابھی اپن نے ایسا سوچا نہیں ہے۔" بیرو نے [illegible] کہا۔ "پر جامنی بائی! اپن کو تو ایسا لگتا ہے [illegible]"

"سوچتے ہیں تم کو دادا نہیں ہونا چاہیے تھا۔"

بیرو نے [illegible] سے کہا۔ "تم کو بھی نہیں ہونا چاہیے تھا۔"

"ہاں!" جامنی بائی سر جھکا کے بولی۔ "پر اپن دادا ہے۔"

"اور اپن بھی۔" بیرو نے [illegible] آواز میں کہا۔

جامنی بائی نے منع کیا تھا لیکن بیرو نے آدمی [illegible] نمکین چیزیں اور چائے وغیرہ کے آنے تک بیرو کے [illegible] اُس نے چند کاجو منہ میں ڈال لیے اور چائے پی لی۔ "ابھی [illegible] اور پیسے تو لائے؟" بیرو نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"نہیں دادا!" جامنی بائی مخمور لہجے میں بولی۔

"اپن سوچا پہلے تم سے پوچھ لے۔"

چائے پینے کے بعد وہ پھر کسی سوچ میں ڈوب گئی تھی۔ آنکھیں نیم وا کیے۔ بیرو کے پاس اب کہنے کے لیے کچھ نہیں بچا تھا۔ وہ بھی سوچتا رہا اور جامنی بائی کے چہرے پر کچھ تلاش کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ آج بھی وہ گیروا ساڑی پہنے ہوئے تھی۔ کھلے ہوئے بال اُس نے ایک ربن سے باندھ رکھے تھے۔ کانوں میں پھول کھلے ہوئے تھے۔ ناک میں سنہری لونگ چمک رہی تھی۔ جامنی رنگ پر اُس کی چمک کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ بیرو کہتا تھا کہ جب وہ بات کرنے کے لیے اپنے لبوں کو جنبش دیتی تو اُس کے سفید دانت موتیوں کے مانند لگتے۔ موتی جو پیازی رنگ کی صدف میں ٹکے ہوئے ہیں۔ اندر سے اُس کے ہونٹ، اُس کا منہ پیازی رنگ کا تھا۔ باہر سے سارا جامنی۔ یکایک جامنی بائی کچھ بے چین سی ہو گئی اور اُٹھتے ہوئے بولی: "چلتے ہیں دادا!"

"یہ کیا۔ کیا؟" بیرو تعجب سے بولا۔ "اپن اس کو کیا سمجھے؟ تم نے بولا تھا تو اپن......"

"بات غم کے لیے نہیں۔ تم کو آئے دیر کتنا ہوا ہے، ابھی چلنے کو بولتا ہے؟" بیرو الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔

"پھر کبھی آئیں گے۔"

"وہ ٹھیک ہے۔ سو بار آؤ، ہزار بار آؤ، پر ابھی کیوں جاتا ہے۔ یہیں چلا جائے گا تو اپن سمجھے گا، اپنے سے مہمان کا خیال نہیں ہوا۔ اپن جنگلی ہے۔"

"نہیں بیرو دادا!" وہ بھری ہوئی آواز میں بولی۔

"پھر کیا ہے؟ مجبوری ابھی اپن بیٹھنے کو بولتا ہے جیسا اپن نے کو بولتا تھا۔" بیرو نے کہا کہ وہ تو کچھ بول ہی نہیں رہی تھیں، وہی سر [illegible] الاپتا رہا ہے۔

جامنی کچھ دیر کے لیے اور بیٹھ گئی اور اس اثنا میں اُس نے بیرو سے آس پاس کے علاقوں کے بارے میں چند باتیں پوچھیں۔ کون سا علاقہ کس دادا کے پاس ہے کیسا ہے۔ بیرو کو ان باتوں پر حیرت ہوئی جیسے جامنی کو کچھ معلوم نہیں تھا لیکن وہ اُسے بتاتا رہا اور اس نے ان باڑوں سے اپنے تعلقات پر کسی قسم کا تبصرہ کرنے سے گریز کیا۔

وہ جانے لگی تو بیرو اُسے دروازے تک چھوڑنے آیا۔ بیرو نے ایک آدمی سے کہہ کے اُس کے لیے وکٹوریا منگوائی تھی۔ بگھی میں سوار ہوتے ہوئے جامنی کے ہونٹوں پر لرزش تھی۔ اُس نے بیرو سے پھر کسی دن اپنے باڑے آنے کو کہا۔ بیرو نے وعدہ کیا۔ جامنی بائی کے جاتے ہی بیرو کے آدمیوں نے اُسے گھیر لیا اور جامنی بائی کے آنے کا سبب پوچھنے لگے۔ بیرو کو خود کچھ پتہ ہوتا تو وہ انھیں بتاتا۔ "سب ٹھیک ہے بابا!" ظاہر ہے بیرو کے اتنا کہہ دینے سے وہ مطمئن نہیں ہو سکتے تھے۔

چار دن بعد کی بات ہے کہ بیرو کے باڑے میں ایک اجنبی شخص مٹھائی اور پھلوں کی دو ٹوکریاں لے کے آیا اور اُس نے تحفے میں انھیں صرف بیرو کے حوالے کیا۔ شکل و صورت سے وہ کسی باڑے سے متعلق آدمی نہیں معلوم ہوتا تھا۔ ٹوکریاں جامنی بائی نے بھیجی تھیں۔ بیرو نے اُس کا شکریہ ادا کیا اور تیسرے روز اپنی طرف سے

پھلوں، پھولوں اور مٹھائیوں پر مشتمل چار ٹوکریاں جامنی بائی کو بھیجیں۔ اُس نے بھی اپنے باڑے کے بجائے باہر کا ایک آدمی منتخب کیا۔ باڑے میں کسی کو علم نہیں ہو سکا کہ جامنی بائی کی طرف سے کوئی سوغات آئی ہے اور بیرو نے بھی جواباً اُسے ٹوکریاں بھیجی ہیں۔ جامنی بائی نے انھیں شکریے کے ساتھ قبول کیا اور کہلوایا کہ پرسوں کی شام اپنے باڑے میں وہ بیرو کی منتظر رہے گی۔ بیچ کے وہ دو دن بیرو کے لیے نہایت اضطراب کے تھے۔ جامنی بائی کے پاس دوبارہ جانے کے خیال سے اُس کے دل و دماغ میں عجیب عجیب احساس جنم لے رہے تھے۔ اِس دوران وہ خاکے بناتا، بگاڑتا رہا اور جب سورج ڈوبنے لگا تو اُس نے واروے کے علاقے کا رُخ کیا۔ وہ اپنے ساتھ کسی آدمی کو نہیں لے گیا تھا۔ جس وقت وہ جامنی بائی کے باڑے میں داخل ہوا، وہ نیلی ساڑی پہنے، ہونٹوں پر ایک ہلکی مسکراہٹ لیے اپنے مخصوص انداز میں دروازے پر کھڑی تھی۔ اُس کی چمکتی نظروں نے بیرو کا طواف کیا اور وہ اسے فوراً اندر لے گئی۔ باڑے میں کوئی اور شخص نہیں تھا۔ البتہ اوپری منزل پر جامنی بائی کی دو ملازمائیں موجود تھیں۔ بیرو ایک صاف ستھرے سجے سجائے کمرے میں جا کے بیٹھ گیا۔ کمرے کی دیواریں رنگین تھیں۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر ریشمی پردے لٹکے ہوئے تھے۔ کمرے کے طول و عرض میں چمکیلی جاجم بچھی ہوئی تھی اور وسط میں دیوار کے ساتھ ایک مختصر قالین بچھا ہوا تھا اور ایک چھوٹی میز پر صراحی اور گلاس رکھے ہوئے تھے۔ جامنی بائی نے خود اُسے جام بنا کے دیا۔ اسی وقت گھنگھروؤں میں لپٹی لمبے قد کی ایک خوب صورت لڑکی زرق برق کپڑے پہنے گھنگھرو چھنکاتی اندر آئی اور اُس کے آتے ہی ہارمونیم اور ستار کی آواز گونجنے لگی۔ سازندے کمرے سے ملحق کسی کمرے میں تھے۔ نظر نہیں آ رہے تھے لیکن جلد ہی بیرو کو پتہ چل گیا کہ وہ سامنے لٹکے ہوئے پردے کے پیچھے موجود ہیں۔ لڑکی نے دونوں کو جھک کے سلام کیا اور رقص کرنے لگی۔ بیرو کو ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ سو رہا ہو اور کوئی خواب دیکھ رہا ہے۔ جامنی بائی ایک دوسرے گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے اُس کے قریب ہی بیٹھی تھی۔ اُسے اس طرح دیکھ کے کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ کسی باڑے سے متعلق ہے اور اُسے چلاتی ہے۔ وہ بس ایک عورت تھی، ایک لڑکی۔ [illegible] کہ وہ اُس کے اور قریب ہو جائے، بہت قریب [illegible] لیکن وہ خود اپنی جگہ سے نہیں ہٹ سکا، نہ جامنی کی طرف ہاتھ بڑھا سکا، نہ اُس سے اپنی خواہش کا اظہار کر سکا۔ جامنی [illegible] نظریں اُٹھاتے ہی اُس کا ارادہ متزلزل ہو جاتا تھا۔ [illegible] وہ ایک دم [illegible] لگتا تھا۔ اپنی [illegible] سے کچھ بول سکتا تھا۔"

جامو نے درمیان میں دخل دے کے پوچھا: "واہ! واہ دادا! تم بھی بولو۔ تم اُس وقت کیسے لگتے تھے؟"

بیرو نے آہ بھر کے کہا: "اپن کیا جانے، پر ٹھیک ٹھاک ہوگا۔"

بیرو نے اپنے بارے میں نہیں بتایا تھا کہ وہ خود کو معلوم ہو رہا تھا۔ اب بھی اُس کا سرخ و سفید رنگ اُس کے گالوں پر دکھتا تھا۔ اُس کے گھنگھریالے بالوں پر ابھی کم سیاہی غالب تھی۔ کم و بیش بیس سال پہلے کی بات تھی۔ اُس وقت بیرو کیا حال رہا ہوگا۔ قد کا بڑا، کاٹھی کا مضبوط، خد و خال کا تیکھا۔ بڑی بڑی آنکھیں، کشادہ پیشانی، چوڑے شانے اور ابھرا ہوا سینہ۔ وہ بھی کوئی شہزادہ معلوم ہو رہا تھا، کسی راج کمار سے کیا کم۔ جامنی بائی اپنی جگہ بیٹھی رہی اور بیرو کن انکھیوں سے اُسے دیکھتا رہا۔ اُس کے حواس میں ایک دھیما دھیما سرور رینگ رہا تھا اور وہ یہ سرور توڑنے کے لیے اپنے آپ سے مزاحمت کر رہا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ جامنی بائی کے سامنے مدہوش ہو جائے۔ لڑکی ناچتی رہی۔ جامنی بائی نے ناچ کے دوران اُسے دوسرا جام بنا کے دیا۔ بیرو نے منع نہیں کیا، وہ چسکیاں لیتا رقص دیکھتا رہا مگر اُس کا دھیان رقص میں نہیں تھا۔ وہ مسلسل جامنی بائی کے متعلق سوچ رہا تھا۔ لڑکی نے ناچ کے دو تین بھاؤ بتائے ہوں گے کہ جامنی نے انگلی کے اشارے سے اُسے روک دیا اور بیرو سے پوچھا کہ کیا رقص جاری رکھا جائے؟ بیرو نے یوں ہی سر ہلا کے انکار کر دیا۔ اِس میں اُس کے ارادے کو دخل نہیں تھا۔ پھر خادماؤں نے کھانا لگا دیا۔ کھانوں کی اقسام کم تھیں مگر دیسی نفاست سے پکے ہوئے تھے اور نہایت لذیذ تھے۔ جامنی بائی اس قدر تکلف سے کھا رہی تھی کہ بیرو کو کہنا پڑا: "اِتنا تم تو کچھ کھاتا ہی نہیں۔ اِیدھر بھی تم سے اپن ہی ایسے کیا؟"

"کھاتے ہیں دادا!" وہ تبسم لہجے میں بولی۔

کھانے کے بعد جامنی بائی نے پھر اُس سے پوچھا کہ ایک دوبارہ ناچ کا اہتمام کیا جائے۔ بیرو اس سے بات کرنا چاہتا تھا سو اُس نے کہا: "ابھی تمہارا مرضی ہو تو چلے گا۔"

جامنی بائی نے لڑکی کو نہیں بلایا اور اپنے لب بھینچے سی کے بیٹھ گئی۔ پھر وہی خاموشی۔ بیرو کا دماغ کام نہیں کر رہا تھا کہ وہ کیا کہے کیا کرے۔ کیا یوں ہی بیٹھا کبھی دیواریں کبھی جامنی بائی کو گھورتا رہے۔ سکوت کے ایک طویل وقفے کے بعد جامنی کے لبوں میں جنبش ہوئی۔ اُس کی پلکیں تھرتھرائیں اور اُس کے ہونٹ سکڑنے اور پھیلنے لگے جیسے وہ کسی اذیت میں مبتلا ہو۔ "دادا!" وہ سسکی

جامنی بائی کی مبہوت آنکھیں اُس پر مرکوز رہیں۔

"تم نے سنا جامنی بائی! اپن کیا بولتا ہے؟"

"سن لیا دادا!" وہ نڈھال ہو کے بولی۔

"بس ابھی تم تیار ہو جاؤ، چاقو اُٹھاؤ۔"

"چاقو!" وہ اچنبھے سے بولی۔

"ہاں جامنی بائی! چاقو۔"

"چاقو کیوں دادا؟"

"ابھی اپن جانتا ہے کہ ایدھر ویدر پاڑے کے داداؤں نے تم کو لے جانے کا کوشش کیا تھا اور تم نے بولا تھا، اپن کے اتھے سے کوئی چاقو گرائے تو اپن پھر ایک پل نہیں ٹھہرے گا، اُسی کے ساتھ چلا جائے گا۔ ایسا بولا تھا نا؟"

"ہاں، پر تم سے نہیں بولے تھے۔"

"اپنے سے نہیں بولا ٹھیک ہے پر اپن کو پتہ ہے اور اپن بھی ایک دادا ہے۔ اپن ابھی تمہاری بات پورا کرنے کی کوشش کرے گا۔ تم کو چاقو کے بل پر لے جائے گا اور اپن کے چاقو میں بل نہیں تو سالا تم سے دور ہو جائے گا۔ اپنا منہ سدا کو نہیں دکھائے گا۔"

"نہیں دادا! اپن تم سے نہیں لڑ سکتا۔"

"کیوں نہیں لڑ سکتا؟" پیرو تلخی سے بولا۔ اپنے کو بھبک نہیں چھپا۔ اُس نے تیز و تند لہجے میں جامنی سے کہا کہ اگر وہ چاقو نہیں اُٹھائے گی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اُس نے پیرو کے ساتھ رعایت کی ہے بخشش کی ہے۔ پیرو ہمیشہ اس میں اپنی سبکی محسوس کرتا رہے گا۔ زندگی بھر اُسے خلش رہے گی کہ جامنی بائی نے اُسے کس سبب سے درگزر کیا ہے۔ وہ اپنے آپ سے نگاہ ملا کے رہنا چاہتا ہے نگاہ چرا کے نہیں۔ اس کا ننھے کے ساتھ نہیں کہ بمبئی کے ایک پاڑے کے دادا کی حیثیت سے وہ جامنی بائی کا اہل نہیں تھا۔ کوئی شک نہیں کہ جامنی نے پیرو کو ایک دادا کی صورت میں نہیں دیکھا تھا اور اُس نے صاف طور پر کہہ دیا تھا کہ پیرو اُسے بھی ایک پاڑے کی دادا لگے لیکن اپنی ذات کے کھمن آئندہ دنوں میں جامنی بائی کی نظروں میں اپنی سرخروئی کے لیے پیرو اُس سے چاقو اُٹھانے کا مطالبہ کر رہا تھا۔

جامنی بائی ششدر کھڑی تھی۔ اُس نے شدت سے انکار کر دیا اور بولی کہ یہ پیرو کا دیوانہ پن ہے۔ کیا اُس نے اُس لڑکی سے بھی جس کی اجازت لے کے وہ جامنی بائی کے پاس آیا ہے، اسی طرح کا کوئی مطالبہ کیا ہے؟ مگر پیرو نے اُس لڑکی سے کچھ نہیں کہا اور اُسے جوں کا توں قبول کیا ہے تو جامنی بائی کے سلسلے

میں اُس کی یہ خواہش کیوں ہے۔

"وہ جامنی بائی نہیں ہے پاڑے میں نہیں ہے۔" پیرو نے جھنجلا کے کہا۔ "اُس نے پہلے کسی کو ایسا نہیں بولا۔ جیسا جامنی بائی نے بولا تھا۔"

"دادا! اپن تم سے نہیں لڑ سکتے۔" جامنی بائی ناآرائی سے بولی۔ پیرو نہیں مانا۔ کہنے لگا کہ جامنی بائی کے انکار کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ پیرو کی شکست سے ہراساں ہے۔ اُسے یقین ہے کہ پیرو اُس پر قابو نہیں پا سکتا۔ پیرو کے لیے یہ صورتِ حال کسی عذاب سے کم نہ تھی کہ اُس کے بارے میں ایسا سمجھا جائے۔

"پھر تم سمجھو اپن ہار گئے تھے اُس کو واپس لیتے ہیں۔ پیرو! اُسی چھوکری کے پاس چلے جاؤ۔ اپن کا دھیان چھوڑ دو۔ اپن بھی تم کو بھول جائیں گے۔" جامنی بائی شکست خوردہ لہجے میں بولی۔

پیرو نے کہا کہ اس طرح وہ اُس کے شبہے کی تصدیق کر رہی ہے۔ وہ پیرو کو رسوا کرنا نہیں چاہتی مگر پیرو کے لیے اس سے بڑی رسوائی کوئی نہیں کہ جامنی اُس کے خیال سے چاقو اُٹھانے سے باز رہے۔ "اپن جانتا ہے تم ایسا کیوں بولتا ہے۔ پھر تم بھی اپنے کو ابھی پیرو مت جانو، اہم کے پاڑے کا دادا جانو جو پچھلے دادا کی طرح تمہارے پاڑے میں چاقو چھونے آیا ہے۔" اُس نے اشتعال میں کہا۔

"ایسا مت بولو۔" جامنی بائی ترشی سے بولی۔

پیرو ضد کرنے لگا۔ وہ ہم سے پوچھ رہا تھا، بتاؤ میں اُسے کیسے لے جاتا۔ پیرو کے احساسات سمجھنا ہمارے لیے دشوار نہیں تھا۔ پیرو نے اپنی زبان سے نہیں کہا لیکن اُسے بہت سے احساس ہوں گے۔ دوسرے پاڑوں کے داداؤں کا اور سب سے زیادہ اپنے آزار کا۔ وہ اُس عورت کو کیسے گھر لے جا سکتا تھا جس پر کلی اختیار کا اُسے اعتماد نہ ہو۔ اگر جامنی بائی پیرو کے بیان کے مطابق اُسی کے خیال سے چلو تہی کر رہی تھی تو پیرو کے لیے ہمیشہ کا تازیانہ تھی۔

جامنی اُس سے التجا کرتی رہی لیکن جتنا وہ التجا کرتی پیرو کا اصرار اتنا ہی بڑھتا جاتا اور جب جامنی بائی نے یہ جان لیا کہ اُس کا انکار پیرو کے لیے آتشِ مہمیز کا کام دے رہا ہے تو اُس نے خاموشی اختیار کر لی۔ پیرو کہتا تھا کہ اُس وقت اُس کے چہرے پر گھنا سی چھائی ہوئی تھی اور اُس کی آنکھیں چھتی ہوئی تھیں۔ دیر اس پر سناٹا طاری رہا۔ "ٹھیک ہے دادا!" وہ شکستہ لہجے میں بولی۔ "جیسا تم بولتے ہو، ٹھیک ہے۔"

پیرو نے آگے بڑھ کے اُسے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔ "جامنی بائی!" اُس نے رندھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ابھی تم مجھ کو ایسا کیوں لگتا ہے۔"

جامنی بائی کا سراپا اُس کی آغوش میں پھڑکتا رہا۔ پیرو نے قسمیں کی۔ اُسے خدشہ تھا، جامنی بائی اپنا ارادہ نہ بدل دے۔ پاڑے کے سارے آدمی کو بلا لو۔ اُس نے جامنی بائی سے کہا۔

"ان کو کیوں دادا؟" جامنی بائی کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔

"اپن چاہتا ہے وہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھے اور اپن کو اپنی تمہاری ماں کی تمہارے بھگوان کی سوگند دیتا ہے اگر تم نے چاقو میں کوئی چوری کیا، اپن کا دھیان کیا، پھر اپن چھاتی میں اس کو اتارنے لگا، سمجھی!"

صبح قریب ہی تھی۔ ہمارے ارد گرد چکر لگاتے ہوئے پیرو دار ایک لمحے کے لیے بھی نہیں بیٹھے تھے۔ نہ صرف وہ بلکہ اُن سے قطعے کے لوگ بھی۔ اُن میں سے شاید کوئی نہیں سو رہا تھا۔ فاصلے فاصلے پر گیس کی لالٹین جل رہے تھے اور اُن کے اطراف بیٹھے ہوئے پتھر اور لب نے جنجال اپنے ہاتھوں میں تیار کیے تھے۔ پیرو سانس لینے کیلئے رک گیا تھا۔ ہم سب کی نگاہیں اُسی کی طرف اُٹھی ہوئی تھیں۔ تخیل کے ہمیں بھی اُسی کی جانب تھا۔ ہر شخص دم بخود سا تھا۔ جامنی بائی کی شکل و صورت پیرو نے بیان کی تھی، اُسے سن کے ہم سب کے دل میں اُسے ایک بار دیکھنے کی خواہش جاگی ہوگی۔ دفعۃً تخیل کے دل میں بھی۔ دیر ہو گئی تو جامی نے پیرو کو ٹوکا۔

پیرو نے اپنا بھاری سر ہلایا۔ باتیں کرتے کرتے اُس کا منہ جیسے کچھ گیا تھا۔ بیچ بیچ آواز میں کہنے لگا کہ تھوڑی دیر میں جامنی بائی کے حکم پر ٹھکے کے پاڑے کے سارے آدمی اکٹھے ہو گئے۔ اس دوران وہ تخت پہ اپنے آپ میں گم بیٹھی رہی۔ پیرو اُس کے پاس تخت کے دوسرے سرے پر تھا۔ جب سب لوگ جمع ہو گئے تو وہ تخت سے اُتر آئی۔ پیرو بھی اُس کے پیچھے پیچھے بیچ میں کھلی ہوئی جگہ پہنچ گیا۔ جامنی بائی نے ساڑی کا پلو کمر سے باندھ لیا اور اپنے بکھرے ہوئے بالوں کی لٹوں میں گرہیں لگا دیں۔ سر کو کئی جھٹکے دیے اور اُس کا ہاتھ بائیں جانب بڑھا دیا۔ پاڑے کے ایک آدمی نے فوراً چاقو اُس کی طرف اچھالا۔ جامنی بائی نے پھرتی سے اُسے اُچک لیا۔ چاقو کھلتے ہی اُس کے سراپا میں ایک جھرجھری سی پیدا ہوئی۔ اُس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں چند لمحوں کے لیے بھینچ لیں۔ اُس کی پلکوں میں جوار جاتا سا اُٹھ رہا تھا۔ آنکھیں کھول کے اُس نے لوگوں کو ایک نظر دیکھا۔ پیرو کو ایسا لگا جیسے اُس کی آنکھوں میں آگ بھڑک رہی ہے۔ "دادا!" اُس نے لرزیدہ آواز میں اُسے مخاطب کیا۔

"جامنی بائی!" پیرو نے وارفتگی سے کہا۔

مگر جامنی اُسے مخاطب کر کے رہ گئی۔ وہ چند قدم پیچھے ہٹی اور یکایک اُس کے بدن میں ایک بجلی سی کوندی۔ کوئی شعلہ سا لپکا۔ اُس کے پیچھے ہٹتے ہی پیرو نے بھی اپنا چاقو تان لیا۔ اب جبکہ وہ دونوں آمنے سامنے تھے پیرو کو فوراً اُس کے چاقو سے ہلاکی اُس نے سن رکھا تھا کہ جامنی بائی کی آنکھیں اُس کے مقابل کو متزلزل کر دیتی ہیں۔ یہ آنکھیں پیرو کے لیے اجنبی نہیں تھیں۔ وہ ان میں جھانکتا رہا تھا لیکن آنکھیں ہی نہیں، جامنی بائی کے سارے بدن سے چنگاریاں اُٹھتی محسوس ہوتی تھیں۔ پیرو کو اپنی توجہ مرکوز کرنے میں کسی قدر مشکل پیش آئی۔ اُسے اس بات کی خوشی تھی کہ جامنی کے ہاں اُس کے لیے رعایت کی کوئی گنجائش موجود نہیں ہے گویا اُس نے اُس کی دی ہوئی قسم کا پاس لیا ہے۔ پیرو کی رگوں میں دوڑتا ہوا خون اُبلنے لگا اور اُسے جامنی بائی کے دو نین ہی پینتروں سے اُس کے متعلق سنی ہوئی باتیں جھوٹ نظر آئیں۔ وہ کسی جادو کا کرشمہ تھا۔ اُس کی شہرت کا شعبدہ وہ سب جامنی بائی کے چاقو کا تماشا تھا کہ اُسے چاقو چلانا آتا تھا۔ پیرو نے بہت سے لوگوں کو چاقو اُٹھانے چاقو چلاتے دیکھا تھا مگر جامنی بائی کا انداز سب سے جدا تھا۔ وہ اپنے مدِ مقابل کو اپنے تکنے داؤں کی ہوا بھی نہیں لگنے دیتی تھی۔ کبھی اِدھر کبھی اُدھر ایک پل میں اِس بازو، دوسرے پل میں اُس بازو، اس کا بدن ہوا کے مانند تھا۔ سمندر کی اُٹھتی ہوئی لہر، مچھلی کی طرح۔ پیرو کو ابتدا ہی میں اندازہ ہو گیا کہ درمیان میں سوچنے کا کوئی لمحہ ملنا دشوار ہے۔ سو جامنی بائی کا چاقو منتشر کرنے کی ایک ہی صورت اُس کے ذہن میں آئی تھی کہ وہ خود اُسی کا تیور اختیار کرے۔ اُسے اپنے داؤ کی آہٹ کا احساس نہ ہونے دے جیسا کہ جامنی بائی کا وتیرہ تھا۔ جامنی بائی کا یہ طریقہ کوئی حربہ یا ہتھکنڈا نہیں تھا۔ چاقو پر پورے ہاتھ اور جسم کی قابو یافتگی کے اعتماد کے بغیر ایسا ممکن نہیں تھا۔ پیرو کی خواہش تھی کہ جو کچھ ہونا ہے جلد سے جلد ہو جائے اور دیر تک آمنے سامنے رہنے کی نوبت نہ آئے۔ وہ شروع ہی سے جامنی بائی کی کلائی پکڑنے کی فکر میں تھا۔ جامنی بائی نے اپنا ہاتھ اُس کے قریب نہیں پھٹکنے دیا اور پیرو پہلے ہی مرحلے میں اِدھر اُدھر سے بڑھ بڑھ کے جھپٹ جھپٹ کے اُسے وقتی حالت میں لانے کی کوشش میں ناکام رہا۔ ظاہر ہے، پیرو نے اپنے جسم و دماغ

اور چاقو کی تمام صلاحیتیں آزما کے دیکھی ہوں گی۔ وہ بتا رہا تھا کہ
جاسمی بائی ہر مرتبہ اُس کے نرغے سے جھٹک کے نکل جاتی اور آ آ کے
جانا بیشتر اول کے اُس پر جھپٹتی۔ ہیرو کسی نہ کسی طرح بھی جھک
کے کبھی تیورا کے کسی طرف لپک کے اور اپنے آپ کو اچانک
سمیٹ کے اُس کا وار اکارت کر دیتا اور پھر اُسی کی تدبیر پر عمل کرتا
کہ یک جھپکنے میں چاقو تانے اُس پر اُٹھتا، بڑھتا اور وار اُس پر
چلانے کی کوشش کرتا۔

جاسمی بائی کے لیے ہیرو جیسے کسی شخص کا تجربہ نیا ہو گا۔
ہم نے بمبئی اور کلکتے کے باڑوں میں اُسے اپنے آدمیوں سے بارہا
زور آزمائی کرتے دیکھا تھا۔ اب بھی اُس میں ایسی پھرتی تھی تو جوانی
کے وقت کیسی ہو گی۔ اب کی نسبت جب ایک ہی فرق ہو گا کہ
ہیرو کے ہاتھ میں گرمی کے ساتھ دماغ میں گرمی زیادہ ہو گی جو جھل
کے نزدیک ایک نامناسب بات تھی۔ اُس نے کئی بار مجھے تاکید
کی تھی کہ لڑائی میں چاقو اُٹھاتے ہوئے سر ٹھنڈا رکھنے کی کوشش کرنا۔
خون کی گرمی کے اثر سے سر ٹھنڈا ہی رکھنا۔ یہ کوئی آسان کام نہیں
کہ آدمی اپنے جسم کی کھولتی ہوئی گرمی گردن سے اوپر نہ بڑھنے دے۔
جھل کا مطلب ... یہ نہیں تھا کہ برف کے مانند منجمد ہونا چاہیے بلکہ
کی مراد یہ تھی کہ ... میں جس نہ ہو کھولا ہی لیے تو جتنے ہیں۔ ہیرو
کو بھی ... بات معلوم ہو گی۔ اُس نے ماہم کا باڑا یوں ہی حاصل
نہیں کر لیا تھا۔ بہت سے آدمیوں میں وہی آدمی اڈے کا مالک
بنتا ہے جس کے جسم اور سر میں توازن ہو اور اس لحاظ سے جاسمی
بائی بمبئی کے ایک باڑے کی دادا تھی اور اُس نے کئی باڑے والے
ہی لوگوں کے سر چکرا دیے تھے وہ بھی اسی توازن سے نا آشنا ہوں گی
انھیں دس منٹ سے زیادہ ہو گزر گئے تھے۔ مشہور تھا کہ جاسمی
بائی کو جنہوں نے ملے گئے ہیں۔ اُس کے آدمی چاروں طرف دم سادھے
کھڑے تھے۔ بیچ میں ہیرو کو ایک بار شبہ ہوا تھا کہ جاسمی بائی اُس
کے ساتھ رعایت تو نہیں برت رہی ہے مگر پھر خود ہی اُسے اس
وہم کی تردید کرنی پڑی۔ کوئی پل ایسا نہیں گزرا تھا جب جاسمی بائی
نے اُس کے وار سے بچنے یا اُس پر وار کرنے کا موقع کھو دیا ہو۔ دونوں
پسینے میں شرابور ہو گئے تھے۔ ہیرو آئے اور حملہ کا دینا چاہتا تھا کہ
اس صورت میں شاید کوئی وار کارگر ہو جائے۔ دونوں ایک دوسرے
پر چاقو کا کوئی نشان ڈالنے سے بچ رہے تھے اور ایک دوسرے کو
گزند دینے کے خیال سے چاقو کی جھلکیاں دے رہے تھے۔ دونوں
میں سے کوئی بھی اس کھیل میں کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا گو بڑا
کے کوئی بھی چاقو نہیں چھوڑ دیتا۔ چاقو ہر حالت میں ہاتھ سے چپکا
رہنا چاہیے۔ ہاں کوئی چارہ نہ رہے تو دوسری بات ہے جو گڑبڑا

کے چاقو چھوڑ بیٹھتا ہے۔ جھل کے کہنے کے مطابق اُسے دوبارہ
چاقو نہیں تھامنا چاہیے پھر اُسے چاقو تھامنا نہیں آتا۔ چاقو ایک
دوسرے کو متذبذب کرنے یا بوکھلا دینے سے اُن کا مقصد محض
کسی بہتر داؤ کے لیے راہ ہموار کرنا تھا۔ ہم کسا داؤ کے پیچھے گرنے
بازو سے کھینچی ڈالنے۔ توازن بگاڑنے اور کسی خاص جگہ سے پنجہ
پکڑنے وغیرہ میں کامیابی حاصل کرنا جو ابھی تک ممکن نہیں ہو رہا تھا
جاسمی بائی ویسے وزن میں بہت کم ہو گی۔ کلائی بھی اُس کی ہیرو
کی طرح مضبوط نہیں ہو گی پنجے کی پکڑ بھی ہیرو کے مقابلے میں
کمزور ہونی چاہیے لیکن کمزوری اور مضبوطی کا تعلق داؤ نہ جاننے
والوں سے ہوتا ہے۔ جیسے رگ اُنگل کی زد پر آ جائے تو دیوہیکل آدمی
بھی تڑپنے لگتا ہے۔ جاسمی بائی کو اپنی گرفت کا کوئی جوہر سا ہی
ہو گا جبھی وہ آس پاس کے باڑوں کے داداؤں سے زور آزمائی کرتے
ہوئے نہیں جھجکتی تھی۔ ہر طرف دائرے کی شکل میں کھڑے لوگوں
کے بیچ میں کھلی جگہ زیادہ بڑی نہیں تھی۔ ہیرو متعدد مرتبہ دائیں بائیں
پھرکتا، پھر پھراتا بڑھتا تاکہ کسی ایک گوشے میں جاسمی بائی کی
جگہ تنگ ہو جائے اور اُس پر ہاتھ ڈالنا آسان ہو جائے مگر وہ
اُس تنگ گوشے میں آنے سے پہلے ہی اُس کے پہلو سے بجلی کی
طرح نکل جاتی تھی۔ اُس کے بدن میں بے حد لچک تھی۔ اُسے اُبھرا
ہونے اپنے آپ کو تہہ کرنے میں اتنی دشواری نہیں ہوتی تھی
جتنی ہیرو کو ہوتی تھی۔ دونوں کے بیچ دیر تک چھپ ... کا کھیل
ہوتا رہا۔ پھر جیسے ہیرو کے ذہن نے کروٹ سی بدل یا جیسے اندھیرے
میں اُمید کی کرن پھوٹی۔ اُس نے کسی تاخیر کے بغیر اُسی پر عمل کرنے
کا ارادہ کر لیا۔

اُس نے طے کیا تھا کہ اب کے جب جاسمی بائی چاقو تانے
ہوئے اُس پر لپکے تو وہ ادھر اُدھر ہٹنے کے بجائے ایک دم بیٹھ جائے
جاسمی بائی کے قریب آنے پر ہی اُس کا بیٹھنا سود مند ہوتا۔ فاصلہ
زیادہ ہوتا تو وہ اُس کی طرف بڑھتے بڑھتے پلٹ جاتی۔ فاصلہ کم
جانے پر اُس کے لیے پلٹنا بہت وقت طلب تھا۔ وہ اُلجھ جاتی
یا ہیرو پر ٹوٹ جاتی۔ اس گڑبڑاہٹ کے دوران اُس کا چاقو
ہیرو کے جسم کے کسی حصے پر لگ سکتا تھا اور اُس کا نتیجہ بھی ہیرو
کے حق میں ہو سکتا تھا۔ خود جاسمی بائی کے لیے اتنے کم فاصلے پر
سنبھلنا اور سنبھل کے ہیرو کا پنجہ پکڑنا ممکن نہیں تھا۔ ...
ہونے کے باوجود اتنی جلد ارادہ بدلنے کا امکان ...
ہی ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اب تک وہ ایک دوسرے کا ...
... لیتے رہے تھے۔ اس بار بھی ہیرو پر جھپٹتے وقت جاسمی بائی ...
ہو گی کہ ہیرو کسی جانب بچ نکلے گا۔ ہیرو کا یہ اقدام جاسمی بائی کے

ذہن میں دُور دُور تک نہیں ہو گا کہ وہ یوں اپنے آپ کو خطرے
میں ڈال دے گا۔ یہ ایک طرح کی وحشت تھی جسے دیکھ کے
جاسمی خوفزدہ ہو سکتی تھی۔ بہرحال ہیرو اس موقع کی تاک میں
تھا۔ جلد ہی جاسمی بائی اُس کی طرف تیزی سے بڑھتی ہوئی آئی۔
ہیرو نے چند قدم پیچھے ہٹنے کے پہلے تو اُسے یہ تاثر دیا کہ وہ اُس
کے حملے وار سے بچنے کے لیے تیار ہے لیکن ... جیسے ہی جاسمی
کا اور اُس کا فاصلہ ایک گز سے قریب رہ گیا تو دفعتہً وہ بیٹھ گیا۔
اُس نے اپنے دونوں ہاتھ کھلے رکھے تھے اور اُس کا خیال تھا کہ
ضرورت پڑی تو وہ اپنا چاقو بھی چھوڑ دے گا۔ جاسمی بائی بیچ میں
حائل ہیرو کے جسم سے تیزی سے ٹکرائی مگر ابھی ہیرو اُٹھا تھا کہ
اُس کا بازو یا کلائی پکڑ بھی نہیں پایا تھا کہ وہ اپنے بدن کی پوری
طاقت سے اوپر اُچھل اور پیچھے ہیرو کے دوسری جانب لڑھک گئی،
فرش پر دو ایک قلابازیاں کھاتی ہوئی وہ کچھ دور جا کے کھڑی ہو گئی۔
ہیرو کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے دھند سی چھا گئی
لیکن وہ جلد ہی اپنی جگہ سے اُٹھ کے کچھ پیچھے آ گیا اور اس سے
پہلے کہ اب جاسمی بائی اُس پر لپکتی، وہ ترچھا ہو کے ایک ہاتھ بڑھا
چاقو کو ناک کی سیدھ میں کیے چند قدم جست لگا کر پھر جاسمی کے قریب
آ گیا۔ کوئی امیدیں اس کے سوا اس کے دماغ میں نہیں آ رہی تھی کہ
وہ جاسمی بائی کا اور اپنا فاصلہ کم سے کم رکھے۔ اُس نے کچھ ایسا محسوس
کیا تھا کہ جاسمی بائی فاصلہ کم رہنے سے کترا رہی ہے اگر یہ اُس کا
گمان ہی تھا تو بھی اب زیادہ دیر تک ہیرو یہ آنکھ مچولی جاری رکھنے
پر تیار نہیں تھا۔ فاصلہ کم ہونے پر جلد سے جلد کوئی نتیجہ برآمد ہونے
کی توقع تھی۔ ادھر یا اُدھر جو کچھ بھی ہو۔ ہیرو کا چاقو والا ہاتھ اپنے
سامنے دراز رہنے کی وجہ سے جاسمی بائی دائیں بائیں ہو کے اُس
کا ہاتھ اُچکنے کی کوشش کرتی یا پہلو سے بچ نکل کے ہیرو کو پھر
پلٹنے پر مجبور کر دیتی۔ ہیرو کی خواہش تھی کہ جاسمی بائی اس موقع سے
فائدہ اُٹھائے اور اُس کے پنجے پر جھپٹا مارے۔ بس یہیں سب
سے بھیانک تھا کہ وہ جاسمی بائی سے پنجہ چھڑا لیتا ہے اور خود اُس
کا پنجہ قبضے میں کر لیتا ہے یا نہیں۔

ہیرو کی نگاہیں چاقو پر بھی ہونی نہیں تھیں کیونکہ اس کی
ضرورت نہیں تھی۔ جاسمی سامنے سے اُس کے اُٹھے ہوئے ہاتھ
کے چاقو کی زد پر آنے سے تو رہی اسی لیے ہیرو اس طرف
سے بے فکر تھا اور سامنے دیکھنے کے بجائے ادھر اُدھر جاسمی بائی
کی نقل و حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھا اور ہر قسم کی صورت حال
کے لیے مستعد تھا۔ جاسمی بائی اُسے بڑھتا ہوا دیکھ کے فوراً ہی
ایک جانب ہوئی، پھر دائیں جانب۔ ایک آن میں اُس نے کئی

پینترے بدلے۔ ہیرو نے اپنا ہاتھ سیدھا ہی رکھا اور اس طرح
جاسمی بائی کو کوئی راستہ قائم کرنے پر آمادہ کرنا چاہا۔ جاسمی کے لیے
اس میں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہ کسی وقت بھی رک سکتی تھی مگر ہیرو
کا اس انداز میں چاقو اُٹھائے ہاتھ پھیلا دینا رکھنا اُسے شک
میں ڈال سکتا تھا۔ وہ ہیرو کے انتہائی بائیں جانب ہو گئی۔ مجبوراً
ہیرو کو بھی رُخ بدلنا پڑا لیکن اُس نے اپنا ہاتھ پہلے ہی پھیلائے رکھا۔
جاسمی بائی اس اثنا میں بڑھ چکی تھی۔ ہیرو نے رُخ بدلنے میں ذرا سی
دیر نہیں لگائی تھی۔ وہ اُدھر سے بڑھی اُدھر سے ہیرو پلٹ کے
جاسمی کے سامنے ہو گیا۔ جاسمی بائی اتنی تیزی کی تھی کہ ہیرو کو
اپنا ہاتھ کھینچنے کی مہلت نہیں ملی۔ وہ عین اُس کے مقابل آ چکی
تھی اور چاقو ٹھیک اُس کے سینے میں پیوست ہوا۔ دوسرے ہی
پل وہ ہیرو کے بازو پر جھول رہی تھی اور ہیرو کا سارا جسم
چکرا رہا تھا۔

وزیر اور مارتی کی سسکیاں نکل گئیں۔ سبھی پتھرائی ہوئی نظروں
سے ہیرو کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ ہیرو کا سر جھکا ہوا تھا اور اس کا تمام
ایک ڈھیر بنگ رہا تھا۔ کسی کو کچھ اور پوچھنے کی ہمت نہیں پڑی۔
جھل بھی گم صم بیٹھا تنکوں سے آگ کرید رہا تھا۔ خاصی دیر بعد
جامو نے جھجکتے ہوئے زبان کھولی۔ "دادا! پھر یہ ایسا کیسے ہو گیا؟"
اُس کی آواز حلق میں اٹک رہی تھی۔

"ہو گیا جانی! سب ایسا ہی ہوا۔" ہیرو بھاری لہجے میں بولا۔
"جاسمی بائی اپن سے مسخری کر رہا تھا۔ وہ سب مشغلہ تھا۔ جامو! اپن
سالا سمجھا تھا۔ اب جاسمی بائی کو سمجھا تا ہے وہ داؤ دکھلانے کو نچاتا
تھا۔ اتنے آدمیوں کے بیچ اپنے ہیرو کو ذلیل کرنا نہیں مانگتا تھا۔
انتا ٹیم اُس نے اپن کے لیے لیا تھا۔"

"نہیں دادا!" جامو متفکر لہجے میں بولا۔

"اپن نے آخری ٹیم اُس کا مسکان دیکھا تھا۔ وہ ٹولا ان کے
بازو پر ہی بیٹھا تھا۔" ہنستا ہوا بولا۔ "اپن ہار گئے دادا! اپن سے کچھ
نہیں بولا گیا۔ بھالا تو وہ کان بند کر چکا تھا، تم سمجھتا ہے کیا دادا!
اپن نے پلٹنے میں دیر کی کہ اُدھر سے وہ چل پڑا تھا۔ وہاں سے
چل پڑا تھا جامو! وہ چاہتا تو کسی اور طرف کو جا پڑتا۔"

ہیرو ٹھیک ہی کہتا تھا۔ جب اُس نے جاسمی بائی سے پیار
کیا تھا تبھی جاسمی بائی نے بیسے کر لیا ہو گا۔ جامو نے اُس سے
کچھ اور نہیں کہا۔ ہیرو کی آنکھیں نیچے ہو گئی تھیں۔ اُس نے درمیان
میں جس لڑکی کا ذکر کیا تھا، اُس کا نام نہیں بتایا۔ نہ کسی نے پوچھا
مگر میں اور جھل اُسے دیکھ چکے تھے۔ وہ گیتا کی ماں کے سوا کوئی
نہیں ہو سکتی تھی۔

اندھیرا ہونے تک ہم نے اپنے راستے میں پڑنے والے پہاڑوں کی اور کئی دیواریں عبور کر لی تھیں لیکن جو تھے دن صبح رات بھر کے پڑاؤ کے بعد صرف ایک میل کے قریب ہی گئے ہوں گے کہ آسمان پر یکایک کالے بادل گھر آئے اور ہم خیمے نصب کرنے کے لیے کوئی مناسب جگہ تلاش کر ہی رہے تھے کہ موسلادھار بارش ہونے لگی۔ سلطان بھی بھیگ گیا۔ ہر چند ہم نے اُس کے اسٹریچر پر فوراً چھولداری ڈال دی تھی۔ خیموں کی میخیں ٹھونکتے ٹھونکتے ہم سبھی شرابور ہو گئے تھے۔ بارش جتنی تیزی سے آئی تھی اُسی تیزی سے گزر گئی۔ تھوڑی ہی دیر میں مطلع صاف ہو گیا اور تازہ دھوپ چمکنے لگی لیکن جھل نے پھر آگے بڑھنے سے سب کو روک دیا تھا۔ سلطان کے جسم پر کپکپی طاری تھی۔ اسٹریچر کے جھٹکوں اور بارش نے اُس کے رہے سہے اوسان بھی چھین لیے تھے۔ سب اُسے مختلف قسم کی دوائیاں دیتے رہے اور اُس کے گرد ہی بیٹھے رہے۔ سلطان کسی طرح قابو میں نہیں آیا۔ جتنا اُس کا دھیان کرتے، وہ اتنا ہی اور بکھر جاتا۔ پھر اسی دن شام کو اُس نے نہ جانے کیسے آنکھیں کھول دیں۔ پٹ پٹاتی پلکوں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ تشام اُس کی نظروں کے سامنے بیٹھی تھی۔ اُس پر نظر پڑی تو مسکرایا۔ پھیکی پھیکی مسکراہٹ۔

"کیا ہے سلطانے؟" جھل نے بے چینی سے پوچھا۔

"استاد!" بمشکل وہ ڈوبتی اور لرزتی آواز میں بولا۔ "اِس کا دھیان رکھنا۔ اب تمھی اِس کا۔۔۔"

"کیا بولتا ہے رے" جھل مضطربانہ اُس کا گال تھپتھپانے لگا۔

"لینے والا وقت نہیں ہے" سلطان کی آواز پر غشی طاری تھی۔

"نہیں رے" جھل نے تندی سے کہا۔

معلوم نہیں جھل کی آواز اُس کے کانوں میں پہنچی بھی یا نہیں۔ وہ تشام کو دیکھ رہا تھا اور اُس سے کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر کئی ٹیڑھی میڑھی لکیریں نمودار ہوئیں اور وہ کچھ بھی کہہ سکا۔ تشام پر آنکھیں جمائے لیٹا رہا۔ دیر تک اُس کی آنکھیں نہیں جھپکیں۔ جھل نے پھر ہاتھ بڑھا کے انھیں خود ہی بند کر دیا۔

تشام کے سینے سے نہ کوئی آہ بلند ہوئی نہ اُس کے آنسو نکلے۔ وہ بُت کی طرح خشک بیٹھی رہی۔ سلطان کو جب قبر میں اُتارا جا رہا تھا تو بھی وہ کچھ نہیں بولی۔ اِس دوران جھل، ہیرو، جامو اور آبا جان اُسے تھامے رہنے، بازوؤں سے پکڑے، گردن میں ہاتھ ڈالے تاکہ اُس کی آنکھوں میں جیسے منجمد ہو گئے تھے۔ سبھی اپنے اپنے طور پر اُس سے کچھ نہ کچھ کہہ رہے تھے۔ مارتی، بلاکو، زور دار، بلغم، سولام جیسی سارنے اور میں نے بھی اُس سے بہت کچھ کہا لیکن اُس نے جیسے کسی کی بات ہی نہیں سنی۔ اندھیرا ہونے لگا تھا لیکن ہم نے اسی کے خیال سے جلدی کی کہ وہ سلطان سے جتنی جلد اور جتنی دُور ہو جائے اچھا ہے۔ مرنے والوں کے ساتھ کون رہتا ہے۔ مرنے کا مطلب ایک مستقل دُوری ہے۔ سارے رشتے زندگی کے ہیں۔ رات کو ہم نے خاصا آگے جا کے یاکوں سے سامان اتارا۔ اُس رات کسی نے کھانا پکایا نہیں۔ مانگ قبیلے کے آدمیوں کو گوشت کے لیے بکھیں اور بُھنا ہوا اناج دے دیا گیا، وہی انھوں نے کھا لیا۔

ہم سب ایک ہی خیمے میں تھے۔ تشام رات بھر ایک کونے میں ساکت و جامد بیٹھی رہی۔ جھل اُس کے ماتھے، ہاتھوں اور گالوں کو پیار کرتا تھا۔ اُسے جھنجھوڑتا تھا مگر تشام کا بدن شل پڑا تھا۔ رنگ بالکل سفید ہو گیا تھا جیسے رفتہ رفتہ کوئی اُس کا خون چوس رہا ہو۔ ساری رات کوئی بھی اُس کے پاس سے نہیں ہٹا۔ نہ جھل، نہ آبا جان، نہ ہیرو۔ ہیرو نے اُس کی دل جوئی کی سب سے زیادہ کوشش کی تھی۔ عمر میں تشام اُس کی بیٹی گیتا کے برابر ہی تھی اور ہیرو ہی کی کوشش سے تشام کی آنکھیں بھیگیں۔ صبح ہونے سے کچھ پہلے ہیرو نے اُسے اٹھا کے اپنے سینے میں بھینچ لیا تھا اور اُس کا بدن گدگدانے لگا تھا۔ تشام کی آنکھوں سے آبشار سا بہہ نکلا۔ ایسے بلک بلک کے روتی کہ میں نے کبھی کسی کو ایسے روتے نہیں دیکھا تھا۔ اُس کے ساتھ جیسے ہم سبھی کو رونا یاد آ گیا تھا۔

ہم شہزادپل سے بھی آگے بڑھ آئے۔ زادپل کی بستی میں داخل ہونے کے بجائے ہم دور ہی دور سے راستہ کاٹ کے نکل گئے۔ راستے میں اور بھی کئی بستیاں پڑیں مگر جیسے ہی دور سے اُن کے نشانات نظر آتے، ہم راستہ بدل دیتے۔ چاہے کتنا ہی چکر کاٹنا پڑتا۔ ندی، نالے، دریا، پُل، ستون تک ڈھونڈیں۔ گھما تیل سلطان کو دفن کرنے کے چار دن بعد تک ہم روز رات کو چند گھنٹوں کے لیے ٹھہرتے، مسلسل چلتے رہے۔ جامو کا زخم سوکھ گیا تھا لیکن جھل کے پیر کی سوجن بڑھتی جا رہی تھی۔ ہم اصرار کر کے اُسے یاک پر بٹھا دیتے اور دن میں دو بار اُس کے پیر پر لیپ کرتے۔ اِسی وجہ سے سفر میں کچھ رکاوٹ نہیں پڑی۔ سردی کی شدت بھی کچھ کم ہو گئی تھی اور آگے راستے اتنے پیچیدہ نہیں تھے۔ ساری پیچیدگی ہمارے عام راستوں سے ہٹ جانے کے سبب سے تھی۔ پانچ دن تک تشام ہمارے ساتھ رہی۔ کھوئی کھوئی سی ساتھ چلتی رہی۔ جب کہتے اٹھ جاتی، جب کہتے بیٹھ جاتی۔ جب نظر پڑتی اُس کی آنکھیں چھلکتی ہوئی دکھائی دیتیں۔ سو ہر کوئی اُس کے چہرے کی طرف نگاہ کرنے سے پہلو تہی کرتا تھا۔ سولام تبتی سے خوب واقف تھا اور تشام کو کم کم ہندوستانی ٹوٹی پھوٹی ہی آتی تھی اِس لیے بیشتر اُس کے قریب رہتا تھا۔ سائے کی طرح اُس کے ساتھ لگا ہوا۔ آبا

جان بھی اُس کے ساتھ ساتھ رہتے تھے اور میں بھی۔ ہم سمجھ رہے تھے کہ اُسے کچھ قرار آ گیا ہے۔ قرار اُسے ضرور آ گیا تھا لیکن پانچویں دن سہ پہر کے وقت ہم نے دو بلند پہاڑوں کے درمیان رسیوں کا پُل عبور کیا ہی تھا اور پُل سے چند قدم آگے آئے تھے کہ تشام کو نہ جانے کیا ہوا، وہ واپس دیوانہ وار پُل کی طرف بھاگی۔ ملکی نے اُس کا پیچھا کرنے کی کوشش کی مگر پُل تک چند ہی قدم کا فاصلہ تھا۔ تشام ہزاروں فٹ نیچے گھاٹی میں بہتے ہوئے دریا میں کود گئی۔ ملکی بھی گرتے گرتے بچا۔ جب تک ہم سب وہاں پہنچے، دریا کی تیز لہریں اُسے بہا کے لے گئیں۔ سب نیچے جھانکتے رہ گئے۔ ہیرو نے اپنا ماتھا کھسوٹ لیا اور آبا جان سینے میں سر چھپا کے بیٹھ گئے۔

کسی کو یقین نہیں آتا تھا کہ تشام چلی گئی ہے۔ سب کی نظریں اس طرح جھک رہی تھیں کہ شاید ابھی وہ کسی جانب سے واپس آ جائے گی۔ ہم بہت دیر تک وہیں بیٹھے رہے۔ نیچے گھاٹی میں اُترنا مشکل تھا ورنہ ہم اُسے نیچے جا کے دیکھتے۔ نیچے جانے کا صرف ایک راستہ تھا کہ دریا میں چھلانگ لگا دی جائے۔ ہم اور آگے بڑھ گئے مگر سب کے چہروں کو جیسے زنگ سا لگ گیا تھا۔ گرتے پڑتے اندھیرا ہوتے ہم پھر ایک جگہ آ کے ٹھہر گئے۔

تشام بھی اُسی مٹی کی بنی ہوئی تھی جس کی کورا تھی۔ جس کی بہت سی باتیں کورا سے ملتی جلتی تھیں۔ اُس کے لانبے بال، آنکھیں، پیشانی، اُس کے مسکرانے اور شرمانے کا انداز۔ تشام کو اگر کورا کی طرح کوئی آسرا ہوتا کہ سلطان واپس آ جائے گا، تو وہ بھی ایسا نہ کرتی۔ ساری زندگی اُس کا انتظار کرتی رہتی لیکن اُس نے اپنی آنکھوں سے سلطان کو ہمیشہ کے لیے جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اُسے کورا جیسا کوئی آسرا نہیں رہا تھا۔ کورا کی طرح جھوٹ موٹ کا بھی۔ ہم نے تشام سے کوئی سی بات کہنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ جتنی بھی تسلیاں ممکن تھیں دیتے رہے تھے۔ سب کا خیال تھا کہ انھوں نے روٹھی ہوئی تشام کو منا لیا ہے۔ مجھے شبہ تھا کہ تشام ایسے کیسے بہل جائے گی۔ جامو نے اُسے اپنی بہن بنا لیا تھا اور کہا تھا کہ اُس کے ہوتے ہوئے اُسے کسی بات کی فکر نہیں کرنی چاہیے۔ آبا جان اور ہیرو اُسے بیٹی بیٹی پکارتے تھے۔ اگر وہ سلطان کے بدلے سب سے کچھ نہ کچھ مانگتی تو جس کے پاس جو کچھ تھا، وہ اُس کے حوالے کر دیتا مگر کیا اس طرح سلطان کی قیمت ادا ہو جاتی۔ قیمتیں تو اُن چیزوں کی ہوتی ہیں جنھیں لوگ بیچنے اور خریدنے کے لیے آمادہ ہوں۔ یہاں تو صرف خریدار تھے۔ دُکھ کے بدلے سُکھ کا سودا کرنے کے خریدار۔ سب اپنی اپنی بولیاں بول رہے تھے۔ بے شک تشام کو سلطان کی قیمت مقرر کرنے کا اختیار تھا مگر وہ اُس کی کیا قیمت لگاتی۔ ہر چیز کی قیمت نہیں ہوا کرتی۔

کورا سے بھی لوگ ایسا ہی کہتے ... بتایا تھا جیسلمیر میں رانا مہتاب کی بیٹی کنیز الرشد کا پیام ... نہ جانے اتنے عرصے میں کس کس نے کورا کے لیے مولوی صا[حب] کے آگے خزانے بچھائے ہوں گے اور صرف مولوی صاحب ... جانتے ہوں گے کہ کورا کو کھونوں سے تعاقب کرنا کتنا مشکل ... لوگ کہتے ہیں وقت کے ساتھ بہت کچھ بدل جاتا ... ہیں، عادتیں چھوٹ جاتی ہیں۔ آدمی زندہ رہنے کے لیے کوئی نہ کوئی ذریعہ ڈھونڈ لیتا ہے۔ کپڑا نہ ہو تو پتوں سے ستر پوشی کر لیتا ہے۔ کھانا نہ ہو تو گھاس پھوس کھا لیتا ہے۔ ہر چیز کا کوئی نہ کوئی بدل مل جاتا ہے۔ آدمی کا بدل بھی مل جاتا ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو دنیا کب کی ختم ہو جاتی مگر سب کو نہیں ملتا۔ ان کا نصیب ... ہو، انھیں نہیں ملتا۔ مولوی صاحب نے کورا کے لیے کیا کچھ نہیں کیا ہوگا۔ اُسے پڑھایا لکھایا۔ اُس کے لیے اپنا گھر بار ... دیا۔ دربدر مارے مارے پھرتے رہے۔ انھوں نے کورا کو اپنی محبت میں ہزار تسلیاں دی ہوں گی مگر یہ اُن کی تسلیاں ہی تھیں جو کورا کی آنکھیں روشن تھیں۔ وہ اُس کی اپنی تسلی تھی جو اپنے آپ سے بھی تو کچھ کہتی ہوگی۔ اُس کا دل بھی اُس سے کچھ کہتا ہوگا۔ اُس کا دل کہتا ہوگا کہ میں اُسے کہاں کہاں ڈھونڈوں۔ مجھے میری نظریں اُسے اپنے بدن پر چپکی محسوس ہوتی ہوں گی۔ کیونکہ اُس کی نظریں بھی مجھے اپنے ارد گرد محسوس ہوتی تھیں۔

مولوی صاحب نے اُسے جو کچھ بتایا ہو، امکان اِسی بات کا زیادہ ہے کہ انھوں نے اُسے میرے مر کھپ جانے کا یقین دلانا چاہا ہوگا۔ وہ میرا آسرا چھوڑ دے۔ اُن کے خیال میں کورا کو اِسی صورت میں صبر آ سکتا ہے۔ انھیں نہیں معلوم تھا کہ کورا نے اُن کی بات کا بالکل یقین نہیں کیا ہے۔ وہ چپ ہے تو اِس کی وجہ یہی ہے کہ اُس کے دل کی امید کی ساری کونپلیں جل گئی ہیں۔ اُس نے مولوی صاحب سے حجت نہیں کی ہوگی کہ وہ نہیں مانتی۔ بس وہ چپ ہو گئی ہوگی۔ اتنے عرصے کورا کے ساتھ رہنے کے باوجود مولوی صاحب کو پتہ نہیں چلا کہ آدرک کتنے عرصے نہیں چلے گا۔ خود وہ تھک جائیں گے اور ایک دن انھیں احساس ہوگا کہ انھوں نے میری طرف سے بے خبری برت کے کتنا بُرا کیا ہے۔ میرے ذہن میں بار بار یہی بات آتی تھی ورنہ پھر کیا وجہ تھی کہ مولوی صاحب نے کبھی پلٹ کے میری خبر نہیں لی۔ وہ ایسا کر سکتے تھے۔ میں مر تو نہیں گیا تھا اور مر گیا تھا تو انھیں کم از کم اِس کی تصدیق ضرور کرنی چاہیے تھی۔ وہ میری طرف سے بالکل مطمئن ہوں گے۔ جھل نے ایک بار

استاد تو مجھ سے کہا تھا، لاؤ ڈلے! کیا پتہ، مولوی صاحب ابھی تک
اُن جھکشوؤں سے خوف زدہ ہوں جو کرا کی تلاش میں سارے ہندوستان
میں منڈلاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کبھی اُن جھکشوؤں سے اُن کا کوئی
واسطہ پڑا ہو اور انھیں یہ شبہ ہو کہ مجھ سے رابطہ قائم کرنے کے بعد
کرا اتنی محفوظ نہیں رہے گی جتنی اُن کے پاس ہے۔ میں قبیل کی
بات سُن کے خاموش ہو گیا تھا۔ بحث کرنے سے کیا حاصل تھا۔ میں
جانتا تھا کہ ایسا کہنے سے قبیل کی مُراد مجھے سمجھانا ہی تھا۔ ایسا تھا
تو بھی مولوی صاحب اپنا بوجھ کم کرنے کے لیے میری تلاش ضرور
کرتے۔ وہ مجھے تلاش کرنا ہی نہ چاہتے تھے وہ کرا کو اپنے پاس
سے جُدا کرنا ہی نہ چاہتے ہوں گے۔ انھیں خدشہ ہو گا کہ کرا پھر
اُن سے چھن جائے گی اور یہ سب تو اُن کے اپنے اندر کی باتیں تھیں۔
کرا سے انھوں نے کیا کہا ہو گا، میرے نہ آنے کی کیا تاویل دی
ہو گی۔ جو کچھ بھی دی ہو گی۔ یہ مولوی صاحب کی بھول تھی کہ انھوں
نے جو کہا ہے کرا نے اُسے قبول کر لیا ہے۔ کرا اپنی تاویل سے
قائم تھی۔ اپنے دل کی تاویل سے ۔ اور تشائم! وہ کس تاویل
پر بھروسا کرتی۔ اُس کے سامنے کوئی پردہ نہیں پڑا تھا۔ وہ خود کو
کیا باور کراتی!۔۔

ابھی راستہ ہمیں ہندوستان میں داخل ہونا تھا جس سے ہم
یہاں آئے تھے۔ سرحدی چوکیوں اور بستیوں سے گزرنے کے نہیں
اسباب سے ہمیں زیادہ احتیاط کرنی تھی کہ ہمارے پاس دنیا کا
بیش قیمت سامان تھا۔ زرد جواہر، لعل و یاقوت، ہزاروں سال پہلے
کے برتنوں اور زیوروں سے بھرے ہوئے صندوق۔ آدھے سے
زیادہ راستہ ہم نے کسی نہ کسی طرح طے کر لیا تھا۔ میرڈ ہمیں ہندوستان
کی سرحد سے اور قریب کر دیتا تھا۔ کوئی بیسویں اکیسویں دن پہلی
بار ایک بڑا قافلہ ہمیں ہندوستان کی سمت سے آتا نظر آیا۔ ہم
آگے بڑھنے کے بجائے ٹھہر گئے اور قافلے کے کچھ قریب ہونے کا
انتظار کرنے لگے مگر وہ سب جھکشو تھے جو اپنے مخصوص لباس کے
باعث دُور سے پہچانے جاتے تھے۔ ویسے تو کوئی بات نہیں تھی لیکن
ہمارے ہمراہ مانگ قبیلے کے چار آدمی اور ایک تبتی قلی تھا۔ ایک
آدمی کو عمر عادل پر جاہو نے گولی مار دی تھی۔ قافلے کو اپنی طرف
متوجہ کرنے کے لیے وہ شور مچا سکتے تھے۔ زورا، بلاکو اور شولم نے
انھیں اس کے سامنے ہی نہیں ہونے دیا۔ وہ تینوں فوراً انھیں
دُور لے گئے۔ ابا جان کی وجہ سے قافلے کے جھکشو کچھ دیر کے لیے
رُک گئے۔ ابا جان اور اُن کے درمیان چند جملوں کا تبادلہ ہوا۔
انھوں نے ہماری خیریت بھی پوچھی اور مسکراتے ہوئے آگے بڑھ
گئے۔ ہم نے سکون کی سانس لی۔ ہو سکتا تھا کہ آگے جا کے اُن سے
کوئی ہمارے بارے میں استفسار کرتا لیکن ہماری گنتی کم تھی۔ ابا
جان ہمارے ہمراہ تھے اور اسی دوران ہمارے حلیے یکسر
بدل گئے تھے۔ چہرے پر داڑھیاں بڑھی ہوئی تھیں۔ انھیں دیکھ
کے ہم نے بندوقیں پہلے ہی چھپا دی تھیں۔

اس سے پہلے بھی راستے میں اکا دکا بھٹکے ہوئے قافلے
ٹکرائے تھے مگر اُن کے سامنے وہ ایک لفظ نہیں بولے۔ انھیں
اندازہ تھا کہ ہماری بندوقیں اور تمنچے اُن کی کسی بھی آواز پر چلنے
لگیں گے اور صرف وہی نہیں مارے جائیں گے، تو قافلے کے لوگ بھی ختم
ہو جائیں گے۔ انھیں یہ بات پہلے بتا بھی دی گئی تھی۔ جھکشوؤں کا
قافلہ بہت بڑا تھا اور ویسے بھی اُن پر بندوق اٹھاتے ہوئے
ہمارا جھجک لازم تھا اسی لیے ہمیں انھیں ایک دوسرے کی طرف
سے اوجھل کرنا پڑا کہ وہ اس موقع سے کوئی فائدہ اٹھانے کی
غلطی نہ کریں۔

ڈیڑھ مہینے کی مسلسل مسافت کے بعد ہم ہندوستانی سرحد
کے خاصے نزدیک ہو گئے۔ قبیلے کے آدمی اور قلی ہمارے ساتھ تھے
لیکن انھیں مزید آگے لے جانا مناسب نہیں تھا مگر ہمیں اُن کی
اب بھی ضرورت تھی۔ وہ وقت آ پہنچا تھا جب ہمیں اُن کے
بارے میں کوئی نہ کوئی فیصلہ کر لینا تھا۔ جابر کی رائے تھی کہ انھیں
مار دیا جائے۔ بلاکو، جینی، مارتی اور سارتے بھی اُس کے ہم نوا تھے۔
شمبل نے کچھ بھی نہیں بولا۔ میرڈ نے منع کر دیا اور انھیں اپنے ساتھ
ہی رکھا مگر دوسرے دن جیسے ہی ایک گہری گھاٹی پر نظر پڑی
میرڈ نے ہمیں ٹھہر جانے کا حکم دیا۔ قبیلے کے آدمیوں اور قلی کو رسیوں
سے باندھ کے یکے بعد دیگرے نیچے گھاٹی میں اُتار دیا گیا۔ کدالیں،
بیلچیں، ایک خیمہ، شکرے اور سفر کا ضروری سامان بھی اُن کے لیے
کے بعد نیچے چھوڑ دیا گیا۔ جہاں سے نٹ گھاٹی کی تہہ سے انھیں اوپر
چڑھنے اور کسی قریبی بستی پہنچنے میں کئی دن لگتے اور اس دوران
ہم کب کے تبت کی سرحد پار کر چکے ہوتے۔ انھیں ایسے چھوڑنے
پر کوئی بھی تیار نہ ہوتا۔ اگر ہمیں یہ اندیشہ ہوتا کہ وہ ہمارے سامان
کے بارے میں کچھ جانتے ہیں۔ وہ صندوق میں بھری ہوئی چیزوں
کے متعلق قطعاً لاعلم تھے۔ جس وقت بڑے صندوق کے تہہ خانے
سے نکل کے راتوں رات ہم اس مقام پر پہنچے تھے جہاں شولم ہمارا
انتظار کر رہا تھا تو ہم نے اپنی جیبوں اور تھیلوں میں بھرا ہوا سامان
اُس کے ساتھ لائے گئے صندوقوں میں منتقل کرتے وقت اس
بات کی خاص احتیاط کی تھی کہ تینوں قلی اُسے نہ دیکھ پائیں انھیں
اس دوران دُور دُور رکھا گیا تھا۔

اونچے پہاڑوں کا سلسلہ ابھی تک جاری تھا مگر سردی بہت
تدریج کم ہو رہی تھی۔ دن میں ہم اپنے اوور کوٹ اتار دیتے
تھے۔ سردی کا موسم بھی بدل گیا تھا۔ راستے میں باری باری بھی
بیمار پڑے تھے۔ سب کے بدن کی کھال جگہ جگہ سے پھٹ گئی
تھی۔ منہ کھولتے ہوئے ہونٹ دُکھتے تھے۔ رات کو لیٹتے تو گرمی چڑھنے
لگتیں۔ ابا جان بہت کم کسی سے بولتے تھے۔ مجھ سے بھی نہیں۔
تقریباً سبھی کے منہ سلے ہوئے تھے۔ ہمارے ساتھ اب کوئی رہبر
نہیں تھا۔ صرف ایک اندازہ تھا کہ ہم سرحد کے قریب ہو رہے
ہیں۔ سرحد اب آیا ہی چاہتی ہے۔ ایک ہفتہ گزر گیا۔ کہیں بھی سرحدی
بستیوں کے آثار نظر نہیں آئے۔ اس وقت ہمیں راستہ بھٹک جانے
کا شبہ ہوا۔ اب تک ہم بستیاں کاٹ کاٹ کے گزر رہے تھے مگر
اب ہمیں خود اُن کی تلاش تھی۔ اونچائی سے ہم چاروں طرف نظریں
دوڑاتے رہتے کہ کہیں انسانی زندگی کے نشانات دکھائی دے جائیں۔
کئی دن تک ہم اسی تگ و دو میں رہے۔ اس عرصے میں کسی بھی قافلے
سے ہمارا آمنا سامنا نہیں ہوا۔ یقیناً ہم کسی ویران جگہ آ گئے تھے۔
یہاں سبزہ بھی برائے نام تھا اور آگے دُور تک عمر با چٹیل پہاڑوں
کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا جن پر کہیں کہیں برف پڑی ہوئی تھی۔ اگر
سرحد اتنی ہی دُور تھی تو ہمیں قبیلے کے آدمیوں اور قلی کو گھاٹی
میں نہیں اتارنا چاہیے تھا۔ شاید انھوں نے ہی ہمارا رخ کسی دوسرے
راستے کی طرف موڑ دیا تھا لیکن سمت کی پہچان مشکل نہیں تھی۔ ابا
جان کے پاس قطب نما کی ایک چھوٹی ڈبیا تھی۔ سورج سے بھی
سمت کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ ہم نے اپنے اندازے کے
مطابق جنوب کی سمت سفر جاری رکھا اور زمین جیسے ہمارے
پیروں کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتی گئی۔ بڑے بڑے پہاڑ، میدانوں
کو دیکھتے ہوئے ہفتے گزر گئے تھے۔ سب کی رفتار تیز تھی۔ ہندوستان
کی سرحد نزدیک آنے کے خیال سے سبھی کے قدم اُٹھ رہے تھے
لیکن ایسا لگتا تھا، یہ پہاڑ کبھی ختم نہیں ہوں گے۔ ساری زندگی ہم
انھی کے گرد گھومتے رہیں گے۔ سامنے جب کوئی اونچا پہاڑ دیوار
بنا کھڑا نظر آتا تو جی چاہتا بڑھ کے اس میں سوراخ کر دیں۔ ایک
مختصر فاصلہ طے کرنے کے لیے ایک پہاڑ کے کئی چکر کاٹنے پڑتے
تھے، تب کہیں وہ سامنے سے ہٹتا تھا مگر اس کے ہٹتے ہی دوسرا
سامنے آ جاتا تھا۔ تبت کی جنوبی سرحدی چوکی کا نام سا ما تھا اور
اس کے پاس بہت سی چھوٹی بڑی بستیاں آباد تھیں۔ سا ما یا
کسی دوسری بستی کی دُور دُور تک کوئی علامت موجود نہیں تھی۔
قبیلے کے لوگوں کو جُدا ہوئے دس روز سے زیادہ ہو چکے
تھے، ہم چلتے رہے۔ چلتے ہی کی صورت میں کوئی بستی ملنے کا
امکان تھا اور آخر گیارھویں روز بلندی سے نشیب میں
واقع ایک چھوٹی بستی ہم نے ڈھونڈ ہی لی۔ کسی سیاح کو دنیا
کوئی نیا خطہ دریافت کرنے کی اتنی خوشی اور اہمیت نہیں ہو
ہو گی جتنی ہمیں کُتی کے چند مکانوں پر مشتمل بستی دیکھ کر ہوئی
سب لوگ آگے جا کے رُک گئے اور شولم اور میرڈ تقریباً بھاگتے
ہوئے بستی کی جانب بڑھے۔ جب تک وہ نہیں لوٹے ہم اُن
کا بے چینی سے انتظار کرتے رہے اور جب وہ لوٹے تو اکیلے نہیں
تھے۔ اُن کے ہمراہ یاکوں کے ساتھ چار آدمی بھی تھے۔ یقیناً وہ قلی
ہی ہو سکتے تھے اور وہ قلی ہی نکلے۔ انھی کے ذریعے ہمیں معلوم
ہوا کہ ہم آسام کی طرف جانے کے بجائے جنوب مغرب میں
بھوٹان کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ بھوٹان کو سارا عبور کر کے
ہی ہندوستان میں داخل ہوا جا سکتا تھا۔ وہ جگہ بے آباد وہاں کے
لوگ ہمارے دیکھے بھالے نہیں تھے۔ بھوٹان زیادہ دور نہیں
رہ گیا تھا لیکن ہم نے قلیوں کو آسام کی سرحد کی جانب چلنے کو
کہا۔ انھیں ایک بڑے معاوضے کی پیشکش کی گئی تھی اور کچھ
رقم پیشگی بھی دے دی گئی تھی۔ ساتھ ہی اُن سے یہ وعدہ کیا
گیا تھا کہ اگر وہ سا مال سرحدی چوکی تک ہمارے ساتھ چلیں گے
تو ہم اپنا بچا ہوا تجارتی سامان اور چند یاک بھی اُن کے حوالے
کر دیں گے۔ وہ آنا کانی کر رہے تھے لیکن ابا جان کا اصرار کارگر
ثابت ہوا۔ وہ مان گئے۔ آئندہ ایک ہفتے کی مسافت سے ہمیں
اندازہ ہوا کہ ہم کتنے مختلف راستے پر اپنی منزل سے کتنی دور چلے
گئے تھے۔

ایک ہفتے بعد جب قلیوں نے ہمیں بتایا کہ سا مال سرحدی
چوکی اب ایک دن کے فاصلے پر رہ گئی ہے تو سب ایک دوسرے
کو ناقابلِ یقین نظروں سے دیکھنے لگے۔ گویا چند میل کے فاصلے پر
ہندوستان تھا۔ دو یا تین دن کا سفر۔ سبھی کی بجھی ہوئی آنکھیں چمکنے
لگی تھیں۔ ہم نے قلیوں سے کہہ دیا تھا کہ سا مال آنے سے کچھ دور
پہلے ہی وہ ہمیں مطلع کر دیں۔ اب تک ہم نے انھیں نہیں بتایا
تھا کہ ہندوستان میں داخل ہونے کے لیے ہمارے پاس راہداری
کا باقاعدہ پروانہ نہیں ہے ورنہ وہ شروع ہی میں آنے میں تامل
کرتے۔ ابا جان کا کچھ نہیں تھا۔ جھکشو پروانۂ راہداری کی قید سے
آزاد تھے۔ جیسا کہ ہمیں توقع تھی، یہ سُن کے قلی منہ بنانے لگے اور
انھوں نے پروانے کے بغیر ہمیں آگے لے جانے سے صاف انکار
کر دیا۔ یہاں تک آ کے ہم اُن سے کوئی ضد بھی نہیں کر سکتے تھے۔
بستیاں قریب تھیں اور ہمارا کوئی بھی غلط عمل ہمیں اُن کی نظروں
میں مشکوک کر سکتا تھا۔ جاتے وقت بھی ایسا ہی ہوا تھا بڑا نے

کے بغیر تبتی بڑی مشکل سے ہمیں تبت میں داخل کرانے کے لیے
تیار ہوئے تھے۔ ہم نے انھیں ایک بڑی رقم کی پیشکش کی
اور اپنے تمام کے تمام یاک اور ایک بندوق بھی اُن کے حوالے
کرنے کا وعدہ کیا۔ پچھلے تجربے کے مطابق ہمیں اندازہ تھا کہ اُن
کا انکار ہماری طرف سے محض رقم میں مزید اضافے کے لیے ہے۔
وہ انکار کرتے رہے اور جب انھیں یہ یقین ہو گیا کہ اب ہم اس
سے زیادہ نہیں بڑھیں گے تو وہ چپ ہو گئے۔

ہم ساما نہیں گئے بلکہ کچھ پیچھے لوٹ کے ایک جانب
پہاڑوں پر چڑھنے لگے۔ ایک دن، دو دن، تین دن، پورے پانچ
دن بعد ہمارے ڈگمگاتے قدم ہندوستان کی زمین چھو رہے تھے۔
ہم ہندوستان کی پہلی سرحدی چوکی والنگ کے اطراف گھومتے
ہوئے اس سے کچھ آگے ساتی نامی ایک قصبے کے گرد و نواح
میں آ گئے تھے۔ ساتی سے ہم پہلے بھی گزر چکے تھے۔ یہاں دہری
شہریت کے لوگ رہتے تھے۔ بجز وقتی تبتی، بجز وقتی ہندوستانی۔
ہم ساتی کی بستی میں بھی نہیں گئے۔ تبتیوں نے ہمیں وہاں چھوڑ
کے واپس جانا چاہا تھا۔ ہم نے انھیں کسی نہ کسی طرح اور آگے
چلنے پر آمادہ کر لیا اور دو دن کی مزید مسافت کے بعد وہ ہمیں قصبہ
من زانگ کے علاقے میں لے آئے۔ ہمیں یاد تھا کہ من زانگ سے
دوسری منزل قصبہ ہوچی ما کا فاصلہ تقریباً آٹھ میل کے برابر ہے اور
ان آٹھ میلوں میں بڑے پاٹ کے دریا، گھاٹیاں، اونچی چوٹیاں،
کیڑے کوڑے، جنگلات اور درندوں کی کثرت ہے۔ ہوچی سے
ہمیں جیپیں مل سکتی تھیں۔ تبتی من زانگ سے آگے بڑھنے پر قطعاً
تیار نہیں تھے لیکن اُن کے بعد بار برداری کے لیے خچروں اور نئے
تبتیوں کی تلاش میں ہمیں مجبوراً قصبہ من زانگ میں داخل ہونا
پڑتا۔ خچروں اور یاکوں کے بغیر آٹھ میل کا یہ دشوار گزار راستہ طے
کرنا ہمارے لیے ناممکن تھا۔ تبتی ہماری کمزوری سے خوب
واقف تھے۔ سامان تو ہم کسی طرح اپنے کندھوں پر اٹھا لیتے مگر
جنگل کے لیے بہر کی سرزمین کی وجہ سے زیادہ دور چلنا نقصان دہ
ثابت ہوتا۔ وعدے کے مطابق ہمیں اپنے تمام یاک اُن کے
رخصت ہونے پر اُن کے حوالے کر دینے تھے۔ جامو کو اُن پر غصہ
آ رہا تھا۔ پیرو نے اُسے تھامے رکھا اور چھول داریاں کہ اب مجھے
باقی بندوقیں، گرم کپڑے اور مزید نقدی کے معاوضے پر انھیں
ہموار کر لیا۔ تبتیوں کو بھی واپس جانے کی جلدی تھی۔ انھوں نے
ہمیں ایک ہی دن میں من زانگ سے ہیون وتی پہنچا دیا۔ جس وقت
ہم ہیون وتی کی سرزمین میں داخل ہوئے سورج چمک رہا تھا۔
گنگنی سی ہوا چل رہی تھی۔ اجنبی اجنبی سی ہوا، جسم چھپائے جاتے

تھے۔ ہمارے سامنے کچھ فاصلے پر لکڑی اور بانس کے مکانات کے
جھنڈ تھے مگر ہم اُن سے دُور ہی رہے۔

سب کے پیر جیسے زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ مارٹی نے
تبتیوں کو اپنی گھڑی بھی دے دی۔ سردی بے حد کم ہو گئی تھی۔ ہم نے
جتنی چیزوں کا اُن سے وعدہ کیا تھا، اُس سے بڑھ کر جو کچھ جانے
دیں، زائد تھا، سب اُن کے سپرد کر دیا۔ یوں بھی ہمیں اپنا سامان
کم کرنا تھا۔ تبتیوں کے جانے کے بعد اور جیپوں کی تلاش میں
نکلنے سے پہلے ہم نے اپنے حلیے ٹھیک کیے۔ سب نے شیو کیا،
ایک دوسرے کے بالوں کی لٹیں قینچی سے تراشیں اور نئے کپڑے
بدل لیے۔ آپا جان نے بھی اپنا بھکشُوؤں کا لباس اُتار دیا۔ اُن کے
پاس کوئی اور لباس نہیں تھا۔ میرا کُرتا، پاجامہ اور صدری جن کے
انھوں نے اوپر سے بندھی پہن لی۔ زرین نے یہ سارے کپڑے
اپنے ہاتھوں سے سیے تھے۔ سورج ڈوبتے وقت جیپیں ملنا ممکن
نہیں تھا اس لیے ہم نے سُولم اور جامو کو جلد سے جلد آگے روانہ
کر دیا اور خود اپنے سروں پر صندوقوں کا بوجھ اٹھائے ہیون وتی کی
بستی کی طرف بڑھنے لگے۔ مجھے یقین تھا کہ میری طرح سبھی کے دل
دھڑک رہے ہوں گے۔ ابھی ہم بستی کے کنارے پر تھے کہ سُولم اور
جامو واپس ہوتے دکھائی دیے۔ اُن کے ساتھ خچر اور تبتی تھے۔ کچھ
پوچھنا بیکار تھا۔ انھیں جیپیں نہیں مل سکی ہوں گی۔ ہم نے سامان
خچروں پر لاد دیا۔ ہیون وتی سے اگلا قصبہ ناؤ سات میل کی دوری
پر تھا مگر وہاں پہنچتے پہنچتے اندھیرا ہو گیا۔ تبتی اندھیرے کے باوجود
ہمیں بستی تک پہنچانے کے لیے تیار تھے لیکن ہم نے انھیں لوٹا
دیا۔ دُور سے بدھوں کا ایک مندر نظر آ گیا تھا۔ بستی میں جانے سے بہتر
تھا کہ رات ہم مندر کی عمارت میں گزار دیں۔ خچر تبتی بھی ہمارے ساتھ
ٹھہر گئے۔ ابھی صبح پوری طرح نمودار نہیں ہوئی تھی کہ جامو اور سُولم
کسی سے کچھ کہے بغیر پھر جیپوں کی تلاش میں نکل گئے۔ واپس
آئے تو اُن کے ساتھ دو جیپیں تھیں۔ ناؤ سے قصبہ ہوچی ما، پھر سارا،
تھوزانگ، پھر دینگ انگ۔ تین دن بعد کہیں ٹرکوں، کہیں
جیپوں کے ذریعے شب و روز سفر کرتے ہوئے قصبہ دری ای میں
آ کے ہم نے دم لیا مگر بس دم لینے کی حد تک۔ ہمیں معلوم تھا کہ
دری ای میں ہندوستان کے پولیٹیکل ایجنٹ، انٹیلی جنس افسر
اور ٹریڈ ایجنٹ کے دفاتر موجود ہیں اور پولیس اسٹیشن بھی۔ صندوقوں
میں بھرے ہوئے سامان کی وجہ سے ہمیں خود کو چھپائے رکھنا
پڑ رہا تھا۔ زیادہ احتیاط میں بھی اندیشے تھے، کوئی بھی ٹوک سکتا
تھا۔ ہیون وتی سے جتنے تبتی اور ڈرائیور ہمیں ملے ہم نے انھیں یہی
بتایا کہ ہم ان قصبوں کے اطراف تجارت کی غرض سے گھوم رہے

تھے۔ اب واپس اپنے گھروں کو جا رہے ہیں اور ہم دو قافلے ہیں
جو ہیون وتی میں اتفاق سے ایک دوسرے سے مل گئے تھے۔ ہم نے
اپنے چہروں، لباس اور انداز سے طویل سفر کے نشانات مٹا دینے
کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ بہرحال انھیں ہم پر شک نہیں ہوا۔ ہم
بڑھتے رہے، ہمارے سامان پر اور جیسے جیسے ہم پہاڑی علاقوں سے میدانی
علاقوں کی طرف بڑھتے گئے، ہمارے اندیشے بھی کم ہوتے گئے لیکن
کسی قدر اطمینان سب کو اُسی وقت حاصل ہوا جب ہم نے ترن سکیا
ریلوے اسٹیشن پر کلکتے جانے کے لیے ریل گاڑی میں قدم رکھے۔

ساری بندوقیں تبتی لے گئے تھے۔ تبتی چاقو البتہ ہماری
جیبوں میں موجود تھے۔ چیکنگ، پولیس والوں اور مسافروں کی نظروں
سے بچنے کے لیے ہم نے فرسٹ کلاس کے ٹکٹ لیے تھے حالانکہ
ہمارے کپڑے فرسٹ کلاس مسافروں جیسے نہیں تھے۔ کاش ہمیں کسی
مقام پر اپنے صندوق سوٹ کیسوں سے بدلنے اور نئے کپڑے خریدنے
کا وقت مل جاتا مگر کسی جگہ زیادہ دیر تک ٹھہرنا ہمارے لیے مناسب
ہی نہیں تھا۔ جلد سے جلد ہر سے دُور، انسانوں کی بھیڑ میں گم ہو
جانا ہی قرین مصلحت تھا۔ اگر صندوق میں وہ سامان نہ ہوتا
جو اب موجود تھا تو ہمیں قدم قدم پر یہ احتیاط کرنے کی
ضرورت نہیں تھی۔ ایک ڈبے میں بیٹھنے کے بجائے ہم دو
ڈبوں میں منقسم ہو گئے تھے۔ بقول آپا جان، میں، پلاکز، مارٹی اور جاپانے
ایک ڈبے میں، دوسرے میں پیرو، جامو، پلوتو، سُولم، زولا اور جینتی
گم جھگ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ دنوں بعد ریل گاڑیاں، اسٹیشن،
بجلی، قسم قسم کی اشیا، طرح طرح کے لوگ، بھاگتے چیختے چلاتے
ہوئے آدمی پھر ہماری نظروں کے سامنے تھے۔ ہر طرف شور ہی شور۔
قصبہ دری ای میں بہت دنوں بعد ہم نے ہندوستانی طرز کا کھانا
کھایا تو مرچوں سے منہ جل گیا۔ دودھ میں کھولتی ہوئی چائے کا
ذائقہ بھی سٹھا سٹھا سا تھا۔ سب کچھ بدلا بدلا، نیا نیا سا تھا جیسے ہم
کسی نئی دنیا میں آ گئے ہوں یا ہم نے دوسرا جنم لیا ہو۔ مجھے اپنے
ہر طرف پتنگے سے اڑتے محسوس ہو رہے تھے اور ایسا لگ رہا تھا
جیسے میں سیدھا کاوا کے پاس جا رہا ہوں۔ میری انگلیاں بے اختیار
گردن میں پڑی اُس کی دی ہوئی مالا کے دانے ٹٹولتی تھیں اور ہر
لمحے مجھے گمان ہوتا تھا کہ میری مالا کھو گئی ہے۔ اُس کی کوئی ایک
ایسی چیز تو میرے پاس موجود تھی جسے میں چھو سکتا تھا۔ جب بھی
مالا کے دانوں سے میری انگلیاں مَس ہوتیں لگتا جیسے اُس کے
ہاتھ میرے ہاتھوں میں ہیں اور وہ میرے سینے سے لگی ہے، مجھے
ٹوک رہی ہے، ٹہوکے مار رہی ہے، "میں سو گیا ہوں تو مجھے جگا
رہی ہے۔" وہ میرے سامنے کھڑی مسکرا رہی ہے۔ میں اسے دیکھ نہیں سکتا
لیکن میں اُسے چھو سکتا ہوں۔ میں اُس کے خواب میں بھٹک رہا تھا۔
ہر لمحہ ہمیں کلکتے سے قریب کر رہا تھا۔ میرے گھر والوں کا کیا حال
ہوگا۔ گاڑی کسی بڑے اسٹیشن پر ٹھہرتی تو کبھی وہ دوسرے ڈبے
سے ہمیں پوچھنے آ جاتے، کبھی میں، مارٹی، پلاکز، سارے اُن کے
پاس چلے جاتے۔ سارے کو کلکتے پہنچنے کی سب سے زیادہ بے کلی
تھی۔ کہتا تھا جب ہم اچانک وہاں پہنچیں گے تو آغا جان اور کبیر
خان حیران رہ جائیں گے۔ اتنے دن ہو گئے تھے، آدھا برس ہونے کو آیا،
وہ سب نہ جانے کیا سمجھ رہے ہوں گے کہ ہم کبھی لوٹ کے آئیں گے
بھی یا نہیں۔ جمیل نے کسی کو نہیں بتایا تھا کہ اُس کا ارادہ کس طرف
جانے کا ہے مگر اُس نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ واپس آنا نہ آنا
اتفاق ہے۔ ایک حادثہ۔ انھیں معلوم تھا کہ اُس نے پہلے ہی اُن
لوگوں کو منتخب کیے تھے جن کے آگے پیچھے کوئی نہ ہو، جن
کے پیر بندھے ہوئے نہ ہوں۔ تبتیوں اور بندوق کی مشقیں، جانے
سے پہلے جمیل کا دن دن بھر اڈے سے باہر رہنا، انھیں یہ سب
باتیں یاد آتی ہوں گی۔ وقت گزرنے کے ساتھ اُن کی پریشانی
بھی بڑھتی جا رہی ہوگی۔ سب ایک دوسرے کا منہ تکتے ہوں گے
کہ ہماری کوئی خیر خبر ملی؟ ہمیں زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا؟
کلکتے کے نام زرین کے خط نہیں تو بمبئی میں ایک دو بار خط
آتے ہوں گے۔ کلکتے لوٹتے سیدھے جواب دیتا ہوگا، بمبئی سے
جولین اور چمپا کے خط بھی اُس کے نام آتے ہوں گے۔ بہت اچھا ہے
وہ جولین، اُس کی ماں اور چمپا بیگم کو فیض آباد ہی سے لے آیا ہو۔ کہتا
تھا کہ استاد ناراض ہو گئے مگر ایک بار جب جولین فیض آباد آ
ہی جائے گی تو استاد اُسے بمبئی واپس نہیں بھیج دیں گے۔ اگر وہ
واقعی اُسے فیض آباد لے آیا ہے تو حویلی میں ہر وقت ایک ہنگامہ
رہتا ہوگا۔ میر علی، زہرہ، سلمیٰ، جو میاں، فرزند خانم، نیساں، سب کو
[illegible] کا انتظار ہوتا ہوگا۔ نیساں پانچوں وقت مصلے پر بیٹھی
دعائیں مانگتی ہوگی، الٰہی! بابر بھائی کو سلامت رکھنا۔ آغا جان کا
گھران لوٹانا۔ اس عرصے میں نیساں اور بڑی ہو گئی ہوگی۔ بلال میر
نے بھی میٹرک کا امتحان پاس کر لیا ہوگا۔ جانے کیا کیا بدل گیا ہوگا۔
میر علی فیض آباد میں رو رہے ہیں۔ دو پہر سے پیر جانے کا سوال ہی
نہیں پیدا ہوتا تھا لیکن اگر اُن کا انتخاب کے زمیں کو آن کا لگتا
نہ کیا ہو۔ میرے دماغ میں سب کی شکلیں گڈمڈ ہو رہی تھیں، سینہ
کی بند ہونے لگتا، کبھی جیسے اس کے سارے دروازے کھل جاتے
اور روشنی سی بھر جاتی۔

گاڑی تیز رفتاری سے بنگال کی طرف بڑھ رہی تھی، سب ہی

پنی نشستوں پر بیٹھے کہیں گم تھے۔ جمیل کو نچلی برتھ پر لٹا دیا گیا تھا۔ اُس کے پاؤں میں تکلیف کچھ زیادہ ہو گئی تھی۔ چہرے سے اس کا اظہار نہیں ہوتا تھا مگر اُس کی خاموشی بتا رہی تھی کہ طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں نے اُس کے پیر اپنے زانوؤں پر رکھ لیے تھے۔ میرے مقابل ابا جان کھڑکی کی طرف منہ کیے گھومتی ہوئی زمین دیکھ رہے تھے کہ ڈبے کی دیوار سے ٹکی آنکھیں خالی خالی، پیشانی پر شکنیں۔ معلوم نہیں کہاں کھوئے ہوئے تھے۔ حقیقت میں کہیں جو توقع نہیں ملا تھا میرا خیال تھا گاڑی میں بیٹھ کے مجھے اپنے پاس بلا کے ضرور پوچھیں گے کہ گزرے ان دنوں کہاں رہا، یہ لوگ کون ہیں۔ ان لوگوں کے بارے میں انھوں نے کوئی رائے ضرور قائم کی ہوگی۔ اتنے دن ساتھ رہنے کے بعد کوئی بات اُن سے ڈھکی چھپی نہیں رہی ہوگی مگر انھوں نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا۔ سارے سفر کے دوران انھوں نے مجھ سے بہت کم بات کی تھی۔ ہاں مجھے دیکھتے ضرور رہے تھے۔ بارہا میرے دل میں آیا، اُن سے پوچھوں وہ فریال، فرخ، خادمہ اور اکبر کو کس کے پاس چھوڑ کے آئے ہیں لیکن ڈر لگتا تھا۔ نہ جانے کون سا جواب سننے کو ملے۔ اُن کے پاس بتانے کو کچھ ہو نہ ہو۔ شاید جمیل سے ان کی کچھ بات ہوئی ہو۔ وہ دونوں آپس میں کبھی کبھی چپکے چپکے باتیں کرتے دیکھے تھے لیکن ہو سکتا ہے جمیل نے انھیں بتایا ہو کہ اُن کی خواہش کے مطابق میں نے اپنا تعلیمی سلسلہ جاری رکھا تھا۔ وہ یہی چاہتے تھے کہ میں بہت پڑھوں لکھوں اور بڑا افسر بن جاؤں۔ شاید جمیل نے اُن سے نہیں کہا کہ میں نے قتل کے جرم میں سات سال جیل کی سزا کاٹی ہے مجھے بہت اچھا چاقو چلانا آتا ہے۔ تم بھی ذرا ہی نہیں چلاتے بچتے تو انھوں نے خود ہی دیکھ لیا ہوگا۔

مجھے احساس ہوتا تھا، ممکن ہے وہ اپنی جھجک کی وجہ سے مجھ سے توقع کرتے ہوں کہ میں اُن سے لتی، فریال، فرخ، خادمہ اور اکبر کے بارے میں پوچھوں گا۔ ممکن ہے سوچتے ہوں کیسا بھائی ہے جسے اپنی بہنوں اور بھائی کے نام بھی یاد نہیں رہے۔ بھائی اُن سے کیا کہتا، اگر اُس نے لتی کو جھکی نظروں کے درمیان بیٹھا ہوا دیکھا ہوتا تو کسی اور کے بارے میں پوچھتے ہوئے اُس کی جرأت یوں جواب دے جاتی۔ غالباً ہم دونوں کو ایک دوسرے سے کوئی سوال کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ہمیں خود ہی جواب نظر آتے رہیں تو ٹھیک ہے۔ میں نے جمیل سے یہ معلوم کرنے کی ضرورت بھی نہیں سمجھی کہ وہ کلکتے جا کے ٹھہر جائے گا یا سیدھا فیض آباد جانے کا ارادہ ہے جہاں جہاں گھر ہے۔ ابا جان اُسے دیکھنے کے لیے بے چین ہوں گے۔ ایک مدت بعد وہ اُن کے سامنے آئے گا تو اُن کا کیا حال ہوگا اور جو کچھ بچ سکتے میں رہ جائے گا۔ ہو سکتا ہے جمیل نے اُن سے کہا ہو کہ دو چار دن کلکتے میں ٹھہر کے پھر فیض آباد جائیں گے۔ بہر حال ابا جان کو معلوم ہوگا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں اور اُن کے ذہن میں آگے کے بھی خاکے ہوں گے۔ وہ فیض آباد میں رہیں گے یا کہیں اور۔ اب اُن کا اپنا کوئی گھر نہیں ہے۔ ظاہر ہے اب وہ گیا تو نہیں جائیں گے اور زرین انھیں کہیں جانے دے گی۔ حویلی میں جا کے ابا جان سب سے زیادہ اسی کو پسند کریں گے۔ وہ اُن کا اسی طرح خیال رکھے گی جس طرح جمیل کا۔ شاید وہ دوسروں کا خیال رکھنے ہی کے لیے پیدا ہوئی تھی۔ لتی کی بہت سی خصوصیات اُس میں موجود تھیں۔ ابا جان نے لتی کو کھو دیا مگر زرین سے مل کے بڑی حد تک لتی کا ازالہ ہو جائے گا مگر یہ سب میرے اپنے ذہن کے خیال تھے۔ میں ابا جان کے دل میں چھپا نہیں بیٹھا تھا۔ نو سال میں انھوں نے بہت سے خواب دیکھے ہوں گے۔ اب ان کی تعبیر کا وقت آیا ہے۔ اتنی بڑی دولت سے وہ کیا کیا خریدیں گے۔ جاگیریں، کوئی ریاست۔ ان ٹھیکروں سے وہ اپنے خوابوں کی کیسی کیسی تعبیریں ڈھونڈیں گے۔ اُن کا شمار دنیا کے مال دار ترین لوگوں میں ہو جانا چاہیے۔ اب خزانہ اُن کے ساتھ تھا اور وہ خزانے کے ساتھ۔

جمیل آنکھیں موندے لیٹا تھا۔ ساری رات گزر گئی۔ ابا جان تھوڑی دیر کے لیے لیٹے پھر اٹھ کے بیٹھ گئے وہ کھڑکی سے کبھی کبھی نظر اٹھا کے میری طرف دیکھ لیتے۔ رات کو انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ میں بھی لیٹ جاؤں مگر مجھے نیند ہی نہیں آ رہی تھی۔ میں رات بھر بیٹھا رہا۔ صبح سویرے گاڑی نو کروچ جو ہمارے ایک میل تک آئی ہوگی کہ اچانک رک گئی۔ ہم نے دروازہ کھول کے دیکھا۔ گاڑی دونوں طرف سے پولیس نے گھیر لی تھی۔ ابھی گاڑی ٹھیرے چند لمحے بھی نہ گزرے ہوں گے کہ ایک پولیس افسر دو سپاہیوں کے ساتھ ہمارے ڈبے میں داخل ہوا۔ پہلے اُس نے انگریزی میں دخل اندازی کی معافی چاہی لیکن دوسرے ہی لمحے جیسے ہی اُس نے ہماری صورتیں دیکھیں صورتیں کیا لباس دیکھے تو ناک بھوں چڑھا کے بولا "تم لوگوں کے پاس فرسٹ کلاس کا ٹکٹ ہے؟" اُس نے انگریزی میں کہا۔ اُس کی نگاہیں ہماری چپلوں اور سامان پر پھسل رہی تھیں۔ اُسے یقین نہیں تھا کہ ہمارے پاس فرسٹ کلاس کا ٹکٹ ہوگا۔

"بابو کیا گٹ پٹ کرتا ہے رے؟" جمیل نے بوجھل آواز میں مجھ سے پوچھا۔

"ٹکٹ کو پوچھ رہے ہیں۔" میں نے ترشی سے جواب دیا۔ مجھے پولیس افسر کے لہجے پر غصہ آ رہا تھا۔ اس کی نظروں میں حقارت تھی۔ "ہمارے پاس ٹکٹ ہیں۔" میں نے آہستگی سے انگریزی میں کہا۔

مجھے انگریزی میں بات کرتے دیکھ کے وہ چونکا ہوا اور مجھ سے بولا: "دکھاؤ۔" اُس نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا تھا۔

میں نے سوچا، کہیں دکھاتے ہیں مگر پہلے بات کرنے کی تمیز سیکھو، مگر میں چپ رہا۔ جمیل نے اپنی جیب سے ٹکٹ نکال لیے تھے: "دکھا دے بابو صاحب کو۔"

میرے ہاتھ سے ٹکٹ لینے کے باوجود اُس کا شک نہیں گیا۔ الٹ پلٹ کے کبھی ٹکٹ کو دیکھتا کبھی ہمیں کبھی سامان کو۔ "ٹھونک بجا کے دیکھ لو، جعلی نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔

"آپ لوگ کہاں سے آ رہے ہیں؟"

"ٹکٹ میں لکھا ہے۔" میں نے تلخی سے کہا۔

"ہوں۔" وہ سر ہلانے لگا اور کچھ توقف کے بعد بولا "آپ لوگ کیا کرتے ہیں؟"

"کیا ٹکٹ کے ساتھ یہ سب بتانا بھی ضروری ہے؟"

"نہیں، اتنا بھی ٹھیک ہے۔" اُس کے لہجے میں نرمی تھی۔ نرمی اس لیے آ گئی تھی کہ میں نے اسے انگریزی میں جواب دیا تھا۔ جمیل نے مجھے اشارہ کر دیا تھا ورنہ میں اُس سے ضرور پوچھتا۔ جمیل کا خیال ہوگا کہ وہ پولیس افسر ہے، ہمارے سامان پر بھی شک ظاہر کر سکتا ہے۔ کسی وقت بھی کوئی حکم دے سکتا ہے اور ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ ساری گاڑی پولیس والوں نے گھیر رکھی ہے۔ ڈبے میں موجود اُس کے ساتھ آنے والے دونوں سپاہیوں کی نظریں صندوقوں پر جمی ہوئی تھیں۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے افسر کو کوئی اشارہ کرتے، افسر نے مجھ سے معذرت کی اور کہنے لگا کہ گاڑیوں کی یہ چیکنگ مسافروں کے تحفظ کے لیے ہے۔ میں نے اپنے الفاظ منہ ہی میں دبا کے رکھے۔ وہ واپس چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد گاڑی روانہ ہو گئی۔

میں نے مڑ کے دیکھا، ابا جان کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ مجھے احساس ہی نہیں رہا تھا کہ ابا جان بھی ڈبے میں بیٹھے ہیں اور وہ انگریزی بہت اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ خود بولنے کے بجائے مجھے اُن کے پولیس افسر سے بات کرنے کا انتظار کرنا چاہیے تھا۔ پولیس افسر کسی نہ کسی طرح واپس چلا گیا تھا اور گاڑی بھی روانہ ہو گئی تھی لیکن جاتے وقت اُس کی آنکھوں سے صاف ظاہر تھا کہ وہ ٹکٹ سے ضرور مطمئن ہو گیا ہے مگر ہم سے نہیں۔ وہ اپنا اطمینان کرنے پھر واپس آ سکتا تھا یا گاڑی کے ساتھ چلنے والی پولیس کو کچھ کام کر سکتا تھا کہ وہ ہم پر نگاہ رکھیں۔ مجھے اُس سے اتنی درشتی سے بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ مبادا وہ ناراض ہو جاتا تو پھر سب خاک ہو جاتا۔ ملاتے جیسے مجھے پچھتاوا ہوتا رہا۔ ہر چند میں نے کوئی غلط بات نہیں کی تھی لیکن مارٹی کے بقول "افسر افسر ہی ہوتا ہے۔" تمام راستے مجھے بے چینی رہی۔ جہاں گاڑی رکتی، میں سب سے پہلے باہر جھانک کے دیکھ لیتا کہ پولیس نے گاڑی کے گرد دوبارہ تو گھیرا نہیں ڈال لیا ہے۔ مجھے خزانے کی فکر نہیں تھی، اس کا مجھے کیا کرنا تھا مگر جہاں تک ابا جان کا تعلق ہے، میں اُن کی حفاظت سے وہاں تک پہنچا دینا تھا۔ شام ہو رہی تھی۔ گاڑی تیزی سے کلکتے کے نزدیک ہوتی گئی۔ پھر کوئی نہیں آیا۔ میں سوچ رہا تھا اگر جمیل نے ابا جان کو میرے بارے میں کچھ نہیں بتایا ہے تو میرے روانی سے انگریزی بولنے پر انھیں ضرور حیرت ہوئی ہوگی۔

ابھی کلکتہ آنے میں درمیان کے دو ایک اسٹیشن باقی تھے کہ جمیل نے پیری، زورا، مارٹی اور ابا جان کو ایک ڈبے میں کر دیا اور خود دوسرے ڈبے میں چلا آیا۔ میں بھی اُس کے ساتھ آ گیا۔ ہم نے دو سب صندوق بھی اسی ڈبے میں منتقل کر لیے تھے جس میں ابا جان تھے اور اپنے ساتھ صرف وہ سامان رکھا تھا جس میں خزانہ نہیں تھا۔ یہ احتیاط سب کی سمجھ میں آتی تھی اس لیے کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ جمیل چھ مہینے بعد کلکتے واپس جا رہا تھا۔ حالات مختلف ہوتا تو بات اور تھی۔ ہمارے پیچھے کلکتے میں بہت کچھ بدلا جا چکا ہو سکتا تھا۔ پیری، زورا اور مارٹی کا تعلق بمبئی کے اڈوں سے تھا۔ انھیں کلکتے میں اڈے کے چند آدمیوں کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا۔ گاڑی سے اترتے وقت ہمارا ایک دوسرے سے الگ الگ رہنا ہی بہتر تھا۔ اب کے اسٹیشن پر کوئی ہمیں لینے کے لیے آنے والا نہیں تھا لیکن وہاں مختلف اڈوں کے چند آدمی ہمیشہ موجود رہتے تھے۔ اسٹیشن تقریباً ہر وقت مسافروں سے بھرا رہتا تھا۔ کسی بھی اڈے کا آدمی ہمیں وہاں مل سکتا تھا۔

گاڑی گرجتی ہوئی ہاوڑا کے پلیٹ فارم میں داخل ہوئی تو میری رگوں میں خون جمنے لگا۔ ہم پہلے اترے، بعد میں پیری اور آئیما وغیرہ۔ جمیل لنگڑا کے چل رہا تھا۔ پلیٹ فارم سے گزر کے ایک آدھ منٹ کے بعد جب ہم گیٹ سے باہر آ گئے تھے اور ٹیکسیوں کی طرف بڑھنا ہی چاہتے تھے کہ سامنے سے ایک آدمی بھاگتا ہوا ہماری طرف آیا۔ میں نے اُسے پہچان لیا۔ وہ بدرو تھا۔ بھیم پورہ کے اڈے کا آدمی۔ آتے ہی اُس نے جمیل کے پیر چھو لیے اور لپٹتے ہوئے بولا: "استاد تم؟"

"کیسا ہے رے بدرو؟" جمیل اُسے بدرو ہی کہتا تھا۔

"تم..... تم کدھر تھے استاد؟" وہ [illegible] سے بولا۔

"بڑی دور چلے گئے تھے؟"

"دور چلے گئے تھے؟" اُس کی آواز بھرا رہی تھی۔

اور ابا جان کو پہلے ہی اپنے سے جدا کر دیا تھا کہ ہمیں اپنے پیچھے
گزرنے والے شب و روز کا کوئی علم نہیں تھا۔ اس وقت جگل کی یہ
احتیاط مجھے فضول لگی تھی۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ
گاڑی سے اترنے کی دیر ہے، بدو چنگاریاں لیے کھڑا ہے۔
مشاعرے کے ختم ہونے کے بعد وہ ایک بار صوفی گھرشی نے پوچھا گیا
تھا۔ جگل کئی کئی مہینے میرے ساتھ اڈے سے بے خبر کبھی جنوبی
بلوچستان کبھی وسطی ہندوستان گھومتا رہا تھا۔ جب میں نے یہیں
میں گھرشی کو ختم کرنے والے لوگوں کو پہچاننے کے لیے جھنگا
استاد سے پالا پڑا تھا تو اسی دوران جگل بھی وہیں آگیا تھا لیکن اس
کے ساتھ کالے نتھے سجاد وغیرہ بھی تھے۔ اڈا چلتا رہا۔ ہم واپس آئے
تو کہیں سے کوئی شکایت نہیں ملی تھی۔ جنت کی طرف جاتے وقت
جگل شہر کے تمام اڈوں پر چھو گیا تھا اور اسے یقین ہو گا کہ اس
کے پیچھے کوئی الٹی سیدھی حرکت نہیں کرے گا۔ تبھی اس نے سفر کا
ارادہ کیا ہو گا اور تبھی اس نے کپتن خاں اور کالے نتھے پر بھروسا کر
لیا تھا ورنہ وہ جامو کو نہیں چھوڑ دیتا۔ ایک سلطان بخت کرتا تھا
مگر جگل اسے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ سلطان کے توقع میں ہی تھی
کہ وہ جگل کے خاص اڈے پر اس کی عدم موجودگی میں کوئی گڑبڑ
کرے گا۔ جامو سے اس کی نہیں بنتی تھی مگر اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اس
کی نگاہ میں جگل کے اڈے پر نظر ہوتی ہیں۔ گھرشی کو جگل کی سزا فوراً مل
گئی تھی۔ پہلی بار تو جگل ہی اسے جگل کے پاس لا کے معافی دلوانی تھی جگل
تیار نہیں تھا۔ ہم نے سفارش کی تھی اس لیے اسے درگزر کر دیا
تھا۔ گھرشی کے دماغ میں خناس سمایا ہوا تھا۔ باز نہیں آیا، دوسری
بار پھر غداری کی اور جامو نے اسے ہمیشہ کے لیے چپ کر دیا۔
اس کے بعد دور دور کوئی دوسرا گھرشی نظر نہیں آتا تھا۔ ہمارے
روانہ ہوتے وقت تمام اڈے ٹھیک ٹھاک چل رہے تھے۔

جگل کپتن خاں اور کالے نتھے کے بجائے اڈے پر اپنی عورت
رکھ جاتا تو بھی سب کچھ ایسے ہی رہنے کی امید تھی۔ اماں جگل نے
اپنی عورت نہیں رکھی تھی۔ وہ کپتن خاں اور کالے نتھے کو اپنی جگہ چھوڑ
گیا تھا۔ کالے نتھے کا خون کچھ زیادہ گرم تھا لیکن کپتن خاں اسے سرد
رکھنے کے لیے موجود تھا۔ مشہور تھا کہ چاقو ہاتھ میں آتے ہی کپتن خاں
کا رنگ بدل جاتا ہے، وہ کوئی دوسرا آدمی نظر آتا ہے پھر اس کا
چاقو ہوا سے باتیں کرتا ہے۔ وہ چاہتا تو لکھنؤ شہر کے سارے اڈے
اس کے چاقو کی نوک پر ہوتے مگر وہ اپنے ایک ہی اڈے میں
مست رہتا تھا اور وہاں بھی ٹک کے نہیں بیٹھتا تھا۔ کبھی نوچندی
میں نکلتے، کبھی آگرے، کبھی دلی۔ جہاں جہاں سے نئے مجرے کی
کوئی اچھی گانے والی اور اچھے ناک نقشے والی آتی ہے کپتن خاں
سارے کام چھوڑ کے پہلے وہیں کا رخ کرتا۔ سنتے ہیں وہ ایک بار

لڑکیوں کی خبر بھر لینے فیض آباد ضرور جاتا تھا۔ کبھی وہ وہاں ٹھہر جاتا۔
لڑکیوں کو اپنی بہن کی طرح سمجھتا تھا۔ شکل و صورت سے وہ کوئی نواب
لگتا تھا۔ ململ کا کرتا، دوپلی ٹوپی۔ کوئی کہہ ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ
ہتھیار اٹھانا آتا ہے۔ اصل عمری رنگت، سرخی مائل ڈیل ڈول
میں کسرتی جسم کا، مرچیں وہ سیاہی تھی۔ جس کام کا ارادہ کر لیتا، اس میں
جٹ جاتا۔ لکھنؤ میں لاڈو میاں کی بڑی دھوم تھی کہ اس کے پاس
بازار کا علاقہ تھا۔ ایک مدت تک یہ دستور رہا کہ لکھنؤ کے کسی
دوسرے اڈے کا کوئی آدمی بازار کا رخ کرتا تو پہلے لاڈو میاں کے اڈے
پر اپنی آمد کی خبر کرا دیتا یا وہاں متعین لاڈو میاں کے کسی آدمی کی نگرانی
میں اندر داخل ہوتا۔ یہ ایک رسم بن گئی تھی جس کا لاڈو میاں کی وجہ
سے بھی پاس کرتے تھے اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ لاڈو میاں نے اپنے
بڑے سے بڑے مخالف کو بازار میں داخل ہونے سے منع کیا ہو۔ اطلاع
دینی شرط تھی اور اطلاع ہو جانے کے بعد کسی قسم کی پابندی عائد نہیں کی
جاتی تھی۔ اس میں نہ کوئی الجھاؤ تھا، نہ جواب کا انتظار کرنا پڑتا تھا
اس لیے لوگ اطلاع بھیجنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے۔ کہتے ہیں
ایک زمانے سے لاڈو میاں بازار کے اڈے پر جما ہوا تھا۔ یہ سب
سے زیادہ آمدنی کا علاقہ تھا اور شہر اور اطراف کے منتخب آدمی یہاں
موجود تھے۔ دن بھر یہ لوگ شہ زوری کرتے رہتے۔ رات کو بن ٹھن
کے بازار میں نکلتے۔ لکھنؤ کے اڈوں کی صورت دوسرے شہروں کے
اڈوں سے کچھ مختلف تھی۔ وہاں بڑے نواب اور راجا لوگ ہر ماہ
ایک مخصوص رقم بھجواتے تھے، باقاعدہ طور پر اڈے صرف کہیں
کہیں قائم تھے لیکن اپنے اپنے علاقے موجود تھے جو ایک طرح سے
اڈوں کی حیثیت رکھتے تھے۔

وہ کپتن خاں ہی تھا جس نے پہلی مرتبہ بازار میں اپنی آمد کی
رسمی اطلاع لاڈو میاں کے اڈے پر نہیں بھجوائی۔ یہاں تک بھی
کوئی بات نہیں تھی۔ کپتن خاں رات کو علاقے میں داخل ہوتے
وقت ناکوں پر بیٹھے ہوئے لاڈو میاں کے آدمیوں سے بھی کہہ
سکتا تھا کہ وہ کوٹھا نمبر اندر جا رہا ہے۔ لاڈو میاں نے شہر کے
دوسرے اڈوں کے چند خاص آدمیوں کو اس رسم سے مستثنا قرار
دے رکھا تھا مگر کپتن خاں کا شمار اس زمرے میں بھی نہیں تھا۔
کپتن خاں کے ساتھ اپنے اڈے کا صرف ایک آدمی تھا۔ جب وہ
وہاں پہنچا اور اس نے لاڈو میاں کے کسی آدمی سے رابطہ قائم نہیں
کیا تو انھیں فکر ہوئی اور ابھی کپتن خاں ایک بالاخانے پر چڑھنے
کے لیے قدم بڑھا ہی رہا تھا کہ ایک شخص نے اس کا راستہ روک لیا۔
کپتن خاں نے دونوں بازوؤں میں لے کے اسے اپنے سامنے سے ہٹا
دیا اور اوپر چلا گیا۔ اس نے وہاں ایک گھنٹا ناچ دیکھا اور وہیں
کے کسی آدمی کے ذریعے اسے خبر ملی کہ نیچے لاڈو میاں اپنے

ساتھیوں سمیت موجود ہے۔ یہ سن کے گانے والی نے گانے سے
انکار کر دیا تھا۔ کپتن خاں نے اس کے اور اپنے درمیان چاقو رکھ
دیا، نتیجہ یہ نکلا کہ وہ ڈر گئی اور وہ ناچتی گاتی رہی۔ آدھی رات کے
وقت جب کپتن خاں اٹھا تو نیچے سب سے پہلے لاڈو میاں
سے اس کی مڈبھیڑ ہوئی۔ لاڈو میاں نے اسے یاد دلایا کہ یہاں کا
کیا دستور ہے۔ کپتن خاں نے ہنس کے جواب دیا، معلوم ہے،
ہمارا بھی کوئی دستور ہے۔ لاڈو میاں نے فیصلہ کرنے میں تاخیر
نہیں کی۔ دوسرے ہی لمحے اپنے ایک آدمی کو اشارہ کیا مگر کپتن
خاں نے کسی استاد کی طرح یہ خطرہ مول لیا تھا۔ چند ہی لمحے گزرے
ہوں گے کہ اس نے لاڈو میاں کے آدمی کا ہاتھ زخمی کر دیا تھا۔
لاڈو میاں کے لیے یہ خلاف توقع تھا۔ پہلے تو وہ خیر گزرنے کے لیے
کپتن خاں کو سمجھاتا رہا پھر کسی اور آدمی کو آزمانے کے بجائے
اس نے خود چاقو سنبھال لیا اور کپتن خاں کے مقابل آگیا۔
کپتن خاں اس کے لیے پہلے سے تیار تھا۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ
لاڈو میاں کو زندگی میں بہت کم ہتھیار اٹھانے کی ضرورت پڑی
تھی۔ یا تو وہ ہتھیار اٹھاتا ہی نہیں تھا، اٹھا لیتا تھا تو چاقو پوری
طرح اس کے قابو میں ہوتا تھا۔ اپنی مرضی کا فیصلہ کر کے ہی لاڈو
میاں ہتھیار بند کرتا تھا۔ کپتن خاں پر وار کرنے سے پہلے اس
نے اسے موقع دیا کہ وہ چلا جائے اور آیندہ ایسی غلطی نہ کرے۔
کپتن خاں نے جواب میں اس پہ چاقو تول لیا۔ گلی میں اس وقت
سناٹا چھا گیا تھا۔ قریب قریب کے تمام بالاخانوں پر ناچ گانا بند
ہو گیا تھا اور راہگیر ان کے گرد اکٹھے ہو گئے تھے۔ کپتن خاں کو دو
ایک ہی مرتبہ لاڈو میاں کے داؤ سے بچنا پڑا ہو گا کہ دیکھتے دیکھتے
وہ چلاوے اچھل کے تیزی سے چیتے کی طرح لاڈو میاں کے جسم پر گرا اور
اس کے چاقو والے بازو میں اپنے بازو سے پیچ ڈال دیا۔ کپتن
خاں نے ایک لمحہ جانے دیا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے دوبارہ
اچھل کے اس زور کا جھٹکا دیا کہ چاقو تو لاڈو میاں کے ہاتھ سے
گرا ہی گرا تھا، اس کے کلائی کی ہڈی بھی ٹوٹ گئی۔ بہت سے
لوگوں نے یہ منظر دیکھا تھا۔ کپتن خاں نے منٹ سے زیادہ وقت
نہیں لیا تھا۔ لوگوں نے بس دو باتیں دیکھیں۔ کپتن خاں کا اچانک
لاڈو میاں سے بھڑنا اور اگلے چند لمحوں میں لاڈو میاں کا ہاتھ جھٹکنا۔
لاڈو میاں کے کسی اور آدمی نے بڑھنے کی کوشش نہیں کی۔ چلتے
چلتے کپتن خاں اس سے کہتا گیا کہ صبح سورج نکلنے سے پہلے
وہ بازار کے اڈے پر نظر نہ آئے۔

اور یہی ہوا۔ سویرے کپتن خاں ابھی سو کے نہیں اٹھا تھا کہ
لاڈو میاں کے آدمی اس کے گھر کے باہر کھڑے تھے۔ وہ اسے اپنے
اڈے پر لے جانے آئے تھے۔ سنتے تھے کہ لاڈو میاں رات کو
اڈے واپس نہیں آیا۔ وہیں سے کہیں اور چلا گیا۔ اب کپتن خاں
آ کے اڈا سنبھالے۔ کپتن خاں نے انکار کر دیا اور کہا وہ اپنے
آدمیوں میں سے کسی کو چن لیں اور آیندہ لاڈو میاں کی ڈالی ہوئی
رسم کا اعادہ نہ کریں۔ کپتن خاں نے جان بوجھ کے منع کر دیا تھا۔
ایک تو وہ اپنا اڈا ہی نہیں دیکھ پاتا تھا، دوسرے اس طرح وہ لاڈو
کے ساتھیوں کو آپس میں جھگڑا کرا کے ان کی طاقت کمزور کر دینا
چاہتا تھا۔ اڈے کی گدی کے لیے ساتھیوں کا آپس میں لڑنا لازم
تھا۔ لاڈو میاں کے جانے کے بعد کئی آدمی مارے گئے، ایک کے
بعد ایک۔ کپتن خاں بیٹھا سنتا رہا۔ پھر بازار میں لاڈو میاں کا ایک
پرانا آدمی کسی طور جم گیا۔ تھوڑے عرصے میں اپنا نام بدل کے
گلباز رکھ لیا تھا۔ وہ ہمیشہ ایک کان میں بالا پہنتا تھا۔ گلاب کا
پھول اس میں ٹنکا رہتا اور گردن میں موتیا کا ہار پڑا رہتا تھا۔
جب بھی کپتن خاں بازار جاتا، گلباز بالے سے پھول نکال کے فوراً
جیب میں رکھ لیتا اور گردن سے ہار اتار کے کپتن خاں کی کلائی
میں باندھ دیتا۔ لاڈو میاں کے بازار سے جانے کے بعد جتنے بھی
آدمی اس کی جگہ آئے سب کپتن خاں کا احترام کرتے تھے۔
کپتن نے کبھی کسی سے کوئی مطالبہ نہیں کیا، کوئی حکم نہیں چلایا تھا،
معاملات میں کبھی دخل نہیں دیا تھا۔ اڈے پر لاڈو میاں کے پرانے
ساتھی ہی قابض تھے مگر ہر طرف یہی سمجھا جاتا تھا کہ بازار کے اڈے
پر اصل راج کپتن خاں ہی کا ہے۔ بازار میں جب بھی کوئی نئی طوائف
آتی تھی تو اسے لاڈو میاں کے ساتھیوں کے سامنے ناچ گانے کا
ایک دور ضرور کرنا پڑتا تھا مگر اب اس تقریب کا اہتمام صرف
کپتن خاں کے لیے ہوتا تھا۔ کپتن خاں کو اور کیا چاہیے تھا۔ اس
کے لیے اتنا ہی بہت تھا۔ جامو نے ایک بار مجھے کپتن خاں کا واقعہ سنایا تھا۔ اس
وقت یہ واقعہ گزرے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔ کپتن خاں کے بارے میں
اور بھی عجیب اور انوکھی باتیں مشہور تھیں۔ عجب پاگل سا تھا۔ ایک
دفعہ ایک نواب نے اس کی کسی بات سے خوش ہو کے اسے دس
ہزار روپے دیے۔ کپتن خاں رقم لے کے اپنے اڈے واپس جا
رہا تھا کہ راستے میں ایک جگہ بھیڑ دیکھی۔ ہندوؤں کا مجمع تھا اور
پنڈت زیر تعمیر مندر کے چبوترے پر کھڑا مندر کی عمارت مکمل
ہونے کے لیے دان مانگ رہا تھا۔ کپتن خاں نے چپکے سے اپنے
آدمی کے ہاتھ نوٹوں کی گڈیاں اسے بھجوا دیں اور اس سے پہلے کہ
پنڈت اس کا شکریہ ادا کرتا، کپتن خاں فوراً وہاں سے کھسک گیا۔
سب لوگ دیکھتے رہ گئے۔ اس کی صرف ایک بہن اور ماں ہی زندہ
تھی۔ بہن کی شادی ہو گئی تھی۔ ماں سیتاپور میں رہتی تھی، معلوم نہیں
انھیں خبر بھی ہوئی یا نہیں۔

ہی کچھ تھا جو جگل نے کپتن نماں کو کلکتے کا اپنا خاص اڈّا سونپ دیا تھا۔ کپتن نماں نے غیر ذمّے داری اور غفلت نہیں برتی ہوگی۔ کوئی اور بات ہوئی ہوگی۔ شعلی لالا' تھا۔ اڈّے پر جتنے لوگ تھے سبھی کی گرفت چاقو پر مضبوط تھی۔ کاٹتے پلک جھپکتے میں دوسرے کو بے بس کر دیتا تھا۔ اُس سے چاقو گروا لینا یا چھین لینا آسان نہیں تھا۔ شہر میں سبھی جانتے تھے کہ جگل کے آدمیوں سے چھیڑ چھاڑ کا نتیجہ لمحوں میں نکل آتا ہے اور کبھی اچھا نہیں نکلتا۔ جانے اُن سب کو کیا ہوگیا تھا۔

آیاجان کے ساتھ سامان اٹھاتے ہوئے قلی بے چین ہو رہے تھے اور آیاجان بھی۔ مارتی بھی ہمارے پاس آ گیا تھا۔ وہاں اُن کے پاس صرف زورا رہ گیا تھا یا قلی۔ زورا کو پتہ بتا کے سامان کے ساتھ صرف آیاجان کو نیص آباد بھیج دینا بھی کسی حال میں درست نہیں تھا۔ پھر نیص آباد ہی کیوں۔ آیاجان اپنے ٹھکانے پر ہی کیوں نہ جائیں جہاں فرنچ، فرنیچر، قالین اور کبھی چھوڑ کے آئے ہیں۔ ہم نے اُن کا ٹھکانا نہیں پوچھا تھا مگر کوئی ایسی جگہ ہوگی جہاں انھیں واپس جانا ہوگا۔ ساری محنت تو اس سامان کے سبب سے تھی جس میں کچھ بھرے ہوئے تھے۔ ممکن ہے آیاجان خود بھی تنہا سفر کرنا پسند نہ کریں نہ انھیں ایسا مشورہ دینا مناسب تھا۔ لیکن سرِدست کوئی جگل سے الگ ہونے اور اُن کے ساتھ جانے پر تیار نہیں تھا تو پھر یہ کہ انھیں کہاں ٹھہرایا جائے یا اپنے ساتھ ہی رکھا جائے؟ دوسرے اڈّوں کے بارے میں بھی کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ بدھو کی بات سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ آخر ہم کیوں پولیس کو مطلوب ہیں لیکن اب کچھ بھی بعید نہیں تھا۔ پولیس کی نظر ہمارے بعد فوراً انھی صندوقوں پر پڑے گی۔ اتنے بڑے شہر میں انھیں چھپانے اور آیاجان کو کسی محفوظ جگہ ٹھہرانے کا کوئی گوشہ، کوئی تہہ خانہ کم از کم میرے علم میں نہیں تھا۔ ہر جگہ مشکوک تھی۔ ایک کانسٹیبل کے نگاہ بھٹکنے اور صندوق کھلنے کی دیر ہوتی کہ سارے شہر کی پولیس حرکت میں آجاتی۔ اُن میں بہت سے پتھر ایسے تھے جن کی چمک سے آنکھیں پھٹ جائیں۔ صندوق کھلتے تو بات کہاں سے کہاں پہنچ سکتی تھی پھر نہ ہم کچھ بتلاتے نہ وہ کچھ کھوج پاتے۔ دونوں صورتوں میں سلاخیں مقدر تھیں۔ آیاجان کے لیے بھی' ہمارے لیے بھی۔

میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ میں جگل سے کہہ دیتا ہوں میں ہی چلا جاتا ہوں لیکن ارادے کے باوجود میری زبان نہیں کھلی۔ آیاجان کو حویلی میں پہنچا کے میں فوراً لوٹ سکتا تھا۔ ایک ڈیڑھ دن کا فرق پڑتا۔ دوسرے دن میں پھر کلکتے میں ہوتا مگر یہ رات کو تنہا مجھے پہاڑ معلوم ہوتی تھی۔ میں انھیں چھوڑ کے چلا جاؤں کیونکہ آیاجان اور اُن کے ساتھ دُنیا کا قیمتی ترین سامان ہے؟ میرا دماغ بالکل کام نہیں کر رہا تھا: ٹھیک ہے جگل بھائی! ابھی اِن کی بات سنو تو یکایک پیرو نے ایک کے نرم لہجے میں جگل کو مخاطب کیا۔ پیرو بھی یہی کچھ سوچ رہا تھا۔ وہ کہنے لگا کہ ہم میں سے کوئی نیص آباد نہیں جائے گا۔ سب یہیں رہیں گے' آیاجان بھی۔ اور جس طرح ہم دو اسٹیشن پہلے ایک دوسرے سے جدا ہو گئے تھے فوراً پھر الگ ہو جاتے ہیں۔ پیرو' زورا' مارتی اور آیاجان شہر کے کسی ہوٹل میں ٹھہر جاتے ہیں۔ جگل اور دوسرے لوگ ادھر اُدھر کی سن گن لینے کے لیے روانہ ہو جائیں یا سیدھے اڈّے کی طرف نکل جائیں۔ جگل نے نہ ہاں کی نہ ناں۔ وقت نہیں تھا۔ جاموں نے کسی توقف کے بغیر [illegible] اسٹریٹ پر واقع اوسط درجے کے ایک ہوٹل کا پتہ بتا دیا۔ جگل کی خاموشی ہی تائید تھی۔ پیرو نے اُس سے باقاعدہ طور پر پوچھنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ مارتی کو لے کے آگے بڑھ گیا اور مسافروں کے ہجوم میں گم ہو گیا۔ میں اُن کے ساتھ نہیں گیا۔ جگل نے مجھے پہلے ہی اُن سے الگ کر دیا تھا۔ پیرو مجھے لے جانا بھی چاہتا تو میں نہ جاتا۔ گوہر جیسی سامنے کو بلانے کے لیے بھاگتا ہوا اُس کے پاس پہنچا۔ چند قدم کا فاصلہ طے کر کے ہم اسٹیشن سے باہر تھے۔

اچھا ہی تھا کہ جس طرح بھی ہو سکے آیاجان جلد سے جلد شہر سے اور ہم سے دُور ہو جائیں۔ ہوٹل بھی کوئی مناسب جگہ نہیں تھی کسی کو بھی شک ہو سکتا تھا مگر ایسی صورت میں پیرو ہی کی تجویز بہتر تھی۔ کلکتے میں رہ کے وہ ہم سے قریب بھی رہے گا اور جس بھی وقت اُس کی ضرورت پڑی تو وہ برابر موجود ہو گا۔ وہ ہم سے اور ہم اُس سے رابطہ رکھ سکتے تھے۔ پیرو پہلی بار کلکتے آیا تھا۔ اڈّوں کے کم ہی لوگوں نے اُس کا چہرہ دیکھا ہو گا۔ دو سال نہیں کچھ مہینے کی مدّت کا فاصلہ تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ اُس کے نقوش اُن کی آنکھوں میں محفوظ ہوں۔ بس ابھی صرف بدھو نے پیرو کو ہمارے ساتھ دیکھا تھا۔ کسی اور کی نظر نہیں پڑی تھی۔ شاید بدھو نے توجہ نہ دی ہو۔ جس وقت اُس نے ہمیں اسٹیشن پر دیکھا تھا پیرو ہمارے ہمراہ نہیں تھا۔ پیرو کے ہمارے پاس آتے آتے بدھو اُسے دُور لے جا چکا تھا اور بدھو کو اُس وقت کسی اور طرف دیکھنے کی مہلت ہی نہیں ملی تھی لیکن اگر بدھو نے پیرو کو دیکھ لیا ہے تو وہ ہم سے جدا ہو کے یہ خبر عام کر سکتا تھا۔ ہم اُسے منع کرتے تو وہ خواہ مخواہ وہم میں پڑ جاتا۔ بدھو کیا، اڈّے کے کچھ اور آدمی بھی پیرو کو پہچان سکتے تھے۔ پیرو، مارتی اور زورا کے چہروں پر نقاب

نہیں پڑی تھی۔

اُدھر جگل کی کلکتے میں آمد کی خبر معلوم ہوتی اُدھر اتفاق سے کوئی پیرو کو پہچان لیتا یا بدھو کے پیٹ کو سہارا نہ ہوتی تو رتنا سے ہاتھ ملانے والے اپنی عادت سے باز نہ آتے۔ دونوں کی ایک ساتھ کلکتے میں آمد دونوں کو الگ الگ ہو جاتا۔ پیرو کا ہوٹل میں ٹھہرنا تاک جھانک کرنے والوں کو چکمانے کے لیے بہت تھا۔ پتہ نہیں کن کن اڈّوں کے آدمی جگل کے لیے اپنے سینے میں زہر چھپائے ہوئے ہوں گے۔ بوجھار کے اڈّے کے لوگ اُن میں پیش پیش تھے۔ رتنا نے انھیں اُکسایا ہو گا تو انھوں نے ضرور اُس کا ساتھ دیا ہو گا اور سب کو فکر ہو گی کہ جگل کسی دن کلکتے واپس نہ آ جائے۔ سب سے زیادہ فکر رتنا کو ہو گی۔ انھوں نے اپنے طور پر ضرور طے کیا ہو گا کہ جیسے ہی جگل کلکتے آئے اُسے کسمسانے کی مہلت نہ دی جائے۔ پہلے ہی قدم میں اُسے اُس کے ساتھیوں سمیت کلکتہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا جائے۔ دوسرے اڈّوں کی مدد کے بغیر رتنا تنہا یہ کام انجام نہیں دے سکتا تھا۔ یا ہو سکتا ہے اُس نے سوچا ہو کہ ایک بار جگل کے خاص اڈّے پر قبضہ کر لیا جائے۔ بعد میں اِدھر اُدھر کے اڈّے خود بخود ساتھ ہو جائیں گے۔ رتنا نے انھیں یقین کی حد تک فریب دیا ہو گا کہ جگل کا واپس آنا ممکن نہیں ہے اور اگر وہ آ بھی جائے گا تو اڈّا چھن جانے کے بعد وہ پہلے جیسا جگل نہیں ہو گا۔ رتنا نے انھیں بہلانے کے لیے بہت طرح کے اختیار کیے ہوں گے۔ طرح طرح کی باتیں بنائی ہوں گی۔

مگر خود رتنا نے اپنے آپ کو کس طرح مطمئن کیا ہو گا؟ اُسے ہر لمحے جگل کی واپسی کا دھڑکا ہو گا۔ کیا اُس کے ذہن میں ایسا کوئی امکان نہیں تھا یا وہ اُس کی واپسی کو کوئی اہمیت ہی نہیں دیتا تھا۔ وہ جگل کو بھول گیا تھا یا اُسے جگل کی عمر گزر جانے، بوڑھا ہو جانے کا گمان ہو چلا تھا۔ رتنا اتنے سال کلکتے سے باہر رہ کے اپنے اعتماد کا زور کرتا۔ اُسے پروان چڑھاتا رہا ہو گا۔ وہ اکیلا کلکتے نہیں آیا ہو گا۔ رتنا کو یقیناً جگل کے اڈّے کے کسی آدمی سے بھنک مل گئی تھی کہ جگل کسی لمبے سفر پر روانہ ہو چکا ہے یا کلکتہ چھوڑ گیا ہے کہ اُس کی واپسی مشکوک ہے۔ اُسے کسی نے بتایا ہو گا کہ جانے سے پہلے جگل نے اپنے بہت سے لوگوں کو اکٹھا کر کے بتایا تھا کہ اُسے بارہ ایسے آدمیوں کی ضرورت ہے جو اپنے آگے پیچھے کی فکر نہ رکھتے ہوں اور جو اپنا سب کچھ تیاگ کے اُس کے ساتھ چل سکیں۔ اُس نے اُن میں سے بارہ آدمی چنے تھے۔ جو رہ گئے وہ سب جگل کے چاہنے والے آدمی تھے مگر کسی نازک لمحے اُن کے منہ سے بات نکل گئی ہو یا کپتن نماں اور کاشتے ہی سے کوئی ناراض ہو گیا ہو۔ آدمی کا کیا بھروسا کوئی پتھر مار دے تو تڑپ اٹھے اور ایک تنکا چبھ جائے تو چیخ پڑے۔ کچھ بھی ہو۔ رتنا نے خوب سوچ سمجھ کے ہی جگل کے اڈّے کی طرف قدم بڑھائے ہوں گے۔ بھید سنبھالنے کا سلیقہ اُسے کچھ زیادہ ہی آگیا ہو گا مگر رتنا کے لیے یہ خبر کہ جگل کلکتے آ پہنچا ہے کسی عذاب سے کم نہ ہو گی۔ جو پیرو کا الگ ٹھہرنا تشویش کا سبب بن سکتا تھا۔ پیرو اور اُس کے ساتھی وہاں کیوں موجود ہیں۔ اُن کے ساتھ وہ بزرگ شخص کون ہے اور اُن صندوقوں میں کیسا سامان بھرا ہے۔ یہ لوگ اتنے دنوں تک کہاں تھے' کہاں سے آ رہے ہیں؟ جگل اور پیرو کا ایک وقت کلکتے میں لوٹنا محض اتفاق نہیں ہو گا اور ضروری نہیں کہ انھیں یہیں آ کے اپنے اڈّے کے متعلق خبر ملی ہو۔ وہ کہیں سفر پر بلکہ نہ گئے ہوں۔ ہر صورت رتنا کے آدمی ہاتھ دھو کے پیچھے پڑ جانے کی طرح لگے ہی ہوں گے۔ قدم قدم پر پیرو کی نگرانی بھی کرتے رہیں گے۔ ہو سکتا ہے پیرو کا ہوٹل میں ٹھہرنا کچھ زیادہ سود مند نہیں آتا مگر اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ پیرو سامنے کا آدمی نہیں ہے۔ لیکن جیسے رتنا کے آدمی بے سبب اُس سے اُلجھتے ہیں پیرو پر آڑی ترچھی نگاہیں ڈالنا ایسا آسان بھی نہیں تھا۔ شاید یہ معلوم ہو کہ پیرو کون ہے۔ رہا پولیس کا تو پولیس کا بھی کوئی الزام کے بغیر پیرو کے گرد حصار ڈالنے کا امکان نہیں تھا۔ کلکتے کی پولیس کے پاس اُس کا کوئی ریکارڈ نہیں ہے۔ نہ بمبئی سے کلکتے آنے جانے پر کوئی پابندی عائد ہے۔ نہ ہوٹل میں ٹھہرنا جرم ہے۔ ان تمام باتوں کے سوا پیرو خود بھی تو ہر ممکن احتیاط کرے گا۔ اپنے لیے نہیں تو آیاجان کے لیے۔ اُسے اندازہ ہو گا کہ ایک ذرا سی چوک کتنے بڑے حادثوں سے دوچار کر سکتی ہے۔

دھوپ چڑھ رہی تھی اور اسٹیشن کے باہر حسبِ معمول انسانوں کا سمندر بہہ رہا تھا۔ وہی عمارتیں وہی سواریاں وہی لوگ وہی چیخ پکار۔ حسبِ معمول ہمیں سانگ رہا تھا۔ ہم کسی سواری میں نہیں بیٹھے۔ جگل سر جھکائے چل رہا تھا۔ اِس وقت سب کے ذہن میں یہی تھا کہ ہم سیدھے اڈّے کی طرف جائیں گے۔ باہر آ کے احساس ہوا کہ کچھ جانے بوجھے بغیر اڈّے کا رُخ کرنا قرینِ عقل نہیں ہے۔ ابھی ہم کچھ بھی نہیں جانتے تھے کہ یہ سب کیوں اور کیسے ہو گیا۔ بدھو نے صرف چند باتیں بتائی تھیں جن سے حواس ہی برقرار نہیں رہے۔ وہی باتیں اتنی اچانک تھیں کہ کچھ اور جاننے کی سکت نہیں تھی۔ سارے بدھو کو الگ لے گیا تھا مگر باہر آ کے اُس نے اپنے ہونٹ بند رکھے نہ کسی نے اُس

بلی جاتی رہی۔ رتنا نے علاقے کے عام لوگوں کے لیے کھانے کا انتظام کروایا تھا۔ تقریباً سارا کھانا بے کار گیا۔ علاقے سے گنتی کے چند فقیر عطائی ہی شریک ہوئے یا وہ لوگ جنہیں زبردستی وہاں لایا گیا تھا۔ بریلا اکثر یہ بتاتا تھا کہ علاقے میں بسنے والے ایک دوسرے سے تجمل کے متعلق پوچھتے ہیں اور کوئی کسی کو جواب نہیں دے پاتا۔ رتنا نے شروع شروع میں سختی کی تھی پھر نرمی کرنے لگا۔ علاقے میں وہ تین چار دن کے وقفے سے گھومنے لگا ہے مگر کسی سے زیادہ بات نہیں کرتا۔ گزرتا ہوا چلا جاتا ہے۔ لوگ اس سے بات کرتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ علاقے کی دکانیں اب جلد ہی بند ہو جاتی ہیں۔ رات کو لوگ اپنے گھروں ہی میں رہتے ہیں۔ اڈے کے ارد گرد کی تمام گلیوں کی عورتیں صرف ضرورت کے وقت باہر نکلتی ہیں۔ مکانوں کی کھڑکیاں اور فلیٹوں کی بالکنیاں خالی رہتی ہیں۔

بنارس سنٹرل سے استاد موتی آیا تھا۔ رتنا سے جیل میں کاٹنے سے ملنے گیا تھا اور دو تین اڈوں کے بھی اس نے چکر لگائے تھے لیکن پولیس نے اس کا پیچھا کرنا شروع کر دیا۔ لوگ کہتے ہیں ایک دن اسے حوالات میں بھی رکھا۔ تین چار دن بعد پھر اسے کسی نے علاقے میں نہیں دیکھا۔ اڈے پر بیٹھے ابھی رتنا کو دو ایک روز ہی ہوئے تھے کہ ایک شام پولیس افسر دت چند سپاہیوں کے ساتھ اس کے پاس آیا تھا۔ آیا اور چلا گیا۔ معلوم نہیں دونوں کے درمیان کیا بات ہوئی۔ علاقے میں پولیس گشت کرتی رہتی ہے۔ کئی دن پہلے کی بات ہے۔ رتنا بازار سے گزر رہا تھا اس کے ساتھ کچھ اور آدمی بھی تھے کہ اچانک تیجا ایک گلی سے نمودار ہوا اور کھلے چاقو کے ساتھ رتنا کے عین سامنے آگیا۔ رتنا کے ساتھی اس کی دوڑ سے گھبرا کر رتنا کو خود چاقو کھولے دیکھ کے پیچھے ہٹ گئے۔ تیجا نے اتنا وقت دیا تھا کہ رتنا چاقو کھول سکے۔ وہ چاہتا تو جھپٹ کے اس کے سینے میں چاقو گھونپ دیتا یا اس کی جانب اچھال دیتا۔ گلی میں سکوت چھا گیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے مقابل تھے۔ تیجا نے اپنی طرف سے بہت کوشش کی۔ رتنا کو کئی بار بچا لیا مگر آخر رتنا نے اس سے چاقو چھین لیا۔ رتنا تیجا کو مار سکتا تھا اس کے بجائے اس نے تیجا کا چاقو اسے واپس کیا اور ایک طرف چل دیا۔

تیجا کھڑا دیکھتا رہ گیا اور اسی دن اس نے علاقے کی ایک دکان سے چوری کی۔ ایسی چوری کہ پکڑا جائے۔ تیجا اسی دن جیل چلا گیا۔ اس نے اتنے دنوں تک اپنے آپ کو کہیں چھپائے رکھا تھا۔ بریلا بتا رہا تھا کہ تیجا نے رتنا کے ہاتھوں اپنا چاقو چھنوا لیا۔ ہم نے تبصرہ نہیں کیا لیکن کسی کو یقین نہیں آتا تھا۔ تیجا کا ہاتھ قریب رتنا تھا۔ اس کے جسم میں بجلی بھری ہوئی تھی۔ بچپن ہی سے وہ تجمل کے ساتھ تھا اور اڈے کا خاص آدمی تھا۔ تجمل جانے

سے پہلے اس نے ہمارے ساتھ تیجا کو چلانے کی بھی کوشش کی تھی مگر تجمل نے اسے کلکتے ہی چھوڑ دیا تھا۔ تیجا کو بھی نہ جانے کیا ہوا! اس کا مطلب یہی تھا کہ رتنا نے اپنا ہاتھ خوب مانجھ کے اڈے کا رخ کیا ہے۔

چائے پڑے پڑے ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ کسی نے ایک گھونٹ بھی حلق سے نہیں اتارا تھا۔ سب یکایک گم صم ہو گئے۔ پھر تجمل اٹھ گیا تھا۔ "بند کرو اسے!" اس نے تتلاتے ہوئے لہجے میں ہم سے کہا اور اکیلا ہی آگے چل پڑا۔ بریلا اور بدرو بھی ہمارے ساتھ چلتے رہے۔ ہماری رفتار خاصی تیز تھی۔ کچھ دور چلنے کے بعد سڑک کے موڑ پر چنگا مل گیا۔ ہمیں دیکھ کے اس کا رنگ ایک لمحے کے لیے سفید پڑ گیا۔ چنگا کا تعلق حال ہی میں شمسو سے تھا۔ تاہم اس کا کچھ وہ تھا مگر سب اسے چنگا ہی کہتے تھے۔ ناکہ دھوبی کے اڈے کا آدمی تھا جب میں جیل میں تھا تو وہ وہاں کبھی کبھی چارا بھی بیچنے آجاتا تھا۔ ہم نے چنگا سے کچھ نہیں پوچھا تھا مگر شاید بدرو اور بریلے نے اپنے کہے ہوئے کی تصدیق کے لیے اسے اشارہ کر دیا تھا۔ چنگا نے کم و بیش وہی باتیں بتائیں جو پہلے بدرو اور بریلا ہمارے سامنے پھوٹ چکے تھے۔ البتہ چنگا کا کہنا تھا کہ رتنا کے آگے دو چار کے آدمی تھے اور رتنا خود بھی باہر سے آدمی لایا تھا۔ رات کو انھوں نے اڈا چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ اڈے کا دروازہ انھی کے ایک آدمی نے کھولا تھا جو کئی دن سے [illegible] سے اڈے ہی پر رہتا تھا۔ پولیس کو وہ آدمی اب تک نہیں ملا۔ تجمل کچھ اور سننا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے نگاہ اٹھا کے چنگا کو رخصت ہو جانے کی تلقین کی۔ چنگا کی زبان جیسے منجمد ہو گئی۔

اڈے کا فاصلہ چار پانچ میل سے کم نہیں ہو گا۔ اسٹیشن سے ہم خاصی دور تک پیدل آگئے تھے۔ میں نے سوچا ٹیکسی کو آواز دوں۔ جتنی دیر ہوئی تھی دل اڑتا جاتا تھا۔ جسم میں کوئی چیز جیسے ڈوب رہی تھی جیسے کوئی چیز الجھ گئی ہو۔ سارے جسم میں پھانسیں چبھ رہی ہوں۔ راستے میں اڈوں کے اور آدمی بھی مل سکتے تھے۔ اس سے پہلے کہ کوئی ہم سے پہلے پہنچ کے رتنا کو اطلاع دے ہمیں خود ہی اپنی آمد کی خبر کر دینی چاہیے۔ درمیان میں کہیں ہمیں پولیس بھی روک سکتی تھی لیکن معلوم نہیں تجمل کیا سوچ رہا تھا۔ جب اڈے ہی کی طرف جانا مقصود تھا تو کسی سواری میں کیوں نہیں؟ دیر کا بہت کچھ تھی کیا ابھی کچھ اور جاننے اور سوچنے کو رہ گیا تھا۔ تجمل بہادر پاؤں میں تکلیف کے باوجود تیز تیز چل رہا تھا۔ اس کا بڑا جانا پڑتا تھا۔ ہم وہاں سے راستہ کاٹ کے بھی نکل سکتے تھے مگر وہ اسی طرف جا رہا تھا۔ تھانے کے قریب اس نے مڑ کے پیچھے دیکھا اور شمولم کو بلایا۔ "چاہے تو نکل جائے۔" اس نے آہستگی

سے شمولم سے کہا۔

شمولم بڑھ کے اس کے گلے سے لپٹ گیا۔ شمولم جاپان ٹاؤن کے اڈے سے وابستہ تھا۔ تجمل نے تبت جاتے ہوئے اسٹیشن سے اسے اپنے ساتھ لیا تھا۔ اڈے کے چند خاص آدمیوں کے سوا کسی کو معلوم نہیں تھا کہ شمولم ہمارا ہم سفر ہے اور وہ ہمارے ساتھ بھی نہیں گیا تھا۔ ہم سے پہلے جا سوار پیرو وغیرہ ایک دن پیشتر دو ہر گروہ کے ساتھ کلکتے سے روانہ ہوئے تھے۔ شمولم بھی انھی کے ساتھ تھا۔ شمولم اسی وقت ہم سے الگ ہو سکتا تھا۔ اگر آگے پولیس کا کوئی چکر پڑنے والا تھا تو اس طرح شمولم صاف بچ سکتا ہے۔ مگر شمولم کیسے جاتا؟ تبت میں وہ قدم قدم پر ہمارے پہلو بہ پہلو رہا تھا۔ تیرے میرے عذاب میں خواہ مخواہ کا شریک۔ کئی بار بیمار پڑا، مرتے مرتے بچا۔ کبھی شکایت کا ایک حرف زبان پر نہ لایا۔ ہمیشہ کی طرح اس کا چہرہ مسکراتا ہی رہا۔ اب وہ کیسے چلا جاتا! تجمل نے اصرار بھی کیا۔ شمولم کی آنکھیں بھر آئیں۔ تجمل جو اس کے شانے پر ہاتھ رکھے بڑھتا رہا اور اسی وقت ایک ثانیے کے لیے میرا سارا جسم جھنجھنا سا گیا۔ جب تجمل آگے جانے کے بجائے تھانے کے پھاٹک میں داخل ہونے لگا۔ دروازے پر تعینات سنتری نے اسے غور سے دیکھا اور زور سے سیٹی بجائی۔ جواب میں اندر بھی سیٹیاں بجنے لگیں اور ہم عمارت کے آگے چھوٹا سا مختصر میدان عبور کر کے چبوترے پر تین چڑھے تھے کہ سپاہی چاروں طرف سے ابل پڑے اور ہمارے گرد پھیل گئے۔ اسی لمحے ایک دراز قد ادھیڑ عمر افسر جھاگ کا جیسا اندر سے آیا اور ٹھٹھک کے ہم سے کچھ فاصلے پر کھڑا ہماری صورتیں گھورنے لگا۔ "استاد تجمل!" وہ حیرت سے بولا۔

"ہاں سورتی بابو!" تجمل نے تھکے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

"مگر تم..... سب..." انسپکٹر کی آواز گلے میں اٹک گئی۔

"سوچا، ہم ہی چلے جائیں تمھیں تکلیف ہوگی۔ شہر آتے ہی پتہ چلا کہ تم لوگوں کو ہماری تلاش ہے۔" تجمل نے رک رک کے کہا۔

"تلاش! مگر تم لوگ تم سب کہاں تھے؟"

"ادھر سے دور تھے۔"

"آؤ۔ آؤ۔ اندر آجاؤ۔"

"اندر ہی جانے کے لیے آئے ہیں۔"

انسپکٹر سورتی جیسے ابھی سو کے اٹھا ہو اور خواب دیکھتا رہا ہو۔ وہ کچھ اس طرح ہڑبڑاتی پلکوں سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ کبھی ہمیں، کبھی سپاہیوں کو اور اپنے آپ کو۔ تجمل دو قدم چل کے چبوترے پر چڑھ گیا۔ انسپکٹر جھکتا ہوا اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔ اس کے پیچھے پیچھے ہم چلے۔ "بیٹھ جاؤ۔" اس نے تذبذب سے کہا۔ کرسیاں چار سے زیادہ نہیں تھیں۔ تجمل کھڑا رہا۔

"ٹھیک ہے سورتی بابو۔"

سورتی نے دوبارہ بیٹھنے کو نہیں کہا۔ "ہمیں تمھاری تلاش تھی۔ ہمیں ٹھیک بتایا گیا۔ ہمیں تمھاری تلاش تھی۔" سورتی کی آواز لپک رہی تھی۔

"اسی کارن ہم خود آگئے۔"

"مگر یہ سب کیا ہوا ہے؟" سورتی اضطراب سے بولا۔

"یہی اپنے کو بھی تم سے پوچھنا ہے۔"

"تم کچھ نہیں جانتے؟" اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

"تھوڑا بہت جانا ہے۔ پر اصل تو تم سے پوچھنا ہے۔"

"ٹھہرو!" وہ ایک دم اٹھ کے بولا۔ "ڈی ایس پی صاحب بھی ہیں۔" ڈی ایس پی اچند ساتھ چھوٹے سے ملحقہ کمرے سے باہر چلا گیا اور اسی لمحے واپس آگیا۔ وردی میں ملبوس ایک شخص کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ دراز قد بھاری کمر کے آدھے بال اڑے ہوئے۔ بھوری آنکھیں سرخی رنگت۔ یہ ڈی ایس پی ٹھاکر ہوگا۔ تجمل نے ایک ہاتھ ذرا سا اٹھا کے اسے سلام کیا۔

"سلام صاحب۔"

"سلام۔" وہ گردن ہلا کے گونجتی آواز میں بولا۔ "استاد تجمل؟"

"ہاں صاحب!" تجمل نے نرمی سے کہا۔

"تم کہاں تھے؟"

"سفر پہ تھے ٹھاکر جی!"

"کون سے سفر پہ؟"

"ذرا دور چلے گئے تھے۔"

ٹھاکر کے ہونٹ باہر نکل آئے۔ "کہاں!"

"کوئی ایک جگہ ہو تو نام لیں۔ دور دور گھوم رہے تھے۔"

"بتانا نہیں چاہتے؟" وہ جزبز ہو کے بولا۔

"ادھر کلکتے میں نہیں تھے ٹھاکر جی!"

"مگر یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ کون سی جگہ تھے؟"

"دھیرج رکھیں صاحب۔ وقت آئے گا تو ہم کو بھی بول دیں گے۔" تجمل نے کسمسا کے کہا۔ "آپ کو اپنی جو کارروائی کرنی ہے کرو۔"

"جانتے ہو تم پہ کیا الزام ہے؟"

"اپنی ساری زندگانی الزام ہے۔ اب کیا کوئی پیچھے رہ گیا ہے۔"

"بہت بڑھ کے استاد!" ٹھاکر کی آواز کڑک کی طرح [illegible] "یہ میں نے پہلے بھی کئی بار کہا ہے۔ ایک آخری وقت ضرور

آئے گا۔ تم بچ نہیں سکو گے۔"

"یاد ہے مائی باپ! ابھی بھی ایک بات شاید سرکار کو یاد ہو۔ میں نے بولا تھا، آخری وقت آئے گا تو کون رہ کے گا بیڑا۔ ایسا لگتا ہے کہ اب کے آگیا۔ پرنٹ کھٹ جل سے ہو کے نکل جاتا ہے۔" جھل نے مدھم لہجے میں کہا۔

"ہمیں اُوپر سے سخت حکم ہیں۔"

"ہم آپ کے سامنے ہیں ماتھر جی! اسٹیشن سے نکلے پیدل آنا ہی پڑتا تھا، سو ہم ادھر ہی آگئے۔"

ماتھر نے ہنکاری بھری اور کنپٹیاں مسلتا ہوا تیزی سے بولا۔ "تو تم کہتے ہو تم یہاں اس شہر میں نہیں تھے؟"

"ہاں صاحب! ایسا ہی بولا ہے۔"

"مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ تم یہاں تھے یا نہیں۔"

"آپ ٹھیک بولتے ہو۔ پھر آپ کیا پوچھتے ہو۔ آپ کے لیے ہمیں پتہ تو پڑا، اپنے لیے بہت پڑ گیا ہے۔"

"کتنے دنوں سے تم باہر تھے؟" وہ بلبلا کے بولا۔

"آدھے سال سے اوپر ہونے کو ہو گا۔"

"باہر کیا کر رہے تھے؟"

"ہم لوگ کیا کر سکتے ہیں۔" جھل نے تنک کے کہا۔ "سامنے سوال ادھر ہی کا ہو گا تو ادھر کے لیے کیا بچے گا۔ باہر کیونکر آئے تھے۔"

ماتھر کے لب ... سلوٹیں پڑ گئیں، کچھ بولتے بولتے رہ گیا۔ کمرہ بڑا تھا۔ میز کے پیچھے اور چاروں دائیں بائیں کئی سپاہی مستعد کھڑے تھے۔ ماتھر نے چاروں طرف ایک اچٹتی نظر ڈالی اور انسپکٹر سوتی سے سرگوشیانہ لہجے میں کچھ کہنے لگا۔ سوتی فوراً باہر چلا گیا۔ چند لمحے یوں ہی گزر گئے۔ بلا کو میرے قریب میرا بازو پکڑے کھڑا تھا، جا کو جھل کے پاس تھا۔ باقی سب پیچھے تھے۔ یکبارگی ماتھر چاٹ جیسے لہجے میں بولا۔ "میں نے تم سے بولا ہے اُوپر سے بہت دباؤ ہے۔"

"ہو گا، ضرور ہو گا۔ پر زور تو دونوں طرف سے لگتا ہے۔ اُوپر سے بھی، نیچے سے بھی۔ نیچے والے بھی کم زور سے نہیں کھینچتے، پھر ... سے ٹوٹ جاتے۔ بھاگ بیٹھتے ہیں۔ آپ کوئی نئے تو نہیں ہو، جانتے ہو اُوپر کا زور کب تک چلے گا۔ نیچے والے سارا دھواں اُڑا دیں گے۔"

"تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"اپنا کہنا کیا، سرکار کی دہائی دیتے ہیں۔"

"استاد جھل!" ماتھر نے اونچی آواز میں کہا۔ "بہتر ہے سیدھی بات کرو۔ جو کچھ ہوا ہے وہ نہایت سنگین ہے۔ ابھی تک ہم کسی نتیجے پر نہیں پہنچے ہیں لیکن سب کا خیال ہے کہ ....."

"پھر دیر کس بات کی ہے۔" جھل بیچ میں بولا۔

"دیر شاید تمھارے آنے کی تھی۔" ماتھر نے تلخی سے کہا۔

"ہمارے سر ہمارے ساتھ ہیں۔"

"سروں کا فیصلہ بھی ہو جائے گا لیکن اس سے پہلے تمھارے پاس موقع ہے، تمھیں جو کچھ کہنا ہو کہہ سکتے ہو۔"

"ایک ہی جگہ پھر سب بول دیں گے۔"

"تمھارا یہاں کا بیان بھی اُدھر کام دے گا۔"

"آپ کے رنگ دیکھتے ہوئے اپنے کو بھی تھوڑی بہت جان کاری ہو گئی ہے۔ بیان کو پلٹا کرنے میں صرف زبان ہلتی ہے۔"

"تو تم یہاں کچھ کہنا نہیں چاہتے؟"

"ایک ہی بار جو بولنا ہو گا، بول دیں گے۔ اُدھر اِدھر لینے سے کواڑ بند نہیں ہو جائیں گے۔ آپ حکم کرو۔"

"ہمارے پاس تمھارے وارنٹ نہیں ہیں۔"

"آپ کی انگلی ہی وارنٹ ہے۔ وارنٹ بننے میں کیا ٹائم لگتا ہے۔"

"لیکن اگر تم چاہو تو اس کی نوبت نہیں آئے گی۔"

ماتھر کی بات سن کے جھل کے ہونٹوں پہ بجھی ہوئی پپڑی ترخنے سی لگی۔ اس کا باچھا چھل گیا۔ جیب سے بیڑی کا بنڈل نکال کے اس نے بیڑی سلگائی۔ "ذرا پانی پلاؤ حوالدار۔" اس نے قریب کھڑے ہوئے حوالدار سے کہا۔ ماتھر کے اشارے پہ وہ ایک کے گلاس میں پانی لے آیا۔ جھل نے ایک ہی سانس میں سارا پانی حلق میں انڈیل لیا اور بیڑی کے دو ایک لمبے کش کھینچ کے بولا۔

"ابھی گاڑی سے اُتر کے سب سے پہلے جھکّے کا مال بدلا تھا۔ بولتا تھا، لوٹ جاؤ، پولیس تمھاری تلاش میں ہے۔ پھر دو ملنے والا بنا، سلام کا جواب ملا۔ یہی یہی بولتا تھا۔ سو ہم آگے پیچھے کدھر گئے نہیں۔ سیدھے ادھری آرہے ہیں۔ ہم کہیں اور بھی جا سکتے تھے۔ ... سن کے اپنے کو بھی پولیس کی تلاش تھی۔"

"تمھارے کہنے کا مطلب ہے۔" ماتھر کی آنکھیں سکڑ کے اور چھوٹی ہو گئیں۔ "یہاں آنے سے پہلے تمھیں کچھ بھی معلوم نہیں تھا؟"

"ایسا ہی سمجھو۔"

"یعنی تم اس عرصے میں بالکل بے خبر رہے؟"

"اتنے دنوں بعد پھر آپ کے درشن نہیں ہوتے۔"

"سنو استاد جھل!" ماتھر لپک کے بولا۔ "تم ایسی کون سی جگہ تھے جہاں تمھیں اپنے آدمیوں کی بھی خبر نہ مل سکتی ہو۔ شاید ان لوگوں نے تمھیں بتایا ہو۔" ماتھر کے لہجے کا طنز چھپا ہوا نہیں تھا۔ "اس واقعے کو ڈیڑھ مہینہ ہو رہا ہے۔ گلی گلی اس خبر کا چرچا ہے۔ تمھیں

کسی نے نہیں بتایا کہ تمھارے پیچھے محلّے میں کیا ہوا، کیا ہو رہا ہے اور تم نے بھی لوٹ کے خبر نہیں لی؟"

ڈی ایس پی ماتھر لوٹ پھیر کے ایک ہی بات کی تکرار کر رہا تھا جس کا جھل کے پاس جواب نہیں تھا۔ کھڑے کھڑے میری ٹانگیں دُکھنے لگی تھیں۔ جیسے میں ایک زمانے سے یوں ہی کھڑا ہوں۔ میرا دل کہیں دھنسا جا رہا تھا۔ ہمیں شاید سیدھے اُدھر ہی کی طرف جانا چاہیے تھا۔ بعد میں یہاں آنا پڑتا تو اتنی گھٹن نہ ہوتی۔ ماتھر کی چمکتی نظریں جھل پہ مرکوز تھیں۔ "ہم کچھ بولیں گے تو تم نہیں سمجھو گے۔" جھل نے سانس لے کے کہا۔

"ہمیں سمجھاؤ، استاد جھل! ہم سمجھنا چاہتے ہیں۔"

"اپنے لیے یہ بعد کی بات ہے۔"

"اور پولیس کے لیے پہلی۔"

"رسّی کا ایک سرا نہیں ہوتا اور ٹوٹی ہوئی ہو تو بہت سے ہوتے ہیں۔"

"پولیس تمھارے باہر ہونے کی شہادت طلب کرے گی۔"

"اور ہم اپنے باہر ہونے کی پولیس سے نہیں کریں گے۔ جانے دو ماتھر جی! اس بات کو جانے دو۔" جھل نے زہرخند سے کہا۔

"مگر اس بات پہ تم گرفتار کیے جا سکتے ہو اور یہی بات تمھیں آگے جا کے ثابت کرنی پڑے گی۔" ماتھر دھمکتے لہجے میں بولا۔

"اور ہم کیا بول رہے ہیں۔ آگے والوں کو بھی کچھ ثابت کرنا پڑے گا۔ آگے والے ایک ادھر سے دیکھتے، ایک کان سے سُن نہیں گیا! وہ پہلے اپنے ماتھے کا ٹھپا دیکھیں گے، پھر بات کریں گے جیسا تم کر رہے ہو۔"

"ہماری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا، تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"کچھ سمجھنے کے لیے آنکھیں بدلنا پڑیں گی ماتھر جی! ساون کے اندھے کو ایک ہی رنگ سوجھتا ہے۔ اپنے کو تم نے سدا سلاخوں اور زنجیروں کے ساتھ دیکھا ہے، جن میں ایک ہی صورت بنائی ہوتی ہے۔ ہو بلا ہی پہ جل کرے گی سرکار۔ جس کے جدی ہونٹ ... پلٹ کے دیکھتے ہو وہ کدھر کو تھا۔ تمھیں یہ ٹھپا ہی لگاتے جاؤ گے۔" جھل کی آواز پھٹنے لگی تھی۔ "گریبان میں کو کچھ ڈالنا آتا ہے کیا! ہم کو اُوپر چڑھنا نہیں آتا۔"

"دیکھو جھل! بگاڑ کرنے سے بگاڑ پیدا ہو گا۔" ماتھر نے اپنا لہجہ نرم رکھنے کی ناکام کوشش کی۔ اس کی پیشانی پہ پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ "اپنی یہ صورت تم نے بنائی ہے، تمھی اب سے سمجھو۔ یہ معاملہ الجھانے کی کوشش مت کرو۔ اس طرح کی باتیں کر کے کیا جتانا چاہتے ہو۔ میں کہتا ہوں تم اپنے لیے برا کر رہے ہو۔ بہت برا۔ تم کس کے سامنے بیٹھے ہو، کسی ایسے شخص کے سامنے نہیں جو تمھیں نہ جانتا ہو۔ میں تمھیں اس وقت سے جانتا ہوں جب تم ایک معمولی سپاہی تھا اور میں کیا، یہاں سبھی جانتے ہیں کہ جھل....."

"کوئی نہیں جانتا ماتھر جی!" جھل اس کی بات کاٹ کے بولا۔

"کوئی نہیں جانتا کہ وہ کون ہے، کیا کرتا ہے، کہاں رہتا ہے، کتنے دن گھر بیٹھتا ہے، کتنے دن گھر سے باہر، کن لوگوں کے ساتھ اس کا اٹھنا بیٹھنا ہے۔ اس کی جیب میں ہمیشہ ایک ہتھیار رہتا ہے۔ اس کے اشارے پہ زندگی اور موت کا فیصلہ ہوتا ہے۔ اس کی کوئی گلی سیدھی نہیں، اس کی نہ دوستی اچھی ہے نہ دشمنی۔ کتنے قاتل جمع ہوئے ہیں۔ کیا میں ان سب کو گنواؤں جو میرے علم میں ہیں۔ جو میرے علم میں نہیں ان کی تعداد اور زیادہ ہو گی۔ تمھارا سارا ریکارڈ کاغذوں میں محفوظ ہے۔ ستارے اچھے لے کے آئے ہو، ہر بار ساتھ دے جاتے ہیں مگر کب تک....."

ڈی ایس پی ماتھر کی زبان میں جیسے آگ سُلگ رہی تھی۔ اس دوران انسپکٹر سوتی واپس آگیا۔ ماتھر نے رُک کے اس کی طرف بے چینی سے دیکھا۔ سوتی نے اثبات میں گردن ہلائی اور انگریزی میں کچھ کہا جسے میں سُن نہیں سکا۔ سوتی کو اپنے قریب رکھی کرسی پہ بیٹھنے کا حکم دے کے ماتھر بگڑتے ہوئے منھ سے بولا۔ مگر اس کے لہجے میں کسی قدر ٹھہراؤ آگیا تھا۔ "سنو، ہم نے شہر میں اپنی تمام کوشش کی ہے، کوئی کونا نہیں چھوڑا ہے۔ ہم نے متعدد آدمیوں کو پکڑا اور ان سے کچھ اگلوانے، کچھ جاننے کا ہر جتن کیا ہے۔ کہیں سے کوئی سراغ نہیں ملا، کوئی سِرا جسے پکڑ کے ہم آگے بڑھ سکتے۔ استاد جھل اچانک اپنے آدمیوں کے ساتھ کہیں چلا جاتا ہے، اتا پتہ دیے بغیر۔ اس کے خاص آدمی نہیں جانتے کہ وہ کس طرف گیا ہے۔ وہ لکھنؤ کے ایک بدنام شخص کپتن خاں کو اپنے اڈّے پہ چھوڑ جاتا ہے۔ کپتن خاں کی موت سے تین دن پہلے استاد جھل کا ایک اور خاص آدمی کالے نتھے یا ایک شہر سے غائب ہو جاتا ہے اور اس کی غیر حاضری میں وہ سب کچھ ہو جاتا ہے جس کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ جب کالے نتھے واپس آتکتا ہے تو اُلٹی باتیں کرتا ہے۔ نہیں بتاتا کہ کہاں گیا تھا۔ وہی کچھ بولتا ہے جو تم کہہ رہے ہو۔ تم واپس آتے ہو تو تم بھی لاعلمی ظاہر کرتے ہو۔ پھر پانی کہاں گرے، نگاہ کس طرف پھسلے؟ ہم کون سا سرا پکڑیں؟"

جھل نیم وا آنکھوں سے سُنتا رہا۔ "جواب دو جھل!" ماتھر درشتی سے بولا۔

"کیا جواب دیں ماتھر جی! آپ سارا کچھ بول دیے ہو۔ اب اپنی زبان کھولنے کو کیا رہ جاتا ہے۔" جھل نے زیرلبی سے کہا۔

"ایسی صورت میں کیا یہ سمجھا جائے کہ تمھیں سب تسلیم ہے؟"

"آپ کی خوشی اس میں ہے تو تسلیم قبول۔"

"تم ایک پولیس اسٹیشن میں بیٹھے ہو استاد قبول! اور ایک ذمے دار آدمی سے مخاطب ہو۔" ماتھر نے بیزاری سے کہا۔

"منھ کو یہاں بگاڑو اور ڈالو دو ہم سب کے ہاتھوں میں۔"

"کیا خیال ہے تم سے مزید گفتگو کرنا بے کار ہے۔"

"یہ ایک بات رہ گئی ہے آپ کی مرضی ہو تو بولیں۔" قبول نے سر جھکا کے کہا اور اپنی ٹانگ اٹھا کے ایک جھٹکا دیا، مسلسل کھڑے رہنے سے اُس کی تکلیف اور بڑھ گئی ہوگی۔

"تم.... تم بیٹھ جاؤ استاد۔" بلا کو نے جھجکتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ قبول نے اُلٹے ہاتھ سے جھٹ اس کے منہ پر طمانچہ رسید کیا۔ بلا کو بیلا پڑ دیکھتے ہوئے تھا، اس کی جھونک میں تھی ہی کرسی پر گرتے گرتے بچا۔

"معاف میں میرے قبول۔" سورتی نے ناراضی سے کہا۔

ماتھر نے انسپکٹر سورتی کی مداخلت پر منہ بنایا اور میز پر جھکی ہے کے اُسے چپ رہنے کی تلقین کی۔ "تم کیا کہہ رہے تھے؟" دوسرے ہی لمحے اس نے قبول سے پوچھا۔

"بولتا تھا، ایک بات رہ گئی ہے آپ کی مرضی ہو تو بولیں۔"

"ہاں ہاں کہو۔" ماتھر نے تجسس سے کہا۔

"اپنے آدمی اپنے کو واپس کر دو۔"

ماتھر اپنی کرسی پر سیدھا نہیں رہ سکا۔ "کیا.... کیا؟"

"ہم آپ سے اپنے آدمی واپس مانگتے ہیں۔" قبول نے نرم آواز میں کہا۔

"تمھارے آدمی تمھیں واپس کر دیں۔" ماتھر نے اضطراب سے دُہرایا۔ "یہی کہہ رہے ہو تم؟"

"آپ نے ٹھیک سُنا ہے۔"

"تم.... تم پاگل ہو گئے ہو کیا؟"

"کیوں صاب! ہم اُن کو آپ سے نہیں مانگ سکتے؟"

"تم کیا، کیا بک رہے ہو؟"

"ٹھیک ہی بک رہے ہیں ماتھر جی! اِدھر اُدھر کی بات چھوڑو، ساری دنیا کی چوکی داری کرتے پھرتے ہو، اپنے آدمیوں کی رکھوالی نہیں کی گئی۔ ہم کس کے پاس جائیں اور اُن کو آپ سے پھر کون واپس مانگنے آئے گا۔ مدعی بننے کا حق صرف تمھی کو ہے؟ ہم کو نہیں ہے؟"

ماتھر کچھ لمحے تک ساکت نظروں سے قبول کی صورت دیکھتا رہا۔ اس نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا پھر جیسے اچانک اُسے کچھ خیال آ گیا ہو، اُس کے ہونٹوں پر استہزائی مسکراہٹ کھیل اٹھی۔

"خوب خوب استاد قبول! اچھا منتر ابلا ہے تم نے۔"

"کیوں سرکار! ہم نے زبان کھولی تو منتر ہو گیا؟"

ماتھر کے چہرے پر درشتی کی لکیریں اُبھر آئیں۔ "تمھارے دماغ میں اگر یہ خناس ہے کہ یہیں دھیان بٹا کے اور معاملے کو اُلجھا کے تم کچھ حاصل کر سکو گے تو اسے نکال دو۔ اس طرح تمھیں شاید کچھ وقت ضرور مل جائے مگر وہ سارے نتیجہ وہی نکلے گا جو ان حالات میں نکلنا چاہیے۔ اچھی طرح کانوں میں ڈال لو، پولیس اس طرح تمھیں کوئی بخشش دینے کو تیار نہیں ہے۔"

"میری بات کا جواب دو ماتھر جی! اپنے آدمی کدھر ہیں؟"

"میری جیب میں ہیں۔" ماتھر بھڑک کے بولا۔

"ہم بولتے ہیں اُن کو ہمیں واپس کر دو۔"

"ورنہ، ورنہ تم کیا کرو گے؟" ماتھر کی چیختی آواز گرجی۔

"جو ان پڑے گا کریں گے۔"

"قبول! قبول! فضول کی باتیں نہ کرو۔" ماتھر جھنجھلا کے بولا۔

"اپنی باتیں فضول لگتی ہیں صاب! ہمارے آدمی چلے گئے ایک نہیں کئی، ہم سے بولتے ہو گھٹیں مت، بجا ارشوت کرو، ہم اپنے آدمی اِدھر چھوڑ گئے تھے۔ ایک سے ایک ہیرا تھا اُن میں، آپ اُن کو نہیں جانتے۔ ہم جانتے ہیں وہ کون تھے، اُن کا ہاتھ کتنا بھل تھا، اُن کے پنجوں میں لوہا بھرا ہوا تھا، رگوں میں بجلی دوڑتی تھی، اُن کے دل کی چادر بہت بڑی تھی، سب کچھ اُس میں سما جاتا تھا۔ اُن کا بل تھا۔ اُن کے نینوں میں صرف آسمان کے دو اڈے کے آدمی تھے۔ یہ اپنے وہ بھائی تھے بیٹے تھے۔ بلکہ ہاتھ پیر تھے۔ ہم سے فضول کرتے ہو کہ تم نے اپنی ہی ٹولیاں بنا لیں، اپنی ہی بوٹیاں نوچ لیں۔ آپ بولتے ہو کہ جانے آپ کے بھیجے کا غذ الماریوں میں بند ہیں، اُن میں کہیں لکھا ہے کہ جس نے پیچھے سے کس چھرا گھونپا ہے، اُلٹی طرف سے ناک پکڑی ہے۔ اُن کو آگے سے بٹانا ہوتا تو اُن کا سُر تو بھی آپ کو نہیں تھا۔ بچہ پانی پینے چلے گلگتے سے جانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ کپتن خاں اپنے ہی آدمیوں کے بیچ بیٹھا تھا ماتھر جی! کپتن خاں نے اپنا کوئی خزانہ چھپا لیا تھا یا اپنی جاگیر کو قبضہ کر لیا تھا؟ اُس نے اپنی ماں کے ساتھ حرام کیا تھا تو دوسرے نے کیا کیا تھا؟ ہم اُسے اُدھر بیٹھا کے گئے تھے۔ کچھ سوچ سمجھ کے ہی بیٹھایا ہوگا۔ اُدھر آپ کے سر کی جگہ اوپر پھیر آگ آتے ہیں تو ہمیں آپ کو سامنے نظر آتے ہیں۔"

قبول کی آواز جھلائی ہوئی تھی، مگر سپاٹ۔ کمرے میں ایک اُسی کی آواز گونج رہی تھی اور جیسے ہر چیز بے آواز ہو گئی

تھی۔ دیواروں کے ساتھ کھڑے ہوئے سپاہی ٹکٹکی باندھے اُسی کو دیکھ رہے تھے۔ بتوں کے مانند بے حرکت۔ انسپکٹر سورتی اور ماتھر کے چہروں پر تشنہ سی چھائی ہوئی تھی۔ قبول نے ایک لمبے عرصے کا اٹھا ہوا پیر اٹھا کے دوبارہ زمین پر ٹکایا اور ہانپنے لگا۔ "کوئی نہیں ملا، بولتے ہو شہر کا کونا کونا چھان مارا۔ کوئی نہیں ملا! یا کسی کو دیکھنا نہیں چاہا! اُن سوروں کی اولادوں نے آنکھوں پر چربی چڑھا دی۔ سامنے موٹا ہی مونا دکھائی دیا۔ انھی لوگوں پر کانٹا پھینک دیا جو سالے پہلے ہی تڑپ رہے تھے۔ کدھر دیکھا؟ کدھر کو دیکھا؟ ہمارا بیکار رہ ہے تو اپنے پاس بھی وردی والوں کا ریکارڈ ہے۔"

قبول چپ ہو گیا۔ میرے جی میں آئی کہ میں بولوں، میں ڈی ایس پی ماتھر سے ایک سوال کروں لیکن قبول کی طرف دیکھ کے میں نے خاموشی مناسب سمجھی۔ ماتھر کے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے۔ قبول کے چپ ہو جانے پر وہ چونک سا پڑا۔ "کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم نے ان تمام پہلوؤں پر غور نہیں کیا ہوگا۔ ہم نے کوئی.... " وہ جھنجھلاتے ہوئے لہجے میں بولا اور اس کی بات منہ ہی میں رہ گئی کیونکہ باہر سے سیٹیاں بجنے اور گاڑیاں رکنے کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ انسپکٹر سورتی یک لخت کھڑا ہو گیا۔ پھر ماتھر بھی دونوں سپاہیوں کو اشارہ کرتے ہوئے فوراً ہی باہر چلے گئے۔ سائبان میں گونجتی ہوئی سلیوٹ کرنے اور جوتوں کی کھٹ کھٹ کی آوازیں ہم سے قریب ہو رہی تھیں پھر وہ دور ہوتی گئیں۔ ماتھر اور سورتی دیر تک نہیں آئے۔ اس دوران ہم ایک دوسرے کو بس دیکھا کیے۔ کسی نے ایک لفظ دوسرے سے نہیں کہا۔ نہ قبول نے۔ سب وہیں کھڑے ماتھر کی واپسی کا انتظار کرتے رہے۔ ماتھر نہیں آیا۔ آٹھ دس منٹ بعد انسپکٹر سورتی تیز رفتاری سے اندر داخل ہوا اور تُرش و تیز لہجے میں بولا۔ "میرے ساتھ آؤ۔"

قبول کی آنکھوں سے سُرخی اُبلنے لگی لیکن وہ کچھ کہے بغیر سورتی کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ سائبان میں دبا دبا سا شور اُٹھا ہوا تھا اور سپاہیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ وہ سب کے سب فاصلے فاصلے پر منتظر کھڑے تھے۔ بیچ کے دو تین کمرے چھوڑ کے سورتی ایک کشادہ گلی نما راستے میں مڑ گیا اور کچھ آگے جا کے ایک بڑے کمرے میں آ گیا جو ایک ہال سے مشابہ تھا۔ کمرے کی چھت اونچی اور گنبد کی شکل کی تھی۔ وہاں کئی پولیس افسران بیٹھے تھے، اُن کی وردیوں اور بیجوں سے پتہ چلتا تھا کہ وہ اعلا افسران ہیں۔ ڈی ایس پی ماتھر بھی اُن میں موجود تھا۔ وسط میں ایک چوڑی میز کے ایک طرف کی کرسیوں پر وہ سب بیٹھے ہوئے تھے۔ اس طرف کی کرسیاں خالی تھیں۔ وہ آپس میں باتیں کر رہے تھے، جیسے ہی ہم اندر

پہنچے، ہماری طرف متوجہ ہو گئے۔ "استاد قبول! بیٹھ جاؤ۔" سورتی نے بلند آواز سے کہا۔ قبول نے اس بار کوئی تعرض نہ کیا۔ بلا، بیر بلا اور چنگا بھی ہمارے ساتھ آ گئے تھے۔ انسپکٹر سورتی نے اُن تینوں کو باہر چلے جانے کا حکم دیا لیکن قبول نے انھیں روک لیا۔ ماتھر، سورتی کو ایک جانب بیٹھنے کو کہہ کے ہم سے مخاطب ہوا اور بتانے لگا کہ ہمارے سامنے کون کون افسران موجود ہیں۔ اُس کے کہنے کے مطابق ان میں دو ایس پی، دو ڈی ایس پی، تین انسپکٹر اور ایک سب انسپکٹر تھے۔ انسپکٹر داؤ دیال کا تعلق خاص ہمارے علاقے سے تھا اور وہی کپتن خاں کے معاملے میں تفتیش پر مامور کیا گیا تھا۔ سب کی مضطرب نظریں ہم پر جمی ہوئی تھیں۔ ایس پی رائے کے سوا اُن میں سے میں کسی کو نہیں جانتا تھا۔ رائے اُس زمانے میں سب انسپکٹر تھا جب تین آدمیوں کے قتل کے جرم میں مجھے پہلی بار تھانے لایا گیا تھا۔ اب اُس کا ڈیل ڈول خاصا بڑھ گیا تھا، چہرہ بھی بھاری ہو گیا تھا۔ رائے نے شاید مجھے نہیں پہچانا۔

"میں نے ضروری سمجھا کہ یہ لوگ بھی موجود ہوں۔" ماتھر نرمائش سے بولا۔ "جو کچھ تم کہنا چاہو، ان کے سامنے قبول کہہ سکتے ہو۔"

"اپنے کو ایک بات بار بار بولنا نہیں آتا۔" قبول نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے کہا۔ "جو ہم نے بولا ہے ایک دم کھل کے بولا ہے۔ آپ ہی ان کو بتا دو۔"

"میں نے انھیں بتایا ہے۔" سورتی کی جھنجھلائی ہوئی آواز ابھری۔ "لیکن اچھا ہے تم براہِ راست انھی لوگوں سے بات کرو جن کا تعلق اس معاملے سے ہے۔"

"آپ آگے بولو۔ اپنے کو کچھ اور نہیں بولنا۔"

سب کے بیچ بیٹھے بڑے افسر ایس پی جوشی نے ایس پی رائے سے کچھ کہا۔ رائے نے اپنے قریب موجود ماتھر کو متوجہ کیا۔ چند منٹ تک وہ آپس میں کانا پھوسیوں کے انداز میں باتیں کرتے رہے۔ جوشی کی بات سُن کے ماتھر نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا۔ "استاد قبول! کیا دوبارہ تمھیں یہ جتانے کی ضرورت ہے کہ تمھارے سامنے اس وقت پولیس کے اعلا عہدے دار موجود ہیں۔ سات دن، ڈیڑھ مہینے سے یہ اسی کیس کی تفتیش میں مصروف ہیں۔"

"مولا بھلا کرے سرکار۔"

"تم جانتے ہو گے کہ یہ پولیس کے منتخب لوگ ہیں۔"

"یہ بھی اپنے کو اچھی طرح جانتے ہوں گے۔"

"تمیز سے بات کرو قبول۔" انسپکٹر داؤ دیال نے جتاتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "یہ اکھاڑا نہیں ہے۔"

"پھر اکھاڑے کے لوگ اُدھر آ بیٹھے دادا جی؟" قبول نے

نمی سے کہا: "تم کیا اپنے رتبے والوں سے بات کر رہے ہو؟"

"یہ انتہا ہے مرزا" داؤدیال اشتعال سے بولا: "ہی از سپلنگ لائی یا باس..........." اس نے اپنی آواز بھینچ لی۔

"اپنے کو زیادہ یاد ہیں داؤجی؟" نجل نے اس کے لہجے سے اندازہ لگا لیا تھا کہ انسپکٹر داؤدیال انگریزی میں گالی بک رہا ہے یا بکنا چاہتا ہے۔ "اچھا ہی ہوا جو داؤدیال نے اپنی آواز کی لگام تھام لی ورنہ اس کا جواب میں آسے ضرور دیتا۔"

"نو نو" ایس پی جوشی نے ہاتھ کے اشارے سے داؤدیال کو تنبیہ کی اور انگریزی میں بولا: "تم تم کن لوگوں سے مخاطب ہو؟ ایک ذرا تحمل کرو۔" پھر اس نے ماتھر سے کہا کہ وہ اپنی بات جاری رکھے۔ ماتھر نے اس سے درخواست کی تھی کہ اسی کو بولتے رہنے دیا جائے۔

"استاد نجل!" ماتھر کے لہجے میں ملامت تھی۔ "میں تم سے کہہ رہا تھا کہ ہم نے ہر پہلو پر غور کیا ہے۔ یقیناً یہ بات ہمارے لیے بھی تعجب کی تھی اور ہے کہ نجل نے اس شخص کو کیوں ختم کر دیا جو چار مہینے سے اس کے اڈے پر بیٹھا ہوا تھا اور جیسا کہ ہمیں معلوم ہوا، وہ تمھاری مرضی سے بیٹھا تھا۔ بے شک مجھے یاد نہیں پڑتا کہ تمھارے ریکارڈ میں پشت سے چھرا گھونپنے والی کوئی روداد تھی جو سب تم سے واقف تھے اور کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ نجل اپنے ہی گھر کو کیوں آگ لگانے لگا، اپنا ہی گلا کیوں گھونٹنے لگا؟" مجھے ماتھر کی باتوں پر بہت حیرت ہو رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا: "تمھیں کپتن خاں سے قبول تھا ایسی ہی کوئی کہ جو گئی تھی تو تم نے یہ طریقہ ہی آخر کیوں اختیار کیا؟ تم سامنے آ کے بھی بات کر سکتے تھے۔ کپتن خاں کے متعلق بھی ہم نے معلومات حاصل کیں۔ پتہ چلا کہ وہ لکھنؤ کا ایک بڑا استاد تھا اور بظاہر اس کا تم سے کوئی جھگڑا نہیں تھا۔ وہ تمھاری عزت کرتا تھا اور پوچھنے پر لوگوں کو بتایا کرتا تھا کہ استاد میں آ ہی رہے ہوں گے پھر کون سی ایسی نازک بات تھی جو تمھارے اور کپتن خاں کے بیچ تنا تنی کی بنیاد بن گئی؟ ہمیں بالکل یقین نہیں آتا تھا اور ہمیں......"

ماتھر جوشی کی طرف دیکھ کے تذبذب سے بولا: "ہمیں اب بھی یقین نہیں ہے۔ اس وقت ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو پکڑیں۔ اسی دن ڈیڑھ سو کے لگ بھگ آدمی تھانوں میں لائے گئے۔ دوسرے دن بھی یہ سلسلہ جاری رہا اور ابھی تک کسی نہ کسی حد تک ہے۔ تمھارا یہ خیال کہ پولیس نے تفریح بازی کے کام لیا ہے تو یہ تمھاری غلطی ہے صرف بدگمانی۔ ہم نے تقریباً سات سو ہی اڈوں سے آدمی پکڑے

تھے۔ اس واقعے کے متعلق وہ خود بھی حیرت کا اظہار کرتے تھے اور ان کی رایوں میں بہت فرق تھا۔ طرح طرح کی باتیں کرتے تھے۔ ان کے ساتھ اڈوں کے استادوں کو بھی تھانے میں بلایا گیا۔

"تمھیں یہ سن کے شاید دکھ ہوگا، اچنبھا بھی کہ انھوں نے تمھارے نام پر کوئی خاص دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ ان کا برتاؤ سرد تھا۔ ہاں گنتی کے چند استادوں نے ضرور تمھارے لیے باتیں کیں مگر ان میں اکثریت ایسے استادوں کی تھی جو تم سے ہمدردی نہیں رکھتے تھے۔ وہ ڈھکے چھپے لفظوں میں تمھاری طرف اشارہ کرتے تھے اور ہمیں معلوم تھا کہ ان کا یہ رویہ بے وجہ نہیں ہوگا۔ اس کے پیچھے بہت سے قصے ہوں گے، برسوں پرانے قصے، برسوں پرانی جھونجل۔ وہ شہر کے تمام اڈوں پر تمھارا راج کیوں کر سہتے ہوں گے۔ ہر وقت داؤ کی تاک میں لگے رہتے ہوں گے کہ کب موقع ملتا ہے، اس سے اچھا موقع ان کے پاس اور کب آتا کہ تم لکھنؤ میں موجود نہیں تھے۔ سو ہم نے تمھارے خلاف ان کے بیانات پر زیادہ دھیان نہیں دیا لیکن انھیں ٹٹولنے اور کریدنے کے کام سے بھی غفلت نہیں برتی۔ نتیجہ صفر رہا۔ وہ کسی کا نام نہیں لیتے تھے۔ کسی کا بھی تمھارا بھی کھل کے نہیں۔ ساتھ ساتھ ہم نے ملاتے کے ان گنت لوگوں کے بیانات قلم بند کیے۔ ہمیں اعتراف ہے کہ ان میں تقریباً سبھی نے تمھارے لیے اچھی رائے کا اظہار کیا۔ انھوں نے کپتن خاں کو بھی برا نہیں کہا۔"

ماتھر کا انداز خطابت کا سا تھا مگر نرم دھیما اور صاف صاف۔ اس میں کوئی الجھاؤ نہیں تھا۔ اس کی زبان رواں اور عام پولیس افسروں سے الگ تھی۔ میری طرح سبھی نے سکون کی سانس لی ہوگی۔ ماتھر وہی سب کچھ کہہ رہا تھا جو ہم کہتے۔ اس نے بتایا کہ کسی نے اقرار نہیں کیا اور پولیس کو ایسا کوئی ثبوت نہیں ملا جس کی رو سے وہ واضح طور پر کسی طرف کا رخ کر سکتی۔ کوئی نشان نہیں تھا۔ جن لوگوں کو پکڑا گیا، انھوں نے اس رات اپنے اڈوں، گھروں یا کسی اور جگہ اپنے موجود رہنے کی شہادتیں دلوا دی تھیں۔ وہ کہہ رہا تھا کہ ہمارے اڈے کے لوگوں نے مختلف نام لیے جن میں موجھار کا اڈا سرِفہرست تھا۔ پولیس کا سب سے زیادہ زور موجھار کے اڈے کے آدمیوں ہی پر رہا لیکن وہاں سے بھی انھیں کچھ حاصل نہیں ہوا۔ جس رات لوگ اڈے پہ داخل ہوئے تھے، انھیں کسی نے آتے جاتے نہیں دیکھا۔ آس پاس گشت کرنے والی پولیس نے بھی نہیں۔ باہر پہرا دینے والا اگرام نامی شخص صبح بدمست پڑا تھا۔ دنوں پہلے اڈے پہ آنے جانے والے لوگوں کے بارے میں بھی پوچھ گچھ کی گئی اور کچھ ایسے آدمیوں کے

نام سامنے آئے جن کا تعلق لکھنؤ سے نہیں تھا اور جو اس رات کے بعد کبھی نہیں دیکھے گئے۔ پولیس کو خیال ہے کہ وہی لوگ ہوں گے مگر وہ کہاں چلے گئے۔ لکھنؤ کے گرد و نواح میں بھی ان کی تلاش کی گئی لیکن ان جیسے حلیوں کے کسی ایک شخص کی بھی نشان دہی کسی نے نہیں کی۔ پھر وہ کون تھے؟" ماتھر بلند آواز میں جیسے پوچھ رہا تھا: "کون تھے وہ نجل؟ اگر ہماری جگہ تم ہوتے تو کس نتیجے پر پہنچتے؟"

نجل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ماتھر کہنے لگا: "اور پولیس کو صرف ان تین چار آدمیوں کی کھوج ہی نہیں تھی جو چند روز پہلے کپتن خاں کی اجازت سے اڈے پر آ کے ٹھیر گئے تھے۔ ان کے سوا بھی چند اور آدمی ہوں گے جنھوں نے انھیں وہاں بھیجا تھا۔ تین چار آدمیوں کے لیے یہ مشکل تھا کہ وہ اپنے آپ کو نقصان پہنچائے بغیر ایک ہلے میں اڈے کے گیارہ بارہ آدمیوں کو ختم کر دیں اور انھیں ایک پل کی مہلت نہ دیں۔ اس رات باہر سے بھی لوگ ان کی مدد کو ادھر آئے ہوں گے اور جس طرح وہ اندھیری رات اور سنسان گلی میں روپوش ہو کے آئے تھے اسی طرح واپس چلے گئے۔ یکے بعد دیگرے وہ یا تو صبح سویرے وہاں سے نکلے یا انھیں اڈے کے قریب مقررہ وقت پر کوئی گاڑی آ کے لے گئی۔ بہرحال وہ کس وقت آئے، کس طرح آئے اس کی تفصیل میں جانے سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ وہ کون تھے، کہاں چھپ گئے؟ بتاؤ نجل! وہ کون ہو سکتے ہیں؟"

"آپ جیسا کوئی جواب نہ دے دیں۔" نجل نے تیکھے لہجے میں کہا: "پھر تو وہ ہی ہو سکتے ہیں۔"

"ہاں! وہ تم بھی ہو سکتے ہو، تم یا تمھارے آدمی۔ کرائے کے آدمی۔ لکھنؤ سے دور کے آدمی۔ شہر میں اور کسے یہ جرأت ہو سکتی ہے کہ وہ استاد نجل کے اڈے پر اس طرح چلنے کی جرأت کر سکے۔"

"تالی بجاؤ بچو!" نجل نے ہماری طرف منہ کر کے تیزی سے کہا۔ کسی نے تالی نہیں بجائی اور ماتھر نے بھی نجل کی بات ان سنی کر دی۔ انسپکٹر داؤدیال کو کرسی جیسے کاٹ رہی تھی۔ وہ بار بار ایس پی جوشی اور ایس پی رائے کو دیکھتا تھا مگر ان دونوں کی نظریں ایک ہی جانب مرکوز تھیں، ہماری جانب۔

"تمھارے سامنے ہمیں کسی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے لیکن بہتر ہے تم جو سچ ہے اسے سمجھو۔ حقیقت جھٹلانے کے بجائے اسے تسلیم کرنے کے لیے تمھیں یہ سب بتا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ہم ان افواہوں سے بے خبر نہیں رہے ہیں جو اس بیچ تمھارے اور کپتن خاں کے جھگڑے کے بارے میں شہر میں اڑتی رہی ہیں۔ شاید تم بھی جانتے ہو گے کہ لوگ کیا کچھ کہتے ہیں۔ ان افواہوں کو مسالا بنانے کے بجائے ہم نے مضبوط شہادتوں ہی پر اپنی نگاہ جمائے رکھنی چاہی ہے لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ ہم ان کی جانب سے اپنے کان بالکل بند رکھیں۔ کہیں حقیقت ان میں نہ چھپی بیٹھی ہو۔ یہ افواہیں کوئی ایسا خاکہ کھینچتے ہیں کہ ہمیں لگتا ہے کہ رتی تھیں جو کسی حقیقت کے لگ بھگ ہو۔ تم اندازہ نہیں لگا سکتے کہ ہم نے کتنے خاکے بنائے اور مٹا دیئے ہوں گے۔ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے سے انھیں یوں ادھر ادھر مارتے رہنا ہی ٹھیک تھا۔"

اسی لمحے سب انسپکٹر سہائے اٹھ کے دبے پاؤں ماتھر کے پاس آیا اور میز پر اس کے سامنے ایک کاغذ رکھ کے واپس اپنی کرسی پر چلا گیا۔ داؤدیال نے اسے بھیجا تھا۔ ماتھر نے کاغذ پر ایک سرسری نظر ڈالی اور سر ہلانے لگا اور مزید کوئی توقف کیے بغیر نجل کی طرف نظر اٹھا کے بولا: "کپتن خاں تمھارا دوست تھا۔ اچھا دوست۔ تم اسے اپنے ساتھ لکھنؤ لائے تھے۔ یہاں کا رنگ ڈھنگ لکھنؤ سے الگ تھا۔ اس کے لیے نیا اور چونکا دینے والا تھا۔ وہ تمھاری مرضی سے آیا تھا مگر ایک دن اس نے تم پر چاقو کھول لیا اور مطالبہ کیا کہ اڈے سے نکل جاؤ۔ تم نے بھی چاقو کھول لیا لیکن تمھارے چاقو نے زندگی میں شاید پہلی بار تم سے دھوکا کیا۔ اڈے کی ریت کے مطابق تمھیں اڈا فوراً چھوڑ دینا اور کپتن خاں کا حق مان لینا چاہیے تھا۔ تمھیں یہ بھی قبول نہ ہوگا کہ تم اڈے کے دوسرے آدمیوں کی طرح اسے استاد مان کے وہیں رہو۔ نہ کپتن خاں اس پر تیار ہوتا۔ اس نے تمھارے ساتھ رعایت کی کہ تم جلد از جلد لکھنؤ چھوڑ دو۔ جن لوگوں کے سامنے چاقو نکلے تھے، ان سب کے ساتھ۔ اڈے کے باقی آدمیوں کو قابو میں رکھنے کے لیے کپتن خاں کو ایسا جتانا لازم تھا کہ تم نے اپنی مرضی سے اڈا چھوڑا ہے کیونکہ تمھارے بعد یہاں اسے اپنے پیر جمانے کیلئے ان کے ساتھ کی ضرورت تھی۔ جان بخشی کے بدلے اور عزت سے لکھنؤ سے نکل جانے کے لیے تمھیں بھی ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔ تم نے اپنے خاص آدمی کالکے سے بھی یہی کہا، دوسرے آدمیوں سے بھی۔ سنا ہے تم نے ان سے کہا تھا کہ تم ایک لمبے سفر پہ روانہ ہو رہے ہو جہاں سے تمھاری واپسی ناممکن ہو سکتی ہے۔ تم نے ایک لمبے سفر کا ڈھونگ رچایا تھا مگر تم نے یہ فیصلہ دل سے قبول نہیں کیا تھا۔ تمھارے ساتھ جانے والے بھی تمھیں ٹوکتے، کھٹکاتے رہے ہوں گے۔ تم نے کپتن خاں کو وقت دیا تھا اور تم اس سے دوبارہ چاقو کھولنے کا موقع ملنا نہیں چاہتے تھے۔ جب تمھی اپنا چاقو کھو بیٹھے تھے تو اڈے سے تمھارے ساتھ نکلے

والے دوسرے کیسے کپتن خاں کے آگے آنے کی جرأت کرسکتے تھے۔
"کپتن خاں جانتا تھا کہ اڈّے پر کانتے ہی ایک ایسا آدمی ہے جو اُس کے لیے پریشانی پیدا کرسکتا ہے۔ اُس نے تمھاری زبانی کانتے کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ اڈّے میں وہ بھی اُس کا برابر کا شریک ہے۔ کانتے ہی سمجھتا رہا کہ استاد واپس آجائیں گے۔ کپتن خاں تمام لوگوں سے یہی کہتا رہا کہ ایک دن استاد واپس آجائے گا۔ مگر کانتے کو کپتن خاں کے رویّے سے کھٹکا ہوگیا تھا یا تمھارے کسی آدمی نے اُس سے مل کے تمام حقیقت سے باخبر کردیا تھا۔ کانتے نے کپتن خاں پر یہ ظاہر نہیں کیا کہ وہ سب جان چکا ہے۔ وہ آدمی جو تین چار دن پہلے اڈّے پر آکے ٹھہرے تھے ہوسکتا ہے کانتے ہی نے کپتن خاں سے اُن کی سفارش کی ہو۔ مگر کانتے ایک دن غائب ہوگیا اور واپس نہ آیا۔۔۔۔" ماتھر نے ایک گہری سانس بھر کے کہا۔ "تم نے سنا استاد قجل؟"
"آپ کو اُدھر کہیں بھی ہونا چاہیے تھا صاب؟"
"زخمی میں زیادہ اچھا رہتا استاد؟" پیچھے سے جاکر نے سرگوشی کی۔
"انکار کرو قجل، ہم تمھارا انکار سننے کے لیے تیار ہیں۔" ماتھر کی آواز دوبارہ گونجی۔ "تمھارے پاس شاید کوئی جواب نہیں ہے۔"
"لگتا ہے یہ اُدھری کہیں پیچھے چھپا بیٹھا تھا استاد۔" جاموہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔
"مگر استاد وہ جواب مانگتا ہے۔" مینی نے قجل کو کہا۔
"کیا بولیں اُسے؟"
وہ سب ایسی نظروں سے ہمیں دیکھ رہے تھے جیسے ہم کوئی نہ جانے ہوئے ہوں۔ میرا خیال تھا کہ یہ سُن کے قجل زور زور سے قہقہے لگائے گا یا ماتم کرے گا لیکن کرسی پر اُس کا جسم ڈھیلا پڑا رہا جیسے اُسے پہلے سے معلوم تھا کہ یہ سب سننا پڑے گا۔ ماتھر کے خاکے میں کوئی عیب نہیں تھا۔ حقیقت سے کتنا ہی دور ہو مگر اس میں حقیقت کا رنگ ضرور جھلکتا تھا۔ بہت سی باتوں کی ہم تردید ہی نہیں کرسکتے تھے اس لیے کہ ان تو ایک ہی بات پر آکے ٹوٹتی کہ پھر ہم کہاں روپوش تھے۔
قجل کو فوراً اپنی بے گناہی کسی کو دکھانی چاہیے تھی۔ آدمی کے بغیر زخم اور پھیل جانے کا اندیشہ تھا۔ بار بار میرے دل میں ہوک اٹھتی تھی کہ ایک بار ہمت کرکے سب کچھ صاف صاف کہہ دوں۔ بس کریں، وہ ان لوگوں سے باز پرس کیوں کر رہے ہیں۔ صرف مجھے پکڑ لیں۔ مجھے پھانسی دے دیں۔ بےکار باتوں سے کیا فائدہ۔ سب کا خون میری گردن پر ہے۔ جنت میں مرنے والے سو سے اوپر

اُدھیں کا مٹن میاں کا وزیر کا۔ تشانم کا، سلطان کا۔ یہاں اڈّے پر ختم ہونے والے بھی لوگوں کا اور نہ جانے کس کس کا۔ مجھے تو نام بھی یاد نہیں رہے۔ میں نہ ہوتا تو ان میں سے کوئی بھی مرنے والا نہیں تھا۔ اتنی جلدی ٹھنڈی مرجاتیں۔ اُن کے دل میں بہت سی آرزوئیں تھیں اور تتی نے ابھی دیکھا ہی کیا تھا۔ کرشنا بھی کہتے تھے کہ تیری وجہ سے میری زندگی بڑھ گئی ہے۔ کاش انھیں معلوم ہوتا کہ میں اُن کی زندگی ختم کرنے کے لیے اُن کے پاس آیا ہوں۔ اتنے اندھے تو اتنے۔ اتنی باتیں کرنے اور کچھ کہ لگانے کی کیا ضرورت ہے۔ ایک ہی شخص کو پکڑ لیا جائے۔ اُسے کیوں نہ مار دیا جائے۔
"برادر قجل! اب چپ کیوں ہوگئے؟" ماتھر نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "تمھاری زبان بند کیوں ہوگئی ہے؟ کیا تو کو سب جھوٹ ہے؟"
"ابھی کتھا کا زور تو ٹوٹے ماتھر صاب!" قجل خوابیدہ آواز میں بولا۔ "اندازہ تھا کہ تم بھی کچھ کہو گے۔ کون جانے یہ زور کس کس کو توڑے گا۔"
"پھندا اتنا اندھا نہیں ہوتا سرکار۔ گردن پہچانتا ہے۔" قجل نے بیڑی سُلگاتے ہوئے کہا۔ صبح سے اب تک وہ مسلسل بیڑیاں پی رہا تھا اور کھانس رہا تھا۔
"کیس عدالت میں ہے۔ فیصلہ اسی کو کرنا ہے۔ پر ان حالات میں وہ کیا فیصلہ کرسکتی ہے۔ تمھارے آدمی اِدھر اُدھر کی باتیں کرکے کیس سلجھانے کے بجائے پیچیدہ اور پُراسرار بنا رہے ہیں۔ کانتے چُپ ہے۔ نہیں بتاتا کہ کہاں گیا تھا؟"
"وہ کیوں بتائے گا؟"
"کیوں؟ وہ کیوں نہیں بتاتا؟"
"جو کارن اپنے ساتھ ہے وہی کچھ اُس کے ساتھ بھی ہوگا۔ اڈّے والے اپنا آتا پتہ بتانے لگیں تو کتنے دن چلیں؟"
"تو اڈّے والے پھر اپنے گلے میں پھندا ڈال لیں گے۔"
"اس کا نام آئے گا تو وہ دیکھ لے گا۔" قجل نے بیزاری سے کہا۔
"اس کا نام آنے میں دیر ہی کیا ہے۔"
"اپنا گلا اتنا سستا نہیں ہے ماتھر صاب! میں نے آپ کو بولا تھا۔ یہ بعد کی بات ہے آپ زیادہ محنت مت کرو۔"
"لیکن قجل! اگر تم ابتدا ہی میں یہ اُلجھن دور کردو تو اس میں تمھارا بھی بھلا ہوگا۔" ہملا بھی۔
"ہمارا بھلا چھوڑو، وہ دیوتا اپنا سرچھے۔ آپ کو دکھائی نہیں دیتا؟ ہم بولتے ہیں اِس طرف دھیان مت دو۔"
"ہم نے ایسا ہی کیا تھا استاد۔"
"کدھر کیا تھا صاب! پھر آپ اپنے سر میں نہیں لگتے۔"

ماں آگے جاکے ہم نے بول دیا کہ ہم اُدھر اپنی ماں بہن بچاتے ہیں تو آپ کون سی کتھا سناؤ گے۔ پھر کس پہ کمبل ڈالو گے؟"
"یقیناً ہمیں اپنی سوچ کا رُخ بدلنا ہوگا۔"
"پھر پہلے ہی ایسا کرلو۔ ہم بھی کسی آدمی کے جنے ہیں۔"
"مگر مگر تم اپنے آپ کو۔۔۔" ماتھر کہتے کہتے رہ گیا۔
درمیان میں بیٹھے ہوئے ایس پی جوشی کی بھاری آواز نے خاموشی کو توڑا تھا۔ "استاد! ہم کو بولو، ہم پھر اور کس طرف دھیان دیں؟"
"ابھی ہم اُدھر آئے ہیں جوشی صاب!" قجل نے نرمی سے کہا۔
"لیکن تمھارے دماغ میں شک کی کوئی وشا ضرور ہوگی۔"
"ابھی کوئی نہیں ہے صاب بہادر، جدھر بھی ہے اپنے سے زیادہ دور نہیں ہے۔" قجل نے کہا۔
"تم سمجھتے ہو کہ تم اُن تک پہنچ جاؤ گے؟"
"نہیں پہنچے تو ماں کا دودھ حرام ہوگا۔"
"تمھارے کہنے کا مطلب ہے تمھیں جانے دیا جائے؟"
"اب نہیں تو آپ دس دن بعد جانے دو گے۔ ہم تب بھی اُن کے پاس پہنچیں گے۔ پر شاید تو دیر لگ جائے۔ اُن حرام کے جنوں کو ماتم مل جائے گا۔"
"مگر دیر تو تمھیں انھیں ڈھونڈنے میں لگ سکتی ہے کیونکہ تم بولتے ہو تم کو ابھی کچھ معلوم نہیں ہے۔"
"اپنے کو زیادہ دیر راس نہیں آتی۔"
"کتنے دن لگیں گے؟"
"بہت زیادہ نہیں۔" قجل کی آواز تپ رہی تھی۔
"یہ اتنے وشواس سے تم تبھی کہہ سکتے ہو جب تم کو کسی آدمی کسی ٹولی یا کسی خاص وشا پر شک ہو۔"
"اپنے پاس آپ کی آنکھیں نہیں ہیں۔"
"لیکن تم کو اِدھر سے جانے دینے کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ تم کو اور خون خرابے کی کھلی چھٹی دے دیں؟"
"ہم اتنے اُلّو کے پٹھے نہیں ہیں جوشی صاب!" قجل نے کہا۔ "پھر ہم سیدھے اِدھر کو نہیں آتے۔ اپنا کوئی ایک ہی جیل میں بند نہیں ہے۔"
"مگر اس کی کیا ضمانت ہے کہ تم۔۔۔۔۔"
قجل اُس کی بات کاٹ کے بولا۔ "آپ کو ایسا نہیں بولنا چاہیے۔ اتنی فوج بھرکا ہے کہ اکٹھی کر رکھی ہے۔ ضمانت اپنے جیالا دینا ہے۔"
ایس پی جوشی کا چہرہ کچھ اور بھاری ہوگیا۔ غیر اختیاری طور

پہ اُس کی نظریں اپنے آس پاس بیٹھے ہوئے افسروں پر چلنے لگیں اور ایس پی راٹھور نے ایک تحسین رائے کے ساتھ کہنے لگا۔
"آئی ڈونٹ تھنک!" وہ انگریزی میں بولا۔ "اب بھی کوئی گنجائش موجود ہے۔ سب جانتے ہیں جانے پہچانے لگ ہیں، جو تمام کا تحمل کرنے والے ڈاکو پیچ کے ماہر یا کاریگر ہیں، کا مرشت میں داخل ہے۔" راٹھور کی آواز اینٹھتی ہوئی تھی۔
"یعنی یعنی انھیں روک کے رکھا جائے؟" جوشی نے تذبذب سے کہا۔
"ان حالات میں یہی مناسب نظر آتا ہے۔"
"مگر جناب!" ماتھر تیزی سے بولا۔ "میرا خیال ہے ہمیں ایک بار اس پر غور کرنا چاہیے۔ یہ فیصلہ تو ہم کسی وقت بھی کرسکتے ہیں۔"
"ماتھر جی! ایس پی راٹھور نے [illegible]"
"کوئی معمولی رعایت بہت مشکل پیدا کرسکتی ہے۔ ان کو کھلا چھوڑ دینے کے ساتھ ہمیں کچھ اور فوری قدموں کے لیے بھی تیار رہنا چاہیے۔ کیا انھیں کل کل بھونکے کاٹنے کی اجازت دے دی جائے؟" وہ حقارت سے بولا۔ "یہ ہمارے حقیقت پیش نظر رکھنی ہے کہ یہ کون ہیں۔ کتنے بڑے کیسے کیسے بڑے مجرمے بیٹھا نہیں گیا۔ اس سے پہلے کہ راٹھور کی زبان سے کچھ اور نکلتا میں کھڑا ہوگیا۔ "کسی نئے خطاب سے نوازے جانا ہے۔ سب تو بہت پرانے ہوچکے ہیں۔" میری آواز بھر آنے لگی تھی۔ جاموہ نے پیچھے سے ٹھوکا مار کے مجھے خاموش رہنے کی تلقین کی لیکن میں کھڑا رہا۔
وہ سب اچھل سے گئے۔ "یہ کون ہے؟" جوشی ناخوشگوار لہجے سے بولا۔
"یہ لاڈلا ہے۔" انسپکٹر داؤد یال نے تیزی سے جواب دیا۔
"لاڈلا! کیا یہ نووارد ہے؟"
"نہیں جناب! خاصا پرانا آدمی ہے۔"
"یہ انگریزی کچھ سمجھتا ہے؟" جوشی تعجب سے بولا۔
"کیا! کیا یہ وہ تو نہیں ہے جس نے قتل کے جرم میں بھی سزا کاٹی تھی اور جیل میں اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کی تھی؟"
"وہی ہے جناب!"
"اس کے باوجود یہ انھی لوگوں میں ہے۔"
"منہ کو خون لگ گیا ہے جناب!"
"ہاں ہاں!" جوشی نے سر ہلاتے ہوئے کہا اور مجھ سے انگریزی میں پوچھا۔ "تم ہو وہ؟"
"میں کوئی بھی ہوں جناب مگر مجھے آپ کا یہ انداز بالکل اچھا نہیں لگا۔" میں نے ہندوستانی میں جواب دیا۔ "آپ اس

لیے بھی ہے۔"

"تم نے سنا کہ ہم نے کیا کہا ہے؟" ماتھر ترش لہجے سے بولا۔

"سن لیا ہے سرکار۔"

"سن لیا ہے تو ٹھیک ہے۔ یہ بھی سن لو کہ اگر تم نے غیر ضروری طور پر ہمیں الجھانے اور غیر متعلق لوگوں سے بدلہ لینے کے لیے استعمال کیا تو اس کا نتیجہ اچھا نہیں نکلے گا۔ پولیس کوئی خون خرابہ، جھگڑا، فساد پسند نہیں کرے گی۔"

"پھر پولیس کا کام کیسے چلے گا؟"

ماتھر نے جیسے سنا ہی نہیں۔ منہ بنا کے بولا: "ایک بات اور تم سے کہنی ہے۔ ہم کو معلوم ہوا ہے کہ تمہارے پرانے اڈے پر اب رتنا نامی ایک آدمی بیٹھا ہے۔ تم جانتے ہو کہ انسپکٹر داؤ دیال ہی کا تعلق تمہارے علاقے سے ہے اور انھوں نے اس کے بارے میں ہر طرح کی پوچھ گچھ کر لی ہے۔ رتنا نے تمہارا اڈا باقاعدہ طور پر عمارت کے مالک سے لیا ہے اور انسپکٹر داؤ دیال کو ہر طرح مطمئن کیا ہے۔ اڈے پر اس کے قبضہ جمانے سے ہمیں بھی اس پر شبہ ہوا تھا کہ کہیں اس نے تم سے کوئی پرانا بدلہ تو نہیں لیا ہے۔ ہو سکتا ہے اڈا لیتے وقت اس کے دماغ میں یہی بات ہو لیکن اس کے سوا کچھ نہیں۔ جیل میں بند تمہارے آدمیوں کی شکایات پر ہم نے اس کے بارے میں پوری انکوائری کی ہے۔ شروع شروع میں تمہارے آدمی اس کا نام نہیں لیتے تھے لیکن جب وہ اڈے پر بیٹھ گیا تو صرف اسی کا نام لینے لگے تھے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہم نے اس کی نقل و حرکت پر کڑی نظر رکھی ہے مگر ہمیں کوئی ایسی بات دکھائی نہیں دی جس سے ہمارا شک آگے بڑھتا۔ وہ واقعے کے کوئی پندرہ دن بعد کلکتے آیا تھا اور اس کے بیان کے مطابق یہ اس کے استاد اشتہ تجمل کو پرانا اڈا تھا اس لیے جیسے ہی اس نے یہ سب سنا، وہ اڈا بچانے کے لیے ادھر آ گیا۔ سنو، بیٹے تم اپنی پرانی جگہ پر اس کی بیٹھک پسند کرو اور اسے ہٹانے کی کوشش کرو، وہ خود ہٹ جائے تو کسی کو اعتراض نہ ہوگا لیکن تم نے اس کے ساتھ زور زبردستی کی تو پولیس تماشا نہیں دیکھتی رہے گی۔ میں نے تمہیں بتا دیا ہے کہ رتنا وہاں عمارت کے مالک کی اجازت سے بیٹھا ہے۔"

"داؤ جی نے بتلا سا کر لیا ہے تو پھر ٹھیک ہی ہوگا۔" تجمل انسپکٹر داؤ دیال کی طرف نظریں جماتے ہوئے بولا۔ "آپ کو کچھ اور بولنا ہو تو بولو۔"

"اور کچھ نہیں۔" ماتھر نے نرمی سے کہا۔

"چوڑیاں ابھی رہ گئی ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ اپنے کو چوڑیاں پہنا کے بھیجو۔"

"دیکھو تجمل،" ماتھر کا لہجہ بگڑ گیا۔ "میں تمہیں وارن کرتا ہوں۔"

"اب آپ کے سامنے کیا بولیں ماتھر صاب! کوئی در دلا ہوتا تو زبان سالی اینڈتی نہیں۔ ادھر زندگی بھر سوچا کہ پولیس کا یہ گورکھ دھندا کیسے چلتا ہے۔ اپنے کو آج پتہ چلا کہ ادھر آپ بھی تو ہوتے ہو۔"

"جاؤ، جاؤ تجمل،" ماتھر اس کا شانہ تھپ تھپاتے ہوئے بولا۔

وہ تجمل کے ساتھ جو ترسے کے زینے تک آیا تاکہ آپ یاد رہو گے، نیچے اترتے ہوئے تجمل نے زیر لبی سے کہا۔

ماتھر نے ایک لمحے کے لیے آنکھیں میچ لیں اور رکی رکی آواز میں بولا: "جاؤ استاد، اپنا جو بسا تمہارے ساتھ ہے۔"

تجمل نے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں جکڑ لیے۔

شام ہو چکی تھی مگر سورج ابھی چھپا نہیں تھا۔ گلی میں معمول کے مطابق چہل پہل تھی۔ ساری دکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ فخرو بے دانتوں والا ہی کے نکڑ کے ہوٹل میں زور زور سے گراموفون بج رہا تھا۔ اس سے ملحق دھوبا پان والا ململ کی بنیان پہنے اور گلے میں تازہ لونگوں کا ہار ڈالے اپنی دکان پر گاہکوں میں مصروف تھا۔

تجمل، جامو، بلاکو، جھینی، پلٹو، شرکم، سارنے میں اور بڑی والا بڈو چھنگا، بامست ہم کل گیارہ آدمی تھے۔ ٹیکسیوں سے ہم نکڑ ہی پر اتر گئے اور بغیر کسی جھجک کے گلی میں داخل ہو گئے۔ تھانے سے یہاں تک راستے میں کسی جگہ رک کے ہم نے ایک گھونٹ پانی بھی نہیں پیا تھا۔ شاید کسی کو بھی بھوک پیاس نہیں لگ رہی تھی۔ سب کو جلد سے جلد علاقے پہنچنے کی بے کلی تھی۔ پولیس افسروں سے اتنا کچھ سننے کے بعد مجھے کچھ شبہ ہونے لگا تھا کہ ہو سکتا ہے وہ رتنا نہ ہو، کوئی اور ہی ہو۔ ضروری نہیں کہ جو کچھ ہر لیے بڈو اور چھنگا نے رتنا کے بارے میں بتایا تھا، وہ حرف بہ حرف ٹھیک ہی ہو۔ اڈے پر قبضہ جمانے کی وجہ سے وہ سب رتنا ہی کو سب کچھ سمجھ رہے ہوں۔ ممکن ہے رتنا بعد ہی میں آیا ہو لاوا ڈاٹ کے آسرا دیکھ کے اس کی نیت خراب ہو گئی ہو مگر تجمل نے تھانے سے نکل کے ٹیکسی ڈرائیوروں کو کسی اور علاقے کا پتہ نہیں بتایا۔ سیدھے اڈے ہی چلنے کی ہدایت کی اور اب ہم خاص اڈے کی گلی میں موجود تھے۔ ٹیکسیوں سے اترتے وقت اتفاق سے کسی کی نظر ہم پر نہیں پڑی لیکن جیسے ہی ہم چند قدم آگے بڑھے گلی میں چوڑیوں کی دکان کے مالک ادھیڑ عمر آدم

بھائی نے ہمیں دیکھ لیا: "استاد!" اس کی ٹھٹکی ہوئی آواز نے ہمارے قدم روک لیے۔ آدم بھائی ہمارے سامنے ششدر کھڑا تھا۔

تجمل نے اس کا بازو پکڑ کے پوچھا: "کیسے ہو کھنجا جی؟"

ہر وقت چوڑیاں پہننے والی عورتوں کا ہجوم اس کے گرد لگا رہتا تھا اس لیے تجمل اسے کھنجا کہتا تھا۔

آدم بھائی تجمل کے سینے سے چمٹ گیا اور بڑبڑانے لگا۔ آدم بھائی کے نظر پڑنے کی دیر تھی، ہم نے بمشکل چند گز کا راستہ طے کیا ہوگا کہ گلی میں ایک شور سا مچنے لگا۔ دیکھتے دیکھتے راہ گیروں اور دکان داروں کی ایک بڑی تعداد ہمارے اطراف جمع ہو گئی تھی۔ وہ سب مبہوت نظروں سے ہمیں دیکھتے تھے۔ غالباً ان سب کو باور کرا دیا گیا تھا کہ ہم کبھی واپس نہیں آئیں گے۔ وہ ہمارے قریب آ کے ہماری آوازیں سن سن کے جب تک یقین نہ کر لیتے تھے، ان کی آنکھوں کی حیرت دور نہیں ہوتی تھی۔ اس سرے سے اس سرے تک گلی خاصی لمبی تھی۔ ابھی ہم اس سرے پر تھے کہ دور دور تک ہماری آمد کی خبر پہنچ چکی تھی اور ہم اپنے ہی علاقے میں تماشا سے بن گئے تھے۔ دونوں طرف سے لوگ بھاگ بھاگ کے آ آ کے ہمیں دیکھنے ہماری طرف بڑھے چلے آتے تھے اور اوپر سے جھروکوں، کھڑکیوں اور کھڑکیوں میں عورتوں اور بچوں کے چہرے نظر آتے تھے۔ ہمارے لیے چند قدم آگے بڑھنا دشوار ہو گیا۔ گلی کے پرانے مکین پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہمارے پاس آتے۔ تجمل کو سلام کرتے، خیریت پوچھتے اور ایک ہی سانس میں نہ جانے کیا کیا کہنے لگتے۔ کوئی کپتن خاں کا نام لیتا، کوئی زردا کا کوئی شرلی لالہ کا۔ سب کا ایک ہی سوال تھا کہ ہم کہاں منہ کالا کرنے چلے گئے تھے۔ اڈے کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا مگر اس طرح وہاں تک پہنچنے میں رات ہو جاتی۔ معلوم نہیں تجمل نے نکڑ پر اترنے کو کیوں ترجیح دی تھی۔ ٹیکسیاں اڈے کی عمارت تک بھی آ سکتی تھیں۔

یہ سلسلہ دیر تک نہ رکتا اگر تجمل انھیں اپنے قریب آنے کے بجائے دور ہٹانا نہ شروع کر دیتا۔ ہم سبھی کو بھی وحشت ہونے لگی تھی چنانچہ سبھی نے لوگوں کو پیچھے ہٹ جانے کی تاکید کی۔ شروع میں مشکل پیش آئی لیکن پھر لوگ خود بہ خود پیچھے ہٹتے اور کنارے کنارے ہوتے گئے۔ وہ کچھ سہم سے گئے تھے اور ان کے چہروں سے ظاہر تھا کہ ہمارے رویے کی یہ اچانک تبدیلی انھیں اچھی نہیں لگی ہے۔ پھر کوئی قریب نہیں آیا اور خاموشی سی طاری ہو گئی۔ چلنے کے لیے راستہ صاف ہو گیا تھا۔ لوگوں کے اتنے قریب آنے سے تجمل کے پیر کو اذیت پہنچی ہوگی مگر وہ تیز

قدموں سے لنگڑاتا لنگڑاتا فاصلہ کم کرتا رہا۔ جب ہم اڈے کی عمارت کے نزدیک پہنچے تو اڈا گرد سناٹا چھایا ہوا تھا۔ علاقہ کے سب وہیں موجود تھے۔ ہم نے کچھ دور سے ہی گلی میں دروازوں اور دکانوں کی سیڑھیوں اور چبوتروں پر سمٹے ہوئے چند لوگ کھڑے تھے۔ اڈے کی حالت ہمارے زیر دست تھی۔ تجمل نے ایک نظر ساری عمارت کا جائزہ لیا۔ رتنا نے نیا رنگ روغن کرایا تھا۔ بڑا دروازہ بند تھا اور دروازے کے قریب والا چوکی خالی پڑی تھی۔ البتہ دروازے کے باہر دو آدمی لاٹھیاں لیے کھڑے تھے۔ میں نے انھیں پہلے نہیں دیکھا تھا۔ دونوں کی عمریں تیس سال سے کم ہوں گی۔ جسم کے بھرے اور رنگ کے کالے تھے۔ دونوں پوری طرح تیار تھے۔

جامو اور بلاکو میرے ساتھ تھے۔ انھیں کسی پہلو قرار نہیں تھا۔ ان کے جسم جھنکتے تھے اور سارا خون جیسے آنکھوں میں اتر آیا تھا۔ میرے ہاتھ پیروں پر بھی ایک لرزش سی طاری تھی۔ ظاہر ہے رتنا کو پہلے سے اطلاع مل گئی ہوگی۔ یہ ممکن تھا کہ گلی میں ایسا شور برپا ہوا اور گلی کے اڈے کے کانوں تک نہ پہنچا ہو۔ ممکن ہے رتنا کو ہمارے گلی میں داخل ہونے سے پہلے ہی خبر ہو گئی ہو جس وقت ہم پولیس افسروں کے سامنے موجود تھے۔ مجھے حیرت تھی کہ تجمل وہاں رتنا کا نام کیسے پی لے رہا ہے۔ اشارۃً بھی تجھیں ایک بار میں نے ارادہ بھی کیا کہ اسے یاد دلاؤں لیکن یہ خیال کر کے چپ رہا کہ تجمل خود اس کا نام کیسے بھول سکتا ہے۔ چلتے چلتے ایس پی ماتھر ہی نے رتنا کا ذکر کیا تھا اور تجمل اس پر بھی اپنی آنکھیں بچانے بیٹھا رہا۔

"رتنا جی سے بولو تمہارے مہمان آئے ہیں۔" تجمل نے سر پر لیے ہیں ان دو قوی آدمیوں سے کہا جو دروازے پر جمائے کھڑے تھے۔

"رتنا استاد ابھی آرام کرتا ہے۔"

ادھر سے جامو ادھر سے تجمل نے بیک جھپکنے میں ہاتھ بلند کر کے ان کے سر وں پر مارے۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ دونوں وہیں بیٹھ گئے اور ان کی چیخ بھی نہیں نکلی تھی کہ جامو اور تجمل نے بال پکڑ کے انھیں اوپر اٹھایا اور گردن کر بلکا سا جھٹکا دے کے انھیں دائیں بائیں دھکیل دیا۔ جھینی نے بڑھ کے دروازے پر ٹھوکر ماری۔ دروازہ مقفل نہیں تھا، چوپٹ کھل گیا۔ اندر دونوں اور دروازوں کے مابین کھلی ہوئی مختصر جگہ پر پانچ آدمی جیالے کھڑے تھے۔ ہمارے جیالو میں بھی رہی میں رکھے ہوئے تھے۔ وہ منتظر تھے۔ ہمیں اندر گھستا دیکھ کے وہ ایک دم ہم پر جھپٹے لیکن ہماری

نگاہوں نے انھیں تاک لیا تھا۔ پتہ نہیں کیا ہوا۔ ہمیں کچھ پرسش
ہی نہیں تھا۔ میں نے اپنے قریب موجود صرف جامو کو دیکھا تھا۔
وہ چیختا ہوا ایک آدمی پر اُچھلا اور اُس کی جھونک میں اُس نے
دو اور آدمیوں کو گرا دیا۔ میں نے بھی کچھ یہی کیا تھا۔ جب مجھے اپنی
شدھ بدھ ہوئی تو وہ پانچوں زمین پر پڑے تھے اور اُن کے
چاقو اِدھر اُدھر گرے ہوئے تھے۔ انھیں دوبارہ چاقو اٹھانے کی
فرصت نہیں ملی۔

سامنے کے دونوں کمروں کے دروازے بند تھے مگر دفعۃً
ایک دروازہ کھلا اور ایک ساتھ کئی آدمی تیزی سے باہر نکلے۔ قجل
کے چہرے سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ ان میں رتنا نہیں ہے لیکن یہ
ان کا طریقہ تھا کہ خود آنے کے بجائے اس نے پھر اپنے چند
آدمی بھیج دیے تھے۔ کیا اس کے دماغ میں یہ تھا کہ قجل اڈّے
تک آنے کے بعد ان آدمیوں کو دیکھ کے واپس ہو جائے گا یا وہ
قجل کا ارادہ آزمانا چاہتا تھا یا اُس کا خیال یہ تھا کہ اس طرح
ہم آدھے ہو کے اُس کے مقابل پہنچیں گے۔ اڈّوں پر کبھی ایسا
نہیں ہوتا مگر اڈّے ایسے حاصل بھی نہیں کیے جاتے جیسے رتنا
نے کیا تھا۔ "پتا کیا ہے؟" اُن میں سے ایک دراز قد اور چھلیے
بدن کے ایک شخص نے چھنکارتے ہوئے کہا۔ "یہ رتنا
اُستاد کا اڈّا ہے۔"

"اُسی کے دوار پہ آئے ہیں ہم۔" قجل مدھم لہجے میں بولا۔
"تم کو باہر بولا نہیں کہ ابھی رتنا اُستاد کے آرام کا سمے ہے۔"
"اُس گینڈے کے بچے کو بول۔ اٹھ آرام کر لینا۔" جامو کی آواز
بھڑک رہی تھی۔ "ابھی اُدھر اُس کی ماں کے پھیلا کار آئے ہیں۔"
"تیزی سے مت بھٹ کھجر۔" وہ دراز کے بولا۔ "اندر ہی
[illegible] کے بول۔"

جامو کا سارا جسم ایک لمحے کے لیے بل کھا گیا۔ وہ بلا کی پھرتی
[illegible] سارے بیک وقت اُن پر جھپٹنے والے تھے کہ قجل کی آواز
[illegible] اُن کے رک گئے۔
"ہاں! ان کو رہنے ہی رکھو قجل۔" رتنا کے آدمیوں میں سے
ایک نے زمین پر تھوک کے کہا۔ "ابھی اُدھر جرا اس کی بہن کے
[illegible] سوار کھڑے ہیں وہ اس کو نہیں پہنچتے؟"
قجل جواب دینے کے بجائے لنگڑاتا ہوا خود اُن کے پاس
جانے لگا لیکن درمیان ہی میں جامو اُس کے آڑے آ گیا۔ "تم پیچھے
[illegible] اُستاد!" وہ چیخ کے بولا۔ قجل رک گیا۔ جامو نے [illegible]
[illegible] انداز میں اِدھر اُدھر نظر دوڑائی اور ایک خنجر بھری لے کے
[illegible] جسم کی گرد جھاڑ [illegible] اُن کی جانب آہستہ آہستہ قدم

بڑھانے لگا۔ وہ اُسے گھیر جانے کا حکم دیتے ہیں مگر جامو اپنی
اُبلی ہوئی آنکھیں اُن پر مرکوز کیے بڑھتا رہا اور اُن کے مقابل ہی
جا کے ٹھیرا۔ تین اطراف سے وہ اُن کے نرغے میں تھا۔

بری سانس سینے میں اٹکنے لگی تھی۔ سب کے پاس نیفے
تھے میری جیب میں بھی لیکن کسی نے نیفا باہر نہیں نکالا۔ جامو
اُن کے بیچ میں پہنچ کے بُت کی طرح جم گیا تھا۔ اس کی حالت
کسی پاگل سانڈ جیسی تھی جو سرنگ کے بیچوں بیچ کھڑا ادھر اُدھر
پلٹ کے وار کرنے کے لیے تیار ہو اور اپنے سینگ تول
رہا ہو۔ کپتن خان اور جامو کا بچپن سے سنگ ساتھ تھا۔ دونوں
ایک دوسرے کو بالکل بھائیوں کی طرح سمجھتے تھے۔ جامو کی نظروں
میں اُسی کا چہرہ سمایا ہو گا۔ اسی جگہ وہ اُسے چھوڑ کے گیا تھا۔

انھوں نے چاقو نہیں چلائے کیونکہ جامو اُن کی رست
بُرد سے قطعاً خود نہیں تھا اور انھوں نے دیکھ لیا تھا کہ اس
کے ہاتھ میں کوئی ہتھیار نہیں ہے۔ "لوٹ جاؤ، ہم بولتے ہیں
لوٹ جاؤ۔ تمھارا کام ختم گیا۔ یہ اڈّا اب رتنا اُستاد کا ہے۔" ان
میں سے ایک آدمی نے ہکلا کے کہا۔ وہ سب جامو کے گرد چاقو
گھماتے تھے۔ "اپنا وقت تو دم کے ساتھ ہے۔ جاکے اُس
زنخے کو بول، وہ ہری نیکر چھنچھنانے کے آجا۔" جامو نے اس
کے بازو کو جھٹکی دی تو سب بھڑک پڑے۔

"ابھی پیچھے رستہ کھلا ہے۔ زیادہ اکل مت کر۔" چھلیے
بڑے جسم کا آدمی دھتکارتے ہوئے لہجے میں جامو سے بولا۔
"چھنچھنیا پھیر لے۔"

جامو نے جو زبان سے کچھ نہیں کہا، جس شخص کے بازو پر
جھٹکی دینے کے لیے اس نے ہاتھ [illegible]
کی گردن پر ہاتھ ڈال کے اسے اپنی طرف کھینچ لیا اور [illegible]
اسی کو نہیں، اُس نے دوسرے ہاتھ سے اُس کے مقابل کھڑے ہوئے
آدمی کی گردن بھی دبوچ لی تھی۔ ایک ساتھ کئی چاقو چلے لیکن جامو
کا داؤ بالکل نہیں سمجھ پائے تھے۔ جامو نے پل بھر کی مہلت
میں اُن کے ساتھیوں کے نیفوں سے پر اپنی جگہ جکڑی بھری تھی کہ
وہ بُری طرح تڑپنے لگے تھے۔ اُن کی آواز بھی نہیں نکل رہی
تھی اور ان میں جامو کی پکڑ سے خود کو چھڑانے کے سوا کوئی
سکت نہیں تھی۔ جامو نے اپنے دونوں ہاتھوں کی وہ دو انگلیاں
اُن کی ٹھوڑی کے نیچے پیوست کر دی تھیں کسی کانٹے کی طرح۔
اُن کے چہرے کھنچے اور لٹکے جسموں کا سارا زور بھی جامو کے اُن
کانٹوں سے چھٹکارا پانے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ دونوں
مکمل طور پر جامو کے قبضے میں تھے اور اُن کے اطراف اُن کے

ساتھی جیسے ہوش و حواس کھو بیٹھے تھے۔ جامو نے ایک ثانیے
میں متعدد پینترے بدلے تھے اور انھیں اپنی انگلیوں کی معیّن
میں پیوست کیے اِدھر اُدھر گھماتا رہا تھا۔ ہر طرف جامو
کے پاس اُن کی ڈھال موجود تھی۔ جامو کے بجائے چاقو انھی کے
جسموں پہ لگتے۔ نتیجۃً باقی آدمیوں کو پیچھے ہونا پڑا۔ اگر وہ آگے
آتے تو اُن کے چاقوؤں سے انھی کے ساتھیوں کے جسم چھلنی
ہوتے۔ جامو اپنی جگہ جما ہوا نہیں کھڑا تھا۔ لمحے بھر بعد اس
کے بدلے ہوئے پینترے کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔ وہ اپنے ہاتھ
آگے پیچھے کرتا تو اس کی چنگلی میں جکڑے ہوئے دونوں آدمی
لازماً اسی کے ساتھ جدھر وہ جاتا، گھوم جاتے۔

ہم سب قریب ہی کھڑے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ جامو
سے ذرا بھی چوک ہو جاتی تو چاقو اُس کے جسم سے دور نہیں تھے۔
دونوں آدمی ڈھال سے ہونے لگے جیسا کہ قجل اکثر مجھ سے
کہتا تھا کہ داؤ میں بس لمحوں کا اُلٹ پھیر ہوتا ہے جامو نے
اس سے زیادہ وقت نہیں لیا تھا۔ قجل بھی اُن کے سامنے جا کے
یہی کچھ کرتا جو جامو نے کیا تھا اور کوئی بھی شخص جس کی انگلیاں
لوہے کی طرح سخت اور چاقو جیسی دھار رکھتی ہوں، ترازو کی
اُس ڈنڈی کے مانند جو بہت بڑا بوجھ سہار لیتی ہے۔ زیادہ
آدمیوں کے درمیان اسی قسم کا کوئی غیر متوقع داؤ سود مند ہوتا
ہے لیکن جامو کو دیر تک اس پر قائم نہیں رہنا تھا فوراً کوئی نیا
رُخ بدلنا چاہیے تھا۔ زیادہ وقت ایک ہی داؤ پہ اڑے رہنے
سے مقابل کے لوگوں کو اپنے بچاؤ کے علاوہ جوابی حربے اختیار
کرنے کا بھی موقع مل جاتا ہے اور جامو کو انھیں یہ موقع نہیں
دینا تھا۔ میرا خیال تھا جامو جلد ہی ان دونوں نیم جان آدمیوں کو ان
کے ساتھیوں پہ دھکیل دے گا اور اسی اثنا میں دوسرے آدمیوں کو
پکڑے گا یا خود چاقو سے اُن پہ وار کرے گا۔ اپنے دو ساتھیوں کی
جان لبی دیکھ کے اُن کے ہاتھ ویسے بھی ٹھیک طرح کام
نہیں کریں گے۔ وہ جامو کے پنجے سے انھیں چھڑانے کے لیے
اپنے چاقو زمین پر بھی پھینک سکتے تھے۔ اسی بات کا امکان
زیادہ تھا۔ اس طرف ہم بھی اُن کے قریب موجود تھے اور چاقوؤں
اتنی دیر خاموش رہنے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ہم ہر صورت
میں یوں ہی کھڑے رہیں گے۔ اُن کے پیچھے ہو جانے کے
باوجود جامو گھوم گھوم کے انھیں اُکسا رہا تھا تاکہ وہ اُس پہ وار
کرنے کا پھر ارادہ کریں اور اپنے ہی ہاتھوں اپنے ساتھیوں کو
چاقو گھونپ دیں۔

جامو کے ذہن میں کچھ اور بھی ہو سکتا تھا لیکن اُسے
کچھ اور سوچنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ اندر سے یک بارگی چند
آدمیوں کے جاگنے کی آوازیں آئیں۔ جامو نے پھر بھی انھیں
نہیں چھوڑا۔ آنے والے چھ آدمیوں میں سب سے نمایاں جو
آدمی تھا وہی رتنا ہو گا۔ مجھے اُس کا چہرہ کچھ جانا پہچانا
محسوس ہوتا تھا۔ شاید کبھی جیل میں دیکھا ہو مگر اب اُس کے جسم
اور شکل و صورت میں بہت فرق ہو گیا تھا۔ اُس کا جسم پہلے
کی نسبت بندھا ہوا تھا۔ وہ درمیانہ سا قد، لانبی گول چہرہ اور
مستول نشانوں کی بھرمار، بھنگ پیالی، لمبی ناک، پتلے پتلے ہونٹ،
آنکھیں بڑی نہ چھوٹی، بال سلیقے سے کڑھے ہوئے۔ درمیان میں
مانگ، کرتا پاجامہ اوپر سے ویسٹ کوٹ جس میں طلوس اُونچے
رنگ کے بڑے سے نگینے کی انگوٹھی کلائی میں گنڈا تھا۔ اُس کی
عمر پچیس سال کے لگ بھگ ہو گی۔ وہ تیز قدموں سے باہر
آیا تھا۔ آتے ہی اُس کی نظر جامو پر پڑی جو اُس کے دو آدمیوں
کو اپنی انگلیوں سے تھامے ہوئے تھا۔ رتنا دروازے کے
پاس ہی رک گیا۔ اُس کے ساتھ آنے والے آدمی جامو پہ لپکنے
کے لیے جست لگانا ہی چاہتے تھے کہ اُس نے ہاتھ کے
اشارے سے انھیں جھڑک دیا اور رکھا کے جامو کی طرف دیکھنے
لگا۔ اُس کے ویسے بھی لیے تھے۔ ہر چیز جیسے بے دم بے آواز
ہو گئی تھی۔ جامو نے دونوں آدمیوں کو اِدھر اُدھر دھکیل دیا تھا
لیکن خود وہیں کھڑا رہا۔ رتنا نے اُس کی طرف توجہ نہیں دی۔
اُس کی گھومتی ہوئی نظر قجل پہ جا کے ٹھیر گئی تھی۔ قجل بھی
اسی کو گھور رہا تھا۔ رتنا کے سکڑتے ہوئے ہونٹ پھیلتے گئے۔
"مہان پُرش آئے ہیں، دیکھت ہیں۔" [illegible] وہ [illegible] لہجے
میں بولا۔

قجل کے لبوں میں جنبش تک نہ ہوئی۔
"او ہو ہو!" وہ ایک کے بولا۔ "قجل اُستاد آئے ہیں۔"
"ذرا جلدی پہچان لیا۔" قجل سپاٹ لہجے میں کہا۔
"پیاس کو اس کو کیا بولے ہیں؟" اُس نے زمین پہ پڑے ہوئے
اپنے آدمیوں کی طرف نگاہ کرتے ہوئے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔
"بولنا بھی آگیا ہے مجھ کو۔"
"اور بھی بہت کچھ آوے ہے تمھارے سر کی قسم۔"
"تو بھو ویر کا ہے کو کرتا ہے؟"
"اندر چل کے کچھ مل بانٹ کر لیو بیرا وہ ہوا ہو۔"
"اب تو تیرا خون ہی پییں گے۔"
"بہت کڑوا ہے اُستاد! [illegible] لگے ہے۔ تیرا [illegible] دن کے
سنگ کچھ ڈھلک گیو ہے۔ آتے کسی نے بولا نہیں کہ رستہ

کدھر کو جا رہے ہے۔"

اُس کا وجود میری طرح کسی کو بھی ایک پل کے لیے برداشت نہیں ہو رہا ہوگا اور وہ اس قسم کی باتیں کر رہا تھا۔ ایک نظر دیکھنے سے معلوم ہو جاتا تھا کہ وہ کیسا آدمی ہے۔ اُس کے منہ ہی لگنا فضول تھا۔ ہم سب بھل کے اشارے کے منتظر تھے جو رتنا کے قریب ہی کھڑا تھا اور ہم میں سے بھی کسی کو اس کے پاس پہنچنے میں دیر نہ لگتی۔ ایسے آدمی کے لیے سوچنا ہی کیا تھا۔

"زیادہ چرچ مت کر۔" بھل نے بھاری آواز میں کہا۔ "جو بکواس کرنا ہے کر لے تیرے پاس ابھی تھوڑا ٹائم ہے۔"

"اب بھی کوئی بکواس رہ رہے ہے؟" وہ آنکھیں مٹکا کے بولا۔ "ہتھیار کو ہاتھ پر اُٹھنے لگا آئے گی۔ اچھا ہے اس کو بیچ میں مت لا۔ اپنا فیصلہ خود ہی کر لے۔ ہم لوٹ آئے ہیں۔"

"او تو ہم کو بھی دکھے ہے تم لوٹ آئے ہو پر ذرا دیری میں آیو ہو اور ادھر سارا کچھ بدل گیو ہے۔ بستے ادھر ہی آئے ہے بڑے۔"

بھل نے جواب میں چاقو نکال لیا۔

"اپنے پلے بھی ہوئے ہے استاد! اس کو بھیتر ہی رکھ لیو تو ٹھیک ہے۔ ہم لوگ وہی کو بڑا کھانا ہے گا۔ ابھی تماری کھوپڑیا میں پہلے کا کوئی دھیان ہے تو اس کو نکال دیو۔ اڈے پر اب ہم بیٹھے ہیں اور کسی سے مار کے نہیں بیٹھے ہیں۔ سودھی دے کے لیو ہے اور جب لیو ہے تو جانے بھی ہیں کہ اس کو کھا کیسے جائے ہے۔ ہم ادھر نا ہی آتے تو بدلے کوئی آ جاتا۔ بہت سے حواسیوں کے تو منہ میں پانی بہہ رہا تھے۔ شکر کرو کہ ہم آ ہی گئے۔ تمہارا سارا آدمی سالا ناک کٹانے کے بیٹھ گیو تھے۔ کچھ ادھر بھاگ گئے، باقی اُدھر جھرے میں چلے گیو۔ بولت ہیں کہ ایون کو ٹوس لیو۔ تمہارا کو شاید ابھی تک پتہ نہیں ہے۔ پر تمہارا کے بھیر گیو ہے تم سے کیا بولیں۔ کچھ کرنا ہیں؟ آیو ہو تو ادھر دھیرج سے بیٹھو پر اڈے کا بچار من سے نکال دیو۔"

"مزد تجھے کسی چھنال نے جنا تھا۔"

"کسی دھوکے میں مت رہیو استاد! بعد کو بڑی نندا ہوئے گی۔ تمہارے نکلنے کے بعد ہم اُدھر رات دن یہی سالا تمھی نا ہی مارت تھے۔ بچھاتی میں تمہاری بات اٹکانے کے گیو تھے۔"

پتہ نہیں بھل کو کس بات کا انتظار تھا، وہ اور کیا سننا چاہتا تھا۔ رتنا کی زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی اور بھل کا چاقو اُس کے ہاتھوں میں سرد پڑا تھا۔ اندھیرا تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ میں نے بے چینی سے بھل کی طرف دیکھا مگر وہ جیسے اپنے آپ میں گم تھا۔ رتنا کے خاموش ہو جانے کے بعد چند لمحے وہ چپ کھڑا رہا۔ "کا سوچن لاگے استاد!" رتنا نے ہی تمسخرانہ لہجے میں اُسے ٹوکا۔

بھل نے اپنا چاقو اُس کی جانب اُچھال دیا۔ رتنا کو اس کی توقع نہیں تھی۔ غیر اختیاری طور پر وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گیا لیکن چاقو زمین پر گرنے ہی والا تھا کہ اُس نے پھرتی سے اُسے ہاتھ میں اُچک لیا۔ "تاہی مانو گے لاگے ہے آج دن آیو گیا۔" وہ چاقو کی دھار پر انگلی پھیرتے ہوئے بولا۔ "ابھی اتنا بہت ہے استاد!" اُس کی آواز ایک دم بدل گئی۔ "اُلٹے پیروں ادھر سے لوٹ لیو۔" اُس نے چاقو واپس بھل کی طرف پھینک دیا۔ بھل نے ہاتھ بڑھا کے اُسے تھام لیا۔ رتنا نے اس دوران اپنا چاقو بھی نکال لیا تھا۔

"جلدی کر جاؤ کے بچے! اندھیرا بڑھ گیا ہے۔ دن میں ہی مجھ کو ٹھیک دکھائی نہیں دیتا، اندھیرے میں کیا خاک سوجھے گا؟"

"لاگے ہے آج دن آیو گیا۔" وہ سر جھٹک کے بولا۔ "بچپن میں ایک کہاوت سنیو تھے۔ گیدڑ کی موت آئے ہے تو شہر کی طرف بھاگے ہے۔ ہے کالی میّا! من میں تیرے داس کی ایک ہی اچھا تھی کہ تیرے چرنوں استاد بھل کے خون کا چڑھاوا دیوں۔" رتنا اپنا چاقو چومتے اور آسمان کی طرف نگاہ کرتے ہوئے جذباتی انداز میں بولا۔ اُس نے چاقو بھل پر تول لیا تھا مگر ایک دم رک گیا اور بھل سے کہنے لگا۔ "پر ادھر نہیں۔ اندر چلو۔ اندر جگہ بڑی ہے۔ تم کو بھی شکایت نہیں ہوئے گی اور ادھر کالی میّا کی مورتی بھی درشن دیوے ہے۔ اس کے آگے ہی بل ہوت ہے۔" یہ کہتے ہی وہ مڑ گیا۔

بھل بھی غالباً یہی چاہتا تھا۔ اُس نے اعتراض نہیں کیا۔ اس طرف جگہ بہت تنگ تھی۔ پیچھے گلی کے کھلے دروازے سے لوگ اندر جھانک رہے تھے مگر اُن میں سے کوئی اندر نہیں آیا تھا۔ اُن کا گھٹا گھٹا شور ہمارے کانوں میں گونج رہا تھا۔

بیچ کا کمرہ پھلانگ کے ہم صحن میں آ گئے۔ صحن کا نقشہ بدلا ہوا تھا۔ فرش دھلا ہوا، دیواروں پر نئی سفیدی ہوئی وی تھی۔ دیوار کے ساتھ ہی بڑی سی چوکی پر گیروے رنگ کی چادر بچھی تھی۔ سامنے مونڈھے پڑے تھے۔ صحن کی یہ صفائی ستھرائی کپتن خان کی زندگی میں ہوتی ہوگی۔ وہ کپڑے بھی صاف ستھرے پہنتا تھا اور ہر وقت بنا سنورا رہتا تھا۔ صحن خاصا کشادہ تھا۔ اندر پہلے سے کچھ اور آدمی موجود تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ رتنا نے اپنے خاص آدمیوں کو باقاعدہ اکٹھا کیا ہوا تھا یا وہ اڈے کے گرد

ہی گھومتے رہتے تھے اور گلی میں ہمارے اطراف بھیڑ دیکھتے ہی یہاں آ گئے تھے۔ اُن میں سے چند کے چہرے مجھے دیکھے ہوئے لگتے تھے۔ شاید وہ موہلے کے اڈے کے لوگ تھے یا کسی اور اڈے کے ہوں گے۔ بھل بلاکر جامو سارنے وغیرہ انھیں خوب جانتے ہوں گے۔ صحن میں آتے ہی رتنا اُس طاق کی طرف مڑ گیا تھا جہاں زبان نکالے ہوئے کالی دیوی کی سیاہ مورتی رکھی تھی۔ وہ ہاتھ جوڑے طاق کے روبرو سرنگوں رہا تھا اور اُس کا چاقو مورتی کے قدموں میں پڑا تھا۔ باقی لوگ صحن میں ہر طرف دربانوں اور پہرے داروں کے مانند کھڑے تھے۔ انھیں آپس میں اشارے کرنے کے سوا اور وقت نہیں ملا ہوگا۔ اُن کے پیچھے ہم فوراً اندر آ گئے تھے۔

صحن میں روشنی کی کمی نہیں تھی۔ تمام بتیاں جل رہی تھیں۔ کالی دیوی کے پاس سے ہٹ کے رتنا چوکی کے سرے پر پاؤں لٹکا کے بیٹھ گیا۔ ہم سب چوکی کے نزدیک ایک طرف موجود تھے۔ اپنے ہی گھر میں اجنبی بنے ہوئے۔ بھل جسم و فنا ہو گزر رہا تھا، یہ دیکھنے کے لیے ہم یہاں نہیں آئے تھے۔ سب اپنے ہاتھ پیروں کو بمشکل روکے ہوئے تھے۔ کسی کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ آگے بڑھ کے رتنا کی انتڑیاں نکال دے، اُس کی کھال ادھیڑ دے، آنکھیں پھوڑ دے۔ اگر بھل یہ سمجھتا تھا کہ وہ رتنا ہی ہے جس نے کپتن خان اور اپنے دوسرے آدمیوں کو آنکھیں کھولنے کی مہلت نہیں دی تھی تو سامنے آنے کے بعد رتنا بھی اتنی دیر کا مستحق نہیں تھا مگر بھل کا جی شاید ٹھہر کا ہو گیا تھا۔ چاقو اُس کے ہاتھ میں موجود تھا اور وہ رتنا کے چوکی سے اُٹھنے کا منتظر تھا۔ جب بھل نے اڈے کی عمارت کے پیچھے گلی کے نکڑ پر ٹیکسیاں رکوائی تھیں اور گلی کے لوگوں نے ہمیں گھیر لیا تھا، اُس وقت مجھے خدشہ ہوا تھا کہیں رتنا اس عرصے میں اڈے سے نکل نہ جائے۔ اڈے کا ایک دوسرا راستہ پچھلی گلی میں کھلتا تھا لیکن رتنا نہ تو پچھلے دروازے سے باہر گیا، نہ اُس نے چاقو اُٹھانے سے اجتناب کیا بلکہ مجھے ایسا لگتا تھا جیسے اُسے ہمارا انتظار ہی ہو۔ جس شخص نے کپتن خان کو اس طرح راستے سے ہٹایا ہو، ہماری آمد کی اطلاع سُن کے وہ یوں اڈے پر بیٹھا نہیں رہ سکتا تھا۔ پھر شاید وہ رتنا نہیں تھا۔ بھل بھی کچھ نہیں سمجھ رہا تھا مگر یہ رتنا کی کٹ حجتی بھی ہو سکتی تھی۔ اس طرح وہ ہم لوگوں پر کچھ اور ثابت کرنا چاہتا ہو گا جو اُس نے پولیس پر ثابت کیا تھا اور رتنا بھی کچھ ثابت کرنے کی کوشش کر سکتا تھا جب اُسے اپنے بازوؤں کا کچھ زیادہ ہی اعتماد حاصل ہو، تازہ حوالہ نہیں۔ اڈے پر قبضہ جمانے کے لیے پہلے کپتن خان کو ایسے ہی ختم کیا جانا چاہیے تھا۔ سامنے آ کے وہ کپتن خان، لالو، شولی، قدے، کالو نتے، کس کس کا سامنا کرتا۔ ایک کپتن خان ختم ہو جاتا تو اڈہ اُس کے ہاتھ میں نہ آتا اور ایک وقت کو آ بھی جاتا تو دوسرے چین نہ لینے دیتے۔ اڈے پر ایک سے ایک آدمی موجود تھا۔ اس طرح اڈے پر کوئی باقی نہیں رہا تھا اور اڈا حاصل کرنے کے بعد وہ اُس کے بازوؤں ہی کا زور تھا جو کھلنے کے دوسرے استادوں کو اُس سے دور رکھے ہوئے تھا اور اب وہ اسی کس بل پر بھل کے سامنے موجود تھا۔ اس بھل کے سامنے جسے وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ اُس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا مگر خوف اور گھبراہٹ کے آثار نظر نہیں آتے تھے یا وہ انھیں چھپانے پر قادر تھا۔

مورتی کے پاس سے ہٹ کے چند ثانیوں تک وہ سر جھکائے چوکی پر بیٹھا رہا پھر اچانک کالی دیوی کا نعرہ لگا کے چوکی سے اُٹھ گیا۔ میں نے روکنا چاہا مگر بھل چند قدم چل کے اُس کے مقابل آ گیا۔ رتنا نے اُس کے پاس پہنچنے سے پہلے ہی دونوں ہاتھ پھیلا دیے تھے۔ بائیں ہاتھ میں چاقو چمک رہا تھا مگر یکایک وہ پیچھے ہٹ گیا جیسے اُسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ "نائیں!" وہ ترش لہجے میں بولا۔ "تیرے پیر میں چوٹ لگے ہے۔ تم سے ٹھیک سے تو چلا بھی نہ جاوے ہے۔"

"آگے بڑھ!" بھل نے بھری ہوئی آواز میں کہا۔

"بڑھنے کو بڑھ جاویں گے پر کالی میّا کا بولے گی؟ چوٹ کھائے کی بھینٹ سرکار نہ کرے گی۔"

"آگے بڑھ!" بھل کی آواز صحن میں گونجنے لگی۔

"نائیں استاد! ہم کو مجبور مت کریو۔ ابھی پاؤں ٹھیک کر لیو، پھر جاوے تو ہم کدھر جاوے ہیں۔"

"یہ گوتو بھلا چنگا ہے رستم کے تھوکے۔"

"او تو تم کو پتہ چل جائے گا رستم کے تھوکے ہیں یا رستم۔ تھوکتے ہیں ہم اپنے پاؤں کی یہ حالت ہوتی تو تم کیا آگے بڑھ جاتے؟ نا نا استاد! اپنے دھرم میں چوٹ کھائے پر ہتھیار اُٹھانا پاپ ہے۔"

بھل نے اُس سے نہیں کہا کہ ہتھیار اندھوں پر اٹھانا پاپ نہیں ہے؟ آ سے چوری سکھانا پاپ نہیں ہے۔ بھل کے بولنے سے پہلے جامو سنسناتی آواز میں بولا۔ "جان دے استاد! تو نے معاف کر دیا ہے تو ادھر سے کوئی دیوی کے لیے چُن لے۔ تمہارے ان کی حسرتیں بھی نکال لیو دیں گے۔ پہلے جوڑ کر تو

کاٹ دیں اور تم کو ایسے ہی تھیلی ہوتے ہے تو اِدھر کھڑے
آدمی تالی بجانے کو تیار ہیں۔ کل کو یہی بھالے کے آؤ اور
بولیو کہ رتنا استاد ابھی پہلے اس پر ہتھیار اٹھاؤ تو کام تمہاری
بات مان لیں گے۔ پہلے استاد کو دیکھ لیں اور استاد ہم کو۔
برسوں ان ہاتھوں کی گھسائی پھر کس کا دن کیے تھے تم لوگ
تو تمہارا لہو بھی آ جاوے گا۔ اڈے پر بیٹھے ہیں ابھی ماں۔۔۔
وہ گالی دے کے ہلا۔ تھل کی آنکھیں بھاری ہو گئی تھیں۔ میرا
اندازہ ٹھیک نکلا۔ اب اُسے کچھ اور نہیں سننا چاہیے تھا۔ وہ
دو قدم آگے بڑھ گیا۔ رتنا کو جلد ہی احساس ہو گیا کہ وہ فضول باتیں
کر رہا ہے۔ تھل کو آگے آتے دیکھ کے ایک آن میں اس نے
اپنا جسم سیدھا کیا اور اس کے ہاتھ پیر جیسے پھڑپھڑانے لگے۔ "میا کی
سوگند"۔ وہ چیختے ہوئے بولا۔ "بہادر مت سمجھیو کہ ہم کوئی
رسّی تڑاوے ہیں۔ ہم کو معلوم نہ تھا کہ ایک دن ایسو آئے گا۔
سوچا کہ تمہارا ہی بچن دیے تھے۔" وہ دیوانوں کی طرح اپنا سر ہوا
میں جھٹکنے لگا۔ "نہیں مانت ہو تو ٹھیک ہے۔ میا جانے۔ اور خود
دیکھ رہی ہے۔" اس نے طاق میں رکھی مورتی پر ایک نظر ڈالی
اور ہاتھ جوڑ کے نعرہ لگایا۔ "جے بھوانی کی۔" اس کے دونوں ہاتھ
تھل کو اپنے شکنجے میں کسنے کے لیے پھیل گئے۔

اس نے اچھل کے تھل سے اپنا فاصلہ اور کم کر لیا۔ تھل
کا چاقو بھی بائیں ہاتھ میں تھا۔ وہ رتنا کی طرح اُچھلا اور کودا
نہیں کچھ آگے جا کے رک گیا۔ رتنا کو بھی ٹھہرنا پڑا مگر اس کے
ہاتھ پہلے ہی جیسے میں تھل کا نشانہ لینے کے لیے بے قرار تھے۔
دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے تھے۔ رتنا کے
ہونٹ بھنچے ہوئے نتھنے پھولے ہوئے تھے اور اس کی آنکھیں
سر سے پاؤں تک تھل کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ وہ ہاتھ جھٹک
جھٹک کے تھل کو جنبش کرنے پر اکسا رہا تھا جو اپنی جگہ جم سا
گیا تھا۔ رتنا کو اس پر حملہ کرنے کے لیے بظاہر کوئی رکاوٹ
نہیں تھی مگر تھل کی اس بے حرکتی نے اسے اور زیادہ محتاط کر دیا
تھا اور وہ کچھ تلملانے لگا تھا۔

صحن میں سکوت مسلط تھا۔ ہر طرف حصار بنائے رتنا
کے آدمی جیسے مجمے کو دیکھ رہے تھے۔ ان کی گردنیں آگے نکلی ہوئی
تھیں آنکھیں پھٹی ہوئی۔ ہم بھی ایک کونے میں دم روکے
کھڑے تھے۔ جلا کو اور سانپ میرے بازوؤں سے چپکے ہوئے
تھے۔ حامد اپنا گال کھرچ رہا تھا۔ سب کی نظریں ایک ہی طرف
لگی ہوئی تھیں۔ بہت دنوں بعد تھل کسی کے سامنے یوں چاقو
کھول کے کھڑا تھا۔ ہمیں کسی واردات کی اتنی فکر نہیں تھی جتنی
رتنا کی طرف سے تھی۔ اس سے کوئی بھی حرکت بعید نہیں تھی
اور اِدھر تھل کا پیر مڑا ہوا تھا۔

رتنا کے جسم پر ایک ہیجان طاری تھا۔ تھل کو ایک جگہ
جمے دیکھ کے اس کی حالت کچھ اور اضطراری ہو گئی تھی۔ وہ پیچھے
نہیں ہٹا البتہ ایک طرف ہو گیا جو پیچھے ہٹنے ہی کے مترادف
تھا۔ تھل وہیں کھڑے کھڑے مڑ گیا۔ رتنا نے اُسے ایک جھپکی
دی، کارگر نہیں ہوئی تو وہ دائیں طرف ہو گیا۔ تھل کو پھر دائیں
طرف اپنا رخ بدلنے میں دشواری نہیں ہوئی۔ تین چار بار وہ
یہی عمل دہراتا رہا۔ اس کا خیال ہو گا کہ تھل کے لیے اس حالت
میں چلنا مشکل ہے چنانچہ وہ اسے جتنا تھکا سکتا ہو تھکائے
لیکن تھل جدھر وہ جاتا، ایک پل میں اُسی طرف منہ کر لیتا۔
اس نے ایک قدم بھی نہیں بڑھایا۔ وہ رتنا سے جو کچھ کہنا چاہتا
تھا، رتنا بھی اُسے سمجھ گیا تھا اس لیے وہ اس کے قریب آنے
اور ایک جگہ جمے رہنے کے موقع سے فائدہ اٹھانے کے بجائے
پہلے اُسے تھکا دینے کی تگ و دو میں تھا۔ رتنا کے لیے یہ صورت
حال عجیب اور وحشت انگیز تھی کہ کوئی اس طرح چاقو تانے
کھڑا ہے۔ ایک انچ بھی ہل کے نہ دے اور وہ اس کے قریب
نہ جا سکے۔ اگر تھل نے یہ طے کر لیا تھا کہ وہ یوں ہی اپنے محور پر
گھومتا رہے گا تو رتنا نے بھی اسی تکرار کی ٹھان لی تھی۔ رتنا کی
جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو کچھ دور جا کے اور فاصلہ بڑھا کے تھل
کی طرح ایک جگہ جم جاتا اور جب تک وہ حرکت نہ کرتا، اس
وقت تک تحمل کرتا۔ شاید اس طرح تھل کو بڑھنا ہی پڑتا مگر
رتنا کو ہر دم یہ احساس ہو گا کہ اس کے سامنے کون ہے اسی لیے
وہ اس کے قریب آنے اور اس پر جھپٹنے سے پہلو بچا رہا تھا،
مبادا تھل کچھ اور ہی سوچے ہوئے ہو۔ کسی کو بھی یہ احساس ہر دم
غالب رہتا۔ مشہور تھا کہ تھل کو صرف ارادے کی دیر لگتی ہے۔
اس کے اٹھے ہوئے ہاتھ ہوا میں اڑتے ہوئے پرندوں کے مانند
ہوتے ہیں جن کا کوئی پتہ نہیں چلتا کہ وہ کس طرف مڑ جائیں
گے، کون سی شاخ پر جا بیٹھیں گے۔

تھل کے ہاتھ گرے ہوئے نہیں تھے۔ رتنا کی طرح وہ بھی
انھیں پھیلائے ہوئے تھا۔ اس کا سر، آنکھیں، کاندھے متحرک تھے
مگر وہ ایک جگہ کھڑا تھا۔ تماشا دیدنی تھا۔ رتنا کے ذہن میں یہی
تدبیر آئی جس پر اُسے پہلے سے عمل کرنا چاہیے تھا۔ یعنی اس
نے اپنا فاصلہ زیادہ کر لیا۔ تھل پھر بھی نہیں ہلا۔ رتنا کے لیے یہ
ناقابل برداشت تھا۔ کچھ دیر تو وہ انتظار کرتا رہا، پھر "جے بھوانی"
کا نعرہ لگا کے دہاڑتا ہوا آگے آیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ سیدھے

تھل کے پیٹ میں چاقو گھونپ دے گا لیکن وہ صرف آزمانا
آیا تھا۔ تین چار فٹ کا فاصلہ رہ گیا تو وہ اچانک پلٹ کے دائیں
طرف ہو گیا۔ پھر وہیں سے اُلٹے قدموں واپس آ گیا۔ اس تیزی سے
آ کے اس کا ایک دم پلٹ جانا آسان کام نہیں تھا۔ اس سے
اس کے جسم کی پھرتی اور زور کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ اُسے
اپنے جسم پر پورا قابو حاصل تھا۔ اس کی بات اس حد تک درست
ہی لگتی تھی کہ وہ برسوں خالی نہیں بیٹھا رہا ہے۔ جسم کو تیار تنا
تو استوار رہا ہے۔ یہ سب اس کے کینے ہی نے کرایا ہو گا جو
جھگڑے سے نکالے جانے پر وہ تھل کے لیے اپنے دل میں بھر کے
گیا تھا۔ کوئی بات ضرور ہو گی جو اتنے عرصے بعد اس نے جھگڑے
واپس ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

ایک فاصلے پر لوٹ کے وہ چند لمحے اپنی سانسیں درست
کرتا رہا۔ پھر زقند کے انداز میں اس نے دوبارہ تھل کی جانب
دوڑ لگائی مگر اس بار وہ کچھ اور ہی ارادہ کر کے گیا تھا۔ تھل کے
قریب جا کے پہلے تو اس نے حسب سابق اپنی پھرتی سنبھال اور
دائیں طرف مڑا۔ وہ واپس ہونے کے بجائے بائیں طرف آنا چاہتا
تھا کہ تھل نے دفعتاً اپنا چاقو پھینک دیا اور عین اسی لمحے ایک
قدم آگے بڑھ کے دائیں ہاتھ کو زور سے جھٹکا دیا۔ میری کھلی آنکھوں
کی بینائی شاید ایک لمحے کو جاتی رہی تھی۔ دوسرے لمحے تھل کا
پنجہ رتنا کے چاقو والے ہاتھ کا پنجا پکڑے ہوئے تھا۔ ابھی میں
اپنے دیکھے ہوئے پر یقین نہیں آیا تھا کہ رتنا نے جھک کے تھل کے زخمی پیر پر
ٹھوکر ماری اور اپنے دوسرے ہاتھ سے اس کی ٹھوڑی پر ضرب
لگانی چاہی۔ تھل کو اندازہ ہو گا کہ رتنا یہی کچھ کرے گا اسی لیے اس
نے اس کا دوسرا ہاتھ کھلا رہنے دیا تھا۔ رتنا دیکھ نہیں سکا کہ تھل نے
اس اثنا میں اپنا خالی ہاتھ سر کے اوپر موڑ کے رکھا ہوا ہے۔ اگر اس
نے دیکھ لیا تھا تو سمجھ نہیں سکا یا اس وقت دیکھا جب وہ ضرب
کے لیے اپنا ہاتھ بڑھا چکا تھا۔ تھل نے کچھ آگے کھسک کے
اس کی ضرب اور یقینی بنا دی اور ضرب برداشت کر لی مگر ادھر
رتنا کا ہاتھ اس کی ٹھوڑی تک پہنچا کہ اُدھر اوپر کسی کلہاڑی کے
مانند اس نے اپنے اٹھے ہوئے ہاتھ سے ضرب لگائی۔ تھل نے
اس بات کا خیال رکھا تھا کہ جس وقت وہ اوپر سے اپنی ٹھوڑی
تک رتنا کے بڑھے ہوئے ہاتھ پر ضرب لگائے تو رتنا کا ہاتھ
ٹھوڑی سے نیچے گر کے اپنے اور اس کے درمیان معلق فاصلے
کے درمیان جھولتا نہ رہ جائے ورنہ ضرب کا نتیجہ نکلا کوئی نتیجہ
اسی صورت میں برآمد ہو سکتا تھا کہ رتنا کا ہاتھ کہیں اٹک
جائے۔ آگے کھسکنے کی یہی وجہ تھی۔ رتنا کا ہاتھ تھل کی ٹھوڑی
سے ہٹ کے اس کے سینے پر آ کے ٹکا تھا۔ صحن رتنا کی چیخ
سے گونج اٹھی۔ تھل نے ساتھ ہی اس کے چاقو والے ہاتھ پر پیچ
سے زور دیا تھا۔ چاقو اب رتنا سے سنبھلا نہیں رہ سکتا تھا، وہ
گر گیا تھا۔ رتنا بھی لڑکھڑانے لگا۔ تھل نے اپنے زخمی پیر سے
اس کے پیٹ میں ٹھوکر ماری اور پیچھے ہی وہ زمین پر گرا، پیٹ کے بل
تھل نے بڑھ کے اس کی گھٹنوں پر اپنا پیر جما دیا۔ رتنا میں اُٹھنے
کی سکت ہی نہیں رہی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ ٹوٹ چکا تھا،
دوسرے ہاتھ سے اس نے تھل کا پاؤں پکڑنے کی کوشش کی
مگر نیچے اس کی ٹھوڑی دبی ہوئی تھی جتنا وہ زور کرتا، ٹھوڑی پر
تھل کے پیر کا دباؤ اتنا ہی بڑھتا جاتا۔ تھل نے جھک کے اس
کا چاقو اٹھایا اور صحن میں چاروں طرف گھما کے دیکھا۔ رتنا کے
آدمی اُسے گھورتے تھے۔ رتنا کے دوبارہ زقند لگانے اور زمین
پر چت گرنے کے درمیان کا عرصہ اتنا مختصر تھا کہ سب کو اپنی
آنکھوں کا دھوکا معلوم ہوتا ہو گا مگر رتنا ان کے سامنے زمین پر
پڑا کراہ رہا تھا۔

ہم سب نے اپنے اپنے چاقو نکال لیے تھے مگر حصار بنائے ہوئے
پھر رتنا کے آدمی آگے نہیں بڑھے اور ہر طرف سے گرنے والے
چاقوؤں کی جھنکار فرش پر اٹھی۔ انھوں نے اپنے چاقو تھل کے
پیروں پر ڈال دیے تھے۔

ہم سب فوراً صحن میں بکھر گئے۔ سولہ نے تھیلا اٹھا لیا
تھا لیکن رتنا کے آدمیوں کو ایک طرف کر کے اور تھیلے با تھل کو
کے اس نے تھیلا واپس جیب میں رکھ لیا۔ شاید اسے آنے والوں کو
یہ جتانا مقصود تھا کہ ہمارے پاس پہنچ گئی ہیں۔ سولہ کی اس بات
اب بے معنی تھی۔ صحن کا ایک چکر لگا کے جا سولہ تھل کے
پاس پہنچا۔ "تم ابھی بیٹ جاؤ۔" وہ بھرائی آواز میں ضد کرنے لگا کہ
رتنا کو اس کے حوالے کر دیا جائے۔

تھل نے پہلے انکار کر دیا مگر پھر مان گیا۔ "اٹھا کے اُدھر
بیٹھک میں پھینک دے۔" اس نے ترشی سے کہا۔

"مردی کو بھی پھر اُدھر لے جا تو استاد؟ دیوی کے
سامنے ہی اس کی بلی ہو جا۔" سولہ نے کہا۔

"اتنے جلدی چھٹکارا دلا دے گا۔ اُدھر لے جا کے ذرا اس
کی خاطر تواضع کر لے۔ اڈے کا استاد ہے یہ۔"

رتنا بھی یہ سب سن رہا تھا۔ اس نے کراہتے ہوئے اٹھنے
کی کوشش کی تھی کہ تھل نے اس کے منہ پر پیر ہٹا کے ایک
ٹھوکر ماری۔ رتنا آنکھیں جھپکنے اور سمجھنے لگا۔ اسے اٹھانے کے
جا ہو نے اس کا وہی ہاتھ پکڑا جو ٹوٹ چکا تھا۔ رتنا کی چیخ نکل

گئیں مگر جامو اُسے ٹھوکریں مارتا ہوا صحن سے لے گیا۔ اُدھر سے بینی اُس کے پیچھے بھاگا۔ قبحل ہی نے اُسے جامو کے ساتھ جانے کا اشارہ کیا ہوگا۔

میں جامو کے ساتھ اندر نہیں گیا تھا۔ رتنا کے گرتے ہی صحن میں کچھ دیر کے لیے کھلبلی سی ہوئی تھی پھر جیسے ہر چیز ٹھہر گئی تھی۔ ہرپالا، بدرا اور چنگا ما ایک کونے میں دبکے ہوئے تھے۔ رتنا کے آدمیوں کی جانب سے اطمینان کرنے کے بعد میں لوٹا تو قبحل صحن کے وسط میں اُسی جگہ خاموش کھڑا تھا۔ میں اُس کا ہاتھ تھام کے چوکی تک کھینچتا ہوا لے آیا۔ "بیٹھ جاؤ۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

اُس نے بجھی بجھی نظروں سے مجھے دیکھا اور میری بات مان لی۔ پھر میں نے فرش پر اکڑوں بیٹھ کے اُس کا پیر اپنے زانوؤں پر رکھ لیا۔ "سب ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ تھکے ہوئے لہجے میں بولا لیکن میں نے اُس سے پوچھے بغیر پٹی کھول دی۔ کپڑے کا رنگ مٹی کی گرد اور خون سے میلا چکٹ ہو گیا تھا۔ وہی ہوا جس کا مجھے اندیشہ تھا۔ پیر پھولا ہوا تھا۔ صاف دکھائی دیتا تھا کہ اندر سے پک چکا ہے اور اوپر تک پیپ رہا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کروں۔ اُسے دیکھ کر میرے ہاتھ پاؤں خود بخود پھولنے لگے تھے۔ پٹی کھول کے میں نے غلطی کی تھی۔ قبحل کو بھی اُسے دیکھنے کا موقع مل گیا اور صحن میں کھڑے ہوئے دوسرے لوگوں کو بھی۔ گلی میں اڈے کے قریب مدن پہلوان نامی ایک جراح رہتا تھا مگر باہر لوگوں کا ہجوم تھا۔ مدن بھی انھی میں شامل ہوگا۔ ایسے میں اُسے ڈھونڈنا آسان نہیں تھا۔ مجھے یاد تھا کہ بیٹھک کے برابر والے کمرے میں مرہم اور دواؤں کا ایک صندوقچہ رکھا رہتا ہے۔ ممکن ہے اب بھی وہ اُسی جگہ ہو لیکن اب عارضی دواؤں کا وقت نکل چکا تھا۔ مدن کو فوراً تلاش کرنا چاہیے تھا۔ میں کسی کو بلا کے اور اُسے قبحل کے پاس چھوڑ کے باہر مدن کے پاس جانے کو سوچ ہی رہا تھا کہ گلی میں شور اُٹھا اور سیٹیاں بجنے لگیں۔ ابھی میں کچھ سمجھ نہیں پایا تھا کہ چند سپاہی، انسپکٹر داؤ دیال اور پولیس کا ایک اور افسر تقریباً بھاگتے ہوئے اندر داخل ہوگئے۔ داؤ دیال اور دوسرے افسر دونوں کے ہاتھوں میں تمنچے تھے۔ تمام دروازے کھلے ہوئے تھے۔ گلی میں لوگوں کی بھیڑ تھی۔ پولیس کی کسی وقت بھی متوقع تھی لیکن مجھے یہ دیکھ کے حیرانی ہوئی کہ بلاکی ان کے ساتھ تھا۔ ابھی چند منٹ پہلے میں نے اُسے یہیں دیکھا تھا۔ داؤ دیال گھبرایا ہوا آیا تھا اور تمنچا تانے چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھ رہا تھا۔ "آؤ داؤ جی آؤ۔ بڑی دیر کر

دی۔" قبحل نے اُٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ میں نے اُسے اُٹھنے نہیں دیا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" وہ بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"ابھی ادھر اپنے پاس رسان سے بیٹھو۔"

"رتنا کدھر ہے؟" داؤ دیال کی نظریں ہر طرف متلاشی تھیں۔

"اُدھر بیٹھک میں بلی کے لیے تیار ہے۔"

"اپنے ماتھر صاب بہادر کدھر ہیں؟" قبحل نے اُس کی بات کا جواب نہیں دیا۔

"وہ بھی آتے ہوں گے لیکن لیکن قبحل یہ سب کیا ہے؟"

"اس کو ہی دکھانے کے لیے آپ کو بلوایا تھا۔ اچھا ہوا رستے میں مل گئے۔ سب ٹھیک ہے صاب! تمنچے کو اندر ڈبی میں ڈال لو۔ بھاری بہت لگتا ہے۔"

داؤ دیال خود ہی دیکھ رہا تھا کہ تمنچے کی ضرورت نہیں ہے۔ اُس نے اُسے ہولسٹر میں اُڑس لیا۔ اُس کے ساتھی افسر نے بھی۔

"مگر یہ اندر کون چیخ رہا ہے؟" داؤ دیال وحشت سے بولا۔ بیٹھک سے بار بار رتنا کی چیخیں اُٹھ رہی تھیں۔ جامو کے ہاتھ نہیں رُکے ہوں گے۔

"آواز بھی نہیں پہچانتے؟ اور کون ہوگا داؤ جی۔"

"قبحل تمھیں اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔"

"اپنے گیارہ آدمیوں کو مٹی کرنے کی اجازت پھر آپ ہی نے دی ہوگی۔ ابھی دھیرج رکھو ماتھر صاب کو آجانے دو۔"

"بیٹھک کا دروازہ کھلواؤ۔" وہ تحکمانہ لہجے میں بولا۔

"دروازے پر تالا نہیں پڑا ہے۔ پر اندر جانے کی کیا ضرورت ہے۔ اُدھر یہ سالے سے حاضر ہیں۔" قبحل رتنا کے آدمیوں کی طرف منہ اُٹھا کے بولا۔ "پہلے انھی کو دیکھ لو۔ دو چار کام کے مل جائیں گے۔ ویسے بھی اپنے کو انھاں گیرے دکھائی دیوے ہیں۔"

انسپکٹر داؤ دیال نے قبحل کی بات آدھی سنی آدھی نہیں سنی، سرپٹ بیٹھک کی طرف دوڑا۔ بیٹھک کا دروازہ بند تھا مگر اندر سے کنڈی نہیں لگی ہوئی تھی۔ ساتھ ہی سپاہی بھی اندر دوڑ پڑے اور اُنھوں نے جامو اور بینی کو پکڑ کے باہر دھکیل دیا لیکن رتنا کی چیخیں بند نہیں ہوئیں۔ قبحل بھی پھر چوکی پر بیٹھا نہیں رہا۔ کسی آنچیر کے بغیر میرے زانو سے اُس نے اپنا پاؤں کھینچا اور تیز قدموں سے لنگڑاتا ہوا بیٹھک کی طرف جانے لگا۔ ابھی وہ اندر نہیں گیا تھا کہ ڈی ایس پی ماتھر، ایس پی جوشی اور ایک دوسرا افسر کئی سپاہیوں کے ساتھ بڑبڑاتے ہوئے صحن میں داخل ہوئے۔ قبحل رُک گیا۔ "آپ ہی کا انتظار تھا ماتھر صاب۔" قبحل نے اُس

کے قریب جا کے زیر لبی سے کہا۔

"شاید مجھ سے اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی ہو گئی ہے اُستاد قبحل!" ماتھر سنسناتی ہوئی آواز میں بولا۔ اُس کا چہرہ بھی لال ہو رہا تھا۔

"آپ ہی کے بولوں کا خیال تھا سرکار! ورنہ اس بے بیچے کی ادھرا کچھ بھی نہیں ملتی۔ ہاں اپنے ہاتھوں میں زندگی بھر اُلجھن ہوتی رہے گی۔"

ماتھر پلکیں پٹ پٹانے لگا۔ "مجھے یقین تھا، مجھے یقین تھا کہ تم نہیں بھولے ہو گے۔" وہ جوش میں بولا۔

"آپ نہیں ہوتے تو شاید بھول بھی جاتے۔"

"مگر تم تم یہاں یہ سب ......؟" ڈی ایس پی ماتھر سٹ پٹائے لہجے میں بولا اور کچھ کہے بغیر قبحل کا منہ تکنے لگا۔

کوئی جواب دینے کے بجائے قبحل بیٹھک کی طرف مُڑ گیا۔ ماتھر اور جوشی بھی اُس کے ساتھ اندر چلے گئے۔ انسپکٹر داؤ دیال وہاں پہلے سے موجود تھا۔ قبحل کے سوا ہم میں سے کوئی بھی اندر نہیں گیا۔ جامو اور بینی کو سپاہیوں نے پکڑ رکھا تھا۔ وہ اُن سے اپنے آپ کو چھڑانے کی بے کار کوشش کر رہے تھے۔ اندر سے رتنا کے چیخنے کی آوازیں اچانک اور تیز ہو گئیں۔ دیر تک وہ باہر نہیں نکلے۔ قبحل کے پیر پر اب پٹی نہیں تھی۔

جس وقت سپاہی رتنا کو تھامے باہر لائے اُس سے چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔ جامو نے اُسے ادھ مُوا کر دیا تھا۔ منہ اور ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ جامو نے شاید اس کی کُہنیاں زمین پہ رگڑی تھیں، وہ بھی زخمی تھیں۔ اُس کی گردن ڈھلک ڈھلک جاتی تھی۔ [illegible] کی انکھیاں کھلی ہوئی نظر آتی تھیں۔ گریبان چاک تھا اور چھٹی ہوئی واسکٹ کندھے پہ جھول رہی تھی۔

"تم سب بھی ہمارے ساتھ چلو گے۔" ایس پی جوشی نے باہر آ کے حکم دیا۔

قبحل نے سر اُٹھا کے تند نظروں سے جوشی کو دیکھا۔ پھر ماتھر کو۔ میں درمیان میں بولنا چاہتا تھا کہ ہم سب کو لے چلو، قبحل کو یہیں رہنے دو لیکن جب قبحل ہی کے ہونٹ پھڑپھڑا کے رہ گئے تو میں بھی خاموش رہا۔

سپاہیوں کی تعداد کم تھی اور رتنا کے آدمیوں سمیت ہماری زیادہ۔ اُنھوں نے پہلے رتنا کے آدمیوں کو ہنکاتے ہوئے باہر نکالا۔ جب سے پولیس اڈے پہ آئی تھی اُن کی نظریں اِدھر اُدھر بھٹک رہی تھیں۔ ممکن ہے اُن میں سے کسی نے بھاگنے کا بھی ارادہ کیا ہو لیکن اتنے لوگوں کی موجودگی میں اس کا کوئی امکان نہیں تھا۔

پلٹو، سارے سُولم کے ساتھ ہرپالا، بدرا اور چنگا مسلسل اُن پر نظر رکھے ہوئے تھے اور پھر پولیس بھی موجود تھی۔

گلی میں اب بھی لوگوں کے غٹھ کے غٹھ لگے ہوئے تھے۔ باہر رہ جانے والے سپاہی سیٹیاں بجا بجا کے اور لاٹھیوں کے زور پر انھیں عمارت سے دور رکھے ہوئے تھے۔ آگے پیچھے پولیس کی کئی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ احتیاطاً وہ پورا انتظام کر کے آئے تھے۔ رتنا باہر نکلا تو پولیس کو ایک دوسرے پر ٹوٹتے ہوئے لوگوں کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ ہر سو چیخ پکار پڑ گئی جیسے بھیڑ میں کسی کو سانپ نظر آ جائے۔ اس کے پیچھے ہم تھے۔ رتنا اور قبحل کو علیحدہ ایک جیپ میں بٹھا دیا گیا۔ پھر ایک بڑی بند گاڑی میں وہ ہمیں ٹھونسنے لگے۔ میں اور جاکو گاڑی میں پہنچے تھے کہ اچانک ایک کنکری میرے سینے پر آ کے لگی۔ میری نظر ٹھیک اُسی سمت گئی جدھر سے کنکری آئی تھی۔ وہاں مجھے لوگوں کے پیچھے ایک بند دکان کے ایک چبوترے پر چڑھا ہوا [illegible] نظر آیا۔ میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ پھر اُس نے آنکھ کے اشارے سے مجھے تسلی دی اور اپنا چہرہ لوگوں کے پیچھے چھپا لیا۔ اُسی وقت سپاہیوں نے ہماری پیٹھ پر ہاتھ مار کے ہمیں گاڑی پر چڑھنے کو کہا اور لوگ بھر گئے۔ پیچھے کوئی باقی نہ رہا تو وہ کرنے میں [illegible] کھڑے ہو گئے۔ دروازہ بند کر دیا گیا اور گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ گاڑی کے اوپری حصے میں لوہے کی جالیاں لگی ہوئی تھیں۔ میں نے اُن سے جھانک کے [illegible] کی لیکن اُس کا چہرہ مجھے پھر نظر نہیں آیا۔

تھانہ کوتوالی دور نہیں تھا۔ گاڑیوں کی [illegible] لوگوں کی بھیڑ ہونے کی وجہ سے تھی۔ [illegible] کی ساری دکانیں بند ہو گئی تھیں۔ چند منٹ بعد [illegible] دروازہ کھلا تو ہم تھانے کے احاطے میں تھے۔ سپاہی [illegible] اور سنگینیں لیے ہر جانب پھیلے ہوئے تھے۔

سب کو ایک کمرے میں کر دیا گیا۔ وہ حوالات [illegible] لیکن آنے کے بعد وہاں سے باہر نکلنے پہ پابندی [illegible] پہ سپاہی پہرا دے رہے تھے۔ رتنا کے آدمیوں کو کسی دوسرے [illegible] میں رکھا گیا ہوگا۔ کمرے میں [illegible] چھوٹی میز، دو کرسیوں اور دیواروں کے ساتھ لگی [illegible] کے سوا کچھ نہیں تھا۔ درمیان میں چھت سے لٹکا ہوا [illegible] ایک بلب ٹمٹما رہا تھا۔ فرش ننگا تھا۔ [illegible] ہو رہا تھا۔ سب دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کے زمین پہ بیٹھ گئے۔ پہلے ہی سب کے کپڑے گندے تھے اور گندے ہو جائے

سے کیا فرق پڑتا تھا۔ جینی سب سے زیادہ تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ ٹانگیں سکیڑ کے لیٹ گیا۔ بلاکو اس کی ٹانگیں دبانے لگا۔ رات کا ابتدائی حصہ تھا۔ ہمیں وہاں آئے ہوئے گھنٹے بھر سے زیادہ ہو گیا۔ کوئی ہمیں پوچھنے نہیں آیا، نہ قجل لوٹا۔ مچھروں نے بیٹھنا دشوار کر دیا تھا۔ ملتو ابتدا میں گولیاں بک رہا تھا کسی نے کوئی جواب نہیں دیا تو گھٹنوں میں سر دیئے چپ بیٹھ گیا۔

اڈے پر اس کمرے میں لانے سے پہلے انھوں نے ہماری تلاشی بھی نہیں لی تھی۔ تلاشی لیتے تو نیچے دیکھ کے ان کی آنکھیں ضرور خیرہ ہوتیں۔ رات دھیرے دھیرے بڑھ رہی تھی کسی کے پاس گھڑی نہیں تھی لیکن جھینگروں کے شور اور ہوا سے ٹکراتے ہوئے بادلوں کی گونج بڑھ جانے سے وقت کا اندازہ ہوتا تھا۔ سب کی آنکھیں دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ کئی گھنٹے گزر گئے ہوں گے۔ قجل واپس نہیں آیا۔ سپاہیوں نے ہم سے کھانے کو بھی نہیں پوچھا تھا۔ سولم نے ان سے پانی منگوا لیا تھا۔ صبح سے اب تک ہم نے صرف پانی پیا تھا۔ قجل کے نہ آنے کی وجہ سے بھی بے چین تھے معلوم نہیں انھوں نے اُسے ہم سے علیحدہ کیوں کر دیا تھا اب کون سی بات پوچھنے کو رہ گئی تھی۔ اس کے روکنے کا کوئی مقصد ضرور ہوگا۔ رتنا تھانے آ کے مکر گیا ہوگا یا ہو سکتا ہے ہم سے چوک ہو رہی ہو۔ رتنا کے سوا کسی اور طرف ہمارا دھیان ہی نہیں جاتا تھا۔ ایسی حالت میں کوئی بھی اعتراف کر لیتا مگر جیسے ہی رتنا کے حواس درست ہوئے ہوں گے اُسے اپنے کیے ہوئے کی نوعیت کا اندازہ ہوا ہوگا مگر ایک رتنا ہی اکیلا نہیں تھا اُس کے ساتھی بھی اس کے شریک تھے اور جیسا کہ قجل نے انسپکٹر داؤدیال کو اشارہ کیا تھا کہ سلطانی گواہوں کی موجودگی میں رتنا کو تنگ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اتنے بہت سے آدمیوں میں دو ایک آدمیوں کو زندگی یقیناً زیادہ عزیز ہو گی۔ ہم میں سے کوئی ماتھر اور جوشی کے ساتھ مٹھ بھیڑ میں نہیں گیا تھا مگر جب وہ واپس رتنا کو لے کے آئے تھے تو ان کے چہروں پر چھائے ہوئے اضطراب سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کچھ سمجھ کے کچھ جان کے آئے ہیں۔ کوئی ایسی بات جو ان کی توقع کے خلاف تھی۔ پھر تھانے لے چلنے کے لیے جوشی کا عجز جن کے قجل کے متوحش ہونے کا بھی یہی سبب ہوگا کہ یہ قجل کے لیے ناقابل فہم تھا۔ وہ اُسے تھانے لے کے آ گئے اور اب اُسے روکے ہوئے تھے۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا کہ کب تک یہاں رہنا پڑے۔ ساری رات سارا دن اور نہ جانے کتنے دن سب کے جسم فرش پر اینٹھے ہوئے لوتھڑے سے پڑے تھے۔ ایک دوسرے پر ڈھیر ہوئے جیسے اب ان میں کچھ باقی نہ رہا ہو۔ سب ہار گئے ہوں۔ وہ زبان سے کچھ نہیں کہتے تھے لیکن مجھے ہر لمحے یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ مجھی کو اپنے دل میں برا بھلا کہتے ہوں گے۔ کہتے ہوں گے کہ اس کا سایہ ہی نحوس ہے۔ ہر روز ہزاروں کی گنتی کم ہو جاتی ہے ایسے موت کیوں نہیں آجاتی۔ کبھی ماں کا خیال کر کے جامو کے سینے میں دھواں بھر جاتا ہو گا۔ شولی لال ساریے ساتھ ہی جوان ہوئے تھے۔ ہر بات زبان ہی سے نہیں کہی جاتی، آنکھیں کہتی ہیں چہرہ کہتا ہے۔ ان کی چبھتی نظریں مجھے اپنے چہرے اپنے سارے جسم پر محسوس ہوتی تھیں اور مجھے خود ان کے سامنے نگاہیں اٹھاتے ڈر سا لگتا تھا۔

آدھی رات کا وقت ہو گا، بلاکو نے مجھے جھنجوڑا "لاڈلے سُن رہا ہے؟"

میں نے ہڑبڑا کے اُسے دیکھا۔ تھانے میں اچانک کسی کے چیخنے چلانے کی آوازیں اٹھنے لگی تھیں۔ کوئی بری طرح آہ و بکا کر رہا تھا۔ آوازیں قریب کی نہیں تھیں۔ سب چونک اٹھے۔ ایک خیال میرے دل میں سردی کی لہر کی طرح اٹھا اور میں نے ذرا اُسے جھٹک دیا۔ کوئی جانی پہچانی آواز نہیں تھی۔ پھر وہ صدائیں بڑھتی گئیں۔ جینی بھی اٹھ کے بیٹھ گیا۔ سولم نے دروازے کے پاس جا کے سپاہیوں سے پوچھا "کس کی [illegible]"

"تیرے بھائی بند ہی ہوں گے [illegible]" وہ حقارت سے [illegible]

سولم کا پوچھنا بے کار تھا۔ سپاہیوں کو کیا معلوم ہو گا۔ ترکب سے ہمیں کھڑے ہراتے رہے تھے۔ بعلاک منزاکی اور چیخیں۔ ایک کے بعد ایک بلتی ہوئی آواز۔ یہ آوازیں بہت دیر تک تھانے کے در و بام میں سنسناتی رہیں۔ کبھی تو مدھم کبھی تیز۔ پھر ایک دم گہری خاموشی طاری ہو گئی۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد ہمیں اپنے کمرے کے باہر چاپیں سنائی دیں۔ وہ ہماری ہی طرف آ رہے تھے۔ سب کھڑے ہو گئے۔ ان میں قجل کی چاپ الگ سے پہچانی جا سکتی تھی۔ میرا سر گھومنے لگا۔ چند ہی لمحوں میں انسپکٹر داؤدیال کے ساتھ قجل کمرے میں داخل ہوا۔ میری نظر سب سے پہلے اس کے پیر پر گئی اور میری گردن خود بخود جامو کے شانے پر ڈھلک گئی۔ جامو نے مجھے زور سے چپٹا لیا۔ قجل کے [illegible] میں سفید پٹی بندھی ہوئی تھی۔

داؤدیال دروازے ہی سے لوٹ گیا۔ قجل فرش پر بیٹھ گیا۔ سب اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے [illegible] آثار دو [illegible] ہے۔ یہ جگہ بھی بری نہیں ہے۔ [illegible] نہیں ہو گا؟"

"بھوک ہی سال نہیں ہے استاد" ساریے نے منہ [illegible]
"سو جا بڑے بڑے میں زیادہ تمام نہیں ہے۔ تھوڑی دیر [illegible] ڈال لو" قجل نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔
"نیند بھی نہیں پیٹ رہی ہے استاد" بلاکو نے جیسے میں بولا اور قجل کے کہنے لگا "تم لوگ کیسی رہی؟"
"سو جا لوٹنے دے رے" قجل ٹانگیں پھیلا کے فرش پر لیٹ گیا۔ ساریے اس کا سر اپنے زانو پر رکھ کے آہستہ آہستہ دبانے لگا۔

صبح ہونے میں ابھی بہت دیر تھی۔ سبھی کروٹیں بدلتے رہے۔ قجل کو بھی نیند نہیں آ رہی تھی۔ دروازے پر کھڑے ہوئے پہرے دار بھی بینچ پر بیٹھ گئے تھے۔ قجل نے کچھ نہیں بتایا تھا اور جاننے کی ہمت ہی نہیں تھی۔ میرا زور دار ماں اور ابا جان بھی اُدھر ہوٹل میں جاگ رہے ہوں گے۔ ابا جان نے ہیرو سے ضرور پوچھنا چاہا ہو گا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ نہ جانے ہیرو نے انھیں کیا جواب دیا ہو گا۔ کہا ہو گا "بڑے صاحب آپ کیوں فکر کرتے ہیں ابھی بہت سے لوگ زندہ ہیں۔"

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سورج آتے آتے کہیں رک گیا ہے یا رستہ ہی بھول گیا ہے۔ رات کھنچتی ہی جا رہی تھی۔ امی جان ہمیں، ہم سب سے کہا کرتی تھیں "خدا نے ہر چیز کی ایک حد مقرر کی ہے۔ خدا کے سوا کسی کو بھی دوام نہیں ہے" شاید اندھیرے کی حد بھی تمام ہو گئی تھی۔ رات کی چادر کھنچتے کھنچتے آخر پھٹ گئی۔ امی جان کی باتیں اس وقت کبھی ہماری سمجھ میں آتی تھیں کبھی نہیں۔ میں ان سے طرح طرح کے سوال کرتا رہتا۔ مجھے یاد ہے جب ان سے کوئی جواب نہ بن پڑتا تو وہ ڈانٹ کر کہتیں "بس ایسا ہی ہے۔ تو بہت بنتی ہے، بال کی کھال نکالتا ہے۔" وہ ہوتیں تو میں ان سے پوچھتا، امی! بہت سی صدیاں تو کبھی ختم نہیں ہوتیں۔ بہت سے اندھیرے تو کبھی ختم نہیں ہوتے۔ رات ہوتی ہے، دن نکلتا ہے مگر اندھیرا نہیں جاتا۔ بہت سے اندھیرے سورج کی روشنی بھی دور نہیں کر سکتی، نہ اندھیرا جاتا ہے، نہ موت آتی ہے۔

صبح ابھی پوری طرح نمودار نہیں ہوئی تھی کہ کسی سپاہی نے دروازے سے آواز لگائی "استاد قجل! تیار ہو جاؤ۔"

قجل نے ساریے کے زانو سے سر اٹھایا اور آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ کسی کی آنکھ ہی نہیں لگی تھی جو اٹھنے میں وقت لگتا۔ قجل کے کہنے پر سب یک لخت کھڑے ہو گئے۔ دروازے پر کھڑے ہوئے سپاہی ایک طرف ہٹ گئے اور ایک سپاہی ہمیں تھانے کے عقبی حصے میں لے آیا۔ وہاں کھلے ہوئے نلوں سے تر تر پانی بہہ رہا تھا۔ قجل جامو ساریے اور میرے سوا سبھی نے اپنے سر نلوں کے نیچے کر دیے۔ منہ ہاتھ دھو کے ہم واپس اسی کمرے میں آئے تو میز پر ناشتہ لگا ہوا تھا۔ کچوریاں سلائس مکھن اور چائے۔ ایک سپاہی گلاسوں میں چائے انڈیلتا رہا۔ مگر سب کو جیسے سانپ سونگھ رہا تھا۔ ہر ایک نے دو دو گلاس چائے پی اور کچھ نہ کچھ ضرور کھایا پھر بھی پلیٹوں میں بچا رہ گیا۔ ناشتہ کرتے کرتے کمرے میں خاصا اجالا ہو چکا تھا مگر ہم اس وقت تک وہیں رہے جب تک دوسری بار سپاہی نے آ کے ہمیں باہر آنے کو نہیں کہا اور وہ کوئی دس پندرہ منٹ بعد ہی آ گیا تھا۔

دالان میں ہمارے پہنچتے ہی ایک جانب سے انسپکٹر داؤدیال آ گیا اور اس کے ساتھ ایک دوسرا افسر سب انسپکٹر شیو جی۔ دونوں کے چہرے نکھرے دُھلے ہوئے تھے۔ لباس بے شکن تھا اور داڑھیاں منڈی ہوئی تھیں مگر ان کے چہرے اور ماتھے کی شکنیں چغلی کھا رہی تھیں کہ وہ رات بھر جاگتے رہے ہیں۔ ہمیں دیکھ کے دونوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ سی پھیل گئی۔ دالان کے سامنے وہی گاڑی کھڑی تھی جو گزشتہ رات ہمیں اڈے سے لائی تھی۔ داؤدیال ڈرائیور کے ساتھ اگلی نشست پر بیٹھ گیا۔ سب انسپکٹر سورتی اور دوسرے سپاہی گاڑی کے پچھلے بند حصے میں ہمارے ساتھ بیٹھے۔ آدھ پون گھنٹے کی مسافت کے بعد گاڑی جس عمارت میں جا کے ٹھیری وہ میری اچھی طرح دیکھی بھالی ہوئی تھی جس وقت میرا مقدمہ جاری تھا۔ مجھے روز روز ہی جیل سے یہاں لایا جاتا تھا۔ قجل آہستگی سے نیچے اترا۔ پھر اس نے جامو کو بلایا اور ساریے کو بھی۔ مجھے یا اور کسی کو نہیں۔ باقی سب کو وہیں بیٹھے رہنے کی ہدایت کر کے وہ چلا گیا۔ سپاہیوں میں بھی صرف دو سپاہی ہماری نگرانی کو رہ گئے تھے۔ دھوپ خوب چڑھ آئی تھی اور کچہری میں لوگوں کا ہجوم بڑھ گیا تھا۔ گاڑی کھلی ہوئی تھی اور ہم آتے جاتے لوگوں کو بخوبی دیکھ سکتے تھے۔ وہی لوگ اُسی طرح کے لوگ۔ ہتھکڑیاں لگے منہ چھپائے سر جھکائے لوگ۔ عمارت میں آج بھی ویسی ہی بھیڑ تھی جیسی کئی سال پہلے ہوتی تھی۔ جیسے کل کی بات ہو جیسے کل رات ہی کوئی مجھ سے جدا ہوئی ہو۔ مجھے پسینہ آنے لگا۔ قجل کوئی دو گھنٹے بعد لوٹا۔

گاڑی کا دروازہ پھر بند کر دیا گیا اور کچھ دیر بعد جب اُسے دوبارہ کھولا گیا تو ہماری آنکھیں چندھیا گئیں۔ گاڑی اڈے کے باہر کھڑی تھی سب کے حواس گم سے تھے۔ چند لمحوں تک تو سب پر سکتہ سا طاری رہا۔ پھر سب ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔

پلٹو جُٹرک مُڑک کے رُلنے لگا اور اُس نے سبھی کی آنکھیں جھکو دیں۔ انسپکٹر واڈدیال بھی گاڑی سے اُتر آیا تھا اور ایک سرد، ٹھنڈا کا بازو تھامے کچھ کہہ رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں جھلملا رہی تھیں۔ یہ دیکھتے دیکھتے لوگ پھر جمع ہونے لگے۔ اڈے کے رسمی مالک مُول نما نے آ کے تالا کھولا۔ ساری عمارت ویران پڑی تھی۔ بڑے دروازے سے کمرے تک کے کھلے حصے میں سامنے فرش پر رتنا کے آدمیوں کا کل کا خون جما ہوا تھا۔ سارے کمروں کے دروازے کھول دیے گئے تھے۔ محلے کے لوگ عمارت میں گھس آئے اور پھر تو ان کا ایک تانتا سا بندھ گیا۔ جو بھی آتا، کچھ نہ کچھ لے کے آتا۔ پھولوں اور مٹھائی کے دونوں کا انبار لگ گیا۔

ہم سب ایک دوسرے کے چہرے دیکھ رہے تھے۔ جُھل صحن کے وسط میں پڑی ہوئی چوکی پر آ کے بیٹھ گیا تھا اور مجھے لگا کہ اُس کے منہ میں دبی ہوئی تھی۔ منتیا اُس کے لیے تازہ حقہ بھر کے لایا تھا۔ سب ایک خواب سا معلوم ہوتا تھا۔ آنے والوں کو بھی اس خبر پہ یقین نہیں آیا ہوگا کہ جُھل اڈے پر واپس آ گیا ہے۔ اس لیے وہ خود اپنی آنکھوں سے اُسے دیکھنے آ رہے تھے۔ کوئی اُس کے ہاتھ چومتا، کوئی پیر چھوتا، کوئی سلام کرتا، خیریت پوچھتا، رتنا کی شکایت کرتا، کوئی رُٹے گھٹتا اور کٹّن خاں کا ذکر چھیڑ دیتا۔ اس دوران ہریالا اور بدرو اُس ہوٹل سے ہمارا سامان لے آئے تھے جہاں کل صبح اسٹیشن سے نکلنے کے بعد ہم نے اُسے چھوڑ دیا تھا مگر کسی نے کپڑے نہیں بدلے۔ سہ پہر جُھل کو ایک لمحے کی فرصت نہیں ملی اور سہ پہر کو ہی گلی میں ایک بار پھر شور اُٹھا۔ ہم سب باہر کی طرف بھاگے۔ وہ سب آ رہے تھے۔ وہ سب۔ سب سے آگے کانتے تھا، برابر میں نصیب میاں، تکھوا، گلو، لیلا، ہرچیان اور ان کے پیچھے وہ سب۔ گلی میں دُور دُور تک اُنھی کے سر نظر آتے تھے۔ سب کی داڑھیاں بڑھی ہوئی، بال بکھرے ہوئے، آنکھیں ویران اور چہروں پہ وحشت برس رہی تھی۔ کانتے نے جیسے ہی دیکھا، دیوانگی سے میری طرف جھپٹتا ہوا لپکا۔ اِدھر سے میں بڑھا۔ اُس نے مجھے اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا اور میری گردن سے سر رگڑنے لگا۔ وہ بار بار میرا چہرہ دیکھتا اور مجھے چوم لیتا۔ میرے گالوں کو پیار کرتا۔ کبھی میری ٹھوڑی چومتا، کبھی پیشانی۔ پھر میرے سینے پر اُس کا سر ڈھلک گیا۔ وہ سسکنے لگا۔

میں اُسے سنبھالنا چاہتا تھا مگر میرا جسم خود ریزہ ریزہ ہو گیا تھا۔ اُسے دلاسا دیتے ہوئے میری زبان کانپنے لگی اور آنکھوں سے آنسو پھوٹ پڑے۔

اچھا ہی ہوا کہ جامو نے جھٹ بیچ میں آ کے اُسے میرے بازوؤں سے کھینچ لیا اور نصیب میاں میرے سینے سے لپٹ گئے۔ پھر گلو، لیلا، ہرچیان، اکبر، تکھوا، تھن۔ کسی کو کچھ ہوش ہی نہ رہا۔ ہوش اس وقت آیا جب جُھل کی بھاری آواز گونجی۔ "اندر چلو رے۔"

جُھل کو دروازے پر کھڑا دیکھ کے سب ہمیں چھوڑ کے دیوانہ وار اُسی کی جانب دوڑ پڑے اور انھوں نے اُس کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ "اندر چلو۔" جُھل نے آنکھیں میچ کے کہا۔

اندر آ کے وہ بالکل پاگل ہو گئے تھے۔ بار بار گلے ملتے۔ کوئی دوڑ کے اُس کے پاس جاتا، کوئی اس کے پاس۔ کسی ایک جگہ کوئی ٹکتا ہی نہ تھا اور کسی کے پاس کہنے کے لیے شاید کچھ نہیں تھا۔ کوئی زبان کھولنے کی کوشش کرتا تو آواز ساتھ نہ دیتی۔ بس وہ ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے۔ پھر جھپٹ کے اپنی آغوش میں بھر لیتے۔ ہماری واپسی کی انھیں کوئی امید ہی نہ رہی ہوگی یا انھوں نے بہت شدت سے انتظار کیا تھا۔ سب ٹوٹے پھوٹے، بکھرے ہوئے سے تھے۔ لگتا تھا، وزن جو سینے سے وہ اپنی آنکھوں اپنے سینے پہ جبر کرتے رہے ہیں۔ انھیں اڈے پر موجود علاقے کے لوگوں کا بھی خیال نہیں آیا۔ جُھل سر جھکائے بیٹھا تھا اور وہ اُس کی گرد میں اُس کے ہاتھوں اُس کے پیروں پہ سر رکھے بچوں کی طرح بلک رہے تھے۔ کانتے دیر تک جُھل کے زانوؤں پہ سر رکھے سسکیاں بھرتا رہا۔ جُھل نے اُس سے ایک لفظ نہیں کہا تھا مگر کانتے کی آنکھوں کی جھڑی نہیں تھمی۔ اُدھر جامو بیٹھک کے قریب نصیب میاں سے چمٹا ہوا ہچکیوں سے رو رہا تھا۔ نصیب میاں نہ جانے اُس سے کیا کیا کہہ رہے تھے۔

اب تک کسی نے دھیان نہیں دیا تھا مگر لیلا کو خیال آ ہی گیا۔ میرے پاس آ کے وہ بے قراری سے پوچھنے لگا۔ "وزیر کدھر ہے؟" میں اُسے کیا جواب دیتا۔ میری خاموشی پر اُس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ میں نے اُسے نہیں بتایا کہ صرف وزیر ہی نہیں، سلطان اور مٹھن میاں بھی.... لیکن لیلا نے پھر کسی کے بارے میں پوچھا ہی نہیں۔ اُس کا منہ بگڑنے لگا تھا۔ میں نے اُسے اپنے سینے میں دبوچ لیا۔

اڈے پر پہلے ہی خاصے لوگ موجود تھے۔ اُن کے آنے سے صحن بھر گیا۔ باہر سے لوگوں کی آمد رات تک جاری رہی۔ سیٹھ مول جی اور گلی کے دوسرے لوگوں نے سب کے لیے رات کے کھانے کا انتظام کیا تھا۔ کٹّن خاں اور اُس کے ساتھ جانے والوں کی موت کے کھانے کا اُدھار اُن پر واجب تھا۔ کسی کا

جی کھانے کو چاہتا ہی نہیں تھا لیکن سب نے اصرار کر کے فرش پر بچھے ہوئے دسترخوان پر ہمیں بٹھا دیا۔

رات گئے علاقے کے بھی لوگ واپس چلے گئے مگر وقف کے وہ سارے آدمی جن کے گھر موجود تھے، اپنے گھروں کو نہیں گئے۔ سارے جُھل کو اوپر والے کمرے میں لے گیا۔ سب اِدھر اُدھر مختلف کمروں میں پڑ گئے یا صحن ہی میں وہ یہاں بچھا کے لیٹ رہے۔ کانتے، جامو، لیلا اور جینی کے ساتھ میں بھی اوپری منزل کے ایک کمرے میں چلا گیا۔ زری کو جب میں نسترن کے چنگل سے چھڑا کے اڈے پر لایا تھا تو وہ یہیں ٹھہری تھی۔ سب گم سم سے تھے اور ایک دوسرے سے کچھ پوچھتے ہوئے جھجک رہے تھے۔ نصیب میاں بھی کچھ دیر بعد اوپر آ گئے اور ہمیں چپ دیکھ کے تسلیاں دینے لگے اور وہ خود ہی سب کچھ بتانے لگے۔ پھر لیلا بھی چپ نہ رہ سکا اور کانتے کی زبان بھی کھُل گئی۔ ساری رات یوں ہی گزر گئی۔ اوپر آسمان پر کبھی تارے نکل آتے، کبھی بدلیاں چھا جاتیں۔ صبح کے قریب ہلکی ہلکی بوندیں گرنے لگیں مگر سب چارپائیوں پر پڑے رہے۔ اُن کے چہرے پہلے ہی بھیگے ہوئے تھے۔ رات بھر جاگتے رہے تھے۔ کسی کو ایک پل کے لیے نیند نہیں آئی تھی۔

میں سمجھ رہا تھا جیسے ہی چیرو کو تھانے سے ہماری اڈے واپسی کی اطلاع ملے گی، وہ سیدھا اڈے کا رُخ کرے گا لیکن وہ رات تک نہیں آیا۔ ممکن نہیں تھا کہ اُسے خبر نہ ہوئی ہو۔ کل تھانے جانے کے لیے ہم گاڑی میں بیٹھ رہے تھے تو وہ موجود تھا۔ گویا وہ سارے دن علاقے ہی میں منڈلاتا رہا تھا۔ چونکہ اُسے یقین ہوگا کہ اسٹیشن سے نکلنے کے بعد کہیں اور جانے کے بجائے ہمارے قدم سیدھے اڈے کی طرف بڑھیں گے لیکن ہم آگے گئے ہی نہیں۔ وہیں اسٹیشن سے قریب پڑنے والے پہلے بڑے تھانے کی چار دیواری میں داخل ہو گئے۔ ممکن ہے وہ علاقے کے تھانے کے اطراف بھٹکتا رہا ہو۔ ہم وہاں جاتے تو اُسے دکھائی دیتے مگر رات کو اُس نے اپنی آنکھوں سے ہمیں پولیس کی گاڑیوں میں بیٹھے دیکھا تھا اور اُسے خوب اندازہ ہوگا کہ ہم اپنے علاقے ہی کے تھانے میں جا سکتے ہیں۔ چنانچہ اس نے کسی بھی ذریعے سے سُن گن لینے کی کوشش ضرور کی ہوگی۔ تھانے کے قریب کسی ہوٹل میں بیٹھ کے کسی سپاہی سے رابطہ قائم کر کے۔ ہم صرف ایک رات وہاں رہے تھے۔ صبح ہوتے ہی کچہری چلے گئے تھے۔ رات کو تھانے کے گرد اُس کا چکر لگانا مشکوک ہوتا اور اُسے کچھ پتہ بھی نہ چلتا لیکن ہم دوپہر کو تو اڈے واپس آ گئے تھے۔ ہمیں تھانے جاتے ہوئے دیکھنے کے بعد کیا وہ مایوس ہو کے ہوٹل کے کمرے میں بند ہو گیا؟ اُس کے خیال میں تھانے سے ہمارا ایک آدھ مشکل تھا اور اُس کا اِدھر اُدھر کے لوگوں سے ہمارے بارے میں پوچھنا نقصان دہ ثابت ہو سکتا تھا۔ یقیناً ایسا نہیں ہوگا۔ وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھے نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ اُسے سب معلوم ہو گیا ہوگا۔ جاننے کے باوجود وہ نہیں آیا۔ اُسے کچھ اطمینان ہو گیا ہوگا یا وہ جُھل کی جانب سے بلاوے کا منتظر تھا۔ اڈے پر ہماری واپسی اور رتنا کے اندر جانے کے بعد وہ زیادہ محفوظ ہو گئے تھے۔

مجھے بار بار خیال آتا تھا اگر ہم سیدھے اڈے پر چلے آتے تو شاید سب کچھ بدلا ہوا ہوتا۔ ہم ایک دن بعد اس طرح اڈے پر موجود نہ ہوتے۔ کہاں ہوتے؟ کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ بے شک پھر سینے پر اتنا بوجھ نہ ہوتا۔ رتنا اور اُس کے آدمیوں کو لاشوں میں تبدیل کرنے کے بعد ہی ہم اڈے سے نکلتے اور اس کے بعد جو کچھ ہوتا دیکھ لیتے لیکن اس کے بعد کیا ہوتا! جتنے لوگ یہاں موجود تھے، اُن میں سے پھر کوئی بھی باہر نہ آتا۔ کانتے، نصیب میاں، لیلا اور دوسرے سب لوگوں کے چہرے پھر کبھی اور ہی دیکھنے نصیب ہوتے۔ رتنا کو ختم کرنے اور اڈے پر بیٹھ جانے کے بعد پولیس کو ہمارے پاس پہنچنے میں دیر نہ لگتی۔ چاہے ہم رتنا اور اُس کے آدمیوں کو زندہ زمین میں دفن کر دیتے اور اُن کی قبروں کی راکھ پر بھی کسی کی نظر نہ پڑنے دیتے لیکن پولیس ہمارے ہی پاس اُن کا پتہ پوچھنے آتی۔ ہم تصور ہی کر سکتے تھے کہ پھر کیا کچھ ہو سکتا تھا۔ بدرو کی باتیں سُننے کے بعد سب کی آنکھوں میں خون کے سوا کچھ نہیں تھا۔ جُھل جب اچانک تھانے کی چار دیواری میں جانے لگا تھا تو سب کو چھپا ہوا تھا اور پولیس افسروں کے سامنے آتی دیر تک اُس کی فضول باتیں جن کے بھی جسم کھولا رہے تھے۔ اُس وقت کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ سب کے دل میں ایک ہی بے کلی تھی کہ وہ کسی طرح جلد از جلد اڈے پر پہنچ جائیں۔

نہ جانے ہم میں جانے پر کہیں بھی پڑ سکتے تھے۔ بدرو اور ہریالے نے جو کچھ کہا تھا اُس کی تصدیق پولیس کے سوا کسی اور سے نہیں ہو سکتی تھی۔ یوں بھی بدرو کے قول پولیس کو ہماری تلاش تھی تو ہمیں اُس سے چھپنا بھی نہیں چاہیے تھا ورنہ بدرو نے مشورہ دیا تھا کہ ہم اسٹیشن ہی سے لوٹ جائیں۔ پولیس ہی سے ہمیں اپنی تلاش کی اصل وجہ معلوم ہو سکتی تھی۔ ہم اڈے کی طرف جا رہے تھے لیکن ہو سکتا تھا کہ ہم کبھی وہاں تک نہ پہنچ پاتے۔ راستے

کی طرف سے بھیجے جانے والے آدمی کو ہاتھ پھیلانے کو کہا۔ جب
اُس نے ہاتھ پھیلایا تو کانتے نے اُس کی ہتھیلی پر تھوک دیا اور دبا
جا کے اسے رتنا کے منہ پر مل دینا۔

کانتے بتا رہا تھا کہ اُس نے ڈیڑھ مہینے کا عرصہ جیل میں نہیں،
جیسے کسی بھٹی میں گزارا ہے۔ بار بار اُس کے جی میں آتا تھا کہ وہ
واقعے کے دوران اپنی عدم موجودگی کا ثبوت فراہم کر کے یہاں
سے نکل جائے۔ کانتے کو بھی احساس ہو گا کہ رتنا نے کسی برتے پر
یہ جرأت کی ہوگی۔ اپنے اور دوسروں کے حق پر، مبادا اُس سے
کوئی لغزش سرزد ہو جائے اس لیے کانتے خود کو تھامے رہا۔
روہیتی سے پیرو والے کے آدمیوں، فیض آباد سے پیرو کے ساتھیوں،
کلکتے سے کپتن خاں کے دوستوں اور آسنسول سے اُستاد موتی
کے شاگردوں کو کلکتے بلا کے اڈے کا رُخ کر سکتا تھا مگر اُسے
اچھا نہیں لگتا تھا کہ اوروں کے کندھوں پر بندوقیں رکھ کے چلائی
جائیں۔ وہ خود ہی وہاں جانا چاہتا تھا اور کسی مناسب موقع کا
منتظر تھا۔ اُسے تُجّل کا بھی انتظار تھا۔

تُجّل جیسا کہ اکثر کہا کرتا تھا کہ ہتھیار اُٹھانے سے پہلے
نیشتہ دیکھ لو۔ ہتھیار سرہانے رکھ کے چلاؤ۔ ظاہر ہے تُجّل کی مراد
ذرا باقاعدہ نیشتہ دیکھنے سے تھی نہ ہتھیار سرہانے رکھنے سے۔ ہمارے
پاس بالکل وقت نہیں تھا۔ پیرو یا میں ابا جان کو لے کر فیض آباد
چلے جاتے تو وقت کی تنگی کا اتنا احساس نہ ہوتا۔ جتنی دیر ہمیں
تھانے میں لگی تھی، اتنی دیر میں رتنا کو پیرو زردا اور مارتی کے
بارے میں یہ خبر نہیں مل پائی ہوگی کہ وہ ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے
ہیں۔ ہو سکتا ہے اگر پیرو کو ہم سے باتیں کرتے اسٹیشن پر دیکھ لیا تھا
تو بدبو جانے ساتھ ہی تھا۔ تمام ہی کہ ہم رتنا کے پاس پہنچ گئے
تھے شام کو ہم اُس کے پاس نہ پہنچ پاتے۔ تھانے میں ہمیں کچھ اور
وقت لگ جاتا، ایک رات اور ایک دن یا کسی دن تو شاید رتنا
کلکتے میں پیرو کی موجودگی سے بے خبر نہ رہتا اور یہ جاننے کے
بعد اُسے جا تو اُٹھا کے پیرو کے سامنے پہنچ جانے کی ضرورت
نہیں تھی۔ پولیس کو اشارہ کر دینا کافی تھا۔ پیرو کے پاس رتنا کی
بے خبری جتنا ہی وقت تھا۔ پیرو تک پولیس کے پہنچ جانے
کا مطلب ابا جان تک پہنچنا تھا جن کے پاس جادو کے پتھر
صندوقوں میں رکھے ہوئے تھے۔ اُن کی ایک جھلک سے نہ صرف
ابا جان اور پیرو کے سامنے کے دروازے بند ہو جاتے، ہماری باقی
زندگیوں کا فیصلہ بھی ہو جاتا۔ جتنے کم سے کم وقت میں ہم تھانے
سے نکل جاتے، اتنا ہی ہمارے لیے بہتر تھا۔ آنے والا ہر لمحہ لٹکتی
ہوئی تلوار کے مانند تھا جو کسی وقت بھی ہماری گردن پر گر جاتا۔

گو پیرو کسی ننگی تلوار سے کم نہیں تھا۔ وہ کسی کے خود تک
پہنچنے سے پہلے ہی اُس کی آہٹ سونگھ لیتا لیکن ہمیں اپنے طور
پر اُسے اُلجھن میں ڈالنے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہیے تھا۔ ہمارے
لیے بس یہی ایک بہتر صورت تھی کہ ہم دوبارہ تھانے واپس آئیں
تو رتنا اور اُس کے ساتھی بھی ہمارے ہمراہ ہوں۔

سب سویرے ہی اُٹھ گئے اور نہا دھو کے کپڑے بدل
کے ناشتہ کیے بغیر اڈے سے نکل گئے۔ علاقے کے بہت سے
لوگ بھی ہمارے ساتھ ہو گئے تھے۔ پہلے ہم شمشان گھاٹ گئے۔
اتنے دنوں میں لاش جلا کے سنسکار کرنے کی راکھ بھی ہوا کہاں سے
کہاں لے گئی ہوگی۔ جتنی دیر مندر کے پنڈت جی کچھ پڑھتے رہے
ہم چپ چاپ کھڑے رہے۔ وہاں سے ہم قبرستان گئے۔ جن لوگوں نے
کپتن خاں، شرافی، فیضو، ولی، نصیر، بندے اور سادو کو دفن کیا
تھا، انھی نے اُن کی قبروں کی نشان دہی کی۔ گلی میں رہنے والے
قاضی صاحب نے تلاوت کی۔ جب سب لوگ واپس جانے
لگے تھے وہ کپتن خاں کی قبر سے چمٹ کے پھوٹ پھوٹ کے
روتا رہا۔ تُجّل نے بہ مشکل تمام اُسے وہاں سے اُٹھایا۔ واپسی میں
راستے بھر جانو گنگ بیٹھا رہا۔

اڈے پر آ کے تُجّل نے کئی آدمیوں کو شہر کے مختلف اڈوں
کی طرف جانے کی ہدایت کی اور کہا، اُستادوں سے جا کے بولو وہ
آج رات تک اُدھر کا ہر اُستاد اڈے پر پہنچ جائے۔ تُجّل نے اور کوئی
دوسری بات نہیں کی تھی۔ مجھے یہ سب تُجّل اُس وقت معلوم ہوتا
تھا۔ اڈے کے آدمی اُس کا پیغام پہنچا کے سہ پہر تک لوٹ
آئے تھے۔ شام ہی سے اُستادوں کی آمد شروع ہو گئی اور رات گئے
تک جن جن کو تُجّل نے کہلوایا تھا شاید ہی اُن میں سے کوئی باقی
رہ گیا ہو۔ کوئی اُستاد نہ آ سکا تھا تو اُس نے رقم بھیج دی تھی اور
جس نے رقم نہیں بھیجی تھی اُس نے خود آ کے تُجّل سے مہلت مانگ
لی تھی۔ تُجّل نے اُن سے اپنے پیچھے ہونے والے واقعات کے
بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ خود ہی طرح طرح کی باتیں کرتے
رہے، تُجّل چپ چاپ سنتا رہا۔

مرگھٹ اور قبرستان سے لوٹ کے تُجّل دن بھر بیٹھا
ہی رہا تھا مگر صبح چلنے سے اُس کا زخم اور بگڑ گیا۔ دن میں دو بار
مدن پہلوان نے مرہم پٹی کی تھی اور اُسے مشورہ دیا تھا کہ وہ ایک
جگہ بیٹھا رہے یا بستر پر آرام کرے۔ دوپہر کو اُسے تیز بخار آ گیا تھا
لیکن وہ بیٹھک میں آنے والے اُستادوں اور دوسرے لوگوں سے
ملتا رہا اور حقہ پھونکتا رہا۔ دوسرا دن بھی گزر رہا تھا۔ پیرو زردا اور
مارتی میں سے کوئی بھی اڈے پر نہیں آیا۔ تُجّل جیسے کلکتے میں اُن

ں میں ہمارے آگے رکاوٹیں کھڑی کر دی جاتیں اور پھر پولیس کا
وہ یہ نہ ہوتا۔ اُن کے طور کا اندازہ ہمیں ابتدا ہی میں ہو گیا تھا۔
ں وقت جب تھانے میں ہمارے آنے سے کھلبلی مچ گئی تھی۔
ن کا رویہ اس سے قطعاً مختلف ہوتا اگر وہ ہمیں خود کھینچ کے
تے اور ہماری تلاشی لے کے تمنچے اور ہتھیار برآمد کرتے۔ وہ ہم
پوچھتے کہ ہم اتنے دنوں کہاں رہے ہیں۔ ہم وہی جوابات دیتے
م نے دیے تھے۔ ہم انھیں کبھی نہ بتاتے کہ ہندوستان میں تھے
نہیں لیکن شاید وہ اس طرح نہ سمجھ پاتے جس طرح انھوں نے
ے سمجھا بوجھا تھا۔

رتنا کیوں اندر نہیں گیا؟ رتنا نہیں تو پھر اور کون تھا؟
خاں نے اتنے مختصر عرصے میں اتنے بڑے دشمن کیسے پیدا
لیے۔ ہمیں تو اتنا بھی پتہ نہیں تھا کہ ہمارے وارنٹ نکلے ہوئے
یا نہیں۔ انھوں نے وارنٹ نکالا، اس لیے جاری نہیں کیے
کہ ہم کسی طرح کلکتے واپس آ جائیں۔ تھانے سے نکل کے جیسے
علاقے میں داخل ہوئے تھے ویسے کبھی نہ جا پاتے۔ رتنا اڈے پر
کے سامنے ہم لیں اپنے ہاتھ رنگے رکھ سکتے پہ تیار ہوتے۔
ی آنکھیں بھٹکتی رہتیں اور ہمارے پاؤں اوندھے سیدھے
ے پولیس بھی اڈے پر آنے میں اتنی دیر نہ لگاتی اور تُجّل
کو اتنا وقت دیتا۔ وہ اڈے کی عمارت کے بجائے گلی کے نکڑ
اترتا۔ ہم اپنے ہی گھر چوروں کی طرح داخل ہوتے۔ انھوں نے
ی عدم موجودگی میں ہمارے بارے میں جو ذہن میں بٹھا لیا
وہ ہماری اپنی ہی وجہ سے تھا کہ ہم موجود نہیں تھے۔ انھوں
دوسرے شہروں کی پولیس سے بھی ہمارے متعلق تفتیش
رابطہ رکھا ہوگا اور ہر جگہ سے انھیں نفی ہی میں جواب ملا ہوگا۔ وہ
ان حوالات میں رکھ کے ہمیں جیل بھیجنے کی اجازت حاصل
اُن کے لیے مشکل نہیں تھا اور پتہ نہیں وہاں سے ہماری
کب ہوتی۔ اڈے سے نکلنے کے بعد یا اڈے پر ہماری موجودگی
دوران وہ ہم تک پہنچتے تو پھر واپسی انھی کی مرضی پر منحصر ہوتی
بات پر کہ ہم نے رتنا کے ساتھ کتنی رعایت کی ہے یا
ایت نہیں کی یا دوسرے شہر کے اڈوں کے اُستاد پولیس کے
ں روز نیا خرخشہ چھوڑ کے ہمارے دن بڑھاتے رہتے۔

اڈے پر اُس رات ایک نصیب میاں ہی تھے جو بچ گئے
ن کا کہنا تھا کہ سب کچھ اچانک ہوا۔ معمول کے مطابق رات
ت کے دروازے بند کر دیے گئے تھے۔ اندر پندرہ آدمی
ت وہ جنھیں چار دن سے کپتن خاں نے اُس وقت تک
اجازت نہ دی تھی جب تک وہ اپنا کوئی انتظام نہ

کر لیں۔ تینوں کلکتے میں نووارد تھے۔ انھوں نے بتایا تھا کہ وہ
دل سے آئے ہیں اور پولیس اُن کا پیچھا کر رہی ہے۔ اُس رات
تینوں اچانک غائب ہو گئے۔ نصیب میاں یا کسی اور کے ذہن
میں دور دور تک گمان نہ تھا کہ وہ رتنا کے آدمی ہو سکتے ہیں۔
پوچھ گچھ کے وقت وہ کسی کی طرف اشارہ نہیں کر سکے مگر پندرہ
دن بعد انھیں جب رتنا کے اڈے پر بیٹھنے کی خبر ملی تو اُن کے
ساتھ ہی نے شور مچایا۔ اُن کے پچھلے بیانات مختلف تھے پھر بھی
پولیس نے رتنا کے سلسلے میں ہر طرح کی تفتیش کی ہوگی لیکن
رتنا نے ہر گوشہ بند کر رکھا تھا، کوئی روزن کھلا ہوا نہیں تھا۔

کانتے کہتا تھا کہ جیسے ہی وہ کلکتے واپس آیا، اُسے اڈے
تک نہیں پہنچنے دیا گیا۔ راستے ہی میں روک لیا گیا۔ وہ بتا سکتا تھا کہ
وہ فیض آباد اور بمبئی گیا ہوا تھا لیکن وہ نہیں چاہتا تھا کہ پولیس
دولہن کے گھر یا زریں کی حویلی پہنچے۔ وہ یہ بات کسی وقت بھی بتا
سکتا تھا جب کوئی چارہ نہ ہوتا۔ گاڑی سے اُترنے کے بعد اُس
کے لیے بھی سب کچھ عجیب اور ناقابلِ فہم تھا۔ وہ سیدھا اڈے
کی طرف جا رہا تھا لیکن اُسے جیل پہنچا دیا گیا۔ وہاں اڈے کے
دوسرے ساتھی بھی موجود تھے۔ کانتے نے اُن کی باتوں اور پولیس
کے رویے سے اندازہ لگا لیا تھا کہ ابھی جیل سے باہر نکلنا اُس کے
اور دوسروں کے لیے مفید نہیں رہے گا۔ شاید اس دوران تُجّل واپس
آ جائے یا پولیس خود اصل مجرموں تک پہنچ جائے۔ اُسے کلکتے میں
چلنے والی ہوائیں عجیب ہولناک سی محسوس ہوتی تھیں۔ پولیس نے
اُس پر بے حد سختی کی۔ پوچھ گچھ کا کوئی ایسا طریقہ نہیں رہ گیا تھا جو
روا نہ رکھا گیا ہو۔ کانتے انکار کرتا رہا اور دانستہ چپ رہا۔ وہ کہہ رہا
تھا کہ اُس کا دماغ ہی ٹھیک کام نہیں کرتا تھا۔ اڈے کے اتنے
لوگوں کے بیچ میں بھی وہ خود کو تنہا تنہا محسوس کرتا تھا۔ جو مناسب
سے مناسب بات اُس کے سر میں آ سکتی تھی وہ یہی تھی اور وہ
اس پر کاربند رہا۔ اس عرصے میں فیض آباد سے مجرو، بمبئی سے واچی،
چھیدا، آسنسول سے اُستاد موتی اُس کی خبر لینے آئے۔ پولیس اُن
کے پیچھے پڑ گئی۔ کانتے نے یہ کہہ کر انھیں لوٹا دیا کہ اُستاد بس
اب آتے ہی ہوں گے اور وہ انھیں کسی وقت بھی بلا سکتا ہے۔
جیل میں اُس کے ساتھی مرلے اُس پر زور دیتے تھے۔ ایک مرتبہ
انھوں نے جیل سے فرار ہونے کا منصوبہ بھی بنایا۔ کانتے نے انھیں
منع کر دیا اور ایک بار رتنا کی طرف سے ایک آدمی نے آ کے اُسے
پیشکش کی کہ وہ جیل سے چھوٹ کے اپنے پرانے اڈے ہی پر
واپس آئے۔ رتنا اُسے اپنا منتظر ملے گا۔ رتنا نے کہلوایا تھا کہ سُونا اور
تُجّل کا اڈا خالی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ کانتے نے جواب میں رتنا

...ی بھول گیا تھا یا وہ بھی کہیں راستہ بھٹک گئے ہیں
...جا تو میں ہی جھل کو اشارہ کروں اور کہوں۔ تب ہی ابا جان
...کے فیض آباد چلا جاتا ہوں لیکن جھل کا جسم جھٹک رہا
...حالت میں اُسے چھوڑ کے ایک لمحے کو بھی میرا کہیں جانے
...کرتا تھا۔ اگر وہ خود ہی فیض آباد جانے کا ارادہ کرتا تو
...ابھی کوئی بات نہیں تھی۔ وہیں اُسے آرام مل سکتا تھا۔
...کچھ بحال سے وہ چند دن میں ٹھیک ہو جاتا۔ زرّیں اُسے
...ترتی اور زرّیں کی بات وہ ٹال ہی نہیں سکتا تھا مگر
...وقت اُس کے کلکتے سے جانے کو نہیں تھا۔ نہ اُس کی
...فیض آباد تک کے سفر کی متحمل تھی۔ وہ انہیں بھولا تو
...اُس کے ذہن میں کوئی ایسی ہی بات ہوگی جو اُس
...اڈّے پر نہیں بلایا یا کوئی آدمی اُدھر نہیں بھیجا۔ مجھ
...نہیں جا کے دیکھنے کو نہیں کہا اور جب اُس نے خود
...ت نہیں دی تھی تو میرے کہنے کا کیا سوال پیدا ہوتا تھا۔
...ت کو اوپر کی منزل پر سونے کے لیے ہم لیٹے تو کانتے
...بی پر آگیا اور مجھ سے لپٹ کے ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں
...اُس سے ایک بات پوچھنے کے لیے کئی مرتبہ میرے
...آئی تھی لیکن کوئی مناسب موقع ہی نہیں ملا ہو
...شبّ پارہ کے متعلق پوچھتا۔ مجھے یقین تھا کہ دوسرے
...قہر ادا کر کے وہ اُسے کریمن بیگم کے ہاں سے لے آیا
...ا تو وہ میرے ساتھ ہی مُڑ کے آیا تھا۔ میں نے مجھے
...میں اُس سے شبّ پارہ کا ذکر کیا تو وہ بے چین ہو گیا۔
...آتی تھی کہ تو نے اب تک اُس کے بارے کوئی
...نہیں کی؟" وہ اداسی سے بولا۔ "کیا تُو جانتا تھا کہ اُس
...نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا؟"
...جھوٹ؟" میں اُٹھ کے بیٹھ گیا۔
...میری بات کا یقین آگیا تھا؟"
...ہوا ہے؟" میں نے ترشی سے کہا۔
...نے اُس رات مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔ مجھے پیچھے چھوڑ
...میں تھا۔ جب میں اُوپر پہنچا تو سوائے ایک بچے
...اور کوئی نہیں تھا۔ اُن لوگوں نے بولا کہ کریمن سو رہی ہے
...شبانے کو لے کے بھاگ گئی ہے۔"
...نہیں" میں نے ڈولتی آواز میں کہا۔
...شتاد کے ساتھ جاتا تھا اس واسطے میں نہیں
...ادی اُسے اُسی دن سالے کے شہر سے نکل گئی تھی۔
[illegible]

نے اُس سے زیادہ دینے کو کہا تھا۔ پھر وہ اُسے کیوں لے گئی۔
- لے گئی۔ دل میں خرابی آگئی تھی اور ہو سکتا ہے کہ وہ یہ
سیٹھ نے اپنے آنے کے بعد کچھ بڑی بولی دے کے کسی کو بھیجا ہو۔
میرا دل مجھے لگا شبانے کی قسمت ہی خراب تھی۔

- میں اُسے کہاں ڈھونڈتا؟" کانتے بولا۔ "پہلے میں نے سوچ لیا تھا، اپنے کو جیل ہی گیا تو اُس سالی حرام کی نائی کی آنکھیں باہر نکال لوں گا۔ میں نے مُڑ کر فیض آباد، کپتن خاں کے نوکروں کو لکھنؤ، ملا ماچھی کو بھی چٹھی ڈال دی تھی کہ اُس پاس جدھر بھی اِس جو کچھ کی صورت دکھائی دے اپنے کو ترت لکھو۔"

- تو کیا مجھے وہ مل گئی؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

- وہ نہیں ملی، یہ تیسرے دن کی بات ہے۔ میں بیٹھا تھا۔ ایک میں اڈّے کے بیٹھا تھا کہ گھبرا کے بھاگا ہوا آیا، بولا۔ کانتے استاد! ابھی اُدھر ایک مائی بُرقع اوڑھے کھڑی تھی، نام لیتی ہے۔ اپنا سر گھوم گیا۔ جا کے دیکھا تو وہ ایک کونے میں دبکی کھڑی تھی۔ منہ ڈھکا ہوا تھا۔ بہت پوچھا لاڈلے۔ اپنا کیا حال ہوا، وہ دیر تک سر سے پیر تک اُس کو دیکھتا رہا۔

- کیا وہ شبانے تھی؟" میں نے اچھل کے پوچھا۔

- یہی تو میں بولتا ہوں۔ اپنا مغز بالکل پھر گیا تھا۔" کانتے نے مجھے زور سے دبوچ لیا۔ "وہ شبانے ہی تھی۔" وہ تیزی سے بولا اور کہنے لگا کہ وہ اکیلی تھی۔ اُس کے ہاتھ لرزتے تھے۔ گلابی پاؤں [illegible] میں آئے ہوئے تھے، مُڑ تڑے پر شکنیں پڑی ہوئی۔ کانتے اُسے سی تا جیرے کے بغیر اُوپر کے فلیٹ میں لے آیا۔ اُس نے نقاب اُلٹی تو کانتے کو اُس کا چہرہ دیکھنے کا موقع ملا۔ شبّ پارہ کے رخساروں پر سفیدی چھائی ہوئی تھی۔ آنکھیں ویران اور سہمی ہوئی تھیں۔ "کانتے بھائی! میں آگئی ہوں۔" اُس نے کانپتی ہوئی آواز میں کانتے سے کہا اور بتایا کہ کریمن بیگم اُسے زبردستی بیل سے لے گئی۔ اُس نے لاکھ منع کیا، کریمن نے اُس کی ایک نہ سنی۔ وہ اُس کے ساتھ چلی تو گئی لیکن راستے بھر روتی ہوئی اور اُس نے راستے ہی میں دل پکّا کر لیا۔ بنارس کے اسٹیشن پہ گاڑی ٹھہری تو کریمن بیگم سو رہی تھی۔ شبّ پارہ نیچے اُتر آئی اور دوسرے پلیٹ فارم پر کھڑی ہوئی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ وہ گاڑی الٰہ آباد جا رہی تھی۔ الٰہ آباد سے وہ کلکتے جانے والی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ وہ زنانے ڈبّے میں بیٹھ کے ڈبّے سے تبھی اُتری جب کلکتہ آ گیا۔ کلکتے میں بیٹھ کے وہ سیدھی اڈّے پر چلی آئی۔ کانتے نے اُسے سینے سے لگا لیا۔

وہ بہت بدحال تھی۔ کانتے نے اُس کے لیے دو دیر تک

نیا جوڑا سلوایا۔ اڈّے پر شمول، لالا اور کپتن خاں کے سوا کسی اور کو اُس نے شبّ پارہ کی صورت نہیں دیکھنے دی۔ کپتن خاں اُن میں کئی مرتبہ اُسے پوچھنے جاتا تھا۔ لالا اور شمول بھی ہر وقت اُس کی چوکسی میں رہتے تھے۔ چار دن تک وہ زرّیں کی طرح اڈّے ہی پر رہی۔ کانتے کہتا تھا، جب تک اُس کا اصل رنگ چہرے پہ واپس نہیں آیا، اُسے نیند نہیں آئی۔ چار دن میں وہ سب سے بہت مانوس ہو گئی تھی۔ کپتن خاں کو بھائی صاحب کہتی تھی اور کپتن خاں اُسے بھتوکیہ کے مخاطب کرتا تھا۔ یہاں اُس کا زیادہ دنوں تک رہنا ٹھیک نہیں تھا اور نہ کلکتے میں کوئی مکان لے کے اُسے تنہا رکھا جا سکتا تھا۔ کپتن خاں کا اصرار تھا کہ میری واپسی تک شبّ پارہ کو گاؤں میں اُس کی ماں کے پاس بھیج دیا جائے۔ کانتے نے اُس کا مشورہ نہیں مانا۔ وہ اُسے فیض آباد زرّیں کی حویلی میں لے جا سکتا تھا مگر وہاں پہلے ہی خاصے لوگ تھے۔ چار دن بعد رات کو کانتے اُسے لے کے اڈّے سے باہر نکلا اور بمبئی جانے والی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ دوسری طرف سے کپتن خاں، لالا اور شمول اسٹیشن پہ آگئے۔ شمول نے اُسے بالیاں، لالا نے چوڑیاں اور کپتن خاں نے بہت سی چیزیں دے کے رخصت کیا۔

جولین شبّ پارہ سے مل کے بہت خوش ہوئی۔ کانتے نے اُسے سب کچھ بتا دیا تھا۔ جولین بھی اکیلی اکیلی ویران ویران سی رہتی تھی۔ شبّ پارہ کے آجانے سے جیسے اُس کا کوئی کھویا ہوا عزیز مل گیا تھا۔ کانتے نے جب اُس سے کہا کہ جولی! یہ لاڈلے کی امانت ہے تو بولی میرے لیے اُن کی جگہ ہے۔ وہ وہاں ٹھہرا تو صرف دو دن لیکن یہ اطمینان کر کے ہی اُس نے واپسی کا ارادہ کیا کہ شبّ پارہ وہاں خوش رہے گی۔ چار مہینے میں وہ چار بار بمبئی گیا اور ہر مرتبہ فیض آباد ہوتا ہوا آیا۔ کانتے کے مطابق اُس کے نام میرے منتقل کیے ہوئے روپوں میں سے اُسے ایک دھیلا نکالنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ میں نے بینک میں اُس کے نام کرنساجی کے لیے جمع کیے روپوں میں سے ڈھائی لاکھ روپے منتقل کیے تھے۔ دو لاکھ پچیس ہزار شبّ پارہ کے لیے اور پچیس ہزار احتیاطاً دیگر خرچ کے لیے۔ کریمن بیگم کے نصیب میں یہ دولت نہیں تھی تو میں اور کانتے کیا کر سکتے تھے۔

میں نے کانتے کے ہاتھ چوم لیے۔ رات بھر وہ مجھے اُسی کی باتیں سُناتا رہا۔ میرا بس چلتا تو میں اُسی وقت اُڑ کے شبّ پارہ کو دیکھنے پہنچ جاتا۔ گھر ملبوس میں وہ بالکل بدلی ہوئی نظر آتی ہوگی جیسے نئی گھر میں نظر آتی تھی۔ بکھرے بال، [illegible] دو پٹے کا ہوش نہ پیروں میں جوتی، گھر میں اِدھر سے اُدھر بھٹکتی ہوئی۔ آوازیں پڑتی رہیں۔ ایک لمحے باورچی خانے میں، دوسرے لمحے صحن پر کپڑے پھیلاتے۔ بیچا بیگم کے کہتے ہیں اُس کا رنگ ہی کچھ اور تھا۔ کسی گڑیا کی طرح بنی ہوئی جیسے جھل جا موڑ گیا تھا، رکو دوڑتی جیسے اپنی روح کے بغیر رہ گئی ہو۔ جب بھی وہ بمبئی جاتا، شبّ پارہ پہلا سوال یہی کرتی۔ "کانتے بھائی! کوئی خط آیا؟ کب آرہے ہیں؟" کانتے ہر مرتبہ اُس سے جھوٹ بول کے چلا آتا۔

تیسرے دن صبح جھل نے ٹیکسی منگوائی اور مجھے اپنے ساتھ بیٹھنے کو کہا۔ میں سمجھا کہ وہ ڈیرے سے ملنے جا رہا ہے۔ بیرو اور ابا جان کو مجھ سے بچھڑے تین ہی دن ہوئے تھے لیکن معلوم ہوتا تھا ایک مدت گزر گئی ہے۔ ٹیکسی شہر کی سڑکوں پر گھومتی رہی اور سیالدہ اسٹیشن پہ آکے ٹھہر گئی۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ جھل سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ وہ میرا ہاتھ تھامے آہستہ آہستہ قدم رکھتا ہوا گیٹ عبور کر کے پلیٹ فارم پہ آگیا۔ گاڑی لگی ہوئی تھی۔ وہ فرسٹ کلاس کے ایک ڈبّے میں جا کے برتھ پہ لیٹ گیا۔ ہمارے ساتھ کوئی سامان نہیں تھا۔ "کہاں جا رہے ہیں؟" مجھ سے ضبط نہیں ہوا تو میں نے پوچھ لیا۔

- شبانے کے پاس۔" وہ دھیمے لہجے میں بولا۔

- اور وہ لوگ؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

- آ جائیں گے۔"

ابھی گاڑی چلنے میں کچھ ہی دیر ہوگی کہ بیرو، لالا، مارتی اور ابا جان مجھے قلیوں کے ساتھ پلیٹ فارم پہ آتے دکھائی دیے۔ وہ گاڑی کے پچھلے حصے کی طرف جا رہے تھے کہ میں اُتر کے اُن کے پاس پہنچ گیا۔ "اِدھر، اِدھر، جھل بھائی اِدھر ہیں۔" میں نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔

بیرو نے مجھے ٹانگوں سے اُٹھا کے اُوپر کر لیا۔ میری نظر فوراً ابا جان پہ گئی۔ وہ مسکرا رہے تھے۔ اتنے دنوں بعد میں نے اُن کے چہرے پہ مسکراہٹ دیکھی تھی۔ بیرو مجھے اُٹھائے اُٹھائے اُن کے پاس لے گیا۔ "بڑے صاب! ابھی اِس کو دیکھتے ہو، ایک دم عربی گھوڑے کے ماقف ہے۔ کیا بولتے ہیں اس کو، دل ٹل دل؟" وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا اور اُس نے مجھے اُوپر اُچھال کے برتھ پہ پھینک دیا۔ ابا جان میری کمر پہ تھپکی دیتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ ڈبّے میں داخل ہوتے ہی وہ سب جھل کی برتھ کی طرف لپکے۔ بیرو جھل کا جسم جگہ جگہ سے ٹٹولنے لگا۔ جھل نے چمکتی ہوئی آنکھوں سے سب کو باری باری دیکھا اور اُٹھنے کی کوشش کی تو بیرو نے اُس کی چھاتی پہ ہاتھ مار کے اُسے اُٹھنے نہیں دیا۔ ابا جان جھل

کے سرہانے بیٹھ کے اُس کا ماتھا چھونے لگے۔ انھوں نے اُس کی نبض بھی دیکھی۔ جمل نے گردن اُن کے ہاتھوں پہ ڈال دی اور ابّاجان نے اُس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں بھینچ لیا۔

شامیانے کے آنے ہی کی دیر تھی گاڑی پلیٹ فارم پر رینگنے لگی۔ انھوں نے سامان سوٹ کیسوں اور چرمی تھیلوں میں بھر لیا تھا۔ دو ایک ٹین کے بکسے بھی تھے جب کے کپڑے صاف ستھرے اُجلے تھے۔ ابّاجان کا خط بنا ہوا تھا۔ جسم پہ دو پلی ٹوپی، کرتا پاجامہ، اوپر سے بنڈی پہنے ہوئے تھے اور چہرہ بھی اُجلا اُجلا، نکھرا نکھرا تھا۔ جنت میں ہم نے جس جھکڑ کو دیکھا تھا، وہ اس سے قطعی مختلف تھا لیکن وہ بہت دُبلے اور کمزور لگ رہے تھے۔ تبدیلیں ممکن ہو سکتی تھیں۔ راستے میں صرف دو ٹکٹ چیکر ایک بڑے اور اُن اسٹیشن پر دوسرا مغل سرائے پہ ٹکٹ چیک کرنے آئے تھے اور مطمئن ہو کے چلے گئے مگر جب تک گاڑی فیض آباد تک نہیں پہنچ جاتی تھی ہمارے مطمئن ہونے کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پچھلا تجربہ سامنے تھا۔ گاڑی کسی جگہ ٹھیرتی تو پولیس کے آنے کا دھڑکا لگا رہتا۔ کوئی ایک معمولی سپاہی بھی ڈبے میں اچانک آ کے ہمارے سامان پر اُنگلی اُٹھا سکتا تھا، وہ تلاشی کا مطالبہ کرتا تو انکار کیسے کیا جاتا۔ انکار میں زور بھی ہو سکتا ہے جب ایسا سامان ساتھ نہ ہو جو ہم چھپائے ہوئے تھے۔ ململ کے تھیلے ہاتھی گھوڑے، غلاموں کی فوج، نامیاں، زرنگار ملبوسات، عزت، شان، سبھی کچھ ان صندوقوں میں بند تھا جس کی نظر پڑتا، دشمن ہو جاتا، دماغ پھٹ جاتا۔ فرسٹ کلاس کے مسافروں کے سامان کی اس طرح تلاشی نہیں لی جاتی لیکن یہ کوئی قانون نہیں تھا، کسی کو کسی جگہ بھی شک ہو سکتا تھا۔

گاڑی کی رفتار ابتدا میں تیز تھی، بعد میں سست پڑ گئی۔ ایک اسٹیشن پر لیٹ ہوئی تو لیٹ ہوتی گئی۔ اسی سلسلے سے آگے میں ابّاجان کی برتھ پر جا کے بیٹھ گیا تھا۔ میں نے ارادہ کیا کہ فرخ فرازی، فادر ہسا اور اکبر کے بارے میں اُن سے پوچھوں مگر ابّاجان ہی کے خیال سے پوچھنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی کہ کوئی ایسی ویسی بات ہوئی ترتیب سے کہہ دینے پر اُن کے زخم تازہ ہو جائیں گے۔ پھر یہ بھی خیال آتا تھا، وہ اپنے دل میں کہیں یہ نہ سوچ رہے ہوں کہ زوال میں میرے ذہن پر دھول جم گئی ہے۔ تاہم میں نے لب نہیں کھولے۔ آج نہیں تو کل نہیں تو پرسوں انھیں بتانا ہی تھا۔ مجھے نہیں تو جمل کو کسی طرح جہاں گیر کو اُن سے پوچھتے ہوئے کوئی جھجک نہیں ہوگی کیونکہ اُس کے سامنے نئی گھر سے تو کل بھرا اس نے اپنے محفل میں ہار سنگھار کیے بیٹھے نہیں دیکھا تھا۔ فیض آباد قریب آتے آتے گاڑی لیٹ ہونے کے سبب دُور ہو جاتا تھا گاڑی

کو رات میں کسی وقت پہنچنا تھا لیکن وہ ساری رات گزار کے کہیں صبح پانچ بجے فیض آباد کے علاقے میں داخل ہوئی۔ میں دروازے کا دستہ تھامے اسٹیشن آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ زرّین خانم، خیابان منیر علی زبیر، جہاں گیر سب کے چہرے بار بار سامنے آ جاتے تھے۔ میری رگوں میں سنسناہٹ سی ہونے لگتی تھی۔ مارٹی بھی میرے پہلو میں دروازے پر آ کے کھڑا ہو گیا تھا۔

جمل کو پھر اُٹھنا پڑا۔ اسٹیشن پر مسافروں کا میلا لگا ہوا تھا۔ ہم نے کچھ دیر بھیڑ چھٹنے کا انتظار کیا، تب باہر نکلے۔ گیٹ پر ٹکٹ چیکر نے ایک سرسری نظر ہمارے ٹکٹوں پر ڈالی۔ پھر سامان پر ایک پل کو اُس کی آنکھوں میں گتّی سی اُبھری مگر وہ مسکرا کے دوسرے مسافروں کی طرف دیکھنے لگا۔ قلیوں نے ہمیں فوراً تانگوں تک پہنچا دیا۔ تانگے کے جھٹکے جمل کے پیر کے لیے تکلیف دہ ہوتے لیکن کوئی اور سواری ہی نہیں تھی۔ اسٹیشن سے کچھ دُور ہی چنگی پڑتی تھی۔ تانگا آگے نکل جاتا مگر سڑک کے بیچ میں ایک دُبلے پتلے پستہ قد آدمی نے ہاتھ اُٹھا کے اُسے رُک جانے کا حکم دیا۔ "کچھ نہیں ہے میرے سرکار!" کوچوان نے گھوڑے کی باگیں تھامے ہوئے ہنس کر کہا۔

چنگی والے نے اُس کی بات نہیں سُنی اور پائدان پر رکھے ہوئے بکسے بچھو کے منہ بناتے ہوئے بولا: "کیا ہے؟"

"میرے جواہرات ہیں۔" جمل نے گرجتی آواز میں کہا۔

اُس نے ناراضی سے جمل کی طرف سر اُٹھا کے دیکھا لیکن پلکیں جھپکا کے رہ گیا۔ "ٹھیک ٹھیک بتاؤ۔" وہ کسمسا کے بولا۔

"ٹھیک ہی بولا ہے، ادھر جنگل میں میرے جواہرات لے جانے کے کیا دام ہوتے ہیں؟" جمل نے نرمی سے کہا۔ "روز کاٹ دو بابو۔"

"سامان کھول کے دکھاؤ۔"

"شامت کربلا شاہ" پیرو نے درشتی سے کہا۔ "اپن کو جلدی ہے۔" اُس نے دس رُپے کا نوٹ نکال کے اُس کے حوالے کیا۔ "روز کاٹ کے رکھنا، واپسی میں اپن اِدھر سے لے لیں گے۔"

"سامان دکھا کے دام لگیں گے۔" چنگی والا تانگے کا بمپ تھام کے بولا جیسے تانگا روک لے گا۔

کوچوان نے اُسے بیچ میں سمجھانے کی کوشش کی اور ہم سے بولا: "دس رُپے اور دے دو جناب عالی! دس روپے کا روز کٹ جائے گا تو باقی کیا بچے گا۔ کچھ غریب لوگوں کا بھی خیال کیجیے۔"

"ایسا ہے۔" پیرو نے جیب سے دس رُپے کا ایک نوٹ اور نکالا۔ "ایسا ہے تو پہلے بولنا تھا۔ ادھر یہ خالی پیلی آنکھیں کیوں دکھاتا ہے، سالا اپنے کو کیا سمجھ کے رعب مارتا ہے۔"

کوچوان نے چنگی والے کو آنکھ مار کے اشارہ کیا۔ اُس نے وہیں کھڑے کھڑے چنگی پر بیٹھے ہوئے منشی کو دو دوں بچے کھول کے دس کا شبد سنا دیا اور دو ٹکے کی رسید لے آیا۔ چلتے چلتے وہ سلام کرنا نہیں بھولا۔ "ناراض مت ہونا جناب!"

تانگے والے نے چابک اُٹھا کے گھوڑے پر زور سے مارا۔ گھوڑا سرپٹ شہر جانے والی سڑک پر دوڑنے لگا۔

ہمارے پاس چنگی کی رسید تھی لیکن آگے کسی موڑ پر کسی سپاہی نے ہمیں نہیں روکا۔ صرف مٹھائی اور دودھ کی اکّا دکّا دکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ سڑکوں پر نیم سنّاٹا چھایا ہوا تھا۔ بازار سے گزر کے حویلی تک جانے والا راستہ مختصر تھا۔ میرے دل میں سائیں سائیں سی ہو رہی تھی۔ حویلی قریب آ رہی تھی۔ ابّاجان کو دیکھ کے جہاں گیر کی کیا حالت ہوگی اور زرّین جمل کو دیکھ کے کیا کرے گی، میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

کچھ ہی دیر میں حویلی ہمارے سامنے تھی۔

"آگے پھاٹک پہ کھینچ کے لینا۔" میرے بولنے سے پہلے جمل نے اونچی آواز میں کوچوان سے کہا۔ اُس نے باگیں کھینچ لیں اور تانگا جھکولے کھاتا ہوا ٹھیر گیا۔ سب سے پہلے میں نیچے اُترا۔ حویلی کا پھاٹک بند تھا۔ بڑھا چوکیدار شیرو وہاں موجود نہیں تھا۔ پیرو نے جمل کو سہارا دے کے نیچے اُتارا۔ ابّاجان، زورا اور مارٹی نظریں گھما گھما کے حویلی دیکھ رہے تھے، باہر سے ساری عمارت کا رنگ گہرا تھا اور وہ کسی پرانے قلعے سے مشابہ تھی۔ میں پھاٹک کے دروازے پر پہنچا اور میں نے زور زور سے کنڈا کھٹکھٹانا شروع کر دیا۔

"کون ہے؟" اندر سے شیرو کی لڑکھڑاتی آواز گونجی۔ ساتھ ہی اُس نے پھاٹک کی کھڑکی کھول دی۔ مجھے سامنے دیکھ کے وہ آنکھیں ملنے لگا اور ہکلاتے ہوئے لہجے میں چیخا: "لاڈلے میاں!"

"شیرو چاچا!" میں نے اُسے کولیا میں بھر لیا۔ مجھے اس کا بھی دھیان نہیں رہا کہ ابّاجان پیچھے آ رہے ہیں۔

جیسے ہی شیرو کی نظر جمل پر پڑی وہ اُچھلنے لگا اور میری گرفت سے آزاد ہو کے اُس کی جانب بھاگا۔

"ابھی تک چل رہا ہے رے!" جمل اُس کا بازو جھنجھوڑتے ہوئے بولا۔

"تم نے جو اُدھر باندھ رکھا ہے۔ بنیاد کے بوتے ہے۔"

"بنیا کیسے ہے؟" جمل نے تمتماتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"اپنے سے مت پوچھو۔ خود ہی دیکھ لینا۔"

"جا کے جلدی بول، اِدھر کیا سنّاٹا رہا ہے۔"

شیرو ہنسنے لگا۔ "اچھا!" بولا اندر عمارت کے دروازے پر جا کے کواڑ دھڑدھڑانے لگا۔ کوچوان، پیرو، مارٹی اور زورا جلدی جلدی سامان اُٹھا لائے۔ شیرو کو زیادہ چلّانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ کسی نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور جھڑتے ہوئے لہجے میں پوچھا: "کیا بات ہے شیرو چاچا؟" میں نے آواز پہچان لی۔ وہ زرّین ہی تھی۔

"دیکھو کون آیا ہے۔" شیرو نے گھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

زرّین نے کچھ اور نہیں پوچھا، ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا۔ میری آنکھیں دھندلا گئیں۔ زرّین کے سراپا کا ایک دھندلا سا ہیولا، پیلے زرد وہ اُداسی جھلکی پھر کسی سہمی ہوئی ہرنی کی طرح، بجلی کی طرح کوندتی چبوترے کی سیڑھیاں پھلانگ کے جمل کے سینے سے لگی۔ جمل اُس کے سر پہ اپنا سر رکھے آنکھیں میچے لمحوں تک چپ کھڑا رہا۔ زرّین بُری طرح سسکنے لگی تھی۔ "ہا، ہا..." جمل بوجھل لہجے میں بولا۔ "آ گیا ہوں ری! اب کے تو جب بولے گی، جبھی لوٹوں گا۔ نہیں بولے گی تو نہیں جاؤں گا۔" جمل نے اُس کی ٹھوڑی اُٹھا کے چہرہ سامنے کیا اور اُس کی پیشانی چومنے لگا۔ اُس کی چھلکتی ہوئی آنکھوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔ زرّین سر تا پا لرز رہی تھی۔ اُسے یہ بھی دھیان نہیں رہا تھا کہ کچھ اجنبی لوگ بھی کھڑے ہیں۔ ہم سب اُسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ میری سانس تیز تیز چل رہی تھی۔ پیرو نے سر جھکا لیا۔ "سنبھل ری!" جمل نے اپنے بازوؤں کا حصار کھول کے ابّاجان کی طرف اشارہ کیا۔ "اُدھر دیکھ، پہچان تو کون ہیں یہ؟ چہرہ کچھ جانا پہچانا لگتا ہے؟"

زرّین کی بھیگی پلکیں پٹ پٹانے لگیں۔ اُسے فوراً اپنے دوپٹے کا ہوش آیا۔ جمل نے اپنی آستین سے اُس کی آنکھیں پونچھ دی تھیں۔ زرّین کا چہرہ آگ کی طرح دہک رہا تھا۔ اُس نے لرزتے ہونٹوں سے گردن خم کر کے سٹپٹائے ہوئے انداز میں ابّاجان کو سلام کیا۔

"ابھی سنبھالا ہے بابا! دیکھو لڑکی کیسی سیانی ہے۔"

تقی کے ابّا! ابّاجان چونکے۔ زرّین بھی۔ اُس نے حواس باختگی سے پہلے میری طرف دیکھا، پھر ابّاجان کی طرف اور انھیں دوبارہ سلام کیا۔ ابّاجان نے آگے بڑھ کے اپنے کانپتے ہاتھ اُس کے سر پہ رکھ دیے اور کچھ بولے نہیں کہ جمل نے تقی کا نام کیوں لیا ہے۔ وہ گنگ سے ہو گئے تھے۔

اُسی لمحے جہاں گیر اندر کے دروازے پر سمندر کی لہر کے مانند اُمڈتا ہوا آیا۔ اُس نے پہلے مجھے دیکھا تھا اور میری طرف بڑھا تھا لیکن جمل سے جا کے لپٹ گیا۔ ابّاجان زرّین کے سامنے دروازے کی جانب پشت کیے کھڑے تھے اس لیے

اُس کی نظر اُن پر نہیں جا سکی اور اُس کے سان و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ ابا جان یہاں آ سکتے ہیں۔ وہ کبری تپائی کا شروع ہی سے تھا۔ اب وہ لمبا ہو گیا تھا۔ بانس کی طرح اوپر اٹھتا جا رہا تھا۔ تجمل نے اُس کے کولہے پکڑ کے اُسے اوپر اچھال دیا۔ "کیا بے شیشم ہوا؟" وہ اپنا سر اُس کے پیٹ سے رگڑتے ہوئے بولا۔ "پہلے بکھیر ترس دے۔"

"بابا! ہم آپ سے بہت ناراض ہیں۔" وہ مچل کے بولا۔ "ایک خط بھی نہیں لکھا۔ ایک سطر بھی۔"

"انگلیاں ہی جام ہو گئی تھیں بیٹے۔"

"آپ وعدہ کر کے گئے تھے۔ کسی سے دو لفظ نہیں لکھوا سکتے تھے؟ چھ مہینے میں پانچ منٹ بھی آپ کو نہیں ملے؟"

"معاف کر دے شہزادے، غلطی ہو گئی۔"

جہانگیر اُس کے گلے میں بانہیں ڈال کے جھول گیا۔

"بابا! روز آپ کا انتظار ہوتا تھا۔ زری باجی صبح و شام نیر باجیا سے پوچھتی تھیں، ڈاک آئی؟ کیا گزر گیا؟ آپ ایسے کہاں چلے گئے تھے؟ کتنی دور؟ وہاں سے خط بھی نہیں آ سکتا تھا کیا؟" وہ ایک ہی سانس میں نہ جانے کیا کیا کہتا رہا اور تجمل سر ہلاتا رہا۔

"ذرا پیٹ کھول دیکھ تو تیرے لیے کیا لایا ہوں۔"

"کیا ہے؟" جہانگیر بے تابی سے بولا۔ "مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ آپ اور بابر بھائی آ گئے یہی بہت ہے۔ دل میں عجیب عجیب ہول اٹھتے تھے۔ سبھی دعائیں کرتے تھے۔"

"ادھر تو دیکھ پیچھے کون کھڑا ہے۔"

"کون؟" جہانگیر نے مڑ کے دیکھا۔ ابا جان اُس کی باتیں سن رہے تھے اور اُن کی آنکھوں سے زار و قطار آنسو جاری تھے۔ جہانگیر انھیں دیکھ کے مبہوت رہ گیا۔ ابا جان نے اپنے ہاتھ پھیلا رکھے تھے۔ وہ کسی سحر زدہ معمول کی طرح اُن کے بازوؤں میں سمٹ گیا۔ پھر جیسے سوتا پھوٹ پڑے، ایسا گرج گرج کے رویا کہ سبھی کی آنکھیں چھلکنے لگیں۔ اندر سے منیر علی، خانم، زہرہ، سلمیٰ، جوتیاں، ارشاد اور جہاں بھی آ گئے تھے۔ نیساں اور بڑی ہو گئی تھی۔ مجھے دیکھا تو دیوانی سی ہو گئی۔ اُسے دیکھتے ہی میرا دل بہت چاہتا تھا۔ پہاڑوں میں کتنی ہی بار مجھے اُس کا خیال آیا تھا اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ نیساں میرے ساتھ ساتھ ہی چل رہی ہے۔ کرشنا جی کہتے تھے کہ آدمی کبھی کہیں اکیلا نہیں جاتا۔ اُس کے ہم سفر بہت سے لوگ ہوتے ہیں جنھیں وہ چھو نہیں سکتا پر انھیں دیکھتا رہتا، جن سے باتیں کرتا رہتا ہے۔ نیساں کی پرچھائیں بھی جیسے میرے ساتھ ہی گئی تھی اور مجھے ایک ہی بات ستاتی رہتی تھی کہ کہیں وہ حویلی میں آ کے پچھتائی نہ ہو، کوئی اُس سے ناراض نہ ہو گیا ہو، چھپ کے روتی نہ ہو۔

اُس کا رنگ اور کھل گیا تھا، شہابی شہابی۔ ایسی بھلی لگ رہی تھی جیسے میں پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔ میرے پاس وہ دوڑی چلی آئی اور قریب آ کے ایک لمحے کو سہم کے رک گئی۔ "ابو بھائی!" وہ سسکاری بھرتے ہوئے بولی۔ دوسرے ہی لمحے میں نے اُسے کھینچ کے اپنے پہلو میں سمیٹ لیا۔ میں اُسے سنبھالتا نہیں تو شاید وہ اپنے پیروں پر تھمی نہ رہتی۔ صرف ایک پل اُس نے منہ اٹھا کے مجھے بسورتی نظروں سے دیکھا اور اپنا چہرہ میرے شانے میں چھپا کے سسکنے لگی۔ میں اُسے روکنا چاہتا تھا کہ دوسری طرف سے سفید ساڑی میں ملبوس خانم میرے پہلو میں آ کے کھڑی ہو گئی تھی۔ وہی رنگ روپ، جھل جھل کرتی آنکھوں میں موتی لرزتے ہوئے۔ خانم کی عمر بڑھتے ہوئے وقت کے ساتھ کچھ گھٹ رہی تھی، جیسے پیرا نور سا بکھرا ہوا تھا۔ میں نے بڑھ کے اُس کے کندھے پر اپنا ماتھا ٹکا دیا۔ خانم کی نرم و نازک لمبی لمبی انگلیاں جن سے وہ ستار بجایا کرتی تھی، میری گردن پر منڈلانے لگیں۔ اُس کے پیچھے زہرہ سہمی کھڑی تھی۔ منیر علی لپکتے ہوئے میری جانب بڑھے، وہ دونوں پیچھے ہٹ گئیں۔

پھاٹک اور عمارت کے درمیان کھلے آنگن والے حصے پر سبزہ اُگا دیا گیا تھا۔ احاطے اور عمارت کی دیواروں کے ساتھ ساتھ والی کیاریوں میں رنگ برنگے پھول کھلے ہوئے تھے۔ اندر حویلی میں اب کوئی موجود نہیں رہا ہوگا۔ تمام ملازم بھی وہیں آ گئے تھے۔ دیر تک کسی کو برآمدے میں کھڑے رہنے کا احساس نہیں ہوا۔ کوئی کبھی میری طرف بڑھتا، کبھی تجمل کی طرف۔ جہانگیر کو ابا جان کی آغوش میں مسلسل سسکتے دیکھ کے میں نے انھیں اُن سے الگ کر کے اپنی چھاتی سے چمٹا لیا تھا۔ خانم کے ٹوکنے پر تجمل نے اندر جانے کے لیے قدم بڑھائے تو لنگڑانے لگا۔ ایک بار پھر سبھی اُس کے گرد جمع ہو گئے۔ زریں نے نظر بھر کے دیکھا تو تجمل نے ہنستے ہوئے کہا، "کچھ نہیں، ذرا چوٹ لگ گئی ہے۔" پھر وہ جلد ہی زریں کے کندھے کا سہارا لیے بڑا بنا ہوا آگے بڑھ گیا۔

دالان حصے کے پہلے بڑے کمرے کا رنگ ہی بدلا ہوا تھا۔ فرش پر قالین، دیواروں کے ساتھ آرام کرسیاں، چھت سے بیچ میں ایک چھوٹا فانوس لٹکا ہوا، سامنے کی دیوار کے [illegible] ایک بڑا تخت بچھا ہوا تھا۔ تجمل وہیں جا کے بیٹھ گیا [illegible] نے منہ ہی منٹ ہوئے ہوں گے کہ زریں نے ایک [illegible] کے تجمل کے آگے رکھ دیا۔ نیساں ایک ملازم کے ساتھ چائے

کی پیالیاں رکھ گئی۔ ہم نے ناشتہ نہیں کیا تھا۔ حویلی میں بھی سب ابھی سو کے اٹھے ہوں گے۔ زریں، نیساں، زہرہ، خانم، سلمیٰ، جوتیاں سبھی بھاگے بھاگے پھر رہے تھے۔ زریں کے لاتا پر تجمل نے ہم سب کو نہانے اور کپڑے بدلنے کا مشورہ دیا۔ بال اور ذرا ابھیکی تھے۔ ہم سب کے کپڑے میلے ہو گئے تھے اور کسی کے پاس دھلے ہوئے کپڑے تھے بھی نہیں مگر تجمل کے کہنے پر سبھی اٹھ گئے۔ منیر علی، ابا جان کو بھی ایک طرف لے گئے۔ غسل کر کے جب سب واپس مردانے میں آئے تو سبھی نئے کپڑے پہنے ہوئے تھے جیسے انھیں معلوم تھا کہ ہمارے ساتھ اور لوگ بھی ہوں گے۔ زریں نے میرے اور تجمل کے لیے کپڑے سی کے تیار رکھے ہوں گے۔ چیرو اور زورا کو تجمل کے جوڑے ٹھیک آ گئے ہوں گے اور مارتی کو میرے کپڑے۔ ابا جان پہلے ہی سے کپڑے پہنے ہوئے تھے مگر کرتوں اور پاجاموں میں چھوٹے بڑے سائز کا اتنا فرق محسوس نہیں ہوتا۔ مارتی کو میں نے پہلی بار اُس لباس میں دیکھا تھا۔ ململ کے کڑھے ہوئے کرتے اور چھوٹی مہری کے پاجامے میں وہ عجیب سا لگ رہا تھا۔ بانکا سا۔ میں گھور کر بار بار دیکھتا تھا۔ وہیں تخت پر ایک لمبا دسترخوان بچھا دیا گیا۔ اتنی دیر میں نہ جانے انھوں نے کیا کیا تیار کر لیا تھا۔ قیمہ بھرے پراٹھے، آلو کی ترکاری، پوریاں، حلوہ، بھنا گوشت، بسکٹ اور چائے۔ وقت کا سا سماں تھا۔ سب چیزیں دسترخوان پر چن دی گئیں تو تجمل نے زریں، نیساں وغیرہ کو بھی ہمارے ساتھ بیٹھ جانے کو کہا۔ ابا جان کا اور کچھ نہیں تھا۔ چیرو، زورا اور مارتی سے انھوں نے پردہ پہلے ہی نہیں کیا تھا کیونکہ وہ تجمل کے ساتھ آئے تھے۔ اس لیے انھوں نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی ہو گی۔ زہرہ بھی نیلی چادر سر پہ ڈالے وہیں موجود تھی۔ نیلی چادر میں اُس کے چہرے کا سونے جیسا رنگ دمک رہا تھا۔ منیر علی اور ارشد بھی پہلے سے فربہ نظر آتے تھے۔ ارشد بالکل تن درست معلوم ہوتا تھا۔ مجھے یہ ڈر تھا کہ فیض آباد کی آب و ہوا اور ماحول سے منیر علی اکتا تو نہیں گئے ہوں گے۔ خانم، زریں، نیساں یا جہانگیر کی کوئی بات اُن کے لیے اگر ایقاظ ہو سکتی تھی۔ اپنا گھر بار یاد آتا ہو گا۔ اب دیکھنے سے لگتا تھا جیسے وہ برسوں سے یہیں رہتے ہوں اسی حویلی میں۔ مردانے میں سب سے اونچی آواز انھی کی تھی۔ سب انھیں بابا جان کہتے تھے۔ خانم بھی۔

تجمل کی ہدایت پر تقریباً سارے کے سارے لائبریری کے نیچے بنے ہوئے تہ خانے میں رکھ دیے گئے۔ ابا جان نے انھیں کھول کے دوبارہ دیکھنے کا تجسس ظاہر نہیں کیا۔ اُن پر تو جیسے سکوت سا چھا گیا تھا۔ سر اُٹھا کے سب کو تکنے لگتے اور کسی کے متوجہ ہونے پر چونک جاتے۔ نہ جانے کیا سوچ رہے تھے مگر چہرے سے کوئی بے چینی ظاہر نہیں ہوتی تھی۔ تجمل نے نام لے لے کے چیرو، زورا، مارتی کو اُن سب سے ملوایا تھا۔ زریں تجمل سے ملنے کے لیے سامنے آئی تو وہ چیرو سے کہنے لگا، "ایسی گیا ہے ہوا!"

"اپنی جان ہے تجمل بھائی!" چیرو نے دونوں ہاتھ سے زریں کا چہرہ تھام لیا اور ٹکٹکی باندھ کے اُسے دیکھتا ہوا بھرائی ہوئی آواز میں بولا، "اپن تجمل بھائی کا نام ہے۔ اپنی گڑیا بھی ایک دم تیرے ماپک ہے۔ بالکل ایسا ہی گڑیا سا۔"

"کہاں ہیں وہ؟" زریں نے زیر لب پوچھا۔

"ابھی اُس کو ادھر بلانے کا یا تم کو ہی اُدھر لے جانے کا؟ کیوں تجمل بھائی، کیا اُس کو دیکھ کے کتنا خوش ہو گا۔"

"راج کماری کو ادھر ہی بلاؤ، راجی کو بھی۔"

"ہاں ہاں یہیں بلا لیجیے۔" زریں چہک کے بولی۔ "وہ آ کے تو پھر وہ واپس جانے کو نہیں ملیں گی۔"

"ٹھیک ہے۔ پھر وہ ہمارے ساتھ ہی رہیں گی۔"

"اے تجمل بھائی!" چیرو ہنس کے بولا۔ "اس کا دل بھی تمھارے جیسا ہے۔"

"اس کا دل کسی نے نہیں دیکھا۔ دارا! یہ اُٹھا سے۔" تجمل نے سانس بھر کے کہا، "بغیر ہتھیار کے لڑتی ہے۔"

"آگ بانگ جیسا ہوتا ہے، اپنے کو ایسا ہی لگتا ہے اوپر والے نے اس کو اپنے ہاتھ سے بنایا ہے۔"

زریں شرما کے بھاگ گئی۔

دوپہر ہونے سے پہلے جامو کا چچیرا بھائی اور قبیل بار کے اڈے کا اُستاد عمرو ڈگمگاتے قدموں سے مردانے میں داخل ہوا اور تجمل کے گلے لگ کے بین کرنے لگا۔ وہ اکیلا نہیں آیا تھا۔ اڈے کے اور بھی لوگ اُس کے ساتھ تھے۔ عمرو کو گھاٹی میں مرنے والے ہر بات کا علم تھا۔ کالے تے نے بتایا تھا کہ وہ گھاٹی میں اُن سے ملنے سے پہلے آبائی گھر گئے تھے، انھوں نے یہ سب بتا دیا۔ یہ بھی پتا چلا کہ کپتن خاں اور عمرو میں کسی عورت پر جھگڑا ہوا تھا۔ دونوں تجمل کو اپنی اپنی کہانی سنا رہے تھے مگر دونوں ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔ جامو نے کپتن خاں سے کہا تھا کہ وہ گاہے گاہے لکھنؤ سے فیض آباد کے اڈے پر آتا رہے اور عمرو کو اُلٹی سیدھی حرکتوں سے باز رکھے۔ ابھی عمرو نے کپتن خاں ہی کے بارے میں سنا تھا۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ ہم اُس کے ساتھ چلے گئے ہوئے ستی میاں کو واپس نہیں لا سکے

ہیں۔ فیصل کو کسی ٹیکسی لے آئے، یہ بتانا ہی تھا۔ اُن کے آتے ہی منیر علی اباجان کو دوسرے کمرے میں لے گئے تھے۔ کچھ دیر بعد میں بھی وہاں سے اُٹھ گیا۔ مجھ سے مجروح کی لال آنکھیں دیکھی نہیں جاتی تھیں۔ مجروح کو آئے دیر نہیں ہوئی تھی کہ زرّیں نے خیر سے کمرے کے اندر بلوا لیا اور جلد سے جلد کسی ڈاکٹر کو لے آنے کو کہا۔ پہلے بھی ایک بار مجروح میرے لیے فیض آباد کے ایک مشہور ڈاکٹر کو لایا تھا۔ زرّیں ہی نے اُسے یہ کہلوایا ہوگا کہ ہم لوگ حویلی میں ہیں۔ زرّیں کی بات مجروح کے لیے حکم کا درجہ رکھتی تھی۔ وہ فوراً باہر چلا گیا اور آدھ گھنٹے کے اندر واپس آیا تو ڈاکٹر اُس کے ساتھ تھا۔

زرّیں نے فیصل کا پلنگ وہیں برآمدے میں لگوا دیا تھا اور اُسے اُٹھنے سے بالکل منع کر دیا تھا۔ فیصل نے پھر وہاں سے جنبش نہیں کی۔ ضرورتاً ہی اُٹھا ہو تو اُٹھا ہو۔ زرّیں کے کہنے پر دوپہر کا کھانا مجروح نے ہم لوگوں کے ساتھ ہی کھایا۔ پھر اُفق کے تمام لوگوں کو لے کے چلا گیا۔ پیرو، زورا، مارتی اور اباجان کے لیے الگ الگ کمروں کا انتظام کیا گیا تھا لیکن وہ تینوں ایک ہی کمرے میں آ گئے۔ منیر علی اباجان کے ساتھ سائے کی طرح لگے ہوئے تھے۔ جہاں گیر بھی اُنھی کے ساتھ تھا۔ شام کو مجروح پیرو اور زورا کو اُفق پہ لے گیا۔ مارتی میری وجہ سے وہیں رہ گیا تھا اور جھپتی جھپتی آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگتا تھا۔ رات کو فیصل کو پھر بخار آ گیا۔ زرّیں نے اُسے گرم دودھ کے ایک گھونٹ اور دواؤں کے سوا کچھ کھانے کو نہیں دیا اور رات گئے تک سرہانے بیٹھی اُس کا سر دباتی رہی۔

تین دن تک وقت کا کچھ پتہ ہی نہیں چلا۔ کوئی ضرورت بھی نہیں تھی۔ ہم ایک دوسرے کو دیکھتے اور باتیں کرتے، ہی سے کسی کو فرصت نہیں ملی تھی۔ اباجان بھی جیسے ساری دُنیا سے بے خبر ہو گئے تھے۔ دوسری صبح وہ منیر علی کے ساتھ زمینوں پر چلے گئے۔ رات کو لوٹے تو منیر علی اُنھیں اندر لے گئے۔ میں نے اندر جا کے دیکھا تو ایک طرف سلمیٰ اُن کے پہلو میں بیٹھی تھی، دوسری طرف نیساں۔ دونوں کی زبانیں چہک رہی تھیں۔ وہ کبھی نیساں کی بات سنتے، کبھی سلمیٰ کی۔ کبھی جہاں گیر بیچ میں بولنے لگتا۔ زہرہ اور خانم بھی وہیں موجود تھیں۔ منیر علی کے قہقہے گونج رہے تھے۔ مجھے رشک ہوا کہ اباجان کا غصہ تیز ہے۔ نیساں اور سلمیٰ کوئی گستاخی نہ کر بیٹھیں لیکن اباجان اُن کے درمیان بچے بنے بیٹھے تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ حویلی میں دو ایک پہر ٹھہرنے کے بعد واپس جانے کے لیے اصرار کریں گے۔ فرخ، فریال، فارمہ اور اکبر کے پاس۔ چار دن تک اُنھوں نے اُن کا ذکر ہی نہیں کیا اور نہ کہیں جانے کا کوئی اشارہ کیا۔ کئی مرتبہ میں نے جہاں گیر کو اُن سے چپکے چپکے باتیں کرتے دیکھا تھا۔ جہاں گیر نے اُن سے ضرور پوچھا ہوگا۔ میں جہاں گیر سے معلوم کر سکتا تھا لیکن نہ جانے کون سی بات مجھے روک لیتی تھی۔ اِن دو دنوں اباجان کو زرّیں، خانم، منیر علی اور میرے بارے میں بہت کچھ معلوم ہو گیا ہوگا۔ وہ جہاں گیر اور منیر علی آپس میں صرف موسم کی باتیں تو نہیں کرتے رہتے ہوں گے۔ اباجان کے چہرے سے طویل سفر کے آثار دھُل چکے تھے اور اُن کے ہونٹوں پر دھیمی دھیمی مسکراہٹ رہنے لگی تھی۔ چار دن تک اُنھوں نے تہ خانے کا سامان بھی نہیں کھلوایا تھا۔

پیرو، زورا اور مارتی کو بھی شاید واپسی کی جلدی نہیں تھی۔ وہ گھر والے بنے ہوئے تھے۔ ارشد زیادہ تر اُنھی کے ساتھ رہتا تھا۔ نیساں، سلمیٰ، مجھو میاں، زہرہ، خانم ہر وقت اُن کے اِردگرد رہتی تھیں یا پھر وہ مجروح اور اُفق کے آدمیوں میں گھرے رہتے تھے۔ زرّیں تو مستقل فیصل کے پلنگ سے بندھ گئی تھی حالانکہ اب فیصل کی طبیعت نسبتاً بہتر تھی۔ زخم سکڑنا شروع ہو گیا تھا۔ بخار بھی پھر نہیں آیا تھا۔

حویلی میں ایک دھوم سی مچی ہوئی تھی۔ جسے دیکھو بھاگا بھاگا پھر رہا ہے۔ نیساں، زہرہ باورچی خانے میں کھانا پکوا رہی ہیں۔ سلمیٰ ترکاری کاٹ رہی ہے۔ خانم ملازماؤں سے صفائی کرا رہی ہیں۔ بستروں کی چادریں بدلوا رہی ہیں۔ صحن میں چھڑکاؤ کروا رہی ہیں۔ کبھی شربت آ رہا ہے کبھی چائے۔ صبح و شام انواع و اقسام کے کھانے پک رہے ہیں۔ پکنے کے دوران حسبِ معمول نیساں چکھتی رہتی تھی بار بار جاتی، "بریانی کیسی ہے؟ انڈے ٹھیک بنے ہیں؟" جس چیز کے بارے میں وہ پوچھتی تھی، اُس کا مطلب تھا کہ اُس نے پکائی ہے۔ میں اُسے چڑانے کے لیے کہہ دیتا "بہت بے مزہ ہے۔" وہ میرے سامنے سے جھٹ پلیٹ اُٹھا لیتی اور صورت روہانسی ہو جاتی۔ جب تک میں اُس کے ہاتھ سے پلیٹ واپس نہ لے لیتا، اُس کے گالوں کی سُرخی واپس نہ آتی۔ آتے ہی مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ جہاں گیر نے اچھے نمبروں سے میٹرک کر لیا ہے اور فرسٹ ایئر کی تیاری کر رہا ہے۔ ارشد بھی ایم اے کر رہا ہے۔ وہ جہاں گیر، نیساں، سلمیٰ، مجھو میاں کو روزانہ کئی گھنٹے پڑھاتا اور منیر علی کے ساتھ زمینوں پر نکل جاتا۔ اُس کے علاوہ دو اور ٹیوٹر بھی انھیں پڑھانے آتے تھے۔ نیساں نے مجھے بتایا کہ خانم اب اُسے زیادہ نہیں ڈانٹتی ہیں۔ وہ کبھی کبھی کمرے میں بند ہو کے ستار بجا لیتی ہیں۔ ہر دوسرے تیسرے ہفتے منیر علی کا لڑکا تنویر علی

علی گڑھ سے آ جاتا ہے۔ وہ دو تین دن سے زیادہ نہیں رہتا مگر اُس کے آ جانے سے بہت رونق ہو جاتی ہے۔ زرّیں بہن کتابیں پڑھتی رہتی ہے یا وہ اور خانم مل کے گھر سجاتی رہتی ہیں۔ کبھی زرّیں خانم سے فرمائش کر کے ستار سنتی ہے مگر اُن دونوں کے سوا کوئی نہیں ہوتا۔ نیساں کہتی تھی کہ زرّیں باجی ہر وقت کھوئی کھوئی سی رہتی ہیں۔ بعض اوقات تو اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلتیں۔ رات کو دیر تک باغ میں اکیلی بیٹھی رہتی ہیں لیکن جب بھی بابا، منیر علی یا خانم اُن کے پاس جا کے طبیعت پوچھتے ہیں، گھبرا جاتی ہیں جیسے چوری پکڑی گئی ہو۔ بابا جب بھی باہر جاتے ہیں تو وہ دروازے تک انھیں رخصت کرنے آتی ہیں اور جب وہ لوٹتے ہیں تو پہلے اُنھی کو پوچھتے ہیں۔

اتنے دن ہو گئے تھے، زرّیں نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ اُس رات میں کمرے میں آ کے لیٹا ہی تھا کہ زرّیں کی خوشبو مجھے دروازے پر محسوس ہوئی۔ خوشبو بھی چاپ کی طرح ہوتی ہے۔ کوئی آہٹ نہیں ہوئی تھی۔ دبے پاؤں دروازے پر آئی تھی لیکن مجھے محسوس ہو گیا تھا کہ کوئی آیا ہے اور یہ وہی ہو سکتی ہے۔ میں ایک دم اُٹھ کے بیٹھ گیا۔ "آؤ، وہاں کیوں کھڑی ہو؟ اندر آ جاؤ۔" میں نے مضطرب لہجے میں کہا۔

وہ جھجکتی جھجکتی اندر آئی۔ لمبے بال کھلے ہوئے تھے اور دوپٹے سے لٹیں جھانک رہی تھیں۔ ہرا دوپٹا اُس کے سُرخ و سفید رنگ پر کھلتا تھا۔ میں اُسے کن انکھیوں ہی سے دیکھتا رہا تھا۔ اب اُس کا سراپا میری کھلی آنکھوں کے سامنے تھا۔ آڑا پاجامہ اور کرتا اُس کا خاص لباس تھا۔ اِس میں اُس کا نکھرا ہوا قد اور نکل آتا تھا۔ صرف چوڑیاں کلائیوں میں تھیں یا کانوں میں بالے۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں کسی نئی زرّیں کو دیکھ رہا ہوں۔ "بیٹھ جاؤ۔" میں نے بھری ہوئی آواز میں کہا۔ اُس سے کہنے کو کوئی بات ہی میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ وہ سر جھکائے بیٹھ گئی تھی۔ اچھا ہوا جو اُس نے سر جھکا لیا تھا۔ مجھے اُسے دیکھنے کا خوب موقع مل گیا۔ "اباجان کو دیکھا؟" میں نے یوں ہی پوچھ لیا۔ مجھے کچھ نہ کچھ تو کہنا تھا۔

"- بالکل تمھارے ہی اباجان ہیں۔" وہ مسکرا کے بولی۔

"- کیا مطلب؟" میں نے تیکھے لہجے میں کہا۔

"- میرا مطلب ہے تمھارے جیسے۔" وہ تیزی سے بولی۔ "اُن کا چہرہ، ناک نقشہ تم سے اور جہاں گیر سے کتنا ملتا ہے۔ وہی لمبی ناک، اونچا قد، گہری بھویں، [illegible] تو بہت ہی ملتا ہے۔"

"- تمھیں انھیں ہمارے ساتھ دیکھ کے تعجب تو بہت ہوا ہوگا۔"

"- نہیں۔" وہ اعتماد سے بولی۔ "مجھے یقین تھا ایک دن وہ ضرور مل جائیں گے۔"

"- تمھاری بات ہوئی؟" میں نے آہستگی سے پوچھا۔

"- ہر وقت ہی ہوتی ہے۔"

"- کیا بات کرتے ہیں؟"

"- بہت خوش ہیں، بہت ہی خوش۔"

"- میرے بارے میں کچھ کہتے ہیں؟" میں نے تذبذب سے پوچھا۔

"- پوچھتے رہتے ہیں۔"

"- کیا، کیا پوچھتے رہتے ہیں؟"

"- تم سامنے نہیں ہوتے تو انھیں گھبراہٹ سی ہونے لگتی ہے۔"

"- ہوں۔" میں نے ہنکاری بھری اور چپ ہو گیا۔

"- تم تو ایسے معلوم کر رہے ہو جیسے تمھاری اُن سے کوئی بات ہی نہیں ہوتی۔ تم انھیں دیکھتے بھی جیسے نہیں ہو۔"

"- سچ پوچھو تو ایسا ہی ہے۔ اتنے دنوں سے وہ ساتھ ہیں اور میری اُن سے کبھی ایک آدھ جملے سے زیادہ بات نہیں ہوتی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اُن سے کیا کہوں، اُن کے ساتھ بھی ایسی کچھ ہوگا۔"

"- تمھیں اُن کا خیال رکھنا چاہیے۔"

"- مجھ سے اُن کے سامنے بولا ہی نہیں جاتا۔"

"- وہ تم سے بہت سی باتیں کرنے کے آرزومند ہوں گے۔"

"- ہو سکتا ہے لیکن زرّیں! مجھے.... مجھے اُن سے ڈر لگتا ہے۔" وہ کھِلکھلا کے ہنس پڑی۔ کمرے میں جیسے ستارے جھنجھنا گئے۔

"- میں تم سے بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"- تمھیں تو شاید مجھ سے بھی ڈر لگتا ہے۔" وہ دھیمے لہجے میں بولی۔

"- ہاں زرّیں!" میری آواز ڈوب گئی۔ "شاید تم ٹھیک کہتی ہو۔"

"- یا شاید تم اپنے آپ سے ہی اتنی باتیں کر لیتے ہو کہ پھر کسی اور سے کچھ کہنے سننے کو دل نہیں کرتا ہوگا۔"

میں اُس کی صورت دیکھنے لگا اور میرا جی چاہا کہ اپنا منہ کھسوٹ لوں۔ آتے ہوئے میں سوچ رہا تھا، اب کے زرّیں سے ڈھیر سی باتیں کروں گا۔ اُس سے کچھ نہیں چھپاؤں گا۔ زرّیں اپنے دل میں سمجھتی ہوگی کہ میں اُس پہ اعتبار نہیں کرتا یا اُسے دُور سمجھتا ہوں۔ ہر بار فیض آباد آتے وقت میں ایسا ہی سوچتا تھا اور ہر بار میری زبان پہ فالج سا گر جاتا تھا۔ "زرّیں! تم، تم نہ جانے کیا سوچتی ہوگی، میں جانتا ہوں، اچھی طرح جانتا ہوں۔" میں نے جذباتی انداز میں کہا۔

"- تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟" وہ سراسیمگی سے بولی۔

"- میں ٹھیک ہی کہہ رہا ہوں، میں تمھیں کیا بتاؤں زرّیں۔"

"میں سمجھتی ہوں۔" اُس نے مجھے کچھ کہنے نہیں دیا۔
"کیا سمجھتی ہو؟"
"مایوسی گناہ ہے۔ ایک دن ضرور ایسا آئے گا۔" وہ دُکھ سے بولی۔ "جب تم اپنا کہہ سکو گے۔"
"شاید کبھی نہ آئے۔" میں نے شکستہ لہجے میں کہا۔
"اللہ میاں نے چاہا تو ضرور آئے گا۔"
"کوئی اس کے سوا کہہ بھی کیا سکتا ہے۔"
"ابا جان کے مل جانے کے بعد ایسی بات نہیں کرنی چاہیے۔"
"شاید میں بہت تھک گیا ہوں زرّیں۔" میں نے رُندھی ہوئی آواز میں کہا۔ "اب میرا دل کچھ اور چاہتا ہے۔"
"کیا چاہتا ہے؟"
"مر جانے کو چاہتا ہے۔ مجھے سنکھیا دے دو۔"
"تم نے پھر ایسی باتیں شروع کر دیں۔" وہ بے چینی سے بولی۔
"میں سب کو بہت دُکھ دیتا ہوں۔ تم سمجھتی ہو مجھے اس کا احساس نہیں ہے۔ میری وجہ سے کتنے لوگ پریشان رہتے ہیں، مر تک جاتے ہیں۔"
"مرنا تو سب کو ایک دن ہے۔ جس کا وقت آئے گا اُسے کون روکے گا۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو کسی کے لیے مر تک جاتے ہیں۔"
"جو چلے گئے، لو اور آدمی خود کو کس طرح تسلی دے۔"
"تم ہی تو دوسروں کے لیے خود کو داؤ پر لگا دیتے ہو۔ جو دوسرے بھی تو تمھیں تنگ کرتے ہیں وہ نہیں سوچتے ہوں گے کہ مر جائیں تو شاید تمھیں کچھ سکون مل جائے، تمھارا بوجھ کچھ کم ہو جائے۔"
"زرّیں!" میری آواز حلق میں پھنس گئی۔
"سبھی تمھارے لیے دعائیں کرتے ہیں۔" وہ ڈگمگاتے ہوئے لہجے میں بولی۔
"لیکن میں تو کسی کے لیے کچھ بھی نہیں کرتا۔ میں نے تمھارے لیے کیا کیا ہے۔ میرا جی تمھارے لیے بہت کچھ کرنے کو چاہتا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ تم ہر وقت خوش رہو۔ مجھے معلوم نہیں کہ تم یہاں کس طرح رہتی ہو۔ تمھیں میرا اتنا خیال ہے۔ زرّیں! تم مجھے بہت یاد آتی تھیں۔ کاش! کاش میں ہمیشہ تمھارے پاس رہتا اور تمھارے ماتھے پر ایک شکن بھی نہ آنے دیتا۔ میں تمھارے لیے..... میں نہ جانے کیا کیا کہہ گیا تھا۔ کسی کی بڑی بڑی آنکھیں دیکھ کے میری زبان ٹھٹھر گئی۔ اُس کے ہونٹ تھرتھرا رہے تھے۔
میں پلنگ سے اٹھ کے بے اختیار اُس کے پاس پہنچ گیا اور میں نے اُس کے شانے تھام کے اُسے اٹھا لیا۔ زرّیں کو چکّر سا آ گیا تھا۔ میرے ہاتھ بھی کپکپانے لگے تھے۔ میں نے اُسے جلدی سے پھر کرسی پر بٹھا دیا۔ اُس کا سینہ دھڑک رہا تھا۔ میں فرش پر اُس کے پیروں کے نزدیک بیٹھ کے ہانپنے لگا اور پتہ نہیں مجھے کیا ہوا۔ میرا سر اُس کے پیروں پر جھک گیا۔ میں اُس کے پیروں پر اپنا سر رکھ کے رونا چاہتا تھا کہ اُس نے پاؤں کھینچ لیے اور کرسی سے اٹھ کے خود بھی میرے مقابل فرش پر بیٹھ گئی اور گھٹنوں میں منہ چھپا کے سسکنے لگی۔ میں جھجھکتے جھجھکتے تکتا رہا۔ میرا سارا جسم بے جان سا ہو گیا تھا۔ بے شمار لمحے گزر گئے ہوں گے۔ زرّیں کو دیکھنے کوئی بھی اس طرف آ سکتا تھا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ "مت رو زرّیں! خدا کے لیے مت رو۔" میں نے بہ دقت کہا۔
"تمھیں رُلانا مقصود نہیں تھا۔ میں تو تمھیں بتانا چاہتا تھا کہ تم..... تم کہیں..... کہیں مجھے....."
"کچھ مت کہو۔ مجھے معلوم ہے۔" وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔
"میں نے سوچا ہے صرف ایک بار اور جاؤں گا، پھر نہیں آؤں گا۔"
"خدا نے چاہا تو تمھیں پھر جانے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی انشاء اللہ۔ اگر خدانخواستہ تم یونہی واپس آ گئے تو میں تم سے دوبارہ جانے کو کہوں گی۔ کیا اس سے بڑا کوئی اور مقصد ہو سکتا ہے؟"
"زرّیں! آخر تم کتنی..... " میرے ہونٹ بھینچ کے رہ گئے۔
"کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟" وہ سادگی سے بولی۔
"تم ٹھیک کہتی ہو مگر زمین بہت بڑی ہے۔"
"آدمی کا حوصلہ زمین سے بڑا ہوتا ہے۔ کاش میں بھی تمھارے ساتھ چلتی۔"
"ضرور لے چلتا۔ تمھیں اندازہ نہیں کہ کہاں کہاں جانا پڑتا ہے۔ گلیوں میں، بازاروں میں، کیسے کیسے محل کوچوں میں۔ کبھی اِس دروازے کبھی اُس دروازے۔ صبح یہاں شام وہاں۔ بے منزل۔"
"مجھے اندازہ ہے لیکن جلدی جلدی گھر تو واپس آ سکتے ہو۔"
"ہر بار یہ خیال آتا ہے کہ یہاں تک آ گئے ہیں تو اور آگے دیکھ لیں۔ اسی میں وقت گزر جاتا ہے۔ کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔"
وہ اپنی گونجتی، کھنکتی آواز میں مجھے تسلیاں دیتی رہی۔ میری خاموشی پر اُس نے موضوع بدل دیا اور خانم، نیساں، زہرہ وغیرہ کی باتیں کرنے لگی۔ اس طرح کبھی اُس نے مجھ سے اتنی باتیں نہیں کی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی مینا چہچہا رہی تھی۔ مجھے یہ سب عجیب سا لگ رہا تھا۔ وہ مائیوں میں بیٹھی دلھن کے مانند سمٹی بیٹھی تھی اور اُس کی پلکیں پٹ پٹ جھپک رہی تھیں۔ گھڑی نے دو بجائے تو وہ چونک اٹھی۔ "میں اب جاتی ہوں۔"

"کچھ دیر اور بیٹھو۔"
"بابا کی دوائی کا وقت ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے ٹھیک چھ چھ گھنٹے بعد انھیں گولیاں دیتے رہنا چاہیے۔ تواتر میں فرق نہیں آنا چاہیے۔"
"میں تمھیں پہنچا آتا ہوں۔"
"اب تم آرام کرو۔ رات بہت ہو گئی ہے۔"
"رات تمھارے لیے نہیں ہوئی؟"
"مجھے دن میں کون سا کام ہوتا ہے۔"
"اور میں تو یہاں دن بھر پھاوڑا چلاتا رہتا ہوں۔"
اُس نے مسکراتی، جھلملاتی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور دروازے تک جاتے جاتے بولی۔ "دودھ پی لینا۔"
دالان میں چاندنی چٹک رہی تھی اور خنک ہوا چل رہی تھی۔ دالان کے سرے تک وہ میرے ساتھ چلتی رہی۔ سامنے کمرے بند تھے۔ میں نے سوچا کہیں تجمل کو دوا پلا کے پھر واپس آ جائے۔ مجھے بہت سی باتیں یاد آ رہی تھیں اور نیند بھی نہیں آ رہی تھی۔ تجمل کے کمرے کے دروازے پر اُس نے ہلکی سی تھپکی دی اور پلٹ کے مجھے سرگوشی میں شب بخیر کہتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔
صبح ناشتے کے بعد ہم سب تجمل کے پاس چوکی پر بیٹھے تھے۔ تجمل نے اپنا پیر کھول رکھا تھا اور دادا بابا کو دکھا رہا تھا۔ زخم بھر گیا تھا۔ اتفاق سے اس وقت مردانے میں پیرو، زورا ور، ابا جان اور میرے سوا کوئی نہیں تھا۔ چار دن کی چھٹی کے بعد ارشد جہاں گیر کو پڑھانے کے لیے لائبریری میں چلا گیا تھا۔ بشیر علی بھی تھوڑی دیر پہلے کسی کام سے اٹھ کے اندر چلے گئے تھے۔ تجمل نے ابا جان سے کہا۔ "آپ آپ چلے جاؤ بابا!" وہ اپنا پیر ٹھونکتے گئے۔ "ابھی ادھر دیکھو! سب ٹھیک ہے۔ بٹیا چلنے دیتی تو میں بھی آپ کے ساتھ ہو جاتا۔ پر پیرو دادا تو ساتھ ہے۔"
میرے کان کھڑے ہو گئے۔
"ان کا ایسے چھوٹنے کوئی نہیں بولتا۔" پیرو نے آہستگی سے کہا۔ "بمبئی سے نکلے ہوئے دن ہو گئے دادا! وہ تھوڑا سا ابھی بھی سوکھ گیا ہوگا۔ گیتا اور لاٹی بھی دروازہ دیکھتی ہوں گی۔"
"ایسا تو اپن بھی سوچتا ہے تجمل بھائی۔"
"پھر آ جانا۔"
"ٹھیک ہے جیسا تم بولتا ہے۔"
"لیکن مجھے بھی آپ لوگوں سے کچھ کہنا تھا۔" ابا جان کسمساتے ہوئے بولے۔
"بولو بابا!" پیرو نے اضطراب سے کہا۔
"مناسب لفظ نہیں مل رہے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کس طرح کہنا چاہیے۔"
ابا جان کی زبان اٹک رہی تھی۔ "یہاں وہ سب لوگ وغیرہ بھی موجود نہیں ہیں لیکن بہرحال آپ تو ہیں۔ میرے لیے کچھ اور مت سمجھیے۔ میری درخواست ہے کہ....."
"بولو بابا! ایسی کیا بات ہے۔" تجمل تردّد سے بولا۔
"میری خواہش ہے کہ آپ....." ابا جان کہتے کہتے رک گئے۔ "میری خوشی اسی میں ہوگی اگر آپ....." چند لمحوں کے توقف سے وہ دھیمی آواز میں بولے۔ "اگر ان چیزوں میں بھی شریک ہوں۔"
"ہیں ہیں بڑے صاحب!" تجمل کا تو منہ مرجھا سا گیا۔ "دادا! سنتے ہو بابا کیا بول رہے ہیں۔"
"سنتا ہے تجمل بھائی!"
ابا جان کے چہرے پر سرخی چھا گئی۔ "آپ نے اتنا کام میرے لیے کیا۔ یہ پتھر رہیں گے۔ یہ بہت ہیں۔ پشتوں ہم کھائیں گے اور ختم نہیں ہوں گے۔ میں انھیں رکھ کے کیا کروں گا؟ میں اکیلا انھیں اتنی بڑی تعداد میں لا بھی نہیں سکتا تھا۔ یہ سب آپ....."
"رہنے دو بابا!" تجمل نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ابھی بس کرو۔"
"انکار کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آتی۔"
"نہیں آئے گی بابا! نہیں آئے گی۔"
"آخر آپ کو عذر کیوں ہے؟"
"ابھی کیا بولیں بابا!" تجمل نے ہنس کے کہا اور پیرو ذرا کھل کے بولا۔ "اپنے کو اِس کے کی لت پڑ گئی ہے۔ یہی اپنا دھندا ہے۔"
ابا جان متذبذب نظروں سے تجمل کا چہرہ دیکھتے رہ گئے۔
"ہم لوگ تو آپ کو دیکھنے گیا تھا بابا! گیتا کی قسم لے لو، اپنے من میں کوئی پیسے کا جگہ نہیں تھا۔"
"مجھے علم ہے لیکن کیا یہ اچھا نہیں ہوگا کہ ہم سبھی اس میں شریک ہوں کیونکہ سب اس میں برابر کے شریک رہے ہیں۔ شاید وہیں میں نے آپ سے کہا تھا کہ مجھے اُن سے زیادہ اپنے لڑکے کو ڈھونڈنے کی جستجو تھی مگر جستجو بھی کسی سبب سے تھی۔ بے شک سب سے بڑا سبب یہی سب کچھ تھا لیکن یقین کیجیے میرے دماغ میں اتنا کچھ نہیں تھا۔ میری استطاعت تھی کہ میں اتنا کچھ لا سکوں۔ یہ دُنیا کے بیش قیمت نوادر ہیں۔ مجھے تھوڑی بہت شدبد ہے مگر اس کی صحیح قیمت کا اندازہ کرنا میرے لیے بھی مشکل ہے۔ اس سے ہم نئی زندگی شروع کر سکتے ہیں اور اسے استعمال کرنے کا، میں جہاں تک سمجھتا ہوں، ہمیں پورا حق پہنچتا ہے۔ جس چیز کی طرف آپ اشارہ کر رہے ہیں وہیں اُس

ہیں اس کی کارفرمائی کا بھی دخل ہے۔ نہیں ہے کیا؟ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں یہ سب سمیٹ کے خوش رہ سکوں گا؟ مجھے سکون مل جائے گا؟"

"ابھی آپ ایسا کیوں سوچتے ہو۔ آپ کے پاس ہے تو اپنے پاس ہے۔ ادھر سب آپ کے لاڈلے بچے ہیں، ضرورت ہوئے گی تو آپ ہی کے در پہ آئیں گے، اپنے بابا کے پاس۔"

ابا جان اصرار کرتے رہے۔ مارتی اور زورا بھی شد و مد سے بیچ میں بولنے لگے تھے۔ انھوں نے ابا جان کی کوئی بات نہیں سنی۔ کہنے لگے "سمجھ لیجیے، ہمارا حصہ آپ کے پاس امانت ہے۔" طرح طرح کی دلیلیں دے کے انھیں خاموش کر دیا۔ میں چپ چاپ سنتا رہا۔

اسی دن کچھ دیر بعد ہی ابا جان، میں اور پیرو تہہ خانے میں داخل ہوئے۔ پیرو اور میں نے بکسے کھولے۔ ابا جان نے جھولی پر جانچ کے دس پندرہ پتھر الگ کر لیے اور اسی دن سہ پہر کو ہم تینوں لکھنؤ روانہ ہو گئے۔ وہاں حضرت گنج کے علاقے میں واقع کارلٹن ہوٹل میں ٹھہرے۔ یہ لکھنؤ کا سب سے بڑا ہوٹل تھا۔ شام کو ہم پہنچے تھے اور شام ہی کو میں اور پیرو صرافے کی طرف نکل گئے۔ رات تک جوہریوں کی آمد کا سلسلہ بندھا رہا۔ دوسرے دن صبح ان کے ساتھ چند نواب بھی آئے۔ تیسرے دن رات کو ہم واپس فیض آباد پہنچے تو تینوں کی بنڈلیوں میں ڈھائی لاکھ روپے موجود تھے۔ ابا جان کو بہت جلدی تھی۔ سودے بازی کرتے تو شاید تین لاکھ تک رقم ہو جاتی۔ چلتے وقت انھوں نے لکھنؤ سے سب گھر والوں کے لیے بہت سی چیزیں خریدیں۔ سب کے لیے سونے کی چوڑیاں، کپڑے، جوتیاں، پھل اور مٹھائیاں۔ کچھ رقم رکھ کے باقی سب انھوں نے شیر علی کے پاس جمع کرا دی۔ شیر علی بھی نوٹوں کی اتنی گڈیاں دیکھ کے حیرت زدہ رہ گئے۔

راستے میں ان کی اور پیرو کی باتوں سے مجھے پتہ چل گیا تھا کہ وہ فرخ، فریال، نادرہ اور اکبر کو بمبئی میں اپنے دوست مولوی محمد اکرم کے ہاں ٹھہرا آئے ہیں۔ مولوی محمد اکرم سے میں بھی ملا تھا۔ وہ نہایت شریف آدمی تھے۔ یقیناً ابا جان کی نظر میں ان سب کی حفاظت کے لیے اس سے بہتر کوئی جگہ نہیں ہوگی لیکن انھیں گھر سے نکلے ہوئے سال سے کم کیا لگا ہوگا۔ چھ مہینے تو بمبئی کو ہو گئے تھے۔ ہم پہنچے تھے تو وہ وہاں موجود تھے۔ جنگجوؤں کے طور طریق سیکھنے، کسی قافلے کے ساتھ جانے، تبت تک کے سفر، سونا اور خزانے والے شہر تک رسائی حاصل کرنے میں انھیں سال سے زیادہ کا عرصہ بھی لگ سکتا ہے۔ جب سے میں نے یہ سنا تھا

اس کے باوجود کہ میں مولوی اکرام کے گھر جا چکا تھا میرا دل بہت گھبرا رہا تھا۔ میں یہ کیسے بھول سکتا تھا کہ فتنی اسی علاقے سے گھر سے باہر نکلی تھی۔ مولوی اکرم کے رہن سہن سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بس عزت سے اپنی زندگی گزار رہے ہیں۔ ابا جان نے چلتے ہوئے انھیں کوئی بڑی رقم دی ہوگی۔ میں جلد سے جلد بمبئی جانا چاہتا تھا، چاہے ابا جان ابھی جانے کا ارادہ نہ کریں۔ مگر ابا جان نے دوسرے ہی دن صبح بمبئی جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ زرین، خانم، نیساں اور زہرہ نے سفر کی تیاری شروع کر دی تھی۔ جہانگیر بھی جانے ساتھ جانے کے لیے مچل رہا تھا، خانم کے کہنے پہ چپ ہو گیا۔ صرف ایک رات درمیان میں تھی مگر مجھ سے یہ رات کاٹے نہ کٹتی تھی۔ رات کے کھانے کے وقت ہم گھر پہنچ گئے تھے، مجھ سے کھانا بھی نہیں کھایا گیا۔ فرخ، فریال، نادرہ اور اکبر کے چہرے نظروں میں گھوم رہے تھے۔ اب وہ بہت بڑے ہو گئے ہوں گے۔ مجھے شاید پہچان بھی نہ پائیں۔ کاش میں ابا جان اور پیرو کے درمیان ریل میں ان سب کے متعلق ہونے والی باتیں نہ سن پاتا، اسی لیے میں ابا جان سے نہیں پوچھتا تھا۔

کھانے کے بعد خانم میرے قریب آ کے چپکے سے بولی۔
"بابر میاں! مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔"
"کیا بات ہے آپی؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔
"تم میرے کمرے میں آ جانا۔ ویسے کوئی خاص بات نہیں ہے۔"
"پھر بھی کچھ تو بتائیے؟"
"پریشانی والی بات ہے۔ شاید میں تم سے ابھی نہ کہتی مگر تم جا رہے ہو اس لیے تمھیں بتا دینا ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔"
میرے جسم میں سوئیاں سی چبھنے لگیں۔
رات گئے تک خانم کو فرصت نہیں ملی۔ میں کئی بار اس کے کمرے کی طرف گیا لیکن وہاں کوئی نہ کوئی بیٹھا ہوتا تھا۔ ضرور ایسی کوئی بات تھی جو خانم صرف مجھی سے کرنا چاہتی تھی۔ جب تک میں خانم کے کمرے میں نہیں گیا، مجھے وحشت ہوتی رہی۔ "میں نے تمھیں پریشان کر دیا۔" خانم مجھے دیکھتے ہی بولی۔
"میں نے کہا تھا ایسی کوئی خاص بات نہیں ہے۔ تم کھڑے کیوں ہو، اطمینان سے بیٹھو۔"
میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔
"بات یہ ہے کہ ابھی کوئی دو ہفتے ہوئے، بابا نے مجھ سے ایک مشورہ لیا تھا۔" خانم رازدارانہ انداز میں بولی۔
"کیسا مشورہ؟"
"انھوں نے زرین کا ذکر کیا تھا، کہنے لگے تجھے، میری خواہش

ہے کہ زرین کو اپنی بہو بنا لوں، ویسے وہ مجھے زہرہ ہی کی طرح عزیز ہے۔ میں تم سے مشورہ کر رہا ہوں، بات نہیں ٹھہرا رہا۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ بہت نازک معاملے ہوتے ہیں اور پھر ایک گھر میں رہنے سے تو اور بھی زیادہ نازک۔ وہ تنویر علی کی طرف اشارہ کر رہے تھے اور انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ میں چاہتا ہوں زرین گھر سے کہیں اور نہ جائے، البتہ جب تک میری طرف سے اشارہ نہیں ملے گا وہ اپنی تمنا کبھی زبان پہ نہیں لائیں گے اور اگر میری طرف سے انھیں کوئی امید افزا جواب نہ ملا تو وہ اس کا بالکل برا نہیں مانیں گے۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ انھوں نے بھی دوبارہ اشارۃً کنایۃً بھی مجھ سے نہیں پوچھا۔ میں نے تمھیں یہ سب اس لیے بتایا ہے کہ تم سے مشورہ کروں؟"
"آپی، میرا مشورہ، میں..." میں نے ہنستے ہوئے کہا۔
"میں نے کسی سے اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔ تنویر واقعی لڑکا ہے، سب کا دیکھا بھالا ہے۔ میں نے سوچا تم سے ذکر کر دوں۔"
"میں، میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ آپ، فیصل بھائی اور خود زرین سے پوچھ لیجیے۔" میری آواز بھرّانے لگی تھی۔
"مجھ سے پوچھا نہیں جاتا بابر میاں!"
"پھر، پھر میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"
"تم نے سنا ہوگا کہ لڑکیاں گھروں میں آگ بیری کی طرح ہوتی ہیں، پتھر تو آئیں گے اور یہ کوئی فخر نہیں۔ اسی طرح رشتے ہوتے ہیں۔ لڑکیوں بالیوں کو دیر تک گھر میں بٹھانا اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ کبھی نہ کبھی تو ہم سب کو اس مسئلے پہ غور کرنا ہوگا۔"
مجھ سے کوئی جواب نہ دیا جا سکا۔
"تم سوچ لو۔ بابا کو کہے ہوئے دو ہفتے سے زیادہ ہو رہے ہیں۔ انھوں نے لوٹ کے نہیں پوچھا۔ وہ بہت سمجھ بوجھ کے آدمی ہیں۔ دوبارہ نہیں کہیں گے لیکن بالفرض انھوں نے پھر ذکر چھیڑ دیا تو میں کیا جواب دوں؟"
"آپ جو مناسب سمجھیں کہہ دیجیے گا۔"
"میری تو عقل کام نہیں کرتی۔"
"مجھ سے کچھ مت پوچھیے۔ میں کیا بتا سکتا ہوں۔"
"زرین کا تمھارے سوا کون ہے۔"
"آپ مجھ سے زیادہ بہتر سمجھ سکتی ہیں۔"
"مگر تم نے اس بارے میں کبھی غور تو کیا ہوگا؟"
"شاید کبھی نہیں۔"
"تمھاری رائے ہو تو میں بابا (فیصل) سے ذکر کروں۔"
"آپ کرنا چاہیں تو پہلے زرین سے پوچھ لیجیے۔" میں نے یوں ہی کہہ دیا۔
"زرین بے چاری کیا کہے گی۔"
"تو پھر جیسا آپ کا جی چاہے۔"
"تم بھی کچھ بتاؤ، تمھاری کیا رائے ہے۔ آگے بات کروں یا چپ رہوں؟ ضروری نہیں کہ تم فوراً جواب دو۔ میں سمجھتی ہوں انھوں نے باقاعدہ بات نہیں کی ہے، محض اپنی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ ان کی جگہ میں ہوتی تو میں بھی یہی کرتی۔ زرین ہے ہی اتنی اچھی، ہر کوئی اسے اپنے گھر کی دلہن بنانا چاہے گا۔"
نیساں دھمکتی ہوئی کمرے میں اچانک داخل ہوئی تو خانم چپ ہو گئی۔ میرا دم گھٹ رہا تھا۔ نیساں نہ آتی تو نہ جانے کب تک مجھے خانم کی یہ اجنبی اجنبی باتیں سننی پڑتیں۔ خانم سے کچھ کہے بغیر میں نیساں ہی کے ساتھ کمرے سے باہر نکل آیا۔ "آپ یہاں چھپے بیٹھے تھے۔ ہم نے حویلی کا کونا کونا چھان لیا۔" نیساں ہنستے ہوئے بولی اور میری انگلی پکڑے پکڑے ایک طرف چل پڑی۔ سچ پوچھو تو مجھے اس وقت کچھ جھنجھلاہٹ آیا۔ جب میں نے اپنے سامنے زہرہ کو کھڑے دیکھا۔ زہرہ جیسے میرے ہی انتظار میں کھڑی تھی۔ مجھے دیکھ کے اس کا چہرہ کھلنے لگا۔ "لائیے زہرہ آپا!" نیساں شرارت سے بولی۔ "بابر بھائی آپ ذرا آنکھیں تو بند کیجیے۔ بند کیجیے۔" میں نے آنکھیں بند کر لیں اور دوبارہ نیساں کے حکم پہ کھولیں تو وہ میرے سامنے ایک سوئٹر لہرا رہی تھی۔ "بتائیے کیسا ہے؟"
"اچھا ہے، بہت اچھا..."
"رنگ پسند ہے آپ کو؟"
"ہاں سب کچھ پسند ہے۔"
"زہرہ آپا نے اپنے ہاتھوں سے بنا ہے۔ ذرا آپ اسے پہن کے دکھائیے۔" وہ مچلتے ہوئے بولی۔ میں نے اس سے بحث نہیں کی ورنہ وہ ضد کرنے لگتی۔ اس نے پیچھے سے اور کندھوں سے سوئٹر کھینچ کے درست کیا اور گھوم گھوم کے جائزہ لینے لگی۔ "بس بابر بھائی! آپ اس میں کتنے اچھے لگ رہے ہیں۔" وہ جوش میں بولی۔ "ایک رتی کم نہ زیادہ، بالکل ناپ تول کا آیا ہے۔ معلوم ہے، زہرہ آپا نے صرف اندازے سے بنایا ہے۔"
میں نے زہرہ کو ایک نظر دیکھا۔ وہ سر جھکائے انگلیاں چٹخا رہی تھی اور ہونٹ کاٹ رہی تھی۔ میں اس کا شکریہ بھی ادا نہیں کر سکا۔ "زہرہ آپا کہتی ہیں کہ آپ ان لوگوں کو لے کے جلدی آئیے گا۔ سب انھیں دیکھنے کے لیے بے چین ہیں۔" نیساں تیز تیز لہجے میں بولی۔ میں نے اس سے یہ بھی نہیں کہا کہ تم زہرہ خود کیوں نہیں بولتی، وہ گونگی تو نہیں ہے۔ نیساں کو شاید احساس

ہو گیا کہ میں اُس کی باتیں توجہ سے نہیں سُن رہا ہوں۔ اُس کا چہرہ بجھنے لگا وہ زرد کے اشتیاق آنکھوں سے مجھے تکنے لگی۔ وہ پریشان سی ہو گئی تھی۔ میری طبیعت پوچھنے لگی۔ میں نے اُس کی پیشانی کو بوسہ دیا، اُس کے ہاتھ چومے اور اس سے پہلے کہ اُس کی تشنہ آنکھیں چھلکنے لگتیں، میں منہ پھیر کے چلا آیا اور اپنے کمرے میں آ کے میں نے دروازہ بند کر لیا۔ مجھے اپنا جسم خالی خالی سا لگ رہا تھا۔ کھوکھلا، راکھ کا ڈھیر۔ ساری رات میں دیواروں پر روشنی کے لرزتے سائے دیکھتا رہا۔ کسی نے دروازے پر دستک دی تو پہلی دستک پر میں نے اُٹھ کے دروازہ کھول دیا۔ میں سمجھا شاید زرین ہو گی مگر وہ مہمان گیر تھا اور یہ بتانے آیا تھا کہ اب مجھے تیار ہو جانا چاہیے۔ میں نے چونک کر اُسے دیکھا۔ بالکل دھیان نہیں رہا تھا کہ صبح ہمیں یہاں سے روانہ ہو جانا ہے۔

گاڑی صبح چھ بجے جاتی تھی۔

ہم ٹھیک ساڑھے چار بجے حویلی سے نکل گئے تھے۔ رات کو شاید کوئی نہیں سو پایا تھا۔ منیر علی، ارشد، جہانگیر، محمود اور دوسرے کے دوسرے لوگ ہمیں اسٹیشن تک رخصت کرنے آئے تھے۔ گاڑی وقت پر روانہ ہوئی۔ ہمیں ایک ڈبّا خالی مل گیا تھا۔ فیصل کی ہدایت پر ہیرو نے فرسٹ کلاس ہی کے ٹکٹ لیے تھے۔ نشستیں بہت آرام دہ تھیں۔ کچھ دیر تک وہ سب باتیں کرتے رہے پھر برتھوں پر لیٹ گئے۔ لکھنؤ اسٹیشن گزر گیا اور بہت جلد آ گیا تو مجھے سمت کا اندازہ ہوا۔ لکھنؤ سے براہِ راست بمبئی جانے کے بجائے ہم دلّی کی طرف جا رہے تھے گویا دلّی سے پھر ہمیں بمبئی جانے والی گاڑی میں بیٹھنا تھا۔ اسٹیشن پر اسٹیشن گزرتے رہے۔ بریلی اسٹیشن پر مارتی نے ٹفن کھول دیے۔ سب یہ دیکھ کے ہنسنے لگے کہ زرین نے اتنا بہت سا کھانا ساتھ کر دیا ہے۔ میں بھی دسترخوان پر بیٹھ گیا اور آخر تک اُن کا ساتھ دیتا رہا۔ یہ بریلی اسٹیشن تھا۔ بریلی سے مُراد آباد صرف باون میل کی دوری پر واقع ہے۔ درمیان میں رام پور کا شہر آئے گا، پھر مُراد آباد۔ مُراد آباد کی طرف سے گزرنے کے خیال سے میرے ذہن میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ اتنے دن گزر گئے تھے جب میرے منیر علی کو لے کے ہم سیدھے فیض آباد چلے آئے تھے۔ اس کے بعد تبت کی طرف روانہ ہو گئے۔ مولوی صاحب کہیں اس عرصے میں اپنے شہر واپس نہ آ گئے ہوں؟ انھیں کہیں عافیت نہ ملی ہو تو آخر انھوں نے گھر جانے کا فیصلہ کر لیا ہو۔ گاڑی بریلی سے چل چکی تھی۔ جیسے جیسے مُراد آباد قریب آتا جا رہا تھا، میرا گمان جڑ پکڑتا جا رہا تھا۔ ایک نظر دیکھ لینے میں کیا حرج ہے۔ کتنا فرق پڑے گا۔ زیادہ سے زیادہ چند گھنٹوں

کا۔ مگر میں آپاجان سے کس طرح کہہ سکتا تھا کہ ایک پہر کے لیے مُراد آباد رُک جائیے۔ یوں بھی ہمیں شام کو دلّی پہنچ کے رات کے ۸ بجے تک بمبئی کی گاڑی کا انتظار کرنا تھا اور صبح کو نہیں شام کو ہم بمبئی پہنچیں تو کون سا گھاٹا ہو جائے گا۔ بعد میں پھر کب اس طرف آنا ہو۔ میں سوچتا رہا کہ ان سے کس طرح کہوں۔ وہ کیا کہنے لگیں گے۔ گاڑی تیز رفتاری سے مُراد آباد کی سمت بڑھ رہی تھی۔ میری بے چینی بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ کھانے کے بعد آپاجان نے سامنے کی برتھ پر لیٹ کے آنکھیں موند لیں تو مجھے ایک خیال آیا۔ میں نے ہیرو کو جھنجھوڑا۔ "دادا! میری ایک بات مانو گے؟" میں نے اس سے سرگوشی میں التجا کی۔

"بول جانی!" وہ تعجب سے بولا۔ "کوئی گڑبڑ ہے؟"

"گڑبڑ وڑبڑ کچھ نہیں۔ تم آپاجان سے کوئی بہانہ کر کے کچھ دیر کے لیے مُراد آباد رُک جاؤ تو تمھارا بڑا احسان ہو گا۔ اُنھیں مت بتانا کہ میں نے کہا ہے۔ مجھے وہاں بس تھوڑی دیر لگے گی۔ شام کو مُراد آباد سے ایک گاڑی پانچ بجے کے قریب دلّی جاتی ہے۔ اس سے بھی بمبئی کی گاڑی کا میل بنتا ہے۔ سفر میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ دادا! آپاجان کو تم کسی طرح سمجھا دو۔"

ہیرو نے ایک دو لمحے کے لیے سوچا اور عجیب سی نظروں سے میری صورت دیکھتے ہوئے سر ہلانے لگا۔ وہ آپاجان کے پاس جانے کے لیے اُٹھ گیا تو میں رُخ بدل کے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ معلوم نہیں ہیرو نے آپاجان سے کیا کہا۔ مجھے تبھی پتا چلا جب اُس نے اُوپر کی برتھوں پر لیٹے ہوئے مارتی اور زورا سے نیچے آ کے سامان سمیٹنے کو کہا۔

رام پور اسٹیشن سے مُراد آباد کا فاصلہ صرف سولہ میل تھا۔ آدھے گھنٹے میں گاڑی پہنچ جاتی تھی مگر آدھا گھنٹا جیسے پھیل گیا تھا۔ کٹ گھر کے اسٹیشن سے پہلے رام گنگا کے پل پر گاڑی ٹھیر گئی۔ دریا میں پانی زیادہ تھا۔ جب تک پل صاف نہیں ہو گیا، گاڑی کھڑی رہی پھر گھسٹ گھسٹ کے چلنے لگی۔ میں اکیلا ہوتا تو کٹ گھر پر ہی اُتر جاتا۔ یہاں سے مولوی صاحب کا محلّہ فیض گنج زیادہ قریب تھا۔ تانگہ دس منٹ میں مجھے اُن کے محلّے پہنچا دیتا۔ میری مالا کے دانے سینے میں چبھ رہے تھے اور میرا رواں رواں کانپ رہا تھا۔ کیا عجب کہ زرین کی بات سچ ہی ہو جائے۔

دس منٹ کی تاخیر سے گاڑی مُراد آباد کے اسٹیشن میں داخل ہوئی۔ اسٹیشن کے سامنے ہی اسلامیہ مسافر خانہ تھا۔ میں وہاں پہلے بھی جا چکا تھا۔ ہمارے پاس سامان زیادہ نہیں تھا۔ ایک ہی

قلی نے اُسے مسافر خانے تک پہنچا دیا۔ مسافر خانے کے منتظم کو سب صوفی جی کہتے تھے۔ رجسٹر پر انھوں نے ہمارے ناموں کا اندراج کیا۔ ہیرو، زورا اور مارتی کے نام ہم نے بدل دیے۔ خواہ مخواہ وہ چونکتے۔ اُوپر کی منزل کے ایک روشن اور صاف ستھرے کمرے میں آپاجان، زورا اور مارتی کو ٹھیرا کے میں اور ہیرو فوراً مسافر خانے سے نکل آئے۔ اڈّا تانگے پر بیٹھ کے فیض گنج جا کے ہی رُکے پھر مولوی صاحب کے مکان کی گلی میں پہنچنے میں ہمیں دو چار منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ میں نے دھڑکتے ہاتھوں سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے کسی لڑکی کی آواز آئی۔ میرا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ "کیا مولوی محمد شفیق صاحب یہیں رہتے ہیں؟" میں نے ڈگمگاتی آواز میں پوچھا۔

"وہ۔۔۔" یہ سنتے ہی میرا دل ڈوبنے لگا۔ "مولوی محمد شفیق صاحب۔" اُس نے کواڑ کی آڑ میں کھڑے ہو کے تذبذب سے دہرایا۔ "اب وہ یہاں نہیں رہتے۔ ہم نے یہ مکان اُن سے خرید لیا ہے۔"

"آپ نے خرید لیا ہے؟ کب؟"

"ڈیڑھ مہینے سے زیادہ نہیں ہوا۔"

"کیا وہ یہاں آئے تھے؟"

"جی ہاں! اُنھی سے ہم نے لیا ہے۔"

"آپ کے گھر میں اس وقت کوئی مرد نہیں ہے؟"

"بھائی سو رہے ہیں۔"

"کب تک اُٹھ جائیں گے؟"

"آپ ابا جی کی دکان پر چلے جائیے۔ منڈی چوک میں اُن کی بساط خانے کی دکان ہے۔"

"کس نام سے؟"

وہ جھجک کے بولی۔ "حافظ صاحب کی دکان کسی سے پوچھ لیجیے گا۔"

"آپ کا بہت شکریہ۔"

"آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟"

"ہم پردیسی ہیں۔ مولوی شفیق صاحب کے واقف کار۔"

منڈی چوک بھی دُور نہیں تھا۔ حافظ صاحب کی دکان تلاش کرنے میں ہمیں دیر نہیں لگی۔ دکان پر ایک پستہ قد شخص بیٹھا ہوا تھا۔ بھری بھری خشخشی داڑھی، سرخی رنگ، سر پر بید کی ٹوپی۔ مولوی صاحب کا نام سن کے وہ گھبرا سا گیا۔ "سنا ہے آپ ہی نے اُن کا مکان خریدا ہے؟"

"جی ہاں، ابھی حال ہی میں خریدا ہے۔" وہ کسی قدر ترشی سے بولا۔

"تو کیا وہ یہاں آئے تھے؟"

"اُن کے بغیر سودا کیسے ہو سکتا تھا۔"

"کب آئے تھے؟" میں نے تیزی سے پوچھا۔

"یہی کوئی ڈیڑھ مہینے پہلے کی بات ہے۔"

"پھر وہ کہاں چلے گئے؟"

"میں نہیں کہہ سکتا۔ وہ ایک عرصے بعد مُراد آباد آئے تھے۔ صرف دو دن کے لیے مسافر خانے میں ٹھیرے تھے۔ [illegible] اُن کی کچھ زمین تھی اور یہ مکان۔ دونوں کا سودا کر کے واپس چلے گئے۔"

"زمین کن صاحب نے خریدی؟"

"میں واقف نہیں ہوں۔" وہ اُلجھ کے بولے۔ "البتہ مجھے اتنا علم ہے کہ اُنھوں نے زمین بھی بیچی ہے۔"

"کیا اُنھوں نے یہ نہیں بتایا کہ کہاں سے آ رہے ہیں، کہاں رہتے ہیں؟ ظاہر ہے آپ نے پوچھا تو ہو گا؟"

"حیدر آباد میں کہیں قیام بتاتے تھے۔"

"حیدر آباد میں! وہاں اُن کی ایک بہن بھی رہتی تھیں۔ کیا وہ کوئی پتہ دے گئے ہیں؟"

"کاغذ پر اُنھوں نے مُراد آباد ہی کا پتہ لکھوایا تھا۔"

"کیا اُن کے ساتھ کوئی اور بھی تھا؟"

"ہو سکتا ہے۔ میں نے عرض کیا نا، وہ مسافر خانے میں ٹھیرے ہوئے تھے۔ کوئی دس سال میں وہ مُراد آباد واپس آئے تھے۔ اس عرصے میں دُنیا بدل گئی۔"

"لیکن میں کچھ اور پوچھ رہا ہوں۔"

"جو آپ پوچھ رہے ہیں، اُسی کا جواب دے رہا ہوں۔"

"وہ یہاں اور لوگوں سے بھی ملے ہوں گے۔ یہ اُن کا شہر ہے۔ کیا آپ مجھے چند ایسے لوگوں کے نام نہیں بتا سکتے ہیں جن سے وہ ملے ہوں؟ ممکن ہے اُنھیں اُنھوں نے اپنا پتہ بتایا ہو۔ دیکھیے ہم بہت دُور سے آئے ہیں۔ ہمیں مولوی صاحب سے ایک ضروری کام ہے۔ آپ ہماری کوئی مدد کر سکتے ہوں تو مسافر سمجھ کے کر دیجیے۔ خدا آپ کو اس کا اجر دے گا۔"

"عزیزم! مجھے جو کچھ معلوم تھا، میں نے بتا دیا۔ مجھے مکان سے غرض تھی۔ کچھ اور جاننے بوجھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اپنی ہی اُلجھنیں کیا کم ہیں۔ آپ چاہیں تو میں کچھ نام بتا دیتا ہوں۔ ان لوگوں سے مل لیں مگر میرا خیال ہے آپ کو ناکامی ہو گی۔ مولوی صاحب بہت جلدی میں آئے تھے۔ جلد سے جلد سودا کرنے کی فکر تھی۔ آئے اور چلے گئے۔"

اُن کے بتانے پر ہم دوبارہ فیض گنج گئے اور اُن دو

تین آدمیوں سے ملے مولوی صاحب کی اُن سے ملاقات ہوئی تھی اور اُنھیں اُتنا ہی معلوم تھا، جتنا باطنی حافظ صاحب کو۔ مولوی صاحب بہت مجبوری ہی کی حالت میں یہاں آئے ہوں گے اور اُنھوں نے زیادہ لوگوں سے ملنا گوارا نہیں کیا ہوگا۔ اچانک میرے ذہن میں آیا کہ مولوی صاحب نے مسافر خانے میں مسافروں کی آمد و رفت کے رجسٹر پر اپنا پتہ ضرور لکھوایا ہوگا۔ میں اور ہیرو کہیں اور جانے کے بجائے تانگے میں بیٹھ کے فوراً مسافر خانے واپس پہنچے۔ ایسی کوئی بات نہیں تھی لیکن منتظم صوفی جی ہمیں رجسٹر دکھانے سے کترانے لگے۔ میں نے بہت التجا کی تو کہنے لگے: "آپ عادل صاحب سے مل لیجیے۔ وہ کہہ دیتے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

عادل صاحب کا دفتر مسافر خانے کے وسط میں واقع تھا۔ وہ لمبے قد گندمی رنگ کشادہ پیشانی کے ایک نرم خو شخص تھے۔ عمر چالیس سال سے زیادہ نہیں ہوگی۔ سفید بے داغ شیروانی اور ترکی ٹوپی میں ملبوس تھے۔ میں نے اُن سے درخواست کی اور بتایا کہ مجھے مولوی صاحب کے پتے کی شدید ضرورت ہے۔ "آپ کا بڑا کرم ہوگا۔"

اُنھوں نے صوفی جی کو اندر بلا لیا اور مجھے رجسٹر دکھانے کو کہا۔ ڈیڑھ مہینے پہلے کے مسافروں کی فہرست دیکھ کے اِس کی تصدیق ہو گئی کہ مولوی صاحب مسافر خانے میں ٹھیرے تھے اور اُن کے ساتھ ایک برقع پوش خاتون بھی تھیں یعنی اُن کی بیگم۔

"کیا اُن کی بیگم بھی اُن کے ساتھ تھیں؟"

"رجسٹر تو یہی بتا رہا ہے جناب!" صوفی جی منہ بنا کے بولے۔

"کیا آپ نے اُنھیں دیکھا تھا؟"

"میاں!" وہ ناراضی سے بولے: "ہم یہاں آپ کے خیال میں دوسروں کی عورتوں کو تکتے رہتے ہیں؟ یہاں شُرفا ٹھیرتے ہیں۔"

رجسٹر پر لکھے ہوئے لفظ میرے سامنے تھے۔ اُنھیں دیکھتے دیکھتے میری آنکھیں چھرا گئی تھیں۔ اگلے خانوں میں مولوی صاحب کا پتہ درج تھا۔

"آپ پتہ دیکھ رہے تھے؟" عادل صاحب نے مجھے ٹوکا۔ اُن کی آواز مجھے کہیں دُور سے آتی محسوس ہوئی۔

اُسی لمحے صوفی جی نے میرے سامنے سے رجسٹر اُٹھا لیا۔

ہیرو دادا نے پیچھے سے مجھے کہنی ماری: "اچھا! صاحب کیا پوچھنا ہے؟"

میں نے جھپتی ہوئی آنکھوں سے عادل صاحب کی طرف دیکھا۔ وہ مجھے گھور رہے تھے۔ میں نے نہیں سُنا تھا کہ اُنھوں نے مجھ سے کیا کہا ہے۔

"مولوی صاحب کا پتہ آپ کو درکار تھا؟" عادل صاحب تذبذب سے بولے۔

"ہاں! جی" میں نے سر جھکا کے ڈوبتی آواز میں کہا۔

"آپ کو کچھ اور پوچھنا ہے؟"

"نہیں کچھ اور نہیں۔" میں جلدی سے کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

"روز بیسیوں مسافر آتے جاتے ہیں لیکن مولوی صاحب کا آنا مجھے یاد ہے۔ کچھ یوں بھی کہ ایک زمانے میں اُن کا تعلق بھی اِسی شہر سے تھا۔ میں اُن دنوں مسافر خانے کی نئی عمارت کی تعمیر کے سلسلے میں مصروف تھا۔ اِس لیے ایک ہی بار اُن سے ملاقات ہو سکی وہ بھی سرسری۔ مولوی صاحب بھی کچھ جلدی میں تھے، دو تین ہی روز ٹھیرے ہوں گے۔" عادل صاحب مجھے اپنے آپ سے کہہ رہے تھے۔ اُن کی آواز دھیمی تھی۔ "مجھے کچھ بتائیے؟" وہ چونک کے بولے: "شاید میں آپ کے کسی کام آ سکوں۔"

"اِن ہی کی کھوج میں ہے۔" ہیرو نے تیزی سے کہا: "ابھی وہ کچھ اور بولتا تھا کیا اپنا مطلب ہے کہ آپ؟ . . . ."

"نہیں!" عادل صاحب ہیرو کی بات کاٹ کے بولے۔ "دراصل عرصہ ہوا وہ یہ شہر چھوڑ کے جا چکے ہیں۔ پہلے بھی وہ گھومتے ہی رہتے تھے پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ ایسے لوگ عموماً تنہائی پسند ہوتے ہیں مگر میں مجھ سے خاصے بڑے ہیں۔ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ لیے دیے رہنے والے شخص ہیں۔ سلام دعا مزاج پرسی ہی ایک بات ہو سکی مسافر خانے کی نئی عمارت کا نقشہ دیکھ کے بہت خوش ہوئے۔ کہنے لگے سارے شمالی ہند میں یہ اپنی نوعیت کا واحد مسافر خانہ ہوگا۔ میں نے کہا: بس دعا کیجیے یہ کام کسی طرح تکمیل پا جائے کہ کب تک کے متعلق پوچھا جو مسافر خانے کی تعمیر میں پیش پیش ہیں۔ کہ کب صاحب ایک مشاعرے میں امروہہ گئے ہوئے تھے۔ واپس آئے تو مولوی صاحب جا چکے تھے۔ میں نے اُن سے مولوی صاحب کا ذکر کیا تو ملاقات نہ ہونے کا افسوس کرنے لگے۔ صورت یہ ہے جناب کہ یہاں از خود کوئی دفتر میں آ جاتا ہے تو ملاقات ہو جاتی ہے ورنہ ہم اپنی جانب سے مسافروں کے معاملات میں غیر ضروری طور پر مخل نہیں ہوتے۔" چند لمحے رُک کے عادل صاحب بولے: "افسوس ہے کہ اُن کے بارے میں مجھے کچھ اور معلوم نہیں ہے۔ کوئی اور خدمت ہو تو فرمائیں۔"

"آپ کا شکریہ صاحب!" ہیرو نے ملٹ کے انداز میں اُنھیں سلام کرتے ہوئے کہا: "آپ کی مہربانی . . . ."

میں عادل صاحب کو سلام کیے بغیر باہر چلا آیا۔ میرے قدم ڈگمگا رہے تھے اور مجھے چکر سے آ رہے تھے۔ ہیرو میرے ساتھ نہیں آیا تھا۔ پتہ نہیں وہ عادل صاحب سے اور کیا باتیں کر رہا تھا، خواہ مخواہ وہ کسی شک میں پڑ جاتے۔ مولوی صاحب کے بارے میں اُنھیں اِس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں تھا، معلوم ہوتا تو چھپاتے نہیں۔ وہ طبیعت کے کھلے، بات چھپانے والے آدمی نظر نہیں آتے تھے۔ میں مسافر خانے سے باہر اسٹیشن روڈ پر آ کے کھڑا ہو گیا۔ میری سانس پھولی ہوئی تھی اور سارے جسم سے ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ چھوٹ رہا تھا۔ سامنے ہی اسٹیشن تھا جہاں مسافروں کی بھیڑ لگی تھی۔ تانگے والوں کے شور میں ہر آواز دب گئی تھی۔ شاید ابھی ابھی کوئی گاڑی آئی تھی۔ کس سمت سے آنے والی گاڑی کہیں آگے جا رہی ہو! یکایک میرے ذہن میں آیا میں اِس گاڑی سے نکل سکتا ہوں۔ ابا جان، زہرا اور دادی مسافر خانے کی اوپری منزل کے ایک کمرے میں موجود تھے۔ اِس سے پہلے کہ اُن میں سے کسی کی نظر مجھ پر پڑے مجھے جلد سے جلد یہاں سے دُور ہو جانا چاہیے۔ اوپر جاؤں گا تو مجھے انھی کے ساتھ جانا پڑے گا مگر ابا جان کے خیال سے میں ٹھیر رہا۔ اِس طرح میرے چلے جانے پر وہ بہت پریشان ہو جائیں گے۔ نہ جانے کیا کیا سوچیں اور کتنی دیر تک انتظار کرتے رہیں حالانکہ ہیرو فوراً سمجھ جائے گا کہ میں کس طرف جا سکتا ہوں مگر وہ ابا جان کو کس طرح مطمئن کر سکے گا۔ بہتر ہے کہ ایک رقعہ لکھ کے کسی آدمی کے ہاتھ ابا جان کے کمرے میں بھیج دوں کہ وہ میرا انتظار نہ کریں۔ میں چند روز بعد اُن سے بمبئی آ ملوں گا۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ پیچھے سے ہیرو آ گیا اور میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے واپس اندر لے گیا۔ میں اُس سے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

چند منٹ بعد ہم سب سامان کے ساتھ مسافر خانے سے نکل آئے اور تیز قدموں سے اسٹیشن کی طرف بڑھنے لگے۔ شام کے چار بج رہے تھے۔ گاڑی تیار کھڑی تھی۔ ہمیں ایک دو منٹ کی بھی تاخیر ہو جاتی تو چھوٹ جاتی۔ دو مسافروں کے سوا سارا ڈبا خالی پڑا تھا۔ کچھ دُور تک تو گاڑی رینگ رینگ کے چلتی رہی پھر اُس نے رفتار پکڑ لی۔ مراد آباد سے حیدر آباد جانے کے لیے یہی ایک سیدھا راستہ تھا۔ اگر میں اُن سے جدا بھی ہوتا تو مجھے اسی طرف دلّی سے گزر کے آگے جانا پڑتا۔ یہاں نہیں تو دلّی اسٹیشن پر میں اُن کی نظروں سے اوجھل ہو سکتا تھا۔

مسافر خانے کے رجسٹر پر لکھے ہوئے لفظ میری آنکھوں میں گھوم رہے تھے۔ ہر جگہ وہی لفظ لکھے ہوئے نظر آتے تھے۔ حمایت نگر کا علاقہ حیدر آباد میں شمل اور میں پہلے بھی اِس علاقے سے گزرے تھے۔ ہو سکتا ہے اُس مکان کے آس پاس بھی گئے ہوں جہاں مولوی صاحب نے اپنا قیام لکھوایا تھا۔ ہم نے علاقے کی تمام مسجدوں، مدرسوں میں اور جہاں جہاں ممکن تھا جا جا کے پوچھ لیا تھا مگر مولوی صاحب وہاں کہیں ہوتے تو کوئی بتاتا۔ وہ اُن دنوں حیدر آباد سے سیکڑوں میل دُور جیسلمیر میں بسے ہوئے تھے۔ جیسلمیر کے بعد بھی دوبارہ حیدر آباد جانے کا موقع نہیں ملا۔ میں نے طے کیا تھا کہ سب سے پہلے وہیں جاؤں گا۔ حیدر آباد میں صاحب علم لوگوں کی بڑی قدر ہوتی ہے۔ جیسلمیر سے مولوی صاحب سارا گھر چھوڑ کے چلے تھے، اُنھیں کسی ایسی جگہ جانا چاہیے تھا جہاں اُن کے جان پہچان والے موجود ہوں۔ جن حالات میں اُنھیں جیسلمیر سے دُور ہونا پڑا تھا، خصوصاً ایسی صورت میں جب ایک نوجوان لڑکی بھی اُن کے ساتھ تھی، اُنھیں در بدر مارے مارے پھرنے کے بجائے کسی ایسے ٹھکانے کا رُخ کرنا چاہیے تھا جہاں ہاتھ پھیلائے بغیر کوئی سہارا مل جانے کی توقع ہو۔ عارضی طور پر سہی چلتے وقت اُن کے پاس پیسے بھی کم تھے۔ صرف اتنے جو رستم خاں نے جیسلمیر سے فرار کرتے ہوئے اُنھیں دیے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ عرصہ ہوا حیدر آباد میں اُن کی اکلوتی بہن بیاہی گئی تھی۔ میں اُس کا گھر تلاش نہیں کر سکا تھا لیکن مولوی صاحب کو اپنی بہن کا پتہ معلوم ہوگا۔ اُس کے شوہر کے رشتے دار، جان پہچان والے وہاں موجود ہوں گے۔ جیسلمیر سے آنے کے بعد شمل نے اچانک تبت جانے کا ارادہ کر لیا ورنہ میں ایک مرتبہ حیدر آباد ضرور جاتا۔

رجسٹر میں مولوی صاحب نے اپنے ساتھ سفر کرنے والی لڑکی کو اپنی بیگم کی حیثیت سے درج کرایا تھا۔ ظاہر ہے مراد آباد میں وہ اُس سے اپنا کوئی اور رشتہ نہیں بتا سکتے تھے۔ یہاں سب جانتے تھے کہ اُنھوں نے شادی نہیں کی ہے۔ لڑکی کو وہ اپنی بیٹی نہیں بتا سکتے تھے۔ جیسلمیر سے عزت و عافیت کے ساتھ نکلنے کے بعد وہ معلوم نہیں اور کہاں کہاں منہ چھپاتے پھرے ہوں۔ اُنھیں کوئی ایسا ہی اندیشہ ہوگا۔ اسی لیے وہ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد اب بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ یقیناً گزشتہ برسوں میں اُنھیں لڑکی کی تلاش میں گھومنے والے بانگ قبیلے کے لوگوں سے کوئی واسطہ پڑا ہوگا جبھی وہ اتنی احتیاط برت رہے تھے۔ اب اُنھیں جیسلمیر کے راناؤں کے آدمیوں سے بھی اندیشہ ہوگا کہ وہ اُنھیں دوبارہ نہ تلاش کر لیں۔ میرا دل نہیں مانتا تھا مگر ایک اور بات بھی ہو سکتی تھی جس سے مولوی صاحب خوف زدہ ہوں۔ مبادا اُنھیں یہ خیال ہو کہ میں کہیں اُن سے اپنی امانت واپس لینے نہ آ جاؤں۔ ممکن ہے میری ہی وجہ سے ایسا ہو۔ تھوڑا بہت قاعدہ قانون اُنھیں بھی معلوم ہوگا کہ مجھے قتل کی سزا میں کم سنی کی وجہ سے رعایت مل سکتی ہے یا پھر اُنھیں میرے مقدمے کے فیصلے کا علم ہو گیا تھا۔ اُنھیں پورا

یقیناً ہوگا کہ سات سال بعد جیل سے باہر آنے کے بعد میں اُسی کو تلاش کروں گا۔ کہیں اور نہیں جاؤں گا۔ جیل کے سات سال میں ایک ایک دن، ایک ایک لمحہ گن گن کے ہی کاٹوں گا۔ ایک ہی اُمید مجھے وہاں زندہ رکھے گی کہ باہر کوئی میرا منتظر ہے۔ جیل کا دروازہ کھلنے کی دیر ہوگی کہ میری آنکھیں پھر تڑپ تڑپ اُسے دیکھنے کے لیے بھٹکتی پھریں گی۔ انھیں خوب اندازہ ہوگا کہ وقت کی دھول میرے سینے سے اس کی تصویر مٹا نہیں سکے گی۔

میری خبر رکھنا اُن کے لیے مشکل نہیں تھا۔ جیل کے سوا میرا کوئی اور ٹھکانا نہیں تھا۔ میرا پتہ بہت آسان تھا۔ وہ مجھے خط لکھ سکتے تھے، مجھ سے آ کے مل سکتے تھے، خود نہیں تو اپنا کوئی پیغام بھیج سکتے تھے اور ان کے دل میں اس وہم و راہ سے اگر کوئی وسوسہ تھا کہ اس طرح جیل کے حکام کو میرے حوالے جانے کا موقع مل جائے گا اور حقیقتاً ان کے اور کورا کے سکون میں کوئی رخنہ پڑ سکتا ہے تو وہ کوئی اور تدبیر اختیار کر سکتے تھے۔ شروع میں نہیں تو تین چار سال بعد وہ اپنے نام اور پتے کے بغیر اطلاعی اور کورا کی خیریت کا دو سطری خط لکھ سکتے تھے۔ میرے لیے تو ایک اشارہ بہت ہوتا۔

جیل میں اُن کا خط نہ آنے اور میری خبر نہ لینے کی میں نے اپنے طور پر بہت سی تاویلیں کر لی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ مولوی صاحب نے یہ خاموشی جان بوجھ کے اختیار کی ہوئی ہے۔ میں نے انھیں اپنے اور کورا کے بارے میں تقریباً سبھی کچھ بتا دیا تھا۔ وہ سمجھتے ہوں گے کہ جس رات دریا کے کنارے اجنبی لوگوں نے ہم پر حملہ کیا تھا اور کورا کو ہم سے چھین لے جانے کی کوشش کی تھی، وہ جانگ قبیلے کے لوگ یا ان کے بھیجے ہوئے آدمی بھی ہو سکتے ہیں۔ اُس رات وہ ناکام ہو گئے۔ میں جیل چلا گیا لیکن مولوی صاحب کے خیال میں جیل میں بھی وہ میری طرف سے پوری طرح چوکنا ہوں گے۔ انھیں سراغ لگانے کی فکر ہوگی۔ مولوی صاحب بھی اُسی دن کھٹکے سے چلے گئے ہوں گے اور اُنھوں نے خط لینا نہیں لکھا کہ میں اُن کے آبائی شہر سے واقف ہی تھا۔ میرے اور اُن کے درمیان کی بات تھی، کسی تیسرے کو اس کا علم نہیں تھا۔ میں سمجھا تھا کہ مولوی صاحب نے حفظ ماتقدم کے لیے مجھ سے کوئی رابطہ قائم نہیں کیا ہے، یہی سوچ کر کہ رہا ہونے پر میں سیدھا مراد آباد ہی آؤں گا اور مراد آباد جیسے شہر میں انھیں ڈھونڈنا میرے لیے دشوار نہیں ہوگا۔ اس دوران کورا نے بھی انھیں اپنے بارے میں بہت کچھ بتایا ہوگا۔ چنانچہ جانگ قبیلے کے لوگوں کے سلسلے میں وہ اور حساس ہو گئے ہوں گے۔ انھیں قدم قدم پر ان کی طرف سے خطرہ ہوگا۔ جیل سے نجات پانے کے بعد میں نے سیدھے مراد آباد ہی کا رخ کیا تھا۔ مولوی صاحب میرے لیے وہاں کوئی خبر نہیں چھوڑ گئے تھے۔ وہ میرے سے مراد آباد گئے ہی نہیں۔ مجھے کچھ بھی نہیں معلوم تھا کہ اس رات کے بعد اُن دونوں کو کیا افتاد پیش آئی۔ جیسلمیر میں منیر علی کا گھر ملنے ہی پر ان کے بارے میں ٹھیک پتہ چل سکا اور پہلی بار مجھے کچھ ایسا گمان ہوا کہ انھیں میرا اندیشہ بھی ہو سکتا ہے۔

مجھے میرے سامنے سے کورا کو دور رکھنے کے لیے اُنھوں نے یہ سب کچھ کیا ہوگا۔ وہ ایک سزا یافتہ آدمی کو کورا کے لیے مناسب نہیں سمجھتے ہوں گے۔ اُن کا ایسا سوچنا بھی ایک طرح سے برحق تھا۔ میرا اُن سے رشتہ ہی کون سا تھا۔ دِلوں کی ملاقات تھی۔ رشتہ اُن کا کورا سے تھا جو اپنے وطن تک اُن کے ساتھ رہی۔ میں اُن کا کون ہوتا تھا۔ جیل میں آکر لوگ بدل جاتے ہیں۔ انھیں کیا پتہ تھا کہ میں نے وہاں تعلیم بھی جاری رکھی ہے۔ میں ہر لمحے اُس کے لیے دعائیں کرتا تھا۔ اُس کا چہرہ میرے سامنے رہتا تھا۔ مجھے احساس تھا کہ اُس نے میرے بغیر بہت دکھ اٹھائے ہیں۔ میں اِدھر جیل میں ہوں تو وہ بھی زندگی جیل کے مانند کاٹ رہی ہوگی۔ مجھے تو سلاخوں کا بادشاہ تھا، وہ تو سلاخوں کے بغیر قید ہوگی۔ اس لیے مجھے جیل سے اُس کے لیے ایک عقل آدمی، ایک متوازن بن کے نکلنا چاہیے۔ راتوں کو جاگ جاگ کے میں اسی لیے پڑھتا رہتا تھا۔ اُسی کی وجہ سے میں نے جیل میں رہنے کے باوجود یہ کیا تھا۔ اُسی کی وجہ سے میں نے جیل سے بہتر سیکھے تھے۔ مجھے تجربہ ہو گیا تھا کہ زندگی گزارنے کے لیے آدمی کو ہر اعتبار سے مستعد اور مسلح رہنا چاہیے۔ سب کچھ مجھے خود ہی کرنا ہے۔ اپنا گھر بنانا ہے۔ میں اس کا پاسبان ہوں۔ میری جوانی میں آ کے وہ گزرا ہوا سب کچھ بھول جائے گی۔ جیل نے ہی مجھ کو یہ نہیں سکھایا تھا کہ رہا ہونے کے بعد مجھے اوّل سے یہ کام کرنا ہے۔ وہ تو میرے لیے وہی خواب دیکھتا تھا جو میں خود دیکھا کرتا تھا۔ وہ مجھے ایک بڑا وکیل بنانا چاہتا تھا۔ مولوی صاحب کو میری فکر ہوتی تو انھیں یہ سب معلوم ہوتا۔ اُن کے ذہن میں بس ایک ہی بات ہوگی کہ میں جیل چلا گیا ہوں، دو جیتے جاگتے آدمیوں کے قتل کے جرم میں۔ سو میرے بدن پر کوڑھ نمودار ہو گیا ہوگا۔ میرا چہرہ سیاہ ہو گیا ہوگا۔ اُن کے خیال میں جیل جانے کے بعد شخص کا چہرہ، رنگ روپ بدل جاتا ہوگا۔

وہ انھیں اتنی عزیز ہو گئی ہوگی کہ اُسے جدا کرنے کا تصور بھی اُن کے لیے عذاب ہوگا۔ وہ اس کے لیے کسی ایسے شخص کی تلاش میں ہوں گے جو خوشی کے ساتھ لے لے کر اُسے اُن کی آنکھوں سے دور نہ لے جائے۔ ایسا ایک شخص انھیں جیسلمیر میں مل گیا۔ ارشد منیر علی کا بھتیجا۔ منیر علی کے خاندان کو وہ اچھی طرح پرکھ چکے تھے۔ ارشد ایک

تعلیم یافتہ لڑکا تھا۔ اُنھوں نے جسے بھی مسترد کر دیا۔ منیر علی کے بہ قول رانا صاحب نے انھیں بہت بڑی دولت کی پیشکش کی تھی، وہ اُس کی دولت کبھی خاطر میں نہیں لائے۔ اس عرصے میں نہ جانے کتنے لوگوں کتنے خاندانوں نے اُن سے کورا کے لیے درخواست کی ہوگی۔ مولوی صاحب نے کہیں ہامی نہیں بھری تھی۔ کیا انھیں اِس حقیقت کا احساس نہیں تھا کہ ایک نہ ایک دن کورا کو اُن سے جُدا ہو جانا ہے۔ ہر لڑکی کو ایک گھر سے رخصت ہو کے دوسرا گھر بسانا پڑتا ہے۔ میں سامنے نہیں تھا اور میں مطلب بھی نہیں تھا۔ تو وہ کورا کے لیے کس شخص کی تلاش میں تھے؟ انھیں کس دن اور کس شخص کا انتظار تھا؟ کون آنے والا تھا؟ شاید کوئی بھی نہیں۔ میں نہ کوئی اور۔ بس انھیں ایک مشتاق اُمید، موہوم سی توقع ہوگی کہ کسی دن کورا خود تھک جائے گی اور پھر وہ جو چاہیں گے اُس کے لیے فیصلہ کر سکیں گے۔ اُنھوں نے جتنے لوگوں کو مسترد کیا ہوگا، بیشتر کورا کے سبب سے کیا ہوگا۔ انھوں نے دیکھ لیا تھا کہ وقت نے کورا کا ارادہ اور فروزاں کر دیا ہے۔ میں اُس کے پاس نہیں تھا لیکن میری باتیں اُس کے سینے میں بسی ہوئی ہیں۔ میری پرچھائیاں مجھ سے سوا اسے حصار لیے رہتی ہیں۔ وہ مولوی صاحب کے ساتھ رہتے ہوئے بھی اُن کے ساتھ نہیں ہے۔ اس کی اپنی الگ ایک دنیا ہے۔

بعد میں زہرہ نے اس کی تصدیق کر دی تھی۔ ہر چند کہ مجھے اس تصدیق کی ضرورت نہیں تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ وہی ہوگی۔ اُس کا قد بڑھ گیا ہوگا۔ اُس کا رنگ نکھر گیا ہوگا۔ شکل و صورت میں وہ پہلے سے بہت بدل گئی ہوگی لیکن وہ ہوگی وہی، جہاں جس رات وہ مجھ سے جدا ہوئی تھی۔ وہیں ہی زہرہ نے کہا تھا کہ وہ ہر وقت کچھ سوچتی رہتی ہے، کھوئی کھوئی رہتی ہے۔ نہ اُسے لباس کا شوق ہے نہ زیور کا۔ کوئی آ کے خود اُسے پوچھ جائے تو ٹھیک، نہ آئے تو شکایت نہیں کرتی۔ گھنٹوں تنہا بیٹھی دیواریں تکتی رہتی ہے۔ اتنا وعدہ مولوی صاحب کے جاننے کے لیے کافی تھا کہ اُس کی منزل تو ایک ہی ہے۔ اُسے ایک ہی شخص کا انتظار ہے۔ وہ جس کی نیند وہی اُس کا خواب ہے۔ وہی اس کی زندگی ہے۔ وہ اُس کے لیے زرد جواہر اکٹھے کر دیں یا اُسے دیواروں میں بند آہنی حافظوں میں محبوس کر دیں۔ بیڑیاں ڈال دیں یا ساری دنیا کی خوشیاں اس کے قدموں میں بکھیر دیں، اُس کی خوشی تو ایک ہی شخص میں پنہاں ہے۔ نو برس گزر چکے تھے۔ مولوی صاحب کو اور کتنے برسوں کا انتظار تھا۔ نو برس کیا، نو صدیاں بیت جائیں۔ وہ تو وہی رہے گی۔ مولوی صاحب نہیں جانتے تھے کہ کبھی کبھی دو آدمیوں سے ایک آدمی کی تکمیل ہوتی ہے۔ وہ دو آدمی جو بظاہر الگ الگ نظر آتے ہیں، باطن ایک ہوتے ہیں۔ مولوی صاحب کا خیال ہوگا کہ وقت دنیا بدل دیتا ہے۔ وقت ایک دن اُسے بھی منقلب کر دے گا۔ اُنھوں نے اس سے جانے کیا کیا کہا ہوگا کہ میں مر گیا ہوں مگر انھوں نے ایسا نہیں کہا ہوگا اور کہا ہوگا تو اس نے تسلیم نہیں کیا ہوگا۔ اُس کا دل بھی ایک آئینہ ہے۔ وہ بھی اس سے کچھ کہتا ہوگا جیسے میرا دل کہتا ہے۔ مولوی صاحب نے جینے کے لیے اُسے طرح طرح کے آسرے دیے ہوں گے لیکن وہ ایک ہی آسرے پر زندہ تھی، اپنے آسرے پر۔

زہرہ تو مجھے بہت بعد میں ملی تھی۔ زہرہ سے ملنے سے پہلے ہی میں اُس کے بارے میں سب کچھ جانتا تھا۔ میرا یقین ہی میری دلیل تھا۔ مولوی صاحب اُسے دُور دُور لیے پھریں، دن، سات سمندر پار لے جائیں۔ ایک دن انھیں میری یاد ضرور آئے گی۔ ایک دن وہ خود نڈھال ہو جائیں گے۔ وہ کورا پر ایک سب سے بڑی مہربانی ضرور کریں گے جسے اب تک وہ نہیں سمجھے تھے اور سمجھتے تھے تو اپنے آپ سے ضد کر رہے تھے۔ بے شک انھیں کورا بہت عزیز ہو سکتی تھی۔ اُن کا بھی زندگی میں کوئی اپنا نہیں تھا۔ ایک کورا ملی تھی اور کورا کون تھی؟ وہ جو صرف ایک لڑکی تھی، اُس کا چہرہ چمکتا رہتا تھا، اُن کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو اُسے اتنا ہی عزیز رکھتا۔ ایک ابا جان ہی تھے جنھوں نے اُس کی قدر نہیں کی۔ جب وہ گھر آئی تھی تو نتی نے بے ساختہ کہا تھا۔ بالکل گڑیا ہے، جی چاہتا ہے طاق میں سجا کے دن اور بس دیکھتی رہوں۔ امی کو بھی وہ اتنی اچھی لگی تھی کہ انھوں نے بُری طرح اُس کی بلائیں لی تھیں۔ چشم بد دور، نظر بد سے بچائے۔ یہ کہتے کہتے اُن کی زبان نہیں تھکتی تھی۔ ابا جان ذرا سا تحمل کر لیتے تو دیکھتے، وہ نتی سے زیادہ اُن کی خدمت کرتی۔ انھیں اپنے بیٹوں بیٹیوں سے زیادہ وہ پیاری ہوتی۔ ابا جان نے اُس کی طرف نگاہ بھر کے دیکھا ہی نہیں۔ اتنا بھی نہ سوچا کہ وہ اُن کی پناہ میں آئی ہے۔ اُس کا کوئی نہیں ہے۔ وہ بے سہارا لڑکی اُن کے گھر کو اپنا گھر سمجھ کے، راتوں رات بندھ گیا سے بھاگتی ہوئی آئی ہے۔ اُس نے کچھ سمجھا ہوگا جبھی اُس طرف کا رخ کیا۔ ایسے کون کس کے گھر آتا ہے۔ ابا جان کو اُس کا نہیں تو کم از کم میرا ہی پاس رکھنا چاہیے تھا۔ میں بھی اُسی گھر کا ایک فرد تھا۔ مجھے کسی کو اپنی مرضی سے اپنے گھر میں رکھنے کا حق نہیں تھا؟ ابا جان وہاں اُس کا رہنا مناسب نہیں سمجھتے تھے تو کہیں اور بھیج دیتے۔ زمین اتنی تنگ نہیں تھی۔ وہ چاہتے تو اُس کے لیے ایک گھر بنا سکتے تھے۔ وہ خالی ہاتھ نہیں آئی تھی، اپنے ساتھ دولت بھی لائی تھی، جیسے جواہرات سے بھری پوٹلی۔ اُس کے لیے جو ابا جان نہیں کر سکے، وہ مولوی صاحب ایک اجنبی آدمی نے کیا۔

مولوی صاحب ایک بار میری لو دے کے تو دیکھتے کہ میری

ن کتنی جھکی ہوئی ہے مجھ سے اُن کے سامنے نگاہیں بھی نہیں
ٹھا سکیں گی۔ میں نے اُن کو سکھ چین چھین لیا تھا۔ اُنھوں نے
کے لیے کتنی پریشانیاں اُٹھائی تھیں۔ ساری زندگی اُس پر قربان
ی تھی۔ زمانے بھر کی نگاہوں سے اُسے بچائے رکھتے
ے تھے۔ میرے پاس اُن کے احسانات کا کوئی بدل نہیں تھا۔
ی صاحب نہ ہوتے تو آج وہ کہاں ہوتی۔ انھیں پیسوں کی کوئی
ہ گئی تھی کہ وہ مراد آباد میں اپنی آبائی زمین اور مکان بیچنے آئے
۔ اس مکان اور زمین سے انھیں کیا ملا ہوگا۔ چند ہزار روپے!
ہی وہ ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ ہر وقت انھیں دھڑکا لگا
ہوگا۔ رانا مہتاب کے واقعے کے بعد وہ اُسے ایک لمحے کے لیے
چھوڑنا نہیں چاہتے ہوں گے لیکن گھر چلانے کے لیے انھیں
ے باہر تو نکلنا پڑتا ہوگا۔ بھیک بھی جسم ہلائے بغیر نہیں ملتی۔
یری جیب میں خزانے کی کنجی رکھی تھی۔ کرشنا جی کی ساری
ت جس کی توں بینک میں پڑی تھی۔ میں نے صرف نیلم کے لیے
ہزار روپے کی رقم خرچ کی تھی شہ پارہ کے لیے دی جانے والی
رمن بیگم کے نصیب ہی میں نہ تھی۔ کانتے نے مجھے پچیس ہزار روپے
چیک واپس کر دیا تھا اور کلکتے کے بینک میں جمع
جانے والے روپے میں سے ایک پائی بھی خرچ نہیں کی تھی۔
کرشنا جی نے یہ سب میرے لیے کیا تھا۔ میرے سوا کوئی اس
ے حق دار نہیں تھا۔ اُن کی رُوح بھی اس بات سے خوش ہوتی کہ
ے میں نے خود پر خرچ کیے ہیں۔ میرے ہی سکھ کے لیے انھوں
یا گیا تھا۔ جس وقت انھوں نے وصیت لکھوائی تھی اُن کی
دہ تھیں لیکن اپنی ماں کے نام انھوں نے کچھ نہیں لکھوایا
چے کہ وہ اُن کے لیے اپنی جگہ ایک اور بیٹا چھوڑ کے جا رہی
نہیں یقین ہو گا کہ اُن کے بعد میں اُن کی ماں کی خدمت میں
ریغ نہیں کروں گا۔ کرشنا جی کی طرح اُن کی ماں نے بھی
ی کا موقع نہیں دیا۔ وہ مجھ پر اتنا بڑا بوجھ لاد کے چلے گئے
چہ نہیں گئیں۔ جب انھیں معلوم تھا کہ مجھے پیسے خرچ کرنا
تا اور بہت سی چیزیں پیسوں سے خریدی بھی نہیں جا
میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں ان روپوں کا کیا کروں۔
یں رکھی ہوئی چیک بک مجھے بہت بوجھل لگتی تھی۔ مولوی
ب ہوتے تو میں یہ سب اُن کے حوالے کر دیتا۔ کوڑا کی
ر کھنے کے معاوضے کے طور پر نہیں۔ اس کا تو معاوضہ ہی نہیں
اس کے لیے تو کرشنا جی کی دولت کیا، قارون کا خزانہ
ہے۔ بس جیسے کرشنا جی کا جی چاہا تھا کہ وہ چلتے وقت
م یہ سب کر جائیں، میرا بھی جی چاہتا تھا کہ کرشنا جی

نے مجھے اپنی جان بچانے کا معاوضہ نہیں دیا تھا۔ وہ مجھے اپنا عزیز اپنا بھائی سمجھتے تھے۔ میں بھی مولوی صاحب کو اپنے آبا جان کی جگہ ہی اور تجمل کی طرح سمجھتا تھا۔ ایک بار وہ مڑ کے دیکھتے۔ آزما تا ہی سہی کر کے مجھ سے دُور کر کے تو انھیں مجھ سے اتنی ایذا بھی نہ ہوتی میں ان کا دستِ بازو ہی بنتا۔ پھر انھیں سر چھپانے کے لیے بستی بستی کی بے کرم خاک نہ چھاننی پڑتی۔ وہ دیکھتے تو یہی کہ کتنے لوگ انھیں پلکوں پر بٹھاتے ہیں۔ کوئی اور نہ بھی ہوتا تو میں اکیلا بہت تھا۔ میں انھیں کوئی کام نہ کرنے دیتا۔ میرے بازوؤں میں منوں بوجھ اُٹھانے کی طاقت ہے۔ کچھ اور نہیں تو میں مزدوری ہی کر سکتا ہوں۔ میرے ہاتھ پیر اسی کی وجہ سے بندھے ہوئے ہیں مجھ سے کوئی کام ہی نہیں ہوتا ورنہ میں کیا نہیں کر سکتا۔ کرشنا جی کی دولت ایک اتفاق ہے۔ میں نے نہ اس کی طلب کی تھی نہ مجھے اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اس کے بغیر بھی میں کچھ کرنے کی تھوڑی بہت اہلیت ضرور رکھتا ہوں۔ میرے ہاتھ کٹے ہوئے تو نہیں ہیں۔

شاید مولوی صاحب کو یہی گمان ہو گیا تھا کہ میں کوڑا کو اُن سے جُدا کر دوں گا۔ میں ایسا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ مجھے اتنا کم ظرف، بے حس اور تنگ دل کیوں سمجھتے تھے۔ وہ مجھ پر یہ بھی نہیں کوڑا پر بھی جبر کر رہے تھے کیا اتنے دنوں تک وہ نہیں جان سکے تھے کہ کوڑا اتنی بھی نہیں ہے۔ وہ اس کے لیے بہترین لباس اور غذائیں فراہم کر سکتے ہیں مگر کیا وہ اس کے ہونٹوں کے لیے مسکراہٹ اور اس کی آنکھوں کے لیے چمک بھی مہیا کر سکتے ہیں۔ انھیں کوڑا کا اس قدر خیال ہے تو ایک سامنے کی بات اُن کی عقل میں کیوں نہیں آ رہی ہے میری صورت، میری حیثیت کوڑا کے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ میں اچھا ہوں یا بُرا، میرے چہرے پر سیاہی ملی ہوئی ہے یا سفیدی۔ میں جیل سے جانور بن کے نکلا ہوں یا آدمی۔ میں جیسا بھی ہوں وہ مجھے اپنی قسمت سمجھ کے قبول کر لے گی اور یہی حال میرا ہے۔ اگر مجھے رہا ہوتے ہی معلوم ہوتا کہ وقت نے کوڑا کی شکل بگاڑ دی ہے وہ سب کچھ بھول گئی ہے مولوی صاحب نے اس کا ہاتھ راشد کے ہاتھ میں دے دیا ہے یا وہ رانا مہتاب کے محل میں حکومت کرتی ہے تو میں یہ سب اپنی قسمت کا لکھا سمجھ کے قبول کر لیتا۔ وہ جہاں ہوتی، جیسی ہوتی میرے لیے تو وہی تھی۔ اس کا پیار کوئی مول تول کا رشتہ نہیں تھا کہ اگر لین ہے تو اس کا جواب لین ہوگا۔ میری آنکھوں سے بینائی چلی جائے گی تو وہ مجھے اپاہج سمجھ کے مسترد کر دے گی، وہ میری دسترس سے دُور ہو جائے گی تو اس کی تصویر میرے سینے میں دھندلی پڑ جائے گی۔

میری سفیدی پر اس کی سفیدی کا انحصار نہیں تھا۔ مولوی صاحب کو زندگی میں کوڑا کی طرح کوئی شخص نہیں ملا تھا تو یہ میری یا اس کی غلطی نہیں تھی۔ اب تو سب کچھ اُن کے سامنے تھا۔ کون انھیں جا کے بتاتا کہ ایک دن نہیں، ایک برس نہیں، اب نو برس سے اوپر ہو چکے ہیں۔ جیل میں تو مجبوری تھی لیکن جیل سے باہر ایک ایک پل مجھے ڈستا رہا ہے۔ میں نے انھیں گلی گلی ڈھونڈا ہے کہاں کہاں نہیں گیا ہوں۔ میرے پیروں میں چھالے تک پڑ گئے۔ میری آنکھیں اس کی پرچھائیں بھی نہ دیکھ سکیں۔ کون اُن سے جا کے کہتا کہ میری رگوں میں ہر وقت کھولن ہوتی رہتی ہے، جی اُوبا اُوبا رہتا ہے۔ سوچتا کچھ ہوں، ہو کچھ جاتا ہے۔ میں اپنے آپ کو بہت سمجھاتا ہوں لیکن دوسرے ہی لمحے سب بھول جاتا ہوں۔ کبھی میرا جی چاہتا ہے کہ اپنے آپ کو خوب طمانچے ماروں، اپنا جسم شکنجے میں کس لوں، کسی کنویں میں چھلانگ لگا دوں یا ریل کے نیچے آ جاؤں۔ مجھے موت بھی نہیں آتی۔ کتنے لوگ میری وجہ سے پریشان رہتے ہیں اور مجھ سے کسی سے سیدھے منہ بات بھی نہیں ہوتی۔ وہ سب بہت اچھے ہیں جو مجھے نہ جانے کیا سمجھ کے معاف کر دیتے ہیں۔ زینی میری ناز برداری کرتی رہتی ہے۔ نیلم میرے لیے جب دیکھو مصلے پر پیشانی رگڑتی رہتی ہے۔ جولین کرین ایک خط بھی نہ لکھ سکا۔ مولوی صاحب کچھ اور نہیں تو مجھے ایک چٹھی زہر ہی بھیج دیتے۔ ایک بار میرے سامنے آ کے تھپڑ لگا دیتے۔ کون میری طرف سے جا کے اُن کے آگے ہاتھ جوڑے کہ وہ میری خطائیں معاف کر دیں۔ خدا بھی اپنے بندوں کو معاف کر دیتا ہے۔

گاڑی تیز رفتاری سے دلی کی طرف بڑھ رہی تھی۔

میں کھڑکی پر سر ٹکائے بے حس و حرکت بیٹھا تھا۔ مجھے پتہ ہی نہ چلا کہ کتنے اسٹیشن آئے اور گزر گئے ہیں۔ میرے سر میں بھی کوئی ریل سی چل رہی تھی۔ نہ جانے کتنی دیر بعد کسی نے میری پشت پر تھپکی دی میں ہڑبڑا سا گیا۔ مارٹی ہاتھ میں چائے کا گلاس لیے سامنے کھڑا تھا اور آبا جان سمیت اُن سب کی نگاہیں مجھی پر منڈلا رہی تھیں۔ ڈبے میں روشنی بہت کم ہو گئی تھی۔ گاڑی کسی اسٹیشن پر ٹھہری ہوئی تھی۔ پلیٹ فارم پر آتا جاتا ہوا شور ڈبے میں گونج رہا تھا۔ میں سمجھا دلی آ گئی ہے۔ میں نے سٹ پٹائے ہوئے لہجے میں مارٹی سے پوچھا۔

وہ پلکیں جھپکانے لگا۔

"دلی ابھی دُور ہے راجا استاد!" اس نے چائے کا گلاس میری طرف بڑھاتے ہوئے جواب دیا۔ "ابھی گڑھ مکتیشر پڑا ہے۔"

مجھے مارٹی کی بات کا یقین نہیں آیا لیکن دلی آ جاتی تو وہ سب اُترنے کی جلدی کرتے۔ گویا مراد آباد سے دلی کا آدھا فاصلہ ابھی باقی تھا۔ میں نے مارٹی کے ہاتھ سے چائے کا گلاس لے لیا۔ منع کرتا تو وہ فضول میں اصرار کرنے لگتا۔ میرے مقابل کی نشست پر دیوار سے ٹیک لگائے آبا جان نیم دراز تھے۔ بیرو اُن کے پاس بیٹھا تھا۔ ڈوڈا دروازے پر کھڑا تھا۔ مراد آباد سے چلنے والے دونوں مسافر اب ڈبے میں موجود نہیں تھے۔ میں نے چائے ختم نہیں کی تھی کہ بیرو اُٹھ کے میرے پاس آ گیا اور میری گردن میں بازو ڈال کے مجھے بھینچنے لگا۔ میں کسمسا کے رہ گیا۔ "ایسا بھی کیا سوچتا ہے لاڈلے بھائی؟" بیرو مجھے گدگداتے ہوئے سرگوشی میں بولا۔

میں سر جھکائے خاموش رہا۔

"اپنے کو نہیں بولے گا؟" وہ شکایتی لہجے میں بولا۔

میرے دل میں آیا بیرو سے کہہ دوں۔ اچھا ہے اُسے بتا دینا چاہیے کہ میں دلی سے اُن کے ساتھ جانے کے بجائے حیدرآباد جانے والی گاڑی میں بیٹھ جاؤں گا۔ حیدرآباد سے بمبئی زیادہ دُور نہیں ہے۔ اُن کے پہنچنے کے دو تین روز بعد میں خود وہاں پہنچ جاؤں گا۔ بیرو سے کہہ دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ وہ آبا جان سے کوئی بھی عذر کر دے گا لیکن وہ اُن سے کیا عذر کر سکتا ہے۔ فیض آباد میں ہمارا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ آبا جان میرے اچانک راستہ بدل دینے اور ساتھ چھوڑ جانے سے بہت حیران ہوں گے۔ وہ بیرو سے طرح طرح کے سوال کریں گے۔ کوئی اور موقع ہوتا تو وہ خاموش ہو جاتے مگر اب وہ بہت کشمکش میں پڑ جائیں گے۔ اگر کچھ نہیں کہیں گے تو اُن کے دل میں بے شمار وسوسے پیدا ہوں گے۔ یہ بہت عجیب بات ہے نو سال بعد جا کے بہنوں کو دیکھنے کی صورت پیدا ہوئی ہے اور میں جا رہا ہوں۔ آبا جان کو خود بھی فرخ، فریال، فاریہ اور اکبر کی صورتیں دیکھنے کی بہت بے چینی ہو گی۔ نو سال سے وہ جس دن کی آرزو کر رہے تھے، وہ دن قریب ہی تھا۔ اب وہ دن آنے میں بظاہر کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ مہمان گیر بھی انھیں مل گیا تھا۔ امی اور ممی انھیں بہت یاد آ رہی ہوں گی۔ آبا جان مہمان گیر کو بھی فیض آباد سے ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ تجمل نے روک دیا۔ بہرحال میں ساتھ تھا۔ فرخ، فریال، فاریہ اور اکبر کے لیے میں مر چکا ہوں گا۔ مجھے اچانک اپنے سامنے دیکھ کے اُن کی حیرت اور مسرت کا ٹھکانا نہیں ہوگا۔ آبا جان مجھے اُن کے سامنے لے جا کے پہلے پہیلیاں بجھوائیں گے کہ پہچانو یہ کون ہے۔ کچھ یاد آتا ہے کہ کہیں دیکھا ہے۔ شاید فرخ پہچان لے یا کبھی۔ مہمان گیر بھی پہلی نظر میں مجھے نہیں پہچان پایا تھا۔

آبا جان کی اس وقت ایک ہی تمنا ہو گی کہ جلد سے جلد بمبئی پہنچ کے مجھے اُن کے سامنے کھڑا کر دیں۔ یہ منظر دیکھنے کے لیے اُن کی آنکھیں ترس رہی ہوں گی۔ درمیان میں میرے چلے جانے سے

ں بے معاوضہ نیت ہوگی۔ پیڑو انھیں مطمئن کرنے کی ہر ممکن کوشش
ے گا لیکن ظاہر ہے، وہ اتنی آسانی سے مطمئن نہیں ہوں گے۔
ں میں خود اُن سے کہہ سکتا کہ صرف دو دن کے لیے مجھے اجازت
دیجیے۔ میری آنکھیں بھی اُن سب کے چہرے دیکھنے کے لیے
تاب ہیں شاید ابا جان سے زیادہ۔ فیض آباد ہی میں وہ مجھ سے
، اور بمبئی جانے کے آثار نظر نہیں آتے تھے تو سب سے زیادہ
ی بھی کر رہی تھی۔ بمبئی ہی میں مولوی اکرام کے فلیٹ پر میں کئی
یا چکا تھا۔ کرشنا جی نے سارے ہندوستان کے تھانوں میں گشتی
روانہ کیے تھے۔ انھی خطوط کے نتیجے میں ابا جان کا سراغ مل
تھا۔ ابا جان نے مجھے نہیں ڈھونڈا مگر میں نے جنگل نے کرشنا جی
ہیں پی نکلا نے انھیں ڈھونڈا تھا۔ سلطان، سرلا، بمبئی، پٹھو،
شن بہان، پیڑو، زورا، مارتی، ہلاکو سبھی اس میں شامل تھے۔
جان کا تتے اور بہت سے لوگ جلیبڑہ غور کیا جائے تو وہ بھی،
جان ہی کی وجہ سے ترنت گئے تھے۔ یہاں بھی جہاں جہاں
ور قبول جاتے ہے، مولوی صاحب کے ساتھ انھیں بھی پوچھتے
بنئی میں جو میرلین کے پاس جہاں وہ کرا کے لائے گئے تھے
پہنچے تھے میں نے اور کرشنا جی نے اُن سے اُن کا پتہ معلوم
کے لیے کیا کیا جتن کیے تھے۔ ممکن ہے ابا جان کو جنگل نے کچھ
ور تم نے کوئی در کوئی گھر نہیں چھوڑا تھا۔ فیض آباد میں مجھے
ی بھنک مل جاتی کہ فرخ، فریال وغیرہ بمبئی میں مولوی اکرام
ٹ میں ہیں تو میں شاید کسی سے کہے بغیر بمبئی چلا جاتا۔ میں
، نہ ٹھیرتا۔ مجھے اپنی ننھی یادہ صفت فرخ اور بھوری آنکھوں
بالوں والی فریال کو گلے لگانے کی ابا جان سے زیادہ حسرت تھی۔
مجھے پہلے انھی کے پاس جانا چاہیے تھا۔ یقیناً میں دو دن
بمبئی سے حیدرآباد جا سکتا ہوں لیکن دو دن کیا، مجھ سے تو
…بھی نہیں گوارا ہو رہا۔ ایسی صورت میں میں انھیں کیا کچھ
گا اور اُن سے کیا بات کر سکوں گا۔ مجھے ہر لمحے حیدرآباد کا
ہے گا۔ اتنے عرصے بعد تو مولوی صاحب کا کوئی نشان ملا تھا۔
ں بھروسا نہیں کہ کل وہ اپنا گھر چھوڑنے کا ارادہ کر لیں کسی
ت نکل جائیں۔ جہاں تک میرے امکان میں ہے، مجھے
…بغیر مسافر خانے کے رجسٹر پر مندرج پتے پر پہنچ جانا
۔ مجھے ایک طرف سے تسلی ہو گئی تھی کہ فرخ، فریال وغیرہ
اکرام کے ساتھ ایک گھر میں محفوظ ہیں۔ ابا جان اُن کا انتظام
…ترنت کے سفر کر چکے تھے اور اب ابا جان انھی کے پاس
…چاہیے تھے۔ پیڑو، زورا اور مارتی بھی اُن کے ساتھ تھے ایک
ہوتے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مجھے اُن سب سے پکڑے

ہوئے جہاں اتنے برس گزر گئے ہیں وہاں دو دن اور سہی۔ جب
تک میں وہاں پہنچ نہ جاؤں بہتر ہے ابا جان اُن سے میرا تذکرہ ہی
نہ کریں۔ سارا حیدرآباد میں وہ بہت اکیلی ہوگی۔ فرخ، فریال کو میرا
انتظار نہیں ہے۔ انھیں میرے بارے میں کوئی علم ہی نہیں لیکن وہ تو
اپنی آہٹ پر بھی چونک جاتی ہوگی۔ فرخ، فریال ایک دوسرے کے
ساتھ ہیں اس کا وہاں کوئی بھی ہم زبان ہم نفس نہیں ہوگا۔ زہرہ
کہتی تھی کہ وہ کسی کو اپنا حال نہیں بتاتی، کسی سے کوئی شکایت نہیں
کرتی۔ مولوی صاحب کی دیوار کے سائے کے باوجود وہ بے سایہ
تھی۔ بہرحال اس کی اس بند مٹھی ٹوٹ جاتی ہوگی۔ ابا جان کو
نہیں معلوم کہ وہ کون ہے۔ میں انھیں کیا بتاؤں کہ یہ وہی لڑکی ہے
جسے انھوں نے اپنے گھر میں پناہ دینے میں پہل کی تھی اور
جس کے لیے میں گھر سے چلا آیا تھا۔ اس کے لیے میں نے پورے
سات سال جیل میں کاٹے تھے۔ ابا جان کی وہ کوئی نہیں ہوتی
تھی لیکن میرے لیے سبھی کچھ تھی۔ ابا جان نے اب تک نہیں سمجھا تھا
تو انھیں اب سمجھ لینا چاہیے کہ میں اس کے بغیر شاید کچھ بھی نہیں
ہوں۔ وہ مجھ سے دور ہے، مجھ سے الگ نہیں۔ میں اس کا کوئی روپ
ہوں یا وہ میرا دوسرا روپ ہے۔

پیڑو میرے پاس ہی بیٹھا تھا لیکن میں اس سے حیدرآباد
جانے کے متعلق اپنے ارادے کا ذکر کرتے کرتے رہ جاتا تھا۔ چلتے
ابا جان کی نظریں بھی پیڑو پر لگی ہوئی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے انھیں پیڑو کے
بارے میں کچھ شبہ سا ہو گیا ہے یا یہ میرا وہم تھا۔ وہ آنکھیں کھولے
کسی سوچ میں گم تھے اور ایک دم چونک کے میری طرف دیکھنے
لگتے تھے۔ میں اُن کے سامنے پیڑو سے کوئی بات کرتا اور بعد میں
پیڑو اُن سے میرے حیدرآباد جانے کا کوئی جواز پیش کرتا تو وہ
فوراً سمجھ جاتے کہ پیڑو کو میں نے مجبور کیا ہے۔ پیڑو کا کوئی کام نہیں
میرا ہی کام ہے۔ میں نے انتظار کیا کہ ابا جان کی توجہ کسی دوسری
جانب مبذول ہو تو میں پیڑو کو بتاؤں۔ ہاپوڑ اسٹیشن بھی آ کے گزر
گیا۔ ہاپوڑ آنے کا مطلب تھا کہ دلی صرف تیس میل دور رہ گئی
ہے۔ ڈبے میں کم روشنی کے قمقمے روشن ہو گئے تھے اور کھڑکی سے
باہر کچھ نظر آنا مشکل ہو گیا تھا۔ گرد و غبار کے … عبور کرنے کے بعد
گاڑی کی رفتار کسی قدر سست پڑ گئی تھی۔ غازی آباد بھی آ گیا۔
ابا جان نے ایک پل کے لیے پلکیں بند کر لیں اور گاڑی دلی کی
حدود میں داخل ہو گئی۔ اب ایک ہی صورت تھی اگر پیڑو سے کوئی
بات کرنے کا موقع نہیں ملتا تو زورا اور مارتی کو سمجھا کے میں دلی
اسٹیشن ہی پر کہیں گم ہو جاؤں۔ دلی اسٹیشن بہت بڑا ہے۔ میں
وہاں ہجوم میں رل مل سکتا ہوں۔ میری جیب میں ایک دو روپے

ہی پڑے تھے لیکن روپیوں کے بغیر مجھے اپنا سفر کسی نہ کسی
طرح جاری رکھنا تھا۔

دلی اسٹیشن پر میرے قدم بہک سے رہے تھے۔ دس نمبر پلیٹ
فارم پر گاڑی آ کے ٹھیری تھی۔ رات کے ساڑھے آٹھ بجے تھے۔
سارا اسٹیشن روشنیوں سے جگمگا رہا تھا اور ہر طرف گاڑیوں، مسافروں،
قلیوں کا شور پھیلا ہوا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ رات دس بجے کے
قریب حیدرآباد کے لیے گاڑی جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے اس دوران
وقت تبدیل ہو گیا ہو تاہم میں ناگ پور تک جانے والی کسی گاڑی
میں بیٹھ سکتا تھا یا ایسی کسی گاڑی میں جو اورنگ آباد تک جائے۔
ایسی ایک گاڑی بھی بھوپال اور منماڑ سے گزرتی ہوئی بمبئی تک جاتی
تھی اور منماڑ سے مجھے اورنگ آباد اور حیدرآباد کے لیے دوسری
گاڑیاں مل سکتی تھیں۔ ابا جان چند قدم آگے بڑھ گئے تھے۔ مارتی اور
زورا مختصر سامان کے ساتھ اُن کے ہمراہ تھے۔ میں کچھ دیر تک اُن کے
پیچھے پیچھے پیڑو کے ساتھ چلتا رہا پھر جب وہ کچھ اور آگے نکل گئے تو
میں نے پیڑو کا ہاتھ پکڑ کے آہستگی سے کہا: "دادا! مجھے … ایک
بات کرنی ہے۔"

پیڑو ایک ثانیے کے لیے رک گیا اور میری طرف تعجب
نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا: "اپن جانتا ہے تو ابھی کون سی بات
بولنا مانگتا ہے۔"

"تم کیا جانتے ہو؟" میں نے مضطرب ہو کے کہا۔

"تم اکیلا کدھر کو بھی نہیں جانے کو مانگتا!"

"دادا!" میں نے حیرت سے اُسے دیکھا۔

وہ مجھے سینے سے چمٹاتے ہوئے بولا: "اپن جانتا ہے۔"

"دادا! میرا اُدھر جانا ضروری ہے۔" میری آواز بھرا گئی۔

وہ سر ہلانے لگا: "اپن بھی تمھارے ساتھ چلے گا۔"

"نہیں دادا! تم ابا جان کے ساتھ جاؤ۔ میں تم سے وعدہ
کرتا ہوں، جلدی واپس آ جاؤں گا۔ دیر بالکل نہیں کروں گا۔ تم ابا جان
سے کوئی بہانہ کر دو۔ میری طرف سے مت کہنا۔"

"اپن نے بڑے صاحب سے بول دیا ہے۔"

"تم نے اُن سے بات کر لی ہے؟"

"دلی سے پہلے ہی اُن کو بولا تھا۔"

"تم نے اُن سے کیا کہا؟"

"بول دیا راجا!" وہ ہنس کے بولا: "اپن نے بولا ابھی تم زورا
اور مارتی کے ساتھ سیدھا بمبئی جاؤ، اپن لوٹ کے آتا ہے۔"

"پھر وہ کیا بولے؟" میں نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

"تھوڑا دیر چپ رہا پھر بولا ٹھیک ہے۔ اپن بھی تمھارے
ساتھ چلے گا۔"

"نہیں، نہیں۔"

"اپن نے منع کرا پر وہ بولا، ابھی سب ساتھ ساتھ ہی بمبئی
چلے گا۔ دو تین دن سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دو تین دن بعد اپن
لوگ بمبئی پہنچ سکتا ہے۔"

"مگر تم نے اُن سے کس طرح کہا تھا؟"

"وہی جو اپن بولتا ہے۔"

"میرا تو نہیں بتایا تھا؟"

اس نے مجھے آگے کی طرف دھکا دیا۔ ابا جان، زورا اور
مارتی آگے مسافروں میں گم ہو گئے تھے۔ "ابھی تھوڑا بہت چلنا
ہے۔" وہ اپنے سر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"دادا، دادا!" میں نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ "میری
بات سنو۔"

"گاڑی کا ٹیم نکلا جاتا ہے راجا!"

"پہلے میری ایک بات سن لو۔"

وہ ٹھیر گیا: "ابھی سب ٹھیک ہے راجا!"

"دادا! اُن سے کہو وہ چلے جائیں۔ اُن کا ہمارے ساتھ جانا
مناسب نہیں ہے۔" میں نے عاجزی سے کہا۔

"اپن اس سے ایسا نہیں بول سکتا۔"

"انھیں وہاں نہیں جانا چاہیے۔ اتنے بہت سے لوگوں کے
چلنے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں تم بھی مت جاؤ۔
خواہ مخواہ تم سب پریشان ہو گے۔ تم سمجھتے کیوں نہیں؟"

"اپن سب سمجھتا ہے۔" وہ ناراضی سے بولا۔

"میں کوئی غلط بات نہیں کہہ رہا ہوں۔ تمھارا اور سب کا
وہاں جانا بالکل لاحاصل ہے۔ تم بھی تنگ ہو گے، مجھ پر بھی بوجھ
رہے گا یا پھر… پھر ایسا کرو صرف تم چلو اور ان سب کو بمبئی
کی گاڑی میں بٹھا دو۔"

"وہ لوگ نہیں مانے گا راجا! اپن نے بول کے دیکھ لیا ہے۔"

"لیکن تم، تم…"

"ابھی اُدھر جا کے دیکھے گا۔ پہلے اِدھر سے نکلے۔"

"ٹھیک ہے پھر میں بھی بمبئی چلتا ہوں۔"

پیڑو میری بات سنی اَن سنی کرتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ ابا جان،
زورا اور مارتی ہمارے انتظار میں آگے جا کے رک گئے تھے۔ ہم
اُن کے پاس پہنچے تو معلوم ہوا کہ حیدرآباد جانے والی گاڑی روانہ
ہونے میں کچھ ہی دیر باقی ہے۔ میں نے اُن کے پیچھے پیچھے ہو کے
وہاں سے بھاگ جانا چاہا لیکن پیڑو میرے ساتھ ساتھ ہی رہا۔ اس

نے جیب سے روپے نکال کے مارتی اور زورا کو دیے اور انھیں پلیٹ فارم پر کھڑے ہوئے ٹی ٹی سے ٹکٹ کی تبدیلی کے متعلق معلومات کرنے کی ہدایت کی۔ اُن کے واپس آنے سے پہلے ہم فرسٹ کلاس کے ایک ڈبے میں بیٹھ گئے تھے۔ میں نے باہر ڈبوں پر لگی ہوئی تختیوں میں حیدرآباد کا نام دیکھ لیا تھا۔ اب کچھ سننے سے کچھ حاصل نہیں تھا۔ تھوڑی دیر میں گاڑی بھی چل پڑی۔ میرے جسم پر رعشہ سا طاری تھا۔

آج کی رات کل کا پورا دن کل کی ساری رات پھر کہیں دوسرے دن دوپہر کو یہ سفر ختم ہونا تھا۔ درمیان میں گاڑی لیٹ ہو جائے تو شام بھی ہو سکتی تھی رات بھی۔ ریل گاڑی کے سوا اور کوئی تیز ترین ذریعہ نہیں تھا۔ دلی اسٹیشن کے دور ہوتے ہی آپا جان نے فرش پر چادر بچھا کے کھانا لگا دیا۔ انھوں نے مجھ سے کہا تو میں بھی اُن کے ساتھ فرش پر آ گیا۔ صبح فیض آباد سے چلتے ہوئے زلیخا نے اتنا بہت سا کھانا ساتھ کر دیا تھا کہ دوپہر کو کھانے کے باوجود باقی رہ گیا تھا۔ شاید میری طرح کسی کو بھوک نہیں لگ رہی تھی۔ آپا جان نے چند لقمے لیے ہوں گے کہ ہاتھ کھینچ لیا۔ میں اُن سب کے خیال سے بےچار بار نوالے حلق میں اٹکا رہا تھا۔ زیبا نے میٹھے چاول بطور خاص میرے لیے پکائے تھے۔ مجھ سے وہ بھی نہیں کھائے گئے۔ انھوں نے جیسے ہی کھانا سمیٹا میں اوپر کی برتھ پر جا کے لیٹ گیا۔ آپا جان میری برتھ کے عین نیچے تھے اس لیے نہ وہ مجھے دیکھ سکتے تھے نہ میں انھیں۔ ڈبے میں چھ مسافروں کی گنجائش تھی۔ وہ چھ کے چھ موجود تھے۔ ایک خوش پوش صحت مند سانولے رنگ اور بھرے ہوئے چہرے کا نوجوان۔ دوسری اس کے ساتھ سونے جیسی رنگت، کتابی چہرے کی ایک لڑکی۔ اس نے کاسنی ساڑی پہن رکھی تھی۔ کانوں میں سفید آویزے لٹک رہے تھے۔ گلے میں ہار، ہاتھوں میں چوڑیاں۔ وہ نوجوان کی بیوی ہو سکتی تھی یا بہن بھی۔ ڈبے میں داخل ہوتے وقت میں نے اُسے ایک نظر ہی دیکھا تھا اور نہ جانے کیوں مجھے شبہ ہوا تھا جیسے میں نے اسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ بعد میں مجھے اس کا چہرہ نظر نہیں آیا۔ وہ ہم سب کی طرف پیٹھ کر کے اور ساڑی کا پلو سر پر ڈال کے کونے میں بیٹھی رہی۔ ہم پانچ آدمیوں کو ڈبے میں دیکھ کے نوجوان نے دبے لفظوں میں اعتراض کیا لیکن پیرزادے نے اُسے سمجھایا کہ ایک مزید آدمی کی موجودگی سے اُسے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ وہ چپ تو ہو گیا مگر دیر تک اس کے چہرے پر کھنچاؤ رہا۔ ڈبے میں برتھیں بھی صرف چھ تھیں۔ تین اوپر تین نیچے۔ نیچے کی برتھوں پر نوجوان، اس کے ساتھ والی لڑکی اور آپا جان تھے اور اوپر ایک پر میں، دوسری پر پیرزادہ، تیسری پر ایک دوسرے کے سروں کی طرف پھر کے زورا اور مارتی۔ برتھ پر آ کے میں نے جیسے ہی آنکھیں موندنے کی کوشش کی، میرا دل ڈوبنے سا لگا جیسے میں کہیں گرنے لگا ہوں۔ میں نے پھر آنکھیں بند ہی نہیں کیں۔

رات کے سناٹے میں گاڑی کا شور بڑھ گیا تھا، رفتار بہت تیز تھی۔ ڈبے میں ہلکی روشنی کا بلب روشن کر دیا گیا تھا۔ پیرزادہ، زورا اور مارتی جلد ہی بے سدھ ہو گئے۔ گاڑی چلے ہوئے دیر ہو چکی تھی، اور میری طبیعت بہت گھبرانے لگی تو میں نے نیچے اترنے کا ارادہ کیا مگر سب کی نیند میں خلل پڑنے کے خیال سے وہیں پڑا رہا۔ مجھے حبس سا محسوس ہو رہا تھا۔ نیچے ایک عورت بھی موجود تھی۔ میرا اترنا ویسے بھی مناسب نہیں تھا۔ ظاہر ہے میں آپا جان ہی کی برتھ پر جا کے بیٹھ سکتا تھا۔ باقی دو برتھوں پر نوجوان اور لڑکی آرام کر رہے تھے۔ اسی دوران کسی لمحے میں نے کروٹ بدلی تو میری نظریں بھی اس لڑکی پر گئیں جو نیچے میری برتھ کے عین مقابل لیٹی تھی۔ وہ بھی جاگ رہی تھی۔ کم روشنی کے باوجود میں اس کا سانولا چہرہ اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔ اُسے فوراً احساس ہو گیا کہ کوئی اس کی جانب دیکھ رہا ہے۔ ایک ثانیے کے لیے اس کے سارے بدن میں ایک لہر سی دوڑ گئی۔ وہ چادر اوڑھے ہوئے تھی۔ اس نے اپنا منہ چشم زدن میں دوسری طرف پھیر لیا۔ مجھے پھر وہی گمان ہوا جو اسے پہلی بار دیکھ کے ہوا تھا۔ میں نے یقیناً اسے پہلے کہیں دیکھا تھا۔ کہاں اور کب؟ یہ کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔ میں نے ذہن پر بہت زور دیا۔ ایک بار نہیں کئی بار میں نے اُسے دیکھا تھا۔ پھر یکایک مجھے یاد آ گیا۔ ہو نہ ہو یہ سونیا ہے۔ سونیا کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔ جیل ہی میں میں نے امتحانات دینے شروع کیے تھے اور ایف اے میں اول آیا تھا تو جیلر صاحب اتنے خوش ہوئے کہ مجھے بیوی بچوں سے ملانے اپنے گھر لے گئے۔ ان کے گھر والے مجھے دیکھ کے سہمے ہوئے تھے۔ جیلر صاحب نے انھیں بتایا، یہ ہے وہ قیدی لاڈلا۔ نام اس کا خیر خاں ہے مگر جیل میں سب اسے لاڈلا کہتے ہیں۔ بعد میں میں ان کے گھر باقاعدہ آنے جانے لگا تھا۔ جیلر صاحب میری تعلیم میں خاص دلچسپی لیتے تھے۔ ہر امتحان میں اول آنے پر وہ انعام میں مجھے کتابوں کا تحفہ دیا کرتے تھے۔ وہ جیلر صاحب کی لڑکی سونیا تھی۔

اس دلچسپ سلسلے وار داستان کے
بقیہ واقعات تیسرے حصے
میں ملاحظہ فرمائیے